گفتنی ناگفتنی

وامق جونپوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

گفتنی ناگفتنی

وامق جونپوری

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

تقسیم کار:

صدر دفتر:

- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ــــــ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، نئی دہلی ــــــ ۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی ــــــ ۴۰۰۰۰۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ــــــ ۲۰۲۰۰۲

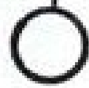
۱۹۹۳ء

قیمت : پچھہتر ۷۵ روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) نئی دہلی میں طبع ہوا

فہرست





حرفے چند

"میں، وامق جونپوری، نے ۱۹۸۶ء میں جو کتاب ختم کر دی تھی، اب ۱۹۹۲ء میں اس کے شائع ہونے کی نوید ملی ہے۔ شکر ہے اس کی اشاعت دیکھنے کو زندہ ہوں، ورنہ، اِن حضرت کا پختہ ارادہ تھا کہ Obituary کے ساتھ شائع کریں۔

"تاخیر کا باعث، پتا چلا ڈاکٹر بیدار کے لیے 'گفتنی' تو خیر ٹھیک ہے 'ناگفتنی' مسئلہ بن گئی۔ میرے بچوں نے خاص طور سے ان پر زور ڈالا' اور انھوں نے میرے بجائے میرے بچوں کا کہنا ماننا ضروری سمجھا اور بالآخر' پانچ سال سوچتے سوچتے' وہ حصہ نکال باہر کیا۔ مگر میں اس پر راضی نہیں ہوں۔ سو 'گفتنی' یہاں دیکھ لیجیے، 'ناگفتنی' آپ کو کہیں اور مل جائیگی۔"

وامق صاحب نے از راہ کرم یہ سب کچھ —— نہیں لکھا۔ لیکن یہ لکھنے کا حق تھا انھیں۔ اِدھر ہم عجیب الجھن میں تھے۔ ان کے بچوں کے خط برابر آ رہے تھے کہ "دیکھیے جناب، ایڈٹنگ کا حق آپ نے استعمال نہ کیا تو ...." اور یہ کہ "ہمارے والد صاحب روانی میں کچھ لکھ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ..."۔ اور بھی بہت کچھ! ان لوگوں کو مشتملات کی کچھ سُن گُن لگ گئی تھی سو 'ناگفتنی' کو ایک بار پڑھا' دوسری بار پڑھا' تیسری بار مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ گفتنی کی اشاعت پہلے حصے کے طور پر فوراً کر دی جائے —— اور 'ناگفتنی' مولانا آزاد روایت کے مطابق تیس سال بعد!

—— ع رب ●●

گفتنی ناگفتنی

دیباچہ

"خود اپنی ذات سے متعلق باتیں بیان کرنے سے زیادہ مشکل کوئی اور ذکر نہیں ہوتا"

مانٹینگ کے مندرجہ بالا کلیہ کی اہمیت کا انکشاف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی خود نوشت کے لیے قلم اٹھانے کی جرأت کرے۔ خود نوشت کی پہلی شرط صداقت ہے۔ صداقت کا دوسرا نام ہے کچا چٹھا۔ اور اپنا کچا چٹھا بیان کرنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اخفائے حقیقت جھوٹ سے بھی بڑا جرم ہے مگر اس امر واقعی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اظہار احوال واقعی سے بڑے بڑے فتنے اور فسادات بھی برپا ہو سکتے ہیں۔ تو کیا کیا جائے، خود نوشت پر قلم اٹھانا چاہیے یا نہیں یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی باہوش آدمی کھلے عام بازار سے برہنہ گذرے اور دیکھنے والے اس پر انگشت نمائی نہ کریں۔ تو پھر خود نوشت کی شرط اوّل سے کوئی کس طرح عہدا برا ہو سکتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایسا یوں ہی ممکن ہے کہ ان نازک حقائق کو بجائے براہ راست بیان کرنے کے بین السطور قلمبند کیا جائے۔ اس میں بیان کی لچک اور ماہرانہ انشا پردازی کو بروئے کار لانا پڑے گا۔ جو جتنا بڑا فن کار ہوگا اس کا خاموش اعتراف اتنا ہی واضح ہوگا۔ اور جو قاری جتنا ذہین اور طباع ہوگا اتنا ہی وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے گا۔ اس لیے خود نوشت کے داعی کو نہ ننگا ناچنے کی ضرورت ہے اور نہ چہ بچہ میں گرنے کی۔

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو
کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خود نوشت میں ایک مسئلہ لفظ "میں" کا آتا ہے۔ "میں" کا استعمال جو تحریر میں آتے ہی تکبر، شیخی، خود نمائی اور خود ستائی کی علامت بن کر خود نوشت میں اپنی ذات کے گھٹیا پن کا احساس دلاتا ہے اس کا کیا علاج ہے۔ اس "میں" کی جگہ اگر راقم الحروف، راقم السطور، کمترین یا خاکسار وغیرہ

وغیرہ لکھا جائے تو تحریر بوجھل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کا حل اگر ممکن ہے تو وہ عبارت آرائی میں مضمر ہے یعنی "میں" کا استعمال اس طرح ہو کہ روانی تحریر میں گھل مل کر بہہ جائے جس طرح نمک بہتے پانی میں اور اس کا احساس ثقل باقی نہ رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سعی میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

دوسری بحث طلب بات یہ ہے کہ کیا کوئی فرد واحد دوسروں اور بالخصوص اُن افراد کا ذکر کئے بغیر اپنی خودنوشت سے پورا انصاف کر سکتا ہے جن کی قربت، معیت، صحبت، محبت، دوستی، دشمنی یا جن کے کرداروں کی کارفرمائیاں اس کی موجودہ شخصیت کے ارتقاء کا سرچشمہ ہیں۔ ان تفصیلات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خودنوشت میں ان کا ذکر ضروری ہے۔ انسان معاشرہ کا جز ہے۔ اور معاشرہ یا سماج نام ہے بہت سی شخصیتوں اور ان کے کوائف کے مجموعہ کا۔ سماج ایک مشین ہے جس کے ہم پرزے ہیں۔ ہمعصر شخصیتوں کا ذکر تو خیر ناگزیر ہے ہی بزرگوں کے حالات مستعار ہوتے ہوئے بھی بغیر ان کی شخصیات پر روشنی ڈالے ہوئے خودنوشت کو صحیح راہ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ بچپن جن کی آغوش میں گذرا ہو، راتیں جن کی کہانیاں سننے میں کٹی ہوں، نوجوانوں نے جن کی آنکھیں دیکھی ہوں اور جن کے صلب سے ہم ہیں ان کو نظرانداز کر دیں۔ ان ہی جملہ شخصیتوں سے اتفاق و انحراف کے موڑوں میں ہمارا حال اور مستقبل پوشیدہ ہے۔ علم اور ماحول اپنا کام کرتے ہیں اور جین (GENE) اپنے اثرات دکھاتا ہے۔ اور ان جملہ عناصر ترکیبی کے امتزاج کا نام خود نوشت نگار کی شخصیت ہے۔ ماحول بدلتا رہا، علم بدلتا رہا، شعور بدلتا رہا مگر نہ بدلے تو بڑی حد تک صلبی اثرات۔

تیسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ الجھن پیدا کر سکتا ہے وہ انتخاب واقعات و سانحات کا ہے۔ کس کو موضوع تحریر بنایا جائے اور کس کو نظرانداز کیا جائے۔ قارئین اور ناقدین مختلف الخیال اور منفرد المذاق ہوتے ہیں۔ نفسیات سے دلچسپی رکھنے والا بہت معمولی اور بظاہر غیر اہم باتوں کی تلاش میں رہتا ہے کہ وہی لاشعور اور تحت الشعور کی درکشاپ میں شخصیت کو ڈھالتے ہیں۔ ماہر انسانیات (Anthropologist) اپنے مطلب کی باتیں تلاش کرتا ہے۔ مارکسی نقاد ماحول، اقتصادی، سماجی اور سیاسی کیفیات سے تولتا اور پرکھتا ہے اور نظریاتی جدوجہد کو زیادہ اہمیت

دیتا ہے۔ غرض کہ خود نوشت کو دلچسپ اور مفید بنانے کے لیے اہم، کم اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کس معیار پر کیا جائے۔ قدم قدم پر رکاوٹ قدم قدم پہ جواز۔ اس لیے مجھ کو تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک حافظہ مساعدت کرے زندگی کے معمولات کو چھوڑ کر تمام رطب و یابس کو خود نوشت میں اس طرح سمو دیا جائے، کہ دانش جویانِ سائنس وادب کی طبع نازک پر گراں نہ گذریں اور سوانح نگاری کی جو تصویریں (Images) بنیں وہ ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہ ہوں۔ زیرِ نظر خود نوشت کے پہلے دو ابواب تاریخی پس منظر پر مشتمل ہیں اور باقی ابواب واقعاتی اور نفسیاتی عناصر کے آئینہ دار ہیں۔ ایک مختصر کہانی ہے جو ۷۶۔۷۷ سال کے عرصۂ حیات پر چند منطقی مفروضات اور ایک سلسلۂ سانحات کی شکل میں بکھری پڑی ہے۔ جس میں نہ کوئی چکاچوند (GLAMOUR) ہے اور نہ شخصیت کے گرد کوئی اتنا بڑا ہالہ ہے جو خطا و نسیان کے ایک مرکب کو انسانوں کی صف سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دے اور نہ رسوائے زمانہ کوئی ایسی غیر معمولی داستان ہے جو قاری کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرے۔ کسی نوع کا بھی گلیمر اتنے بڑے دھوکے کی ٹٹی ہوتا ہے کہ اس میں فنکار کی اصل حیثیت اور شخصیت گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ گلیمر ایک ایسا لکڑ ور مصنوعی چہرہ ہے جس کو ذرا کریدنے سے اصلی چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ پردۂ سیمیں پر چھپے ہوئے ناموں سے شہرت پاتے ہیں، بے تحاشا شراب پینے والے اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے اور کھلم کھلا اپنے معاشقوں کا اشتہار دینے والے قاری کا مرکزِ نظر بنتے ہیں۔

جہاں تک میری زندگی کا سوال ہے میں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی جگہوں یا مرکز سے دور مقامات پر رہا ہوں۔ دہلی، بمبئی، کلکتہ وغیرہ جیسے بڑے شہروں میں طویل قیام کرنے کے کم مواقع ملے جہاں ادیبوں کو نمایاں ہونے کی بے شمار سہولتیں میسّر ہوتی ہیں اور نام و نمود پیدا کرنے کے طریقے خود بخود آ جاتے ہیں۔ میری زندگی چھوٹی چھوٹی تمناؤں، چھوٹی چھوٹی مایوسیوں، چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور چھوٹے چھوٹے تغیرات اور حادثات کا ایک غیر منظم مجموعہ ہے۔ البتہ ہوش سنبھالنے کے بعد سیاسی اور ادبی تحریکوں سے ایسی ذہنی وابستگی رہی کہ جس پر میں جس قدر بھی فخر کروں کم ہے۔

چند باتیں جو میری زندگی کی اساس ہیں، ان کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) نظریاتی، اقتصادی اور جنسی آسودگیاں انسان کی روحانی، جسمانی اور دماغی صحت اور بقا کے لیے بالترتیب انتہائی ضروری ہیں۔ فطرت کے یہ تینوں وہ کم سے کم تقاضے ہیں جن کی بنیادی بحالی اور آزادی پر بیجا پابندی لگانے سے نظامِ زندگی اور سماجی توازن درہم برہم ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جنسی آسودگی فطرت کا وہ جبلّی مطالبہ اور متبرک عطیہ ہے جس کا تحفظ لازم ہے اور جس کے لیے سماج میں قوتِ برداشت اور صحت مند جنسی شعور کا ایک انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔

(۲) مجھ کو یقین کامل ہے کہ جھوٹ کے پر تو ہوتے ہیں پیر نہیں ہوتے۔ کوئی پرندہ ہمیشہ اڑتا رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کو زندہ رہنے کے لیے آرام کرنے کے لیے اور پیٹ بھرنے کے لیے کبھی نہ کبھی تو زمین پر اترنا ہی پڑے گا۔ اور جب پیر نہ ہوں گے تو زمین پر اترنا بھی بے سود ہو جائیگا۔ یہی صورت جھوٹ کی ہے۔ جھوٹ نہ بہت دور تک اور نہ بہت دیر تک اڑ سکتا ہے۔ اور اس کی اصلیت ایک نہ ایک دن کھل کے رہتی ہے۔ تو اب اگر یہ دعویٰ کروں کہ میں اپنی یادداشت میں کبھی جھوٹ نہیں بولا تو کم ہی لوگ یقین کریں گے۔ مگر اصلیت یہی ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اور اس عادت کی وجہ سے زندگی میں بے شمار پریشانیوں، مشکلات اور الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہاں یہ بات بھی صاف کر دینا ضروری ہے کہ جھوٹ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجرمانہ جھوٹ اور دوسرا معصوم جھوٹ جس کا دوسرا نام "گپ" ہے۔ مجرمانہ جھوٹ وہ ہے جو اپنے کو ناجائز فائدہ اور یا دوسروں کو ناجائز نقصان اور خسارہ میں ڈالنے کے لیے بولا جائے۔ مثلاً جعل فریب، دھوکا دھڑی اور غلط بیانی۔ اور معصوم جھوٹ وہ ہے جو محض لطفِ سخن کے لیے اس طرح بولا جائے کہ دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس موخرالذکر جھوٹ کے متعلق دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ زندگی میں کبھی میں اسکا مرتکب نہیں ہوا ہوں۔

(۳) ایک بات جس سے مجھ کو ہمیشہ نفرت رہی ہے وہ ہے نظریات اور فن کے معاملات میں سمجھوتا بازی اور گروہ بندی۔ ان دونوں صورتوں کی بنیاد چالاکی کی زیادتی اور شعور کی کمی ہے۔ جن ادیبوں اور فنکاروں کو اپنی تخلیقات پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ زیادہ تر گروہ بندی کی آڑ لیتے ہیں۔ مگر اس کے بھی نتائج دیرپا نہیں ہوتے۔

(۴) مجھ کو مرنے سے بالکل ڈر نہیں لگتا اور نہ اب اس سے زیادہ جینے کی ہوس ہے کیونکہ جینے کے لیے اب کچھ باقی رہا نہیں۔ میں نے بھرپور زندگی گذاری ہے۔ ادب اور فن کی مزید خدمت کرنے کے علاوہ اور کوئی تمنا باقی نہیں۔ میں نے اپنے لیے جنت اور دوزخ اسی دنیا میں پیدا کر رکھی تھی۔ رہا انقلاب، سو وہ تو آکے رہے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی زندگی میں اس سے ہم آغوش ہونے کے مواقع بعید نظر آتے ہیں۔

(۵) یہ خیال غلط ہے کہ اشتراکیت کا فلسفہ قبول کرنے کے لیے الحاد یا لامذہبیت ضروری ہے۔

(۶) چالاکی دلیل ہے بیوقوفی اور بزدلی کی، اور عقلمندی دلیل ہے نیک نفسی اور بہادری کی۔

(۷) خوش اخلاقی اور انکساری کو ذاتی کمزوری یا نااہلی تصور کرنے والا آدمی بیوقوف ہوتا ہے۔

(۸) بلا وجہ کسی کی نیت پر شک کرنا بدنفسی کی دلیل ہے۔

(۹) توقعات ہی مایوسی کو جنم دیتے ہیں اس لیے خوش رہنے کے لیے کسی سے بھی کسی طرح کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔

(۱۰) نقصان اٹھا کر حاصل کیا ہوا تجربہ زیادہ مفید اور دیرپا ہوتا ہے۔

(۱۱) ہر شخص کو اس وقت تک قابلِ احترام و اعتبار سمجھتا ہوں جب تک وہ اپنے کو اس کا نااہل نہ ثابت کر دے اور اس طرح میں بہ آسانی دھوکا کھاتا رہا ہوں۔

میرے چند اعترافات بھی قابلِ توجہ ہیں:

(۱) بنیادی طور پر میں ایک صلح پسند اور کاہل آدمی ہوں۔ مگر امتدادِ زمانہ نے اضطراری، سے زیادہ حساس (Hyper Sensitive) اور بددماغی کی حد تک تنک مزاج بنا دیا ہے، جن وجوہ سے دشمن بنا لینے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

(۲) مجھ میں بڑا عیب یہ ہے کہ کبھی کبھی بلا سوچے سمجھے ایسی بات کہہ جاتا ہوں جو نہ کہنی چاہیئے اور بعد میں اس حماقت کا ازالہ امکان کے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳) غیبت سننے اور غیبت کرنے میں مجھ کو بیحد لطف آتا ہے۔ البتہ اس کے پیچھے کسی کی تضحیک یا تشہیر کا مقصد نہیں ہوتا، محض وقت گذاری لطف صحبت ہنسنے ہنسانے اور کھانا

ہضم کرنیکے مطلب سے ہوتی ہے۔

(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مدنظر رکھتے ہوئے عرف عام میں جرم یا گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم (Sin against God or any other controlling power) حکم خداوندی یا اولی الامر حکم کے خلاف ترک واجبات مثلاً نماز روزہ وغیرہ (حق اللہ) اور دوسری قسم ہے (Social crime or sin against man) انسان یا سماج کے خلاف جرم یا گناہ مثلاً قتل و غارتگری۔ مار پیٹ ڈاکا جھوٹ دھوکا حق تلفی وغیرہ وغیرہ (حق العباد)

مجھ کو اعتراف ہے کہ میں نے حق اللہ کے خلاف تواتر سے گناہ کئے ہیں اور تارک الواجبات ہوں البتہ فخر و یقین اسپر ہے کہ مجھ سے عمداً انسانی سماجی یا فطرت کے خلاف کوئی گناہ یا جرم سرزد نہیں ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون پلّا زیادہ بھاری نکلتا ہے۔ کتابوں میں تو یہ بھی آیا ہے کہ حق اللہ Write off تو ہوسکتا ہے مگر حق العباد نہیں۔

"گفتنی ناگفتنی" کو پڑھنے کے بعد چند اہل نظر قارئین یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اس میں مشاعروں میں شرکت کا ذکر ضرورت سے زیادہ ہے۔ تو عرض کروں گا کہ اسی ضمن میں میرا ایک موقف ہے جس کی وضاحت کر دینے سے ممکن ہے کہ معترضین قائل ہو جائیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء سے آج تک ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مشاعروں میں میں نے شرکت کی ہے۔ اور جس سے محض پیسے کمانا مقصود نہ تھا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ ترقی پسند شاعری صرف تعلیم یافتہ طبقہ کے تسکین ذوق کے لئے نہیں ہے۔ اس میں بڑا حصہ عوام اور محنت کشوں کا ہے اسی لیے یہ ترقی پسند ادب نظموں غزلوں اور عوامی گیتوں کی شکل میں اُن اَن پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ محنت کش عوام تک زیادہ سے زیادہ پہنچایا جائے۔ اس میں دوہرے فوائد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا ثقافتی اور سیاسی شعور اور اُن میں اپنے مسائل کو حل کرنے کا جذبہ پرورش پاتا ہے دوسری جانب فنکار کو ان کی قربت نصیب ہوتی ہے جس سے ان کی زندگی اور مسائل کا براہ راست مطالعہ کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ارباب ادب کے کرم سے میں کاغذ پر کم پڑھا اور دیکھا گیا ہوں البتہ جتنا زیادہ قریب سے محنت کش عوام کو میں نے دیکھا ہے اور انھوں نے مجھ کو دیکھا ہے

کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ کوئلہ کی کانوں، صنعتی مراکز، کھیت کھلیان اور دور دراز دیہات کو جتنی بار میں نے خطاب کیا ہے اور کسی نے نہیں۔ عوام کی بولیوں میں عوامی گیتوں اور عوامی نظموں سے عوامی ادب کی جتنی خدمت میں نے کی ہے علاوہ نیاز حیدر اور معصوم رضا راہی کے کسی اور ترقی پسند شاعر نے نہیں کی ہے۔ اس انکشاف حقیقت کو ممکن ہے کچھ لوگ خودستائی اور خودنمائی سے تعبیر کریں، مگر جب میں نے خود نوشت کی اوکھلی میں اپنا سر ڈال دیا تو مجبور ہو کر میری شخصیت کے رخ پر پردہ ڈالنے والوں کا پردہ فاش کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اپنی کمزوریوں اور رازہائے سربستہ کو بھی بیان کرنے میں جب میں نے اخفاء سے کام نہیں لیا تو اپنی تمناؤں اور تخلیقات کے خون کو کس طرح چھپا سکتا ہوں۔

مثل مشہور ہے کہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید بر کلہ خود باید زد"۔ اس خود نوشت کے سلسلہ میں کچھ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کسی نے کہا "چڑھ جا سولی پر اور میں چڑھ گیا سولی پر۔ اور جب سولی پر چڑھ کے شہید ہو گیا تب پتہ چلا کہ اہل قلم حضرات خود نوشت لکھنے سے کیوں گریز کرتے رہے ہیں۔ ـــــــ ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مجھ سے خود نوشت کی خواہش کی اور میں نے بغیر اس کے نتائج پر غور کئے ہوئے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور جب چار برس کی عمر سے حافظہ کی پہلی کڑی ہاتھ آئی تو تسلسل واقعات ہاتھ جوڑ جوڑ کر ذہن کے پردہ سیمیں پر ـــــــ بائسکوپ کی مانند نمودار ہونے لگے اور نوک قلم نے ان کو سمیٹ کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ ایک تصویر جو ابھر کر سامنے آئی تو میرا پورا وجود کانپ اٹھا کہ حضرت وامق تم تو اب کہیں کے نہ رہے۔ زیادہ تر اس کی پریشانی نہ تھی کہ دنیا کیا کہے گی۔ البتہ اس تصور سے کہ اپنے بچے اور اعزا اسے خاص کیا خیال کریں گے میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ جن بہادروں نے خود نوشت لکھ کر یہ وصیت کر دی تھی کہ اس کو ان کے مرنے کے بعد شائع کیا جائے کتنے دور بیں تھے۔ مگر میرا معاملہ بہت آگے بڑھ چکا تھا اور میں (No return point) رجعت قہقری کی حد سے بہت آگے جا چکا تھا۔ تو میں نے اپنے دل کو اس طرح تسکین دے لی کہ میرے افراد خاندان اپنی خوش فہمی کی بنا پر میری حقیقت بیانی کو اوریا

ناگفتنی کو زیبِ داستان سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے ۔ اور ایک شاعر کی فنکارانہ تخلیقی اپج پر محمول کر کے قابلِ یقین نہ سمجھیں گے اسی لیے اس کو یوں ہی چلنے دو اور اس طرح اپنے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا ۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہو گا کہ "گفتنی ناگفتنی" میں گفتنی سے ناگفتنی زیادہ ہے اور اس کی یہی خصوصیت اس خودنوشت کی صداقت کلّی پر دلالت بھی کرتی ہے ۔

بڑی ناشکری ہو گی اگر آخر میں اُن دوستوں ہموطنوں فنکاروں اور صحافیوں کے ہمدردانہ مساعی کا اعتراف نہ کیا جائے جنھوں نے "گفتنی ناگفتنی" کی تکمیل میں میرا ہاتھ بٹایا ہے ۔ اس ضمن میں جن حضرات کے اسمائے گرامی سرِفہرست آتے ہیں وہ ہیں کیفی اعظمی ڈاکٹر اے اے فاطمی ابجکار نثار جونپوری شاعر جمالی ہوشی جونپوری عشرت صدیقی اور زردار حسین فوٹو آرٹسٹ ——

—— ان کے علاوہ چند دستاویزات خطوط بھولی بسری اسکول بجوں سرکاری ڈائریاں، اپنے مضامین اور خطبات ، ردی کھاتا یا یادداشتیں اور تحریری معاہدے بھی کچھ کم ممد ثابت نہیں ہوئے ۔

مکرر آنکہ اس کتاب میں اگر کوئی نام کوئی واقعہ یا اس کا جائے وقوع اصلی معلوم ہو اور اس سے کسی شخص کی تحقیر یا ہتک حرمت ثابت ہوتی ہو تو اس کو ایک امر اتفاقیہ ہی سمجھا جائے ۔ واقعات سب صحیح ہیں البتہ اسماء ، افراد و مقامات کافی تعداد میں فرضی ہیں اور چونکہ ان کو بیان کرنے والا میں ہوں اسی لیے کیا فرضی ہے اور کیا اصلی ہے اس کا فیصلہ علاوہ میرے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔

والسلام ، نیاز کیش

وامق جونپوری

لال کوٹھی ۔ موضع و ڈاکخانہ کج گاؤں

ضلع جونپور (یوپی) ، ہندوستان

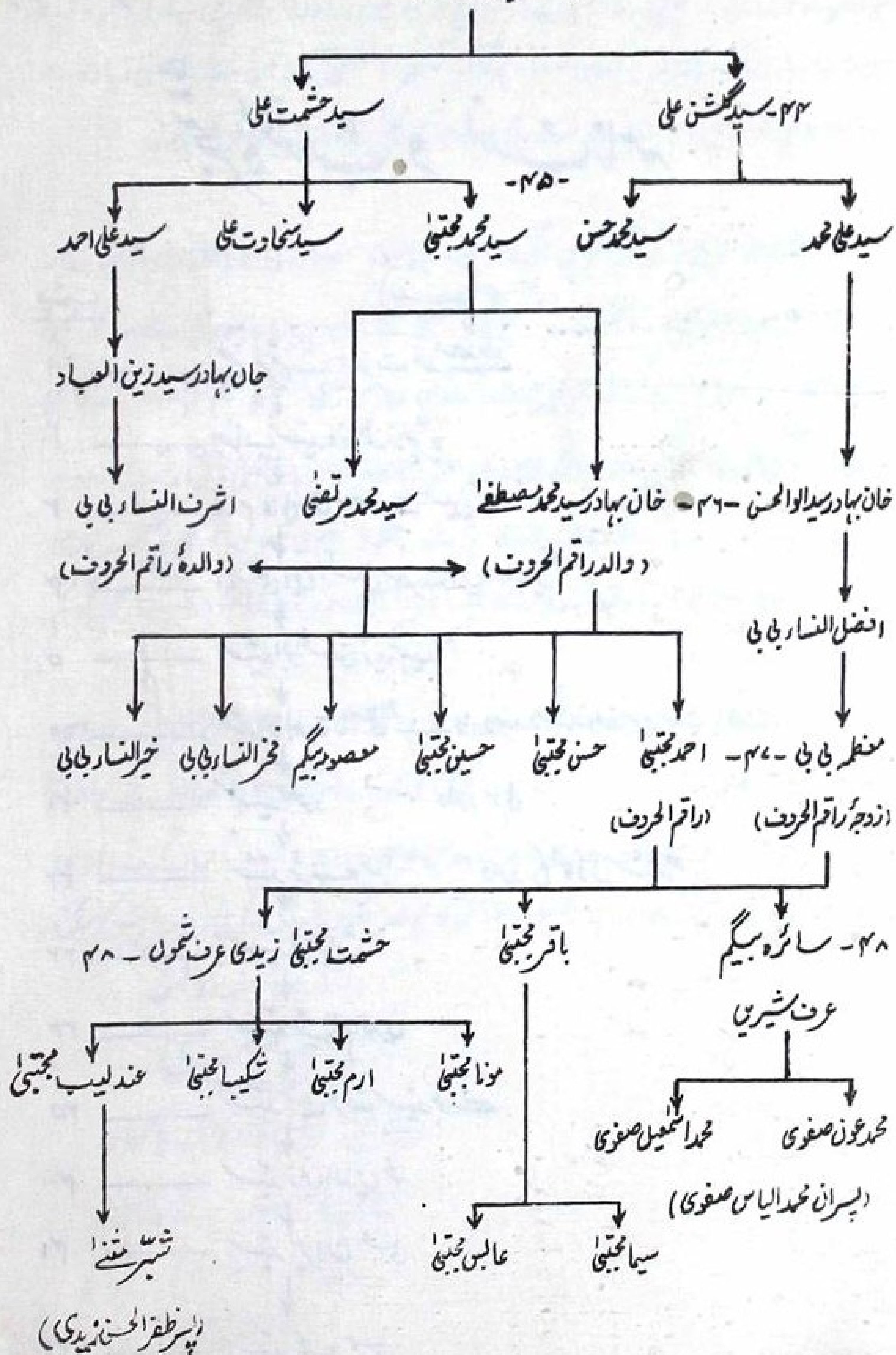
پن کوڈ ۔ ۲۲۲۱۳۸

۱۳ ر اپریل ۱۹۸۶ء

پہلا باب

شجرۂ نسب و نسب نامہ

پشت	اسماء	
۱	ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ	
۲	جناب سیّدہ فاطمہ زہراؓ	
۳	امام عالی مقام حضرت حسینؑ	
۴	امام علی ابن الحسین حضرت زین العابدینؑ	
۵	سیّد ابوالحسن زید شہیدؒ	
۱۶	سیّد ابوالفرح واسطیؒ	وارد ہندوستان بمقام برست پانی پت
۳۱	سیّد مسعود	وارد دہلی
۳۲	سیّد بڑے میر	وارد کجھ گاؤں سنہ ۲۲۰ھ
۳۳	سیّد کرم اللہ	
۳۴	سیّد قیام الدین	
۳۵	سیّد حسین عرف سیّد ہونسے	
۴۰	سیّد زین الدین محمد	
۴۱	سیّد چراغ علی	
۴۲	سیّد محمد علی	



۴۳ - سید بشارت علی
سید حشمت علی
۴۴ - سید گلشن علی
۴۵ -
سید علی احمد
سید سخاوت علی
سید محمد مجتبیٰ
سید محمد حسن
سید علی محمد
جان بہادر سید زین العباد
اشرف النساء بی بی
سید محمد مرتضیٰ
خان بہادر سید محمد مصطفیٰ
۴۶ - خان بہادر سید ابو الحسن
(والدۂ راقم الحروف)
(والد راقم الحروف)
افضل النساء بی بی
خیر النساء بی بی
فخر النساء بی بی
معصومہ بیگم
حسین مجتبیٰ
حسن مجتبیٰ
احمد مجتبیٰ
۴۷ - معظمہ بی بی
(راقم الحروف)
(زوجۂ راقم الحروف)
حشمت مجتبیٰ زیدی عرف شمون - ۴۸
باقر مجتبیٰ
۴۸ - سائرہ بیگم
عرف شیریں
عندلیب مجتبیٰ
شکیبا مجتبیٰ
ارم مجتبیٰ
مونا مجتبیٰ
محمد اسمٰعیل صفوی
محمد عون صفوی
(پسران محمد الیاس صفوی)
شبر مرتضیٰ
(پسر ظفر الحسن زیدی)
عابس مجتبیٰ
سیما مجتبیٰ

نسب نامہ

مندرجہ بالا شجرہ نسب نامۂ خاندانہائے سادات زیدی و حسینی و جعفری و نقوی مقیم جونپور و نواح جونپور مرتبہ سید محمد جعفر صاحب مرحوم مطبوعہ کراچی (پاکستان) مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۵۶ء سے ماخوذ ہے۔ اس نسب نامہ کا پہلا جملہ ہے "اپنے کلام پاک میں پروردگار عالم نے واضح کر دیا ہے کہ ہماری تقسیم قوم و قبیلہ میں اس لیے کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہماری شناخت ہو سکے ورنہ کسی قوم و قبیلہ کو دوسرے قوم و قبیلہ پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔

بیشک فضیلت اسی کو حاصل ہے جو کردار و عمل و شخصیت کے اعتبار سے اچھا انسان ہو۔ یہ نسب نامہ کئی دوسرے قدیم نسب ناموں کے حوالوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سید دولت علی صاحب کا نسب نامہ مورخہ ۱۸۵۶ء خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس نسب نامہ میں مرحوم نے بحوالہ قدیم نسّاب سید صدر جہاں اجمل کے تحریر فرمایا ہے کہ میر سید بڑے میر واسطیہ خارجیہ سادات مسونڈا (بجگاؤں)... از دہلی تا جونپور سادات حسینی صحیح النسب اند"

کھرے سید کو صحیح النسب کہنا کافی اور مناسب ہے مگر زیر حوالہ نسب نامہ میں مؤلف موصوف نے سادات بجگاؤں کے "نجیب الطرفین سید" ہونے پر زور دیا ہے اور لہجہ میں تفاخر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ "نجیب الطرفین" کی اصطلاح کب اور کس انداز فکر کی تحت وضع ہوئی۔ موصوف کے ارشاد کے مطابق "صحیح النسب سید" سے بہتر بھی ایک سید ہوتا ہے جس کو ماں باپ دونوں طرف سے سیادت ملی ہو تو وہ نجیب الطرفین سید ہے۔ کیا کسی کے لیے صحیح النسب سید ہونا کافی نہیں ہے۔ نجیب الطرفین کی اصطلاح نہایت غیر اسلامی غیر انسانی اور غیر ضروری ہے جس پر فخر کرنا یا زور دینا منطقی طور پر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جناب سیدہ فاطمہ زہرا ابنت رسول اکرم سے سیادت چلی ہے۔ اس نہج سے نسلی شناخت کی منطق بتلاتی ہے کہ صحیح النسب سید ہونے کے لیے ماں اور باپ میں سے کسی ایک کا اولاد جناب سیدہ ہونا کافی ہے۔ برخلاف اس کے مولائے کائنات علی ابن ابی طالب کی وہ اولادیں جو جناب سیدہ کے بطن سے نہیں ہیں سید نہیں ہیں۔ سید الانبیاء، سید عالم، سید بطحا ہونا اعزازی لقب کی بات ہے نسب کی نہیں۔ یوں تو مسلمانوں میں نسلی اور جغرافیائی اعتبار سے کئی فرقے ہیں۔ شیخ۔ سید۔ مغل (مرزا)۔ افغان (پٹھان) اور نو مسلم جو شیوخ کے زمرہ میں آتے ہیں۔ مگر یہ خصوصیت صرف سادات کو حاصل ہے کہ ان کی سیادت ماں باپ میں کسی ایک سے صحیح ہے۔ جب کہ دوسرے فرقوں میں نسب صرف باپ سے لیا جاتا ہے۔ البتہ ہر فرقہ میں طرفین

کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ماں کی طرف سے سیادت پانے کی عظیم ترین مثال حضرات حسنینؑ ہی کی ہے۔ محض باپ کی طرف سے صحیح النسب سیادت ائمہ اثنا عشریہ میں چند ائمہ کی ثابت ہے جن کی مائیں سیدانیاں نہ تھیں۔ تو نجیب الطرفین ہونے کی اہمیت اعلان تفاخر ہوا ـــــــــ نجیب الطرفین سید ہونے کے احساس ہی سے کلام الٰہی کے بتائے ہوئے اصول اور مقصد کا بطلان ہوتا ہے۔

جین (GENE) کی دریافت جدید سائنس کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ دریافت ڈارون کی دریافت "اصول ارتقا" کے نوے سال بعد ہوئی۔ اور ارتقاء جاندار میں "جین" کا رول اہم اور ضروری قرار پایا۔ جین حیوانات کے (cell) حیاتی خلیہ کا توراثی عنصر ہے جو ہر جاندار میں اس کی طبعی اور جسمانی خصوصیتوں کو آنے والی نسلوں میں منتقل کرتا رہتا ہے اور ارتقاء کی شروعات اس خلیہ سے ہوتی ہے جس میں جین کا وجود یقینی ہے۔ جین کے اثرات گھٹتے بڑھتے بھی رہتے ہیں۔ افزائش نسل میں چونکہ مختلف البطن جینوں کا مخلوط بنتا رہتا ہے اس لیے اولادوں میں طبعی حسن و قبح کا تناسب انہی جینوں کے تناسب پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی اب یہ کہنا کہ انسانی کردار، اوصاف و شخصیات محض جغرافیائی حالات ماحول اور تعلیم و تربیت سے مرتب ہوتے ہیں سو فیصد درست نہیں ہے۔ اب یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فرد ماحول اور جین کا مشترک پروردہ ہوتا ہے۔ چند تجربات کے بعد یہ بھی قرار پایا کہ فرد کی داخلی شخصیت جینی یا صلب سے کسب اوصاف کرتی ہے اور خارجی شخصیت ماحول سے۔ اس لیے سوانح حیات میں شجرۂ نسب بیان کر دینے سے مقصد پورا نہیں ہوتا۔ نسب نامہ کے افراد کے مختصر حالات زندگی اور بالخصوص اسلاف کی حالات اور خصوصیات پر روشنی ڈالنا فرد کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

ہمارے اسلاف زید شہیدؒ کے بعد چھٹی پشت سے ۱۵ویں پشت تک زیدی کہلائے۔ ۱۶ویں پشت کے چند زیدی سید خانوادے دور عباسی میں عرب سے واسطہ کو ہجرت کر گئے۔ ان سادات واسطہ میں ایک بزرگ سید ابوالفرحؒ ہوئے تھے جو کچھ مدت بعد وہاں سے مع اپنے اہل و عیال کے ہندوستان چلے آئے اور پانی پت کے قریب برست کے مقام پر آباد ہو گئے۔ اس وقت سے وہ اور ان کی اولادیں زیدی الواسطی کہی جانے لگیں۔ ان کے بعد ۲۱ویں پشت میں ایک بزرگ سید مسعود ہوئے جو برست کے اطراف کو چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور وہاں چشتیہ سلسلۂ صوفیا میں شامل ہو کر نظام الدین اولیا کے مرید ہو گئے۔ ان کے بیٹے سید بڑے میر دہلی میں مخدوم نصیر الدین سے عقیدت رکھتے تھے۔ ایک شب میں مخدوم نصیر الدین

نے آنحضرت خاتم المرسلین محمد مصطفیٰؐ کو فرماتے ہوئے دیکھا کہ "اے شیخ نصیر الدین" چراغ دہلی" میرے فرزند سید بڑے میر کو جو تیرے یہاں آتا جاتا ہے امانت دینے سے سرفراز کر" (اسی دن سے مخدوم نصیر الدین "چراغ دہلی" کے لقب سے یاد کئے جانے لگے)، خواب سے بیدار ہو کر چراغ دہلی نے اپنے مریدوں کے ذریعہ سیّد بڑے میر کی تلاش شروع کردی۔ تلاش پر اس نام کے کئی اشخاص آپ کے تکیہ پر حاضر ہوئے تو مخدوم موصوف متفکر ہوئے کہ ان میں کون وہ شخص ہے جس کے متعلق آنحضرت نے بشارت دی ہے اور آپ کوئی فیصلہ نہ کرسکے۔ چند روز بعد آنحضرت خواب میں پھر تشریف لائے اور فرمایا کہ "سید بڑے میر یک تہ پوش (جو اکہرا کپڑا پہنتا ہے) کی تربیت کرکے امانت دینی اس کے سپرد کر"۔ چنانچہ دوبارہ اس نشاندہی پر تلاش کے بعد سیّد بڑے میر حاضر خدمت ہوئے اور چراغ دہلی کی بیعت کرکے سلسلۂ چشتیہ میں شامل ہوئے۔

کچھ مدّت بعد چراغ دہلی نے سیّد بڑے میر سے ارشاد فرمایا "اے سیّد مشرق میں قصبۂ ظفرآباد کے قریب ایک گاؤں سرسونڈہ ہے وہاں جاؤ اور تبلیغ دین کرو" چنانچہ سید بڑے میر مع اپنے چار بیٹوں اور اہلیہ کے دہلی سے ظفرآباد پہنچے۔ وہاں چند یوم تکیہ مرتجی میں قیام کرکے ۷۷۱ھ مطابق ۱۳۶۹ء میں موضع سرسونڈہ (جو اب سادات مسونڈہ عرف لجگاؤں کے نام سے مشہور ہے) پہنچ کر متوطن ہو گئے اور سجادہ کے گرد جوق در جوق تشنگان علم وفضل جمع ہونے لگے۔ سیّد بڑے میر کو دہلی سے رخصت کرتے ہوئے چراغ دہلی نے چند ہدایتیں کی تھیں جن میں دو قابل ذکر و توجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے لیے کوئی پختہ مکان نہ بنوانا۔ دوم یہ کہ اپنی نسل در نسل کے لیے وصیت جاری کرنا کہ ہمیشہ بغیر امتیاز نسل و مذہب ظلم و تعدّی سے باز رہیں۔

دربار دہلی سے سید بڑے میر کو یہ موضع بطور معافی ملا تھا۔ موصوف نے اپنی پوری جاگیر کے اسامیوں کے لگان اور جملہ رسوم معاف کردی تھیں۔ اور حسب ضرورت مختصر اراضی اپنے بیٹوں کو دیدی تھی کہ خود کاشت کریں اور اس طرح افراد خاندان کی پرورش بھی ہوتی رہے۔ آپ کا مزاج توکل، قناعت اور استغنا سے پُر تھا۔ استغنا کا مطلب ہے اپنی ضرورت سے زیادہ کی ہوس نہ کرنا۔ ہوس کار وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے جائز حقوق کو اپنے تصرف میں لائے۔ اور اسی تصوّر سے اپنے حقوق کے تحفظ یا حصول کے لیے جدّوجہد کرنے کی ترغیب کا داغ بیل پڑتی ہے۔ بڑے پیمانے پر یہی جدّوجہد طبقاتی کشمکش (Class Struggle) اور پھر انقلابی جنگ کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو خطری بات ہے۔ توکل قناعت اور استغنا کا مطلب بس اس قدر ہے کہ "ہم کو اتنا کافی ہے باقی دوسروں کا حصّہ

اور حق ہے۔

یہاں سید بڑے میر کے طبقاتی شعور کے ایک مثال قابل توجہ ہے۔ تاریخ جونپور سے پتہ چلتا ہے کہ عہد شرقی سلطنت کے اولیں دور ۸۰۱ھ میں سلطان الشرق ملک سرور جہاں فرماں روائے جونپور نے سید بڑے میر کو بار ہا بڑے تزک واحتشام سے اپنے یہاں دعوت ملاقات دی مگر آپ کبھی اس ہم نشینی شاہ کے لیے راضی نہ ہوئے البتہ سلطان الشرق کے اشتیاق بیحد کو دیکھ کر اپنے صاحبزادوں میں سید تاج الدین، سید کرم اللہ، سید لطف اللہ اور سید مبارز کو ملاقات سلطانی کے لیے اس تاکید کے ساتھ بھیجدیا کہ دربار میں اپنی طرف سے کسی گفتگو کا آغاز نہ کریں۔ ان حضرات کے ورود پر بادشاہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوگیا اور اپنے برابر بٹھالیا۔ دربار میں درباریوں کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو اور بحثیں ہوتی رہیں مگر یہ حضرات لبوں پر مہر سکوت لگائے بیٹھے رہے کہ ایک چابک سوار بادشاہ کی سواری کا خاص گھوڑا سر دربار لاکر اس کو چکر دینے لگا۔ جب گھوڑا رکنے لگا تو سوار نے کوئی تعرض نہ کیا اور جب خود بخود جولانی پر آیا تو اس نے فرس کو چابک مار دیا اور گھوڑا بگڑ کر الف ہو گیا۔ یوں تو چاروں بھائی فرس رانی سے خوب واقف تھے مگر سب سے چھوٹے سید مبارز نوجوان تھے چابک سوار کی اس غلطی کو وہ ضبط نہ کرسکے اور جبیں پر شکن آگئی مگر خاموش رہے۔ بادشاہ جو بظاہر سوار اور گھوڑے کی طرف متوجہ تھا گوشۂ چشم سے ان سید زادگان کو دیکھ رہا تھا سید مبارز کے دلی جذبات کو تاڑ گیا اور مڑ کر ان کے تکدر کا سبب دریافت کیا۔ پہلے تو سید مبارز نے بعنوان شائستہ بات کو ٹالنا چاہا مگر جب بادشاہ کا اصرار بڑھا تو آپ کو گھوڑے کی تعریف اور چابک سوار کی سخت غلطی پر روشنی ڈالتے ہوئے شہسواری کے رموز وقواعد مفصل بیان کرنا پڑے۔ بادشاہ ان کی گفتگو اور انداز بیان سے بہت متاثر ہوا اور اہل دربار کو خطاب کیا کہ "دیکھو عالم اور شہسوار ان کو کہتے ہیں۔" دربار ختم ہونے پر بوقت رخصتی بادشاہ نے اپنے مہمانوں کے ہمراہ گرانقدر وبیش بہا تحائف اور نقد بھیجنا چاہا مگر ان حضرات نے بعنوان مناسب و کسر نفسی شکریہ کے ساتھ شاہی عطیات کو قبول نہ فرمایا۔ گھر واپس پہنچ کر سب سے بڑے صاحبزادے سید تاج الدین نے بڑی تفصیل سے تمام واقعات اور باتیں اپنے پدر بزرگوار کو سنائیں جن پر آپ نے سید مبارز سے بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ خیال ہے کہ باپ کی بیزاری کا بیٹے کے دل کو وہ صدمہ پہنچا کہ سید مبارز نے عنفوان شباب ہی میں انتقال کیا۔

ہر چند کہ استغنا اس جہان خار وسنگ وہوا وہوس میں انسان کو انسانی حدود میں رکھتا ہے تاہم

کمزور طبائع کے بس کی بات نہیں کہ حکومت کے فرش مرمریں اور دولت کے قالین مخملیں پر ان کا ذہنی توازن قائم رہ جائے اور پائے استغنا پھسلنے نہ پائیں۔ چنانچہ سید بڑے میر کے تیسرے فرزند اسی کے شکار ہوئے اور باپ کی مرضی کے خلاف سلطان الشرق کی منھ بولی بیٹی سے شادی کر لی جس کے نتیجہ میں سیّد موصوف نے ان کو اپنے سایۂ عاطفت سے خارج کر دیا اور وہ مجبور ہو کر مع اپنی اہلیہ کے مسونڈہ (کجگاؤں) سے شرقی سلطنت کے باہر راتوں رات مغربی اضلاع کی طرف ہجرت کر گئے۔

سیّد بڑے میر کے بڑے فرزند سید تاج الدین نے شیخ صدرالدین حاجی چراغ ہند کے خاندان میں شادی کی اور گھر داماد ہو کر ظفر آباد منتقل ہو گئے۔

سیّد موصوف کی مرضی سے ان کے مجھلے صاحبزادے سید کرم اللہ کی شادی سید عمر بن سید یحییٰ ابن زید شہیدؒ کی پندرھویں پشت میں امیر سیّد صدر جہاں اجمل کے خاندان میں ہوئی اور انھیں سے سادات مسونڈہ کی نسل چلی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

مسونڈہ کا نام کجگاؤں کیسے پڑا اس کی وجہ تسمیہ تذکروں میں یوں بیان کی جاتی ہے کہ سیّد بڑے میر کے پرپوتے سید حسین عرف سید ہو لسے اور ان کی اہلیہ کی قبریں جب پختہ کی گئیں تو کچھ عرصہ بعد وہ ایک دوسرے کی جانب کج ہو گئیں۔ ان کے ورثا نے اس خیال سے کہ قبریں اندر سے پھٹ گئی ہیں دوبارہ سیدھا کروا دیں لیکن تھوڑی ہی مدت بعد وہ قبریں پھر ویسی ہی ایک دوسرے کی طرف کج ہو گئیں اور جواب تک کج ہیں۔ چنانچہ اس غیر معمولی واقعے سے متاثر ہو کر اہل مسونڈہ نے اس دیہات کا نام کجگاؤں رکھ دیا۔

سیّد حسین عرف سیّد ہو لسے ۲۵ ویں پشت کے فرد تھے۔ ۳۰ ویں پشت میں ہمارے مورث سیّد زین الدین محمد پیدا ہوئے اور ۳۱ ویں پشت میں سید کرم علی شہید اور سید چراغ علی تک پہنچتے پہنچتے سادات کجگاؤں کی آبادی بڑھ کر کئی خاندانوں میں بٹ گئی۔ اسی تناسب سے جائدادیں بھی تقسیم ہوتی رہیں نتیجہ میں انفرادی آمدنی کا پرتا اس قدر قلیل ہونے لگا کہ خاندانوں کی مالی کفالت مشکل نظر آنے لگی۔ اور افراد خانوادہ ہائے کجگاؤں مائل بہ افلاس ہونے لگے۔ مگر چونکہ گھروں پر عربی، فارسی و دیگر علوم و فنون اور شہسواری و سپہ گری کی تعلیم کا ہمیشہ سے رواج تھا۔ سادات کجگاؤں زیادہ تر نوکری پیشہ ہو گئے۔ تخت دہلی۔ رجواڑوں اور ریاستوں میں جا کر سرداری اور دوسرے عہدوں پر فائز ہونے لگے اور چند بزرگ اور آرام پسند افراد گھر ہی پر رہ کر گھر کا انتظام اور زمینداری وغیرہ کی نگرانی کرتے رہے۔

گذشتہ دو صدیوں میں بڑھتی آبادی کے سبب سے ساداتِ جگناؤں بہت بڑے جاگیر دار رئیس یا زمیندار نہ رہ گئے تھے مگر بظاہر اتنے باوقار اور صاف ستھرے رہتے تھے کہ ان کی غربت کا اظہار دوسروں پر نہ ہوتا تھا۔ یہ افراد اگر بقدرِ استعداد نوکری پیشہ نہ ہو جاتے تو مفلس اور نادار معلوم بھی ہو سکتے تھے۔ ہر خاندان یہی ظاہر کرتا تھا کہ کتنے ہزار سالانہ کا سرکاری مالگذار ہے جبکہ اس ایک کھوٹ میں کم از کم پچیس تیس شرکا ہوتے تھے اور ایک ایک حصہ دار کی آمدنی پچاس ساٹھ روپے سالانہ تک گر جاتی تھی تاہم زمیندارانہ آن بان اور مشیخت مآبی میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔ مختلف خانوادوں میں شان و شوکت کی رقابتیں اور ناچاقیاں بھی خوب چلتی تھیں۔ آپس میں برادریاں بھی ترک ہوتی تھیں۔ مگر اب نہ زمینداریاں ہیں نہ شیخی نہ امارت کا جھوٹا مظاہرہ نہ رقابتیں۔ سب نارمل نظر آتے ہیں۔

وصلت اور قرابت کا سلسلہ غازی پور، اعظم گڑھ اور بنارس کے سادات سے بھی رہتا تھا مگر زیادہ تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ اگر خاندان کے اندر ہی رشتے محدود رہیں تو بہتر ہے کہ جائداد کا کوئی حصہ خاندان کے باہر نہ جانے پائے۔ نتیجہ میں سادات جگناؤں اختلاط نسلی (Inbreeding) کا شکار ہو کر رہ گئے۔ علاوہ چند افراد کے ان خانوادوں نے معمولی دماغ اور کمزور صحت کے افراد پیدا کئے جو چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے یا بیکاری کی زندگی گذارتے تھے۔ جن افراد میں صلبی صلاحیت اُبھری جو بالعموم تیسری پشت میں اُبھرتی ہے اور علوم و فنون سے دلچسپی رکھی انھوں نے خوب نام بھی کمایا یا کم از کم باعزت زندگیاں بسر کیں جن کا ذکرِ خیر موقع موقع سے آئے گا۔

گذشتہ نصف صدی سے ہمارے قریبی خاندانوں میں شادیاں زیادہ تر خاندانوں سے باہر ہو رہی ہیں اور نئی نسلیں نمایاں طور پر بہتر دماغی اور جسمانی صحت اور تعلیم و تربیت کے معاملہ میں زیادہ جوہرِ قابل رکھتی ہیں۔ اس روایت و قدامت شکن انقلاب کے ہراول ہمارے عزیز قریب خان بہادر سید علی ضامن صاحب بن سید نجم الدین صاحب بن سید علی محمد صاحب تھے جنھوں نے الحاج خاندانوں سے دور جا کر سادات سنبھل ضلع مراد آباد میں شادی کی۔ اس کے بعد تو خاندان کے باہر شادیوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹی کی شادیاں خاندان کے باہر کیں۔ ہماری پشت تک شادیاں والدین اور یا بزرگان خاندان کی رائے اور حکم سے ہوتی تھیں جس میں طرفین کو چون و چرا کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ مگر یہ طریقہ مستحق نہ تھا اور میں نے اپنے بچوں کی شادیاں باہر کیں اور ان کی رائے اور مرضی سے کیں۔

ہمارے خاندان۔ اعزائے قریبی اور متعلقہ خاندانوں میں کم مگر اچھی شادیاں بھی ہوئیں اور بے جوڑ بھی البتہ ہر عالم میں زن و شو نے ایک دوسرے کے شریک حیات ہو کر صبر و شکر کے ساتھ زندگیاں گذار دیں۔ ان خانوادوں کی Recorded History میں طلاق کا کوئی کیس نہیں ملتا اور شاذ یعنی نہیں کے برابر ایسے شوہر ملیں گے جنھوں نے اپنی ایک بیوی کی زندگی میں دوسری شادی کر لی ہو یعنی شرافت نفس کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قربانی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہ خیال بہت ہی شریفانہ خیال ہے کہ اگر ایک بیوی کی زندگی میں دوسری شادی کر لی تو پہلی غریب بے قصور کا کیا حشر ہوگا۔ باقی چند افراد کے خفیہ اعمال کو جو کچی حالات اور سماجی مجبوریوں کا فطری نتیجہ ہوا کرتے تھے غیر مستحسن سمجھتے ہوئے بھی نظر انداز کر دینے میں عافیت سمجھی جاتی رہی ہے۔ کسی کی مے نوشی اور عیاشی کے ذکر کو مے نوشی اور عیاشی سے کم معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سے بڑا بوژوا تہذیب کا نمونہ کوئی پیش کر دے تو ہم جانیں۔

سادات لکھگاؤں میں ۱۹ ویں صدی کے وسط تک آپس کی خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اس کے بعد سے آج تک اردو زبان و ادب کا عمل دخل ہے۔

خاندانی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ بزرگوں کو لفظ "آپ" سے خطاب کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ "حضور" کے لقب سے خطاب کرتے تھے۔ اور خط و کتابت میں بزرگوں کو "بنوعرض عالی میرساند" یا مختصر تحریر میں "عرض معروض" کے القاب استعمال ہوتے تھے جو کم و بیش اب تک رائج ہیں۔ "جناب والد صاحب قبلہ" وغیرہ قسم کے القاب کو غیر مستحسن شمار کیا جاتا تھا۔ چند روایتیں ہر چند کہ بوژوا تہذیب کی دین ہیں مگر بہت اچھی اور حسین ہیں۔ ان سے Declass ہونا لازم نہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صبح بیدار ہو کر اگر کسی بزرگ کا سامنا ہو تو اس کو سلام کرو۔

اب سے چالیس برس پہلے تک لکھگاؤں میں پردہ کا رواج بہت سخت تھا۔ ایک گھر سے دوسرے گھر میں جانے کے لیے سرنگیں تھیں جن کے منہدم آثار اب بھی ملتے ہیں۔ کسی بی بی کا بغیر جو پالے فنس یا ڈولی کے گھر سے باہر نکلنا بے پردگی کے مترادف تھا۔ برقعہ یا چادر دینیچے کا استعمال تو اب عام ہے مگر پہلے تم بے پردگی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں دس برس کی عمر میں اپنے کانوں اور آنکھوں کے سامنے کا ایک واقعہ قاری کی دلچسپی اور استعجاب کے لیے کافی ہوگا۔ رقیہ بی بی زوجۂ سید سخاوت علی صاحب یعنی میرے جد مغفور سید محمد مجتبیٰ صاحب کی مجھلی بھاوج جن کی عمر اس وقت ۸۰ سے تجاوز کر چکی ہوگی۔ چاندی سے زیادہ

سفید اور چمکدار سر کے بال تھے جو کاغذی نیو سے بھی چھوٹے جوڑے پر ختم ہوتے تھے۔ انگریزی کے عدد سات کی طرح کمر خمیدہ ہمارے آبائی مکان گول کوٹھی کو یعنی اپنی سسرال کے اندر والے مغربی دالان میں تخت پر بیٹھی ہوئی اپنی پھکنی بنا رہی تھیں کہ تقریباً اسی عمر کی تحفہ نامی ان کی لونڈی اپنا منھ پیٹتی ہوئی اور یہ فریاد کرتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی کہ چھوٹے میاں کے "بڑا" (یعنی میرے والد) "تہرا آم کا پیڑ کٹواوت ہیں"۔ تخمی آم کا یہ درخت اس قطعہ اراضی میں پڑتا تھا جس کو والد نے اپنی چچی رقیہ بی بی سے ایک دوسری اراضی کے تبادلہ میں لال کوٹھی تعمیر کروانے کے لیے لیا تھا۔ اور معاہدہ میں وہ درخت بھی شامل تھا جس کا پھل موصوفہ سال بھر تصرف میں لاتی تھیں۔ اس کا اچار پڑتا تھا، چٹنی مربع اور رُب بنتا تھا۔ امچور کھٹائی تھیلیوں اور گھڑوں میں رکھے جاتے تھے اور پال اُٹھنے پر آم کھائے جاتے تھے اور جب سڑنے لگتے تھے تو امرس بنا کر ڈبوں میں بھر دیا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی قد و قامت کا درخت تھا۔ کم از کم اس میں سو من لکڑی نکلی، والد نے جس کا نصف رقیہ بی بی کو دے دیا تھا اور نصف چونے کے بھٹے میں جلایا تھا۔ ہاں تو جب موصوفہ نے درخت کٹنے کے حادثہ کی خبر سنی تو فوراً تحفہ کو بھیج کر بابا کو طلب کیا۔ موصوف جب ہاتھ جوڑے ہوئے ان کے حضور میں آکر کھڑے ہوئے تو موصوفہ نے حکم صادر فرمایا کہ "تمھی ہیں توں ہیں اُو آم کا پیڑ وا دے چکی ہوں مگر تو اد کو کٹواؤ ناں او کو ہواں سے اُچار کے ہمری نیکی زمین پر بٹھوائے دیو"۔ موصوفہ کے نزدیک یہ ناممکن کام اس لیے ممکن تھا کہ انھوں نے کبھی آم کا کوئی تیار درخت نہیں دیکھا تھا۔ بندالکش اور جس دن سے بیاہ کر بند چوپالے میں رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھیں اُس دن سے مرتے دم تک گھر کے باہر قدم رکھنا کیا تھا نہ کبھی ڈیوڑھی کی دہلیز تک نہیں آئی تھیں۔" اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"۔

اب پردہ کا رواج بھی ہمارے خاندان میں تقریباً ختم ہو چکا ہے البتہ بیشتر خواتین جو دوسرے شہروں میں پردہ نہیں کرتیں جب کجگاؤں آتی ہیں تو برقع اور پردہ میں رہتی ہیں۔ اور واپس جاتے ہوئے جونپور سے ٹرین چھوٹی کہ برقعے اٹیچی میں بند ہوئے۔ لڑکیاں اب بالکل پردہ نہیں کرتیں کہ سب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں یا پڑھا رہی ہیں۔ پہلے مزدوروں اور ملازمین سے بھی پردہ ہوتا تھا مگر اب گھروں میں یہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

یہ تھی ہمارے مقامی خانوادوں کی ایک جھلکی۔ مگر ہماری مقامی تہذیب و ثقافت کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک اسی کے متوازی ایک وسیع تر سیاسی سماج اور ثقافتی ماحول کے سرچشمہ کا مختصر ذکر نہ کر دیا جائے جس کے کوائف ہم کو متاثر کرتے رہے ہیں اور وہ ہے جونپور اور اس کا تاریخ ساز رول۔

••

دوسرا باب

جونپور

ماضی بعید میں جونپور کی قدیم آبادی ظفر آباد کو منیچ کہتے تھے جو پراچین کال میں بودھ مت کا بہت بڑا مذہبی تعلیمی اور ثقافتی مرکز تھا اور جس کے تعمیری اثرات جونپور کی اٹالہ مسجد کے شمالی مشرقی اور جنوبی بام و در سے نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں دریائے گومتی پر اکبری پل کے جنوبی سرے پر شیر اور ہاتھی کا ایک مخلوط مجسمہ ملتا ہے جو سمراٹ اشوک کے بودھ کا دور میں ہندوؤں پر بودھوں کی بالا دستی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اٹالہ مسجد کی مغربی جیتی ڈاٹ جیسی چھت بابلی فن تعمیر سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ اس مسجد کی مجموعی ساخت کے پہلو میں جن سے ترشح ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر میں تنہا ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہاتھ نہیں رہا ہے بلکہ کئی ادوار میں مختلف سماجی تہذیبی یا مذہبی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوئی یہ عمارت اس منزل تک پہنچی ہے۔ بہرحال یہ ایک تاریخی مفروضہ ہے جس پر بڑی دیانتداری، خالص علمی اور نامذہبی زاویہ سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خطہ میں آدم خور یادشاہوں کی سرزنش کرنے اور ان کی عوامی پرستش کو ختم کرنے کی مہم پر رام چندر جی بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ چنانچہ قلعہ جونپور کے دامن میں کرار بیر مندر کے قدیم سنگین اور بے جسیم بتوں کے شکستہ اعضاء جو اب بھی موجود ہیں، اس واقعہ کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ چونکہ عوامی روایات کو مٹانا مشکل ہوتا ہے اس لیے یہاں کی قدیم ذاتیں اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں اور ان ٹوٹے ہوئے بتوں پر گیرو اور گلال ملتی ہیں۔ اس کے بعد یہاں مدتوں بھروں کی حکومت رہی۔ بعد میں راجپوت آئے اور کئی چھوٹی چھوٹی جنگوں میں بمشکل بھروں پر فتح پانے کے بعد خود چھوٹے چھوٹے رجواڑوں میں بٹ گئے اور مدتوں اس خطۂ ملک پر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور حکومت کرتے رہے۔

ان سب ادوار کے صدہا سال بعد ملک میں پٹھان حکومت کا دور شروع ہوا۔ غیاث الدین تغلق کے بیٹے شاہزادہ ظفر نے منیچ پر حملہ کر کے اس کو فتح کیا اور منیچ کا نام بدل کر ظفر آباد رکھا جو اس وقت سلطنت دہلی کے مشرقی شمال صوبہ کا دارالامارہ قرار پایا۔

قیام سادات مسونڈہ عرف کجگاؤں ۷۶۰ھ کے دو سال بعد ۱۳۶۱ء میں جب فیروز شاہ تغلق اپنے دورۂ بنگال کے بعد دہلی واپس جارہا تھا تو موسم کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے اس نے کچھ عرصہ ظفرآباد میں قیام کیا۔ اسی دوران دریائے گومتی کی دوسری جانب شمال مغرب کی سمت اس کو ایک ٹیلا نظر آیا جس کو جائے وقوع کے اعتبار سے اسنے بہت پسند کیا اور اس پر ایک قلعہ تعمیر کروایا۔ اور اس قلعہ کے دامن میں اپنے مرحوم چچازاد بھائی جونا شاہ کے نام پر شہر جونپور آباد کیا۔ ("شہر جونپور" کے اعداد سے خود اس شہر کی تاریخ ۷۷۲ھ نکلتی ہے)۔ اور صوبہ کے دارالامارہ کو ظفرآباد سے قلعۂ جونپور میں منتقل کیا۔ شہر کو باوقار اور بارونق بنانے کے لئے دور دراز مقامات سے عالموں، دانشوروں اور صنعت گروں کو بلا کے یہاں بسایا۔ اس طرح تھوڑی ہی مدت میں جونپور ترقی کر کے ہندوستان کے مشہور و ممتاز شہروں میں شمار ہونے لگا۔

جب فیروز شاہ اور محمد شاہ کے بعد محمود شاہ تغلق سریر آرائے سلطنت دہلی ہوا تو اس کی نااہلی کی وجہ سے ملک بھر میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اسی زمانہ میں امیر تیمور نے بھی دہلی پر حملہ کردیا اور ملک کو تاراج کر کے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اس وقت تخت دہلی کا اقتدار اس درجہ گر چکا تھا کہ سلطنت کا ہر صوبہ دار اپنے اپنے حلقہ کا خود مختار حکمراں بننے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔ چنانچہ موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امرائے سلطنت میں سے ایک بیدار مغز امیر نے جس کا نام "ملک سرور خواجہ جہاں" تھا "سلطان الشرق" کا لقب اختیار کر کے قنوج سے بنگال کی سرحد تک اور شمال میں نیپال کی سرحد سے جنوب میں بندیل کھنڈ تک پھیلے ہوئے ملک کے سب سے بڑے صوبہ کے دارالامارہ جونپور پر اپنا پرچم لہرا کر یہاں کا خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اس طرح ۱۳۹۴ء میں "شرقی سلطنت" جونپور کی بنیاد پڑی۔

۱۳۹۹ء میں سلطان سرور کے انتقال پر اس کا متبنیٰ بیٹا مبارک خاں جونپور کے تخت پر بیٹھا مگر جلد ہی مر گیا۔ اس کے بعد اسکا نہایت دانشمند اور ہوشیار بھائی ابراہیم خاں ۱۴۰۲ء میں جونپور کا بادشاہ ہوا۔ دوسری طرف تخت دہلی اور دوسرے امرا کی جانب سے شرقی سلطنت کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ابراہیم شاہ باوجود صلح جو اور امن پسند ہونے کے ایک کثیر فوج لیکر دہلی پر چڑھ دوڑا۔ مرتے دم تک تخت دہلی اور دوسرے خود مختار راجواڑوں سے اس کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ نتیجہ میں کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ بجز اس کے کہ شرقی سلطنت کی طرف رُخ کرنے سے تخت دہلی

اور دوسرے امراگریز کرنے لگے اور ابراہیم شاہ نے بھی جنگ کی طرف سے منھ موڑ لیا۔ محل استعجاب ہے کہ اس فوجی تگ و دو کے باوجود وہ جونپور کو ہر نہج سے آراستہ و پیراستہ کرنے سے کبھی غافل نہ رہا۔ اس نے چالیس برس تک شرقی سلطنت کو بڑی دھوم دھام سے چلایا۔ وہ بڑا علم دوست اور صاحب نظر حکمراں تھا۔ نہایت رحمدل اور انصاف پسند۔ اس کے عہد کے جونپور میں "ہری چرتر دراڑھ پرد" جیسی کتاب کا مصنف گوی لکھن سینی اور سلطان العلماء قاضی شہاب الدین جیسی عظیم شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ ابراہیم شاہ شرقی کو مفید عوام و خواص عمارتیں تعمیر کروانے کا بیحد شوق تھا۔ اس نے لاتعداد مدارس، خانقاہیں مسجدیں، سڑکیں، کاروان سرائے اور عالیشان محلات تعمیر کروائے ــــــ اس کو اپنی فوج کے راجپوت اور عوامی دستوں پر بڑا ناز تھا۔ اس کے زمانہ میں شہر کی خوش حالی اور علم دوستی کا چرچا جب بیرونی ممالک تک پہنچا تو صاحبان فن و تشنگان علم و فن جوق در جوق ایران عراق ممالک سمرقند اور بخارا وغیرہ سے آکر یہاں بس گئے اور ملک کا سب سے بڑا گہوارۂ علم و ادب ہونے کی بنا پر جونپور "شیراز ہند" کہا جانے لگا۔

۱۴۴۰ء میں ابراہیم شاہ کے انتقال کے بعد شرقی سلطنت کئی بادشاہوں سے گذرتی ہوئی ۱۴۵۸ء میں اپنے عظیم ترین اور آخری تاجدار حسین شاہ شرقی تک پہنچی۔ اور سریر مملکت نے خوش آمدید کہہ کر اس کے قدم چومے۔ شرقی سلطنت کی چمن بندی تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اب حنا بندیِ بہار اور خندہ ہائے گل کو احکامات شاہی ملنے کا انتظار تھا۔ اس کام کی تکمیل کا تاج حسین شاہ شرقی کے سر رہا۔ اسی لئے اس کے دور حکومت کو جونپور کا "عہد زریں" کہنا مناسب ہوگا۔

سیاسی سماجی اور ثقافتی اعتبار سے حسین شاہ شرقی چند معنوں میں اپنے پیشرو شاہانِ شرقی سے زیادہ دل کش ہر دلعزیز اور روشن خیال حکمراں تھا۔ علاوہ دوسرے علوم و فنون کے اس کے عہد میں فن موسیقی نے بالخصوص بہت ترقی کی۔ اس نے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں گراں قدر اضافے کئے۔ کئی راگ راگنیوں میں مناسب اور خوبصورت تبدیلیوں اختراعات اور اجتہادات سے کام لیا۔ جونپوری راگ راگنی کو قومی موسیقی میں اہم مقام کی حامل ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں "خیال" کی ایجاد اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ اپنے تمام تر کلاسیکی لوازم کے ساتھ "خیال" دھرپت اور ترانہ وغیرہ سے بدرجہا عام پسند مدرسۂ موسیقی ہے۔ ٹوڑی جونپوری بھی اسی کی ایجاد ہے۔ حسین شاہ شرقی کو اپنے اجداد پر مزید فوقیت اسلئے بھی حاصل تھی کہ اسنے ہندوستانی

اور آخری مقابلہ میں سکندر لودی اس کو بھگاتا ہوا بہار کے اندر تک چلا گیا۔ اور حسین شاہ بمشکل اپنی جان بچا کر بنگال میں پناہ گزین ہوا۔ اس کو ۱۴۹۴ء میں شرقی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا اور ۱۴۹۵ء میں اس نے انتقال کیا۔ اس طرح ہمیشہ کے لیے جونپور کی شرقی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

مگر سکندر لودی کی آتشِ انتقام اب تک ٹھنڈی نہ ہوئی تھی۔ ۱۴۹۴ء میں بہار سے واپس ہوتے ہوئے اس نے شرقی سلطنت کی تمام نشانیوں کو خاک میں ملا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ شیراز ہند جونپور چونکہ سلطنت کا پایۂ تخت تھا، اس نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ کتنے علمی ذخائر اور تصنیفات کے قلمی مسودات مدرسوں اور خانقاہوں کے ملبوں میں دفن ہو کر رہ گئے۔ آخر میں جب اس کی تشنگی انتقام اس سے بجھی نہ بجھی تو اس نے مسجدوں کے انہدام کا حکم صادر کر دیا۔ جب یہ نوبت پہنچی تو علما ان تبرکات کے آڑے آئے اور ان کے افہام و تفہیم سے وہ مغلوب الغیظ السلطان اپنے اس فعل قبیح سے باز آیا۔ مگر اُس وقت تک متعدد مسجدیں شہید ہو چکی تھیں اور جامع مسجد کا صدر دروازہ زمین پر سجدہ کر چکا تھا جو آج تک سکندر لودی کے مظالم کا ماتم کر رہا ہے۔ (عوام کے پیسوں سے اب اس صدر دروازۂ مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا کام ہو رہا ہے) اسی ضمن میں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے کہ سکندر لودی نے اٹالہ مسجد کو ہاتھ نہیں لگایا تھا کہ وہ اس کا شمار شرقیات میں نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک قدیم عمارت تھی جو بعد میں پٹھان شاہانِ دہلی کی سرپرستی حاصل کر چکی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحین کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ان کا مذہب اقتدار پرستی ہے۔ ان کو اقتدار چاہیے دولت چاہیے اور سلطنت میں توسیع چاہیے۔ وہ اقتدار کیلیے زندہ رہتے ہیں لڑتے ہیں اور مرتے ہیں۔ ملک کی تواریخ پر نظرِ غائر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں کبھی کوئی جنگ مذہبی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ مگر اس ملک میں تاریخ نویسی کا یہ المیہ رہا ہے کہ اب تک ہندوستان کی کوئی سیکولر تاریخ نہیں لکھی گئی۔ چاہے مورخ ہندو ہو یا مسلمان یہاں کی تاریخوں میں ایسا مواد زیادہ ملتا ہے جس میں ہندو مسلمان بادشاہوں کے درمیان جنگوں کو فرقہ وارانہ منافرت سے آراستہ کرنے میں بڑا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔ جونپور کی مساجد کو منہدم کر دینے والا سکندر لودی کوئی غیر مسلم بادشاہ نہ تھا۔ ان فرسودہ تاریخوں کو جھٹلانے کی لیے تو لاتعداد حقیقت پر مبنی مثالیں موجود ہیں مگر اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائیوں کی لے لیجئے۔ اورنگ زیب ایک سخت قسم کا مذہبی آدمی

کو اپنایا۔ اُس سے پہلے اُس جیسی مذہبی رواداری اور نا مذہبیانہ طرز حکومت کی ملک بھر میں کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ اُس سے پہلے ملک میں ہندوستانی قومیت کے تصور نے کوئی واضح شکل اختیار کی تھی۔ اس کے عہد کی شرقی سلطنت ملک کی پہلی سیکولر اسٹیٹ تھی۔ (جس کا احیاء کچھ مدت بعد اکبر اعظم کے عہد میں ہوا تھا) ۔ وہ اپنی رعایا میں ہندو مسلم کا کوئی فرق نہ تھا۔ اسی بنا پر اس کے عہد کے ہندو مسلم شیر و شکر ہو کر اپنے مذہبی اور شہری فرائض میں آزادانہ طور پر منہمک رہتے تھے۔ اقتصادی خوشحالی اپنے عروج پر تھی۔ رشی، مُنی، سنت، علما، صوفیہ اور غیر ممالک سے آئے ہوئے اکابر علوم و فنون اپنی اپنی تصنیف و تدریس میں بلا کسی رکاوٹ کے مشغول پائے جاتے تھے۔ اس کے کارناموں کی یادیں تو صفحات دل و قرطاس پر محفوظ ہیں مگر جونپور کی جامع مسجد (بڑی مسجد) اس کا وہ نادر الوجود کارنامہ ہے جس کو دیکھ کر اہل ذوق عش عش کرتے ہیں۔

میتھلی زبان کے عظیم شاعر ودیا پتی نے اپنی تصنیف "کیرتی لتا" میں شرقی عہد کے جونپور کا ذکر بڑے چاؤ، منزلت اور تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں کی صاف ستھری پتھر کی گلیاں، یہاں کے خوشبودار پھول، یہاں کے بازار اور دھرانے۔ یہاں کی عبادت گاہیں، یہاں کی حسیناؤں کی اٹھتی جوانیاں، شاہان شرقی کی محبوب شخصیتیں، ان کا حسن انتظام اور ان کی توجہیں اور جنگیں، ان سب کا ذکر وہ اس سپردگی اور جوش و خروش سے کرتا ہے کہ جون پور اس کا اپنا وطن معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور دل اس بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ وہ یہاں کبھی نہیں آیا جیسا کہ چند مورخین کا خیال ہے۔ ایسی تحریریں علین الیقین پر دلالت کرتی ہیں اس لیے اس کے جونپور آنے کا مؤید ہونا پڑتا ہے۔

ہر کمالے را زوالے — چونکہ حسین شاہ شرقی کی ملکہ خونزدہ بیگم کو شاہان دہلی سے نسبی تعلق تھا اس لیے اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ اس کا شوہر بھی کیوں نہ شاہنشاہ دہلی بنے۔ اپنے عہد حکومت کے انتہائی پُرامن اور کامیاب ادوار سے گذرنے کے بعد آخری دور میں حسین شاہ کو اپنی محبوبہ کے اصرار پر تسخیر تخت دہلی کا بیڑا بادل ناخواستہ اُٹھانا پڑا۔ مگر ایک رحم دل اور صلح پسند بادشاہ کے لیے جو ہمیشہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول پر کاربند رہا ہو جنگ کی تباہ کاریوں کے ساتھ اپنی مہم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانا ممکن نہ تھا جب کہ اس کا مدمقابل سکندر لودی جیسا جنگ جو اور سخت گیر انسان رہا ہو۔ مختصراً ہوا یہ کہ حسین شاہ کو اس مہم میں ہر محاذ پر شکست ہوئی

تھا جو اس کی ذات تک محدود تھی۔ اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں کہ وہ اپنی ہندو مسلم رعایا کو ایک نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہندو مسلمان دونوں میں لامذہبیت کا دشمن تھا۔ اس کی مذہبی رواداری کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ اس کے امرا اور اعلیٰ ملازمین میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ملتی ہے۔ اس کی فوج کے بیشتر سپاہی ہندو تھے۔ وہ اپنے انھی ہندو ہاتھ پیروں کی مدد سے اپنی سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی اس کو برداشت نہ کر سکتا تھا کہ کوئی دوسرا مسلمان سردار یا ہندو راجہ اس کے زیر نگیں کسی خطۂ زمین پر قبضہ کرے اور یہ اس کا کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا۔ جب وہ سلطنت کے معاملہ میں اپنے باپ شاہجہاں اور اپنے بھائیوں کو برداشت نہ کر سکا تو دوسروں کا کیا ذکر۔ مگر دوسروں پر اس کے خیالات کی پابندی کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے عاید بھی نہیں ہوتی تھی۔ شیواجی ایک بہادر سپاہی، آزمودہ کار سپہ سالار اور طاقتور مرہٹہ چیف تھا۔ وہ اپنے حدود اقتدار کو توسیع دینا چاہتا تھا۔ اپنی ایک سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا اور حصول مدعا کے لیے اس نے مرہٹوں اور پٹھان سپاہیوں پر مشتمل ایک عظیم فوج بھی تیار کی وہ کسی اصول سے اورنگ زیب کے خلاف پرچم جنگ بلند کرنے سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ وہ فی الاصل جنوبی ہندوستان میں (ہندو سلطنت نہیں بلکہ) اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا اور اگر اورنگ زیب کو مزید شکست دے سکتا تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا کہ وہ تخت دہلی پر قابض ہو جاتا۔ ان سب باتوں میں کس رُخ سے شیواجی کو اس خیال سے ملوث کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہندو لیڈر تھا جس نے مسلمان حکومت کے خلاف اس لیے جنگ کی تھی کہ مسلمان حکومت سے ہندوستان کو آزاد کرائے۔ کیا شیواجی سے پہلے ہندو راجاؤں نے مسلمان بادشاہوں کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا۔ تاریخ کے ذریعہ اس طرح مسلمان یا ہندو مذہبی عصبیت کو مشتعل کرنا یا اس کی ہمت افزائی کرنا نہایت قوم دشمن اور انسانیت سوز حرکت ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ان تاریخوں پر نظر ثانی نہ کی جائے گی۔ شیواجی جیسی بہادر اور عظیم شخصیت کے اُجلے دامن پر فرقہ پرستی کا یہ دھبا لگانا اُن فرقہ پرست مورخین ہی کو زیب دیتا ہے جو ہندوؤں کے نادان دوست کہے جا سکتے ہیں۔

ان تاریخوں کو لکھنے والے اور اُن سے متاثر ہونے والے ہندوستانی اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وقت کے ساتھ اخلاقی اور سماجی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ سب سے پہلے آریائی قومیں ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں اور یہاں کی قدیم آبادی کو جنوب کی طرف ڈھکیل

کر ملک کی دو تہائی حصہ پر قابض ہوئیں۔ سکندر کو اعظم اس لیے کہا گیا کہ اس نے دنیا کو فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مگر تاریخ نے کبھی ان خونریز فتوحات کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی۔ وہ اس لیے کہ ازمنۂ قدیم میں طاقت اور بالادستی کے مظاہرے کو جرأت اور حوصلہ مندی کی قابل تعریف علامت سمجھا جاتا تھا۔

کچھ اخلاقی پابندیوں اور مزاحمت کے ساتھ یہی حال اسلامی فتوحات کا رہا۔ اور جب فاتح مسلمان ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بس گئے تو ان کو یہاں رہنے کا حقدار باشندہ تسلیم کر لیا گیا۔ علاوہ چند کے یہاں جو مسلمان آئے یہیں کے ہو رہے۔ انگریز چونکہ یہاں رہنے نہیں آیا تھا اس لیے اس کو تین سو برس کے اندر ہی ہندوستان سے نکال باہر کیا گیا۔ مگر اب موجودہ زمانہ میں کوئی قوم دوسری قوم کو اس طرح فتح نہیں کر سکتی اور اگر ایسا کرتی ہے تو دنیا کے عوام کے سامنے وہ جواب دہ ہوتی ہے اور اس کو اپنے حق کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ بین الاقوامی قوانین کی رو سے کوئی حکومت اپنے ملک کے شہریوں کے ساتھ کوئی انسانیت سوز حرکت نہیں کر سکتی۔ ازمنۂ قدیم میں دوسرے مذہب والوں کے ساتھ بے انصافی ظلم اور جبر مذہبی جنون اور کار ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اسی ہندوستان میں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ویدک ویدوں کی تلاوت کے سلسلہ میں اچھوتوں پر مظالم ہوتے تھے۔ بودھوں نے ہندوؤں پر مظالم کیے اور اس کے بعد ہندوؤں نے بودھوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں نے تبلیغ مذہب کا سلسلہ جاری کیا اور اچھوتوں کو اونچی سماجی حیثیت کے لالچ کے ذریعہ تبدیل مذہب کی ترغیب دلائی۔ جس کے لیے آج کے عام ہندوستانی مسلمان ذمہ دار قرار نہیں دیے جا سکتے۔ سکھ اور آریا سماج مذاہب کے آنے کے بعد لمبی تعداد میں اچھوتوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے ان مذاہب کو اختیار کیا۔ مذہب بدلنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ہر انسان آزاد ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری آج کے ہندو، مسلمان اور عیسائیوں پر بالکل نہیں ہے کہ اس کو بہانہ بنا کر ہندو مسلمان میں فرقہ وارانہ فسادات ہوں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں فسادات ہوں۔ آج بھی اونچی ذات والوں کے ہاتھوں ہریجنوں کے قتل عام کی داستانیں عام ہیں۔ قومیت کا یہ ناقص تصور اپنے مذہب سے لاعلمی اور دوسرے مذاہب کو بغیر جانے اور سمجھے ہوئے ان سے نفرت کا نتیجہ ہے۔

ان فرقہ پرست وطن دشمن تاریخوں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جاہل فرقہ پرستی کا مریض بنا دیا ہے اور ان جہلا کا اب یہ مستقل پیشہ بن گیا ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کے مواقع

تلاش کرتے رہتے ہیں اور اگر کوئی موقع ہاتھ نہ آئے تو موقع وضع کر لیتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بظاہر اسباب کس قدر مضحکہ خیز ہیں۔ کسی شہر میں دو سانڈ لڑ گئے اور ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ حکومت نے اردو کو دوسرا درجہ دینا چاہا اور ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کسی صنعتی مرکز میں ایک فرقہ والوں نے دوسرے فرقہ والوں سے زیادہ منافع کمایا، ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ہندو مسلمان لڑکے لڑکیوں میں محبت ہو گئی ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ دو ہندو مسلمان جوئے یا قرض کے معاملہ میں ہاتھا پائی کر بیٹھے اور ہندو مسلمان فساد ہو گیا۔ مسلمان نے مسجد میں سور کا گوشت ڈال دیا ہندوؤں نے مندر میں گائے کا گوشت رکھ دیا اور ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ علاوہ بدمعاشوں کے جو لوٹ مار سے فائدہ اٹھاتے اور خون بہانے میں لذت حاصل کرتے ہیں ان فسادات کا ذمہ دار کوئی اور نہیں۔ طرفین کے بے گناہوں کی جانیں جاتی ہیں۔ عوام اور طرفین کا کثیر مالی نقصان ہوتا ہے اور شہر کی زندگی معطل اور اجیرن ہو جاتی ہے۔ نہ ہندو رہ کر دڑ مسلمانوں کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ مسلمان فرقہ پرست اپنی عظمت گمشدہ کو فسادات کے ذریعہ واپس لا سکتے ہیں۔ انکو ہندوستانی قوم کی سیکولر زندگی میں ضم ہو جانا چاہیئے۔ ملک کی ترقی میں دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ دوش بدوش قدم بڑھانا چاہیئے۔ ان کو اپنی تعلیمی اخلاقی اور اقتصادی حالت بہتر بنانا چاہیئے تاکہ ملک کے وہ باوقار اور باعزت شہری شمار کیے جائیں۔ اپنے مذہبی حدود میں رہتے ہوئے دوسروں سے مذہبی رواداری کو اپنا مسلک بنانا چاہیئے۔ ملک سے غیر مشروط وفاداری اُن کا عین مقصد زندگی ہونا چاہیئے۔ ہندوؤں کو بھی چاہیئے کہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جو ایک بڑا بھائی چھوٹے بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔ اور بجائے وفاداری پر شک کرنے کے رواداری اور محبت سے پیش آئیں۔ جاسوسی، مخبری اور ملک سے غداری کرنے کی مثالیں ہندوؤں میں زیادہ ملتی ہیں۔ ایسے افراد کو جرم کی نوعیت کے اعتبار سے منظر عام پر سخت سے سخت سزا ملنی چاہیئے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کسی تقریر میں کہا تھا کہ اکثریت کی مذہبی عصبیت اقلیت کی عصبیت سے زیادہ خطرناک اور ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے ایک چیلنج ہے۔

فرقہ پرستی کے اس مختصر تجزیہ اور اس کے اسباب و علل کے تناظر میں شہر جونپور فخر یہ سر اٹھا کر آج بھی کہہ سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے اس لعنت سے مبرّیٰ رہا ہے اور حسین شاہ شرقی کے سکھائے ہوئے سبق پر آج تک عمل پیرا ہے۔ جونپور میں ہولی، دیوالی، دسہرہ، کجلی کے میلے، عیدین، محرم اور بارہ وفات

وغیرہ کے جلوس مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترک ورثے معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل جونپور کی گھٹی میں مذہبی رواداری اور ملنساری پڑی ہوئی ہے۔ جونپوری بالعموم بڑا صابر اور آفات ارضی وسماوی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کا سیلاب گومتی جو تین مہینہ تک طوفان نوح کا ایک نمونہ بنا رہا جونپور کے شہریوں کے نظم وضبط کی زندہ مثال ہے۔

یہ کہنا کہ جونپور میں فرقہ پرست جماعتیں کارفرما نہیں ہیں غلط ہوگا۔ یہاں بھی ویسی ہی وہ چور دروازے سے گھس آئی ہیں جیسا کہ ملک کے دوسرے حصوں میں۔ البتہ ان کو اس شہر میں کبھی کوئی کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ انتظامیہ مرکز سے دور دراز علاقوں میں کبھی کبھی ان کی تخریب کاری کا وار چل جاتا ہے مگر یہ بہت عارضی ہوتا ہے اور وہ صورت حال پیدا نہیں ہونے پاتی جو دوسری جگہوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ہمارے دیہی گاؤں میں تو یہ سوال کبھی اٹھا ہی نہیں۔ گاؤں میں کجلی کا میلہ، ناگ پنچمی کا میلہ، دسہرہ دیپاولی، محرم کا جلوس اور غازی سید سالار کی شادی اور شہادت کی بچرا خوانی میں ہندو مسلمان برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ بچرا اس قصبہ اور اس کے نواح کی ایک عوامی صنف شاعری ہے جو اور کہیں رائج نہیں ہے۔ اسکے گانے میں محض بانسری اور ڈھولک کی سنگت ہوتی ہے۔ اسی میں غازی میاں سے اخلاص عقیدت کا جذبہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہوتا ہے جو دلوں پر شدید اثر کرتا ہے۔ میں نے بھی اس عوامی صنف شاعری بچرا میں طبع آزمائی کی ہے۔ عروضی نقطۂ نظر سے بہت مشکل اور پیچیدہ صنف بھی ہے۔

عہد مغلیہ میں بھی جونپور اپنے علم وفضل اور ملک میں قومی ہم آہنگی کا پیشرو ہونے کے اوصاف کی بنا پر اکبر اعظم اور شاہجہاں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ اپنے عہد حکومت میں اکبر نے قلعۂ جونپور میں متعدد دربار کئے تھے، اور یہاں کے اکابر علوم وفنون سے ملتا رہتا تھا۔ جونپور کو شاہجہاں فخریہ "مشرق کا شیراز" کہتا تھا، اور یہاں کے دانشوروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ یہ جونپور کا ماضی وسطی تھا۔ اس کے آئینہ میں جب ہم جونپور کو دیکھتے ہیں تو اس کی تعمیرات میں ایک نہایت گراں قدر اور شاندار اضافہ ملتا ہے، اور وہ ہے دریائے گومتی پر اکبر شاہی پل جس کو اکبر کے حکم سے خانخاناں نے اپنی نگرانی میں بنوایا تھا۔ یہ سنگلاخ اور آہنی صفت پل چار سو برس گذر جانے کے بعد بھی تقریباً ہر سال سیلاب کا سینہ تان کر مقابلہ کرتا رہتا ہے، اور ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس پل پر دکانیں بھی بنی ہیں جو پل کو اچھا خاصا شاپنگ سنٹر بنائے رکھتی ہیں۔ اکبر کے عہد میں جونپور نے ہندی کا عظیم ادیب کوی بنارسی داس جین پیدا کیا جو

ہندی میں منظوم خود نوشت سوانح عمری کا بانی کہا جاتا ہے۔ شاہجہاں کے عہد میں جونپور نے ملا محمود جیسا جید عالم پیدا کیا۔ فلسفہ پر جس کی عظیم عربی تصنیف "شمس بازغہ" دنیا بھر میں عربی تعلیم گاہوں میں آج بھی اپنا سکہ جمائے ہوئے ہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزوں کی بدیسی حکومت اور بڑھتی ہوئی توسیع پسندی کے خلاف ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے جو پہلی جنگ آزادی لڑی تھی اس میں بھی جونپور کے وطن دوست عوام نے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ سلطنت بہادر، راجہ ارادت جہاں۔ راجہ مظفر جہاں، بخت سنگھ اور امر سنگھ وغیرہ نے اپنے اپنے محاذ پر انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ مگر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کے آگے یہ سرفروشان قوم زیادہ مدت تک نہ ٹک سکے اور آخر کار وہ اور انکے بہت سے ساتھی تختہ دار پر چڑھ کے امر ہوگئے۔

ماضی قریب کے جونپور میں شرقی اور مغلیہ ادوار کا علم دوستی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روایت باوجود انگریزوں کی بے توجہی کے بڑے حد تک قائم رہا۔ خطاطی میں محلہ سپاہ کے منصف محمد باقر صاحب نے وہ کمالات دکھلائے کہ میر علی اور میر عماد کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ انھوں نے دو شاگرد بنائے تھے ایک بڑے صاحبزادے محمد جعفر صاحب، اور دوسرے شیخ ممتاز حسین جونپوری۔ اپنی نوجوانی میں میں نے بھی انھی دو حضرات سے خطاطی کے سبق لیے تھے اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ شیخ صاحب کے بعد فن خطاطی جونپور میں ختم ہوچکا ہے۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ منصف محمد باقر صاحب کی وصلیوں کے نمونے اب ناپید ہیں۔ یہ ضرور ہوا کہ ان کے ورثا کی عدم موجودگی میں ان کے قدیم مکان کے ملبہ میں دب کے بہت کچھ فنا ہوگیا تاہم محلہ سپاہ کے چند خاندانوں میں ان کی کچھ وصلیاں تبرک کے طور پر محفوظ ہیں۔

ضلع جونپور کے تعلیم یافتہ طبقہ میں صاحب مقدرت حضرات کو مخطوطات اور قلمی نوادر کے جمع کرنے کا بہت شوق رہا ہے۔ یہاں مخطوطات اور خطاطی کے ایسے ایسے ذخائر تھے کہ شاید و باید۔ مگر سب کے سب امتداد زمانہ اور تقسیم ملک کے وقت انتقال آبادی کی عجلت میں ایسے تباہ و برباد ہوئے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ بند مکانوں کی بند الماریوں میں یا تو وہ دیمک اور کیڑوں کی غذا بن گئے یا نااہل ہاتھوں میں پڑ کے منڈیوں میں ردی کاغذ کے داموں فروخت ہوئے۔ البتہ چونکہ تعویذ ہائے قبور کا فروخت کرنا یا برباد کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

اس لیے ان پر تاریخ گوئی اور خطاطی کے چند قابل قدر نمونے مختلف قبرستانوں میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ راقم الحروف کے وطن بھگاؤں میں مولانا گلشن علی صاحب مرحوم کا مرمریں تعویذ قبر پر تاریخ گوئی خطاطی اور حروف کندہ کاری کا جو نمونہ موجود ہے وہ آج بھی آنکھوں کو روشنی اور صاحبان درک کو متحیر کر دینے کے لئے کافی ہے۔

یوں تو ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ سے ماضی قریب تک جونپور میں مختلف علوم و فنون کے تقریباً ڈیڑھ سو عظیم مفکرین اور مصنفین گزرے ہیں مگر اختصار کے خیال سے ماضی قریب کے صرف اپنے بزرگوں میں چند اہل کمال حضرات کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ مثلاً حاجی محمد حسن صاحب جو علاوہ علم حدیث و فقہ کے علم ہندسہ اور علم ہیئت کے ماہر تھے اور محیر العقول قسم کے بیضادی دائرے کھینچنے والے پرکار کے موجد تھے۔ وہ پرکار غالباً اب بھی ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ مولوی محمد مجتبیٰ صاحب علاوہ اردو فارسی اور عربی کے سنسکرت کے بھی عالم تھے اور علم نجوم میں حد کمال تک دستگاہ رکھتے تھے، اور اردو میں نجوم پر پہلی کتاب "النجوم" کے مصنف تھے۔ شاعری میں حفیظ جونپوری کا جو امیر مینائی کے شاگرد اور ریاض خیر آبادی کے معصر تھے۔ صف اوّل کے غزل گویوں میں شمار ہوتا ہے۔ جونپور حفیظ پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ ان کا ایک شعر تو ایسا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی اور اردو کا شعر ہندوستانیوں کی زبان پر شاید ہی آیا ہوگا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے :: ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اسی طرح خاں بہادر سید محمد محسن ذوالقدر نے جنکا شمار میر انیس کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا مرثیہ گوئی میں بڑا نام کیا اس صنف سخن میں علاوہ دوسرے شعری محاسن کے انھوں نے اس دور کی تسکین ذوق کیلیے رعایت لفظی کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ باعث امتنان یہ امر ہے کہ ان کی جملہ تخلیقات ان کے پوتے محمد محسن صاحب حسانی جونپوری کے پاس محفوظ ہیں جو خود جدید طرز کے مرثیہ گو ہیں اور برصغیر کے بہترین مرثیہ گویوں اور مرثیہ خوانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جونپور نے سر سلیمان جیسا ریاضی کا عظیم عالم اور الہ آباد ہائیکورٹ کا چیف جسٹس پیدا کیا۔ جونپور نے لکھنؤ کو سر وزیر حسن جیسا چیف جج اودھ چیف کورٹ دیا۔ علی ظہیر، حسین ظہیر اور سجاد ظہیر جیسے جنگ آزادی کے عظیم سپاہی، عظیم سائنٹسٹ اور عظیم مفکر دیے۔ جونپور سے باہر کرشن داسی نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہم کو بجا طور پر فخر ہے کہ جونپور نے رام نریش ترپاٹھی۔ گرجادت شکلا گریش جیسے عظیم ہندی کوی پیدا کیے۔ ہندی کہانی کار گنگا دھر اور راجہ رام شکلا جیسے موسیقار اب بھی حیات ہیں۔ رائے امبکا سنگھ جیسا سرفروش اور بہادر جنگ آزادی کا سپاہی

پیدا کیا - لال جی مہروترا کراچی کے میئر اور جاپان برما میں ہندوستانی سفیر تھے - گوپال جی مہروترا الہ آباد ہائیکورٹ کے جج اور آسام کے چیف جسٹس تھے - دیجے مہروترا الہ آباد ہائی کورٹ اور ڈاکٹر اندو پرکاش سنگھ سفیر سوڈان و برما اب بھی فعال ہیں - اردو کے پروفیسر رشید احمد صدیقی - جغرافیہ کے ڈاکٹر محمد شفیع اور ریاضی کے ڈاکٹر وزیر حسن عابدی نے ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر اپنے اپنے شعبۂ علم میں جو بلند مقام حاصل کئے ان سے کون واقف نہیں۔

ملک کی آخری جنگ آزادی میں بھی انگریزوں کے خلاف جونپور نے اپنی حیثیت سے زیادہ قربانیاں دیں - اندولن میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور نام پیدا کیا - یہاں اس جنگ آزادی کا آغاز تو ۱۸۹۴ء میں ہو گیا تھا - وطن پرستوں کے خفیہ جلسے ہونے لگے تھے - اور لوگ بالاعلان انگریزی حکومت کے خلاف نعرے لگاتے تھے - ۱۹۰۵ء میں یہاں کی ضلع کانگریس کمیٹی کے اجلاس کی صدارت گوپال کرشن گوکھلے نے کی تھی - ۱۹۲۱ء کے بعد مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، علی برادران اور سروجنی نائڈو یہاں آنے جانے لگے تھے - ۱۹۴۲ء تک جونپور ان کل ہند سیاسی رہنماؤں کی بتائی ہوئی راہ پر مقامی رہنماؤں مثلاً مجتبیٰ حسین، راجدیو سنگھ، ٹھاکر ہرگوبند سنگھ اور عبدالرؤف جعفری وغیرہ کی قیادت میں منزل آزادی کی جانب تیزی سے بڑھتا رہا - ۱۹۴۱ء کے بعد جب تحریک آزادی نے زیادہ زور پکڑا تو رام لگن سنگھ، رام نیتی اوپادھیا، نظام الدین صدیقی اور سورج ناتھ اوپادھیا وغیرہ کے عملی اقدامات نے تحریک کو واقعی ایک انقلابی شکل دیدی - تحریک آزادی میں ہزارہا جونپوری جیل گئے اور نہ جانے کتنے رائفلوں اور مشین گنوں کا نشانہ بنے - جلیانوالا باغ کی قربانی اپنے خاص پس منظر میں تاریخ کا ایک خونی ورق بن گئی ہے مگر انگریزوں نے جونپور میں کتنا خون بہایا، کتنے گاؤں جلا کر خاکستر کر دیئے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے - اس ضمن میں میری طرف سے بیجا کسر نفسی کا مظاہرہ ہوگا اگر اپنے دیہات کے ایک خاص واقعہ کا ذکر نہ کروں - یہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا ہمارے گاؤں سے بالکل ملحق ٹھاکروں کی ایک بستی مادھوپٹی ہے - وہاں کے چند جوشیلے نوجوان سرفروشانِ آزادی نے گاؤں سے گذرنے والی ریل الہ آباد لائن کے تار کاٹ دیے - جب اس کی خبر حکام ضلع کو ہوئی تو انگریز کلکٹر نے مادھوپٹی کو توپ دم کروا دینے کا حکم صادر کر دیا - آدھی رات کو اس ہیبت ناک حکم کی خبر میرے والد مرحوم خان بہادر محمد مصطفےٰ صاحب ریٹائرڈ کلکٹر کو ملی جو اپنے زمانۂ ملازمت میں

انگریزوں کی ناک کے بال تھے۔ وہ رات ہی رات تقریباً دو بجے اپنی کار میں کلکٹر ضلع کے بنگلہ پر پہنچ گئے۔ ان کی آمد کی اطلاع پاکر کلکٹر اپنے شب خوابی کے لباس میں باہر نکل آیا اور بعد دعا سلام کے اتنی رات گئے غیر متوقع آمد کی وجہ دریافت کی۔ جواب میں موصوف نے اپنے غم اور تردد کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنی پنشن اور خطاب کو واپس کرنے آئے ہیں۔ جس کو سن کر کلکٹر حیرت میں پڑ گیا۔ سبب دریافت کرنے پر موصوف نے فرمایا کہ وہ اپنے بھائیوں، بہنوں اور بچوں کے بے گناہ خون کو بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ اور اگر ایسا ہوگا تو صبح اس کی گولی کا پہلا نشانہ موصوف خود ہوں گے۔ مختصر یہ کہ بڑی ردو قدح کے بعد وہ گورا چٹا اپنے اس قاتلانہ حکم کو اس شرط پر واپس لینے کو راضی ہو گیا کہ اگر کسی وقت بھی ان اطراف میں کوئی ایسا ہی واقعہ دوبارہ رونما ہوا تو وہ بغیر تردد سب سے پہلے موصوف ہی کو اس جرم میں ماخوذ کرے گا۔ اور جس خطرناک چیلنج کو موصوف نے منظور کر لیا۔ اور بادشاہی پٹی کی سرحد پر متعین مشین گن اور آلات آتش زنی واپس منگوا لیے گئے۔ یہ تھا ہمارے وطن کی وضعداری اور جذباتی ہم آہنگی کا معمولی مگر زریں نمونہ۔ اس سلسلہ میں یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ موصوف کا یہی سیاسی نظریہ باپ بیٹے کے درمیان مدتوں موضوع بحث اور وجہ اختلاف رہا ہے مگر اپنے آخری ایام زندگی میں مرحوم میرے ہم خیال ہو گئے تھے۔

جب ہم حال کے آئینہ میں جونپور پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی اقتصادی پستی کو دیکھ کے صدمہ ہوتا ہے۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر اسی تناسب سے ان کی پرورش کے ذرائع میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے چند نئے مکانات، چند نئی سڑکیں اور نئے فیشن کی دو چار دکانوں سے کوئی نمایاں فائدہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں ابتک کوئی بڑی سرکاری یا غیر سرکاری انڈسٹری نہیں قائم ہوئی ہے۔ شاید اس لیے کہ یہاں کے شہری فطرتاً قناعت پسند ہیں اور حکومت کے کانوں تک پہنچنے والی آواز بلند نہیں کرتے۔

بہرکیف جونپور اپنی قدیم روایتی شہرت کو اپنی امرتی، خربوزہ، مولی، مکا کی بال، چمیلی کے تیل اور عطریات سے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ قنوج میں عطر سازی کے لیے مختلف خوشبوؤں کا گھونٹ یہاں سے کافی مقدار میں برآمد ہوتا ہے۔ جونپور کی زمین خوشبو دار پھولوں کے لیے بہت سازگار ہے۔ مگر یہاں کے مراؤ اور مالی ترکاریوں، سبزیوں اور غلّہ کی کاشت میں زیادہ منافع دیکھ کر کیوڑہ، گلاب، چمیلی، جوہی اور بیلا اگانے کی طرف سے روز بروز بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں پھولوں کے اصلی تیل کی جگہ کیمیاوی تیلوں کی تیاری تیزی سے مروج ہو رہی ہے اور اصلی تیل باوجود بڑی تلاش کے مشکل سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

اس قدیم بڑے پیمانہ پر نہ سہی مگر جونپور اب بھی اپنی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو قائم رکھے ہوئے ہے ۔ یہاں اسوقت بھی ہندی اردو پوربی بولی کے ہر مکتبۂ فکر کے کوی اور شعراء زیادہ تر ترقی پسند انفرادی طور پر ادب اور زبان کی خدمت کر رہے ہیں شفیق جونپوری اور کامل شفیقی نے مشاعروں میں بڑا نام پیدا کیا ان کے علاوہ چند نوجوان اور معمر شعراء اور کوی قابل قدر تخلیقی کام کر رہے ہیں ۔ مثلاً کامل شفیقی ہوش جونپوری ، نشاط جونپوری ، شاعر جمالی ، عالم غازیپوری ، بھیم جی ، ادم پرکاش مرند ، ابجے کمار وغیرہ ۔ فتح بہت بلند پایہ اردو اور پوربی بولی کے شاعر تھے ۔ ان کی تضمینوں کا جواب مشکل سے ملے گا ۔ سلام مچھلی شہری وہ دوسرا شاعر تھا جس نے جونپور کا نام روشن کیا ۔ عام طور پر اس کی تخلیقات بڑی سطحی نظر سے دیکھی گئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت اچھا اور بہت اور بحیل اور بعید ندرت پسند شاعر تھا ۔ اس کی شخصیت کے متعلق اتنے لطیفے مشہور ہوئے کہ اُن میں اسکی فنکارانہ شخصیت دب کے رہ گئی ۔ ورنہ اس کے بہت اچھے شاعر ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی

دست کاری اور جدید صنعتی اعتبار سے جونپور ایک پچھڑا ہوا شہر ہے مگر مچھگاؤں نے گذشتہ چند برسوں میں بڑی ترقی کی ہے ۔ زراعت میں فروغ کے ساتھ ساتھ مرزاپوری قالین کی صنعت نے یہاں تعجب خیز حد تک کامیابی حاصل کی ہے ۔ گھر گھر قالین بافی کے کاٹھ کر گھے دن رات کام کرتے رہتے ہیں ، جس نے یہاں کے مزدور طبقہ کو کافی خوش حال بنا دیا ہے ۔ بیڑی کے کارخانے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں ۔

اتر پردیش میں میرٹھ کے بعد جونپور میں سب سے زیادہ اسکولوں اور ڈگری کالجوں کی تعداد ہے ۔ تعجب ہے کہ ماہرین تعلیمات نے ابتک جونپور کو ایک اقامتی دانش گاہ کے قیام سے کیوں محروم رکھا ہے ۔

جونپور زمانہ قدیم سے مندروں اور مسجدوں کا شہر رہا ہے مندروں میں سیتلا دیوی چوکیا کا مندر سب سے زیادہ اہم اور خاص و عام کی توجہ کا مرکز ہے ۔ بہت سی مسجدوں میں جامع مسجد (بڑی مسجد) اور اٹالہ مسجد علاوہ یہاں کے شہریوں کے سیاحوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں ۔

دور حاضرہ کے جونپور شہر میں دو قابل قدر اضافے ہوئے ہیں ۔ ایک گومتی پر نئی طرز تعمیر کا پل جو ملک کی شمالی مشرقی تمائی کو الہ آباد اور دہلی سے ملاتا ہے ۔ دوسرے ہندی بھون کی تعمیر جو بابو رمیشر پرشاد سنگھ جی کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے ۔ اس کامپلکس نے شہر کی ثقافتی ضرورتوں کو بڑی حد تک پورا کیا ہے ۔ جونپور کے جملہ ادبی جلسے ۔ گوشٹیاں

کانفرنسیں، سیمینار، کوی سمیلن اور مشاعرے وغیرہ نہیں ہوتے ہیں۔ اور اگر ضرورت در پیش ہو تو برائتیں بھی ٹھہرائی جاسکتی ہیں۔

مگر یہیں پر جونپور کی بنیادی شہری ضرورتیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے جونپور کو صحتمند اور صالح بنانے کے لیے یہاں ایک بڑی انڈسٹری ایک اقامتی دانش گاہ، ایک پبلک پارک، ایک معیاری پبلک لائبریری اور ایک روزنامہ کی سخت ضرورت ہے۔ اقامتی دانش گاہ سے میعار تعلیم وتربیت ترقی کرے گا اور یہاں سے ڈگری حاصل کئے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسری یونیورسٹیوں کا دروازہ کھٹکھٹانا نہ پڑے گا۔ دماغی سکون اور جسمانی فرحت کے لیے پھولوں، لان، اور سایہ دار درختوں سے مزین ایک پبلک پارک اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک کھیل کود کا میدان، ایک اوپن ایر کھلا تھیٹر، ایک چھوٹا سا زو (زندہ جانوروں کا عجائب خانہ)۔ ان کے نہ ہونے سے عام شہری اپنے خالی اوقات میں کہاں جائے بجز اس کے کہ چار خانوں پان اور سگریٹ کی دوکانوں کے سامنے گپ لڑائے اور لایعنی باتوں میں اپنا وقت ضایع کرے۔ چوتھی ضرورت ایک معیاری پبلک لائبریری کی اس لیے ہے کہ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ بغیر اس کے اپنی علمی پیاس بجھا نہیں سکتا۔ ہر شہری کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہتا ہے اور معلوم کرنا چاہتا ہے کہ سائنس ادب تاریخ اور فلسفہ کی دنیا میں اب تک کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ پانچویں ضرورت ایک روزنامہ کی ہے جس کے بغیر ہماری سماجی، سیاسی اور صحافتی سوجھ بوجھ بالکل نامکمل اور مفلوج معلوم ہوتی ہے۔

اگر اہل جونپور کی یہ پانچ نکاتی ضرورتیں پوری ہو جائیں تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اہل جونپور کا جوہر قابل از سب نعمات سے بحد استفادہ کرے گا اور جونپور اپنے قدیم لقب "شیراز ہند" کو دوبارہ زندہ کرسکے گا، اور اس طرح قومی یکجہتی ملکی سالمیت اور شہریت کے بالغ شعور کو بہتر اور واضح نمونہ کے طور پر پیش کر سکے گا۔ " اگر نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی"۔ جونپور کے پس ماندہ رہنے کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے عوام نے ازمنۂ قدیم سے آزادی کے بعد آج تک کبھی تخت دہلی اور برسر اقتدار سیاسی جماعتوں کا ساتھ نہیں دیا۔ یہاں سے عام طور پر حزب مخالف سیاسی پارٹیوں کا امیدوار انتخابات میں کامیاب ہوتا رہا ہے تو حکومت کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان انقلاب پسندوں کے ساتھ کوئی سلوک کرے۔ ہمارے وطن کے خمیر میں انحراف کا عنصر غالب ہے اور ہم اس جذبہ کو بہت عزیز رکھتے ہیں خواہ بھوکے ہی کیوں نہ رہیں۔

••

تیسرا باب

بچپن سے اختتام تعلیم تک کی چند یادیں

میں کہ احمد مجتبیٰ (راحق جونپوری) بن سید محمد مصطفیٰ بن سید محمد مجتبیٰ بن سید حشمت علی ہوں۔ والدہ کا اسم گرامی اشرف النساء بی بی بنت زین العابدین علی احمد بن حشمت علی تھا۔ والد مرحوم کے بنائے ہوئے زائچے سے پتہ چلتا ہے کہ میں ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اپنے جدّی مکان گول کوٹھی واقع موضع کجگاؤں ضلع جونپور۔ اتر پردیش (ہندوستان) میں پیدا ہوا تھا۔ بڑی بوڑھیوں سے سنا تھا کہ بچپن میں میں بہت دبلا پتلا اور نحیف تھا۔ اور اکثر بیمار بھی رہتا تھا۔ اور یہ کہ ولادت کے بعد زچہ خانے سے نکلتے ہی میری دادی بتول بی بی بنت میر ریاض علی صاحب (بنارسی) نے یہ کہہ کر مجھ پر قبضہ کرلیا تھا کہ آج کل کی مائیں بچے پالنا کیا جانیں۔ نتیجہ میں والدہ سے بس ایک رضاعی رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ دادی دودھ پلواتی تھیں۔ اپنے کلیجے سے لگائے رکھتی تھیں۔ رات میں اپنے ساتھ سلاتی تھیں اور دن میں تیل اور اپٹن وغیرہ کی مالش سے مجھ کو پہلوان بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ یہ سب دوسروں سے سنی ہوئی باتیں ہیں۔ اس طرح زندگی کے پہلے تین سال گذرے جس زمانہ کا کوئی واقعہ خود مجھ کو یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میں والد کو "بابا"۔ والدہ کو "بوبو" اور دادی کو "اماں" کہتا تھا۔ انتہائی مثالی اور عجوبۂ روزگار بات یہ ہے کہ "اماں" "بابا" کی سوتیلی ماں تھیں۔ بابا کی حقیقی ماں سائرہ بی بی کا انتقال بابا کی نوجوانی ہی میں ہوگیا تھا۔ مگر اماں نے اپنے دونوں سوتیلے بیٹوں اور ان کی اولادوں کو وہ محبت اور جذبۂ پرورش و پرداخت دیا تھا کہ اُن کے مرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں مجھ کو معلوم ہوا کہ مرحومہ میری سوتیلی دادی تھیں۔

چار سال کی عمر سے میرے حافظے نے کچھ کچھ اپنا کام شروع کردیا تھا۔ زندگی کی پہلی یاد یہ ہے کہ گھر کے صحن میں پتھر کی ایک گھڑونچی تھی جس پر شب میں پانی کے گھڑے اور صراحیاں رکھی جاتی تھیں۔ اس عمر میں وہ میرے لیے اتنی اُونچی تھی کہ میں پنجے پر کھڑا ہوکر بمشکل اس کا اوپری حصہ چھو سکتا تھا اور دوسرے

مقامات پر اپنے ہجولیوں کے ساتھ شیخی مارا کرتا تھا کہ ہمارا گھر اتنا بڑا ہے کہ اُس کے پانی کی گھڑونچی تمہارے مکانوں کی چھت کے اتنی اونچی ہے۔ کئی سال کے بعد نوجوانی میں اس کو دیکھا تو وہ میری کمر سے بھی نیچی تھی اور میری اناکو سخت ٹھیس لگی تھی۔ طفلی کا دوسرا واقعہ جو اب تک یاد ہے یہ تھا کہ میں کسی نوکر کی گود میں تھا اور جیسے ہی حجّام نے بال کاٹنے کے لیے مشین میرے سر سے لگائی مشین کے دانتوں نے بال پکڑ لیے اور میں بے اختیار چیخ مار کر رونے لگا۔ روحانی تکلیف ہوئی تھی۔ بہت بہلانے اور پھسلانے کے بعد میں نے قینچی سے بال کٹوا لیے مگر بال کٹوانے کے خیال سے ہمیشہ کے لیے ایک (الرجی) اعصابی کراہت پیدا ہو گئی جو آج تک باقی ہے۔

پانچ سال کی عمر میں غالباً میرے مکتب کی رسم ادا ہوئی جس کی تفصیل یاد نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ میں ایک بغدادی قاعدہ کے ساتھ اپنی ماں کے والد میر ریاض علی صاحب کی اتالیقی میں دیدیا گیا تھا۔ موصوف ضعیف تھے، افیم اور چائے کے بہت عادی تھے اور دن رات حقّہ پیا کرتے تھے چنانچہ دو سال تک بغدادی قاعدہ ختم نہیں ہوا۔ اسی زمانہ قیام وطن لکھگاؤں میں میرے ایک بہت بزرگ عزیز مولانا حاجی سیّد رضی الدین صاحب قبلہ بن مولانا حاجی سید محمد حسن صاحب قبلہ بن مولانا سید گلشن علی صاحب قبلہ بھی وطن ہی میں قیام پذیر تھے۔ جو ایک جیّد عالم ہوتے ہوئے بھی بڑے روشن خیال اور مغربی ایجادات کے بڑے دلدادہ تھے۔ متولی ہگلی وقف تھے اور زیادہ تر کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ اور خاندان میں سب سے زیادہ جہاں دیدہ سمجھے جاتے تھے۔ لکھگاؤں میں چا رسب سے پہلے وہ لائے۔ سب سے پہلے مٹی کا تیل وہ لائے ورنہ اسی سے پہلے گھروں میں ڈھبرے اور ڈھبریاں ارینڈی یا سرسوں کے تیل میں جلا کرتی تھیں۔ سب سے پہلے جرمنی کی ڈیز لالٹین (Deitz) وہ لائے۔ سب سے پہلے کشتی لیمپ جس میں دو لمبے لمبے منٹل جلتے تھے وہ لائے اور ان منٹلوں کے خالی ڈبوں سے پچک کے سوئی تاگوں کو تان کر ہم سب بچے ٹیلیفون بنایا کرتے تھے۔ موصوف کو میں رشتے کے اعتبار سے مولوی نانا کہا کرتا تھا۔ ان کے یہاں صبح وشام شیشے کے فنجانوں میں خون کبوتر جیسی رنگین سادی چا رکا دور چلا کرتا تھا۔ مولوی نانا فنجان کو استکان بھی کہتے تھے اور چار میں مصری ڈالی جایا کرتی تھی۔ چنانچہ گاؤں بھر کے افیونی اور چار کے شائقین حضرات دونوں وقت ان کے یہاں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ کمرے میں کئی تخت ملا کر بچھائے گئے تھے اور ان پر سفید چاندنی کا فرش جس کے بیچوں بیچ میں ایک بڑی کشتی میں استراخانی پیتل کا سماور اور شیشے کی پیالیاں ہوتی تھیں۔ ایک چینی کی کیتلی میں لپٹی چا رسماور پر دم دی جاتی تھی اور مولوی نانا پیالیوں میں چار انڈیل کر خود

سب کو دیا کرتے تھے۔ ان صحبتوں میں میرے اتالیق میر ریاض علی صاحب کی خاص اہمیت تھی اور میں ان کا ننھی الف ہوتا تھا۔ میر صاحب کی اہمیت اس لیے بہت تھی کہ ان کو بے شمار لطیفے، عجیب و غریب واقعات اور قدیم داستانیں ازبر تھیں۔ طلسم ہوشربا، قصہ چہار درویش، داستان امیر حمزہ اور الف لیلیٰ۔ چار کی چار جلدیں لیکر داستانیں زبانی سناتے تھے اور ایک ایک داستان کئی کئی دن چلتی تھی۔

بابا کی پہلی تعیناتی بحیثیت ڈپٹی کلکٹر کے فیض آباد میں ہوئی تھی مگر باقی افراد خاندان وطن ہی میں رہے۔ جب ۱۳-۱۴ء میں ان کا تبادلہ سلطان پور کا ہوا تو ہم لوگ بھی سلطان پور لے جائے گئے۔ اس سفر کی روداد یاد نہیں۔ وہاں کے قیام کے متعلق بس اتنا یاد ہے کہ ہم لوگ جیل روڈ پر محمد ہادی صاحب کلکٹر پرتاب گڈھ کے بنگلے میں رہا کرتے تھے۔ سلطان پور میں پہلی بار ٹماٹر اور کرم کلّا (بند گوبھی) کھائی تھی جو بہت پسند آئی تھی اور آج تک پسند ہے۔ میر ریاض علی صاحب بھی ساتھ تھے مگر اب مجھ کو ایک ماسٹر صاحب آکر دو گھنٹے روزانہ اردو کی پہلی کتاب اور انگریزی کی کنگ ریڈر پڑھایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں میر سید علی حامد صاحب جونپوری منصف جو شاعر بھی تھے اور قاضی منظر حسین صاحب بنارسی استاد اردو فارسی اور عربی گورنمنٹ اسکول سلطانپور قریب ہی رہتے تھے اور تقریباً روزانہ شام کو بابا سے گفتگو، شاعری اور لطف صحبت کے لیے ہمارے یہاں آجایا کرتے تھے اور میں اپنے گیند بلے میں مگن رہتا تھا۔

۱۴-۱۵ء میں بابا کا تبادلہ بارہ بنکی کا ہوا۔ اور ہم لوگ ٹرین سے فیض آباد ہوتے ہوئے بارہ بنکی گئے تھے۔ اس زمانے میں مغل سرائے سے سہارنپور تک یہ لائن .O.R.R اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کہلاتی تھی۔ اپنی یاد میں ریل کا یہ پہلا سفر تھا جس میں بیحد لطف آیا۔ پہلے ٹرین میں چار قسم کے ڈبے ہوتے تھے۔ فرسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس، انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس (تھرڈ کا کرایہ ایک پیسہ فی میل، انٹر کا ڈیڑھ پیسے فی میل، سیکنڈ کا دو پیسے فی میل اور فرسٹ کا چار پیسے یعنی ایک آنہ فی میل ہوا کرتا تھا جو آج کل کے سیکنڈ یعنی پرانے تھرڈ کے کرایہ سے کم نہیں ہوتا تھا اور جس میں زیادہ تر انگریز سفر کرتا تھا۔ ہندوستانی اگر کوئی بڑا افسر نہیں ہوتا تھا تو فرسٹ کلاس سے اتار دیا جاتا تھا یا انگریز کے داخل ہوتے ہی خود اتر جاتا تھا۔ چونکہ بوبو اماں اور بہنیں سخت پردہ کرتی تھیں اور برقع کا رواج نہ تھا، اس لیے ایک سیکنڈ کلاس کا پورا ڈبہ (Reserve) مخصوص کروالیا گیا تھا۔ ہم سب بھائی بہن درمیانی برتھ پر بٹھائے گئے تھے اور مزا اس تصور سے آتا تھا کہ ہم ریل گاڑی میں بیٹھیں ہیں جو دوڑ رہی ہے۔

اور درخت، کھیت، گاؤں، جنگل، تالاب اور تار کے کھمبے سب کے سب پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ کھڑکی والی برتھ پر بیٹھ جانے سے یہ سحر ٹوٹ جاتا اس لیے ہم پھر درمیانی برتھ پر واپس آجاتے تھے۔ بارہ بنکی پہنچے تو ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی ایک مثلث نما (تکونی) کوٹھی میں ہم لوگوں کا قیام ہوا۔ اور تیسرے ہی دن سے ایک بڑے جلاد قسم کے ماسٹر صاحب صبح شام آنے لگے۔ صبح کا وقت تو خیر ٹھیک تھا البتہ شام کو عام طور پر عین اسی وقت آتے تھے جو ہمارے کھیلنے اور تفریح کا ہوتا تھا۔

اپنے متعلق ایک بات یہیں صاف کردوں تاکہ آئندہ کے حالات میں بار بار اس کو دہرانے کی ضرورت کم واقع ہو اور مجھ کو اور میرے حرکات و سکنات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مجھ کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ذرا کم ہی تھی۔ کھیل کود اور سیر سپاٹے میں زیادہ دل لگتا تھا۔ آگے چل کر بیشتر وہ کتابیں کبھی پسند نہ آئیں جو داخل نصاب ہوا کرتی تھیں۔ غیر نصابی کتابیں (Extra curricular) اور مشاغل زیادہ مرغوب تھے اور تعلیم ختم ہونے تک یہی حال رہا۔ نتیجہ میں امتحانات میں خوب خوب فیل ہوتا تھا۔ میں پڑھتا بہت تھا مگر اپنی پسند کی کتابیں۔ ایسے پرچے جن میں نصابی کتابوں کا تعلق نہ ہوتا تھا بہت اچھے نمبر لاتا تھا۔ مثلاً مضمون نگاری، ترجمہ، نقشہ کشی، Map reading اور تصویر کشی وغیرہ۔

پہلی جنگ عالمگیر اپنے شباب پر تھی۔ سپاہیوں کی بھرتی اور رسد جنگ کی برآمدگی میں کارکردگی اس وقت کی معیاری کارگذاری سمجھی جاتی تھی چنانچہ بابا نے ان کاموں میں بڑا نام کمایا۔ محض آٹھ برس کی نوکری کی مختصر مدت میں خان بہادری کا خطاب حاصل کیا۔ حکومت کی نظر میں وہ بہت معزز اور معتبر تھے۔

۲۰-۱۹ء میں راجہ ابوالحسن خاں صاحب والی ریاست بلہرہ (ضلع بارہ بنکی) کا انتقال ہوا تو ریاست پر کثیر قرضہ تھا اور راجہ صاحب نے تین نابالغ بیٹیاں وارث چھوڑی تھیں اولاد ذکور میں کوئی نہ تھا۔ سب سے بڑی صاحبزادی جو رانی بٹیا کہلاتی تھیں اور چھوٹی صاحبزادی بلہرہ میں رہتی تھیں اور منجھلی صاحب زادی جو قدرے ایک ٹانگ سے معذور تھیں اپنی نانی ٹھکرائن صاحبہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان حالات میں قانون کے تحت ریاست بلہرہ (Court of Wards) کورٹ آف وارڈس قرار پائی اور بابا اسپیشل منیجر کورٹ آف وارڈس بارہ بنکی مقرر ہوئے جس میں اور بھی ضلع کے چھوٹے چھوٹے تعلقے شامل تھے اور ہم سب لوگ تکونی کوٹھی سے اٹھ کر سول لائنس میں فتحپور تحصیل روڈ پر واقع بلہرہ ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔

انھی ایام میں مظفر پور (بہار) کے رہنے والے بابو امبکا نندن سنہا ڈپٹی کلکٹر بابا کی جگہ پر تبدیل ہو کر آئے تھے۔ تھوڑی مدت تک کوئی معقول مکان نہ ملنے کے سبب وہ بابا ہی کے یہاں مقیم رہے۔ جنس خوردنی ہمارے مودی خانہ سے جاتی تھی مگر کھانا ان کا اپنا خاص باورچی (مہرا) رمیشرا پکاتا تھا۔ مالک اور نوکر میں روزانہ صبح ۹ بجے کا مکالمہ قابل توجہ ہے۔ "رمیشرا آ ___ بھوجن تیار ہو ___ جواب" تھوڑک دیر مہ راج" اعتراض" یہہ نو بج گیلا چاگو پورا کا نا میں تیلا" جواب" ابھی سرکار ابھی آدکلت باٹی" ___ یہ مکالمہ مدتوں بلہرہ ہاؤس میں گجر کا کام کرتا رہا تھا۔ بابا بھی ناشتہ کر کے دفتر کے کمرہ میں آ بیٹھتے تھے اور ہم سب بچے اپنی اپنی کتابیں سنبھالے ہوئے کرتوں پاجاموں پر علم کی مستقل علامتیں روشنائی کے رنگ برنگے دھبے لیے مولوی مقاصد حسین صاحب زید پوری کے گرد جمع ہونے لگتے تھے۔ ماسٹر صاحب انگریزی پڑھانے شام کو آیا کرتے تھے۔ پوپو کے چھوٹے بھائی ماموں سید علی حماد صاحب بھی ساتھ ہی رہتے تھے اور شکار کے بہت شوقین تھے۔ رائفل اور بندوق کا ان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ وہ ہم سب بچوں کو اپنے ہمراہ شکار پر ضرور لے جاتے تھے (بالعموم اتوار کے روز) کبھی قریب کبھی دور۔ ازراہ شفقت مجھ کو بھی (جو بچوں کی برادری میں سب سے بڑا تھا) بندوق چلانے کا موقع دے دیا کرتے تھے۔

۱۹۲۱ء میں مرحوم بھائی نے گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی کے پانچویں درجہ میں میرا نام لکھوایا تھا۔ اور داخلہ کے فارم میں معلوم نہیں عمداً یا سہواً میری تاریخ ولادت ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کے بجائے ۲۳ فروری ۱۹۱۰ء بھرا تھا جس کا علم ہمکو ہائی اسکول امتحان پاس کرنے کے بعد ہوا۔ چونکہ صرف چار ماہ کا فرق تھا اس لیے کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور آج تک دستاویزات میں ۲۳ فروری ۱۹۱۰ء ہی لکھا ہے۔

ماموں گورکھپور میں قرق امین ہو کر چلے گئے۔ اس زمانہ میں انٹرنس فیل شخص کو اس سے بڑی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ میں بھی ان کے یہاں محلہ ترکی پور رہ گیا تھا۔ موصوف ہاتھی پر بیٹھ کر جائدادوں کی قرقیاں کرنے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں وہاں سلہٹ کی چھوٹی مگر بے حد شیریں نارنگیوں کی ٹوکری ایک روپیہ میں ملا کرتی تھی جس میں کم از کم سو ڈیڑھ سو نارنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ اپنے والد خان بہادر زین العباد صاحب کے انتقال کے فوراً بعد انھوں نے نوکری سے مستعفی ہو کر وطن میں گول کوٹھی کی گدی سنبھال لی تھی۔

ان کے بارہ بنکی سے چلے جانے کے بعد ان کے شکاری دوروں کو میں نے سنبھال لیا تھا۔ اب میں اپنے ہم عصروں اور اکبر خان اردلی کو ساتھ لیکر دور دور شکار کھیلنے لگا تھا۔ قصبہ کنتور کے سامنے

گھاگھرا دریا کی کچھار میں بہ استثنار شیر اور گلدار ہر چوپائے کا شکار ملتا تھا۔ سانبھر، بارہ سنگھا، بنڈیلا، اور بہت فاصلہ پر کبھی کبھی گھڑیال بھی۔ خود بلہرہ ریاست کے اندر قلعہ سے قریب کرکچی جھیل انواع واقسام کی مرغابیوں اور مچھلیوں سے پٹی پڑی تھی۔ طویل وعریض اتنی کہ شکار تک پہنچنا بغیر کشتی کے مشکل ہوتا تھا۔ پانی اس قدر صاف شفاف کہ تہہ کی مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نشانہ اتنا صحیح ہوگیا تھا کہ سو گز کے فاصلہ پر رائفل سے روشنائی کی بوتل اڑا دیا کرتا تھا۔ بابا شکار کھیلنے کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ مگر موصوف ہریل (Green pegion) اور (Snipe) چہے کا گوشت بہت پسند کرتے تھے۔ اس لیے عتاب سے بچنے کے لیے ہر شکاری دورے میں ہریل اور چہے ضرور مارے جاتے تھے

۲۳-۱۹۲۲ء میں بلہرہ ہاؤس کا تعلیمی نقشہ یہ ہوگیا تھا کہ مولوی مقاصد حسین صاحب داروغہ کو بھی بنا دیے گئے تھے اور مولوی متوسط حسین صاحب زیدپوری جو اردو فارسی اور عربی کے عالم تھے ہم تینوں بھائیوں کے معلم واتالیق مقرر ہوئے۔ اور انگریزی پڑھانے کے لیے ماسٹر محمد جواد صاحب نقوی (مصطفےٰ آبادی) ٹیوٹر مقرر ہوئے۔ غرض کہ تعلیم وتربیت کا ایک معیاری ماحول تھا۔ ہم لوگ سوتے گھر کے اندر تھے۔ صبح بیدار ہوتے ہی ناشتہ جو بچپن سے نوجوانی تک شب بھر کا اونٹا ہوا دودھ اور باسی چپاتی پر مشتمل ہوتا تھا کرکے مولوی صاحب کے حضور میں پہنچ جاتے تھے اور آمدنامہ و میزان وغیرہ کا سبق شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نوازندہ اور بازندہ دو کبوتروں کی کہانی پڑھتے تھے۔ "سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں ؛ زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں" —— ۹ بجے میں تنہا کبھی سائیکل اور کبھی تانگے سے اسکول جاتا تھا۔ کتابوں کے جھولے میں ٹینس کی ایک گیند بھی ہوا کرتی تھی جس سے انٹرول میں فٹ بال کھیلا جاتا تھا۔ روزانہ چار آنے ملتے تھے جو اسکول کے واحد شاپنگ سنٹر نانک چاٹ والے کی دوکان پر چند احباب اور میرے لنچ کے لیے کافی ہوتے تھے۔ چار بجے تک گھر واپس آجانا ضروری تھا۔ بلہرہ ہاؤس کا احاطہ (Compound) بہت بڑا تھا۔ اسی میں ایک چھوٹا سا کھیل کا میدان تھا جس میں سول لائنس میں رہنے والے میرے تمام ہم عمر احباب اور ہم جماعت مل کر ہاکی یا فٹ بال کھیلتے تھے اور تعطیل میں کرکٹ ہوتا تھا۔ احباب میں افتخار حسین عرف آغا (بعد میں I.A.S.) زین الدین کرمانی (بعد میں I.A.S.) احمد مرزا (بعد میں ضلع سیشن جج) شمس الدین عرف شمی (آجکل چوٹی کے وکیل ہائی کورٹ الہ آباد)۔ رمیش چندر اور مہیش چندر پسران بابو امبکا نندن سنہا ڈپٹی کلکٹر اور تاج الدین اور شہاب الدین (بعد میں افسر جنگلات)

پسران سراج الدین صاحب جج بارہ بنکی تھے۔ چودھری غیاث الدین اشرف (پیارے) بھی میرے احباب میں تھے مگر مرحوم کو نہ پڑھنے لکھنے سے دلچسپی تھی نہ کھیلوں سے۔ ان کا مزاج جمالیاتی تھا اور گفتگو بے مثل کرتے تھے۔

گھر پر تربیت کا حال یہ تھا کہ اگر اسکول میں کسی شرارت یا سبق یاد نہ ہونے پر سزا ملتی تھی تو گھر پہنچنے سے پہلے یہ خبر گھر پہنچ جاتی اور اس بات پر مزید تنبیہ ہوتی تھی کہ ایسا کام ہی کیوں کیا کہ اسکول میں سزا ملے۔ ہم تینوں بھائیوں احمد مجتبیٰ، حسن مجتبیٰ، حسین مجتبیٰ کے ساتھ ہمارا خالہ زاد بھائی علی حیدر رہا کرتا تھا۔ چونکہ ہماری بڑی خالہ کا انتقال علی حیدر کی شیر خواری کے زمانہ میں ہی ہو گیا اس لیے بوبو اس کو اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ علی حیدر کے والد سید علی جعفر صاحب اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھنے چھٹے چھ ماہے آجایا کرتے تھے۔ ان کے طلوعِ بے اطلاع کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہم سب بچے جس کو جہاں موقع ملتا پاخانہ غسل خانہ کوئی اندھیری کوٹھری اور شاگرد پیشوں میں بھاگ بھاگ کر چھپ جاتے تھے۔ ابھی اسباب سفر یکہ سے پورا اترنے نہ پاتا تھا کہ بہ آواز بلند ایک ایک بچہ کا نام لیکر پکارنا شروع کر دیتے اور بابا ان کو سلام کر کے گھر میں بوبو کو خبر دینے چلے جاتے کہ بچوں کا بلیگ آگیا یعنی آپ کے بڑے بہنوئی علی جعفر صاحب آگئے۔ ان کو جلد از جلد اندر بلا کر ناشتہ وغیرہ میں مشغول کر دیا گیا ورنہ باہر کسی لونڈے کا خون بہہ جائیگا۔ ناشتہ کی تیاری میں کچھ وقت تو لگتا ہی اس اثنا میں ہم میں سب سے پہلے جو سامنے پڑ گیا اس بات پر دو کڑے طمانچے کھا جاتا تھا کہ پورے کمر تک جھک کر سلام کیوں نہیں کیا... آموختہ سب یاد ہے ؟ آج کا املا دکھلاؤ ! سب لوگ اپنی اپنی کتابیں کاپیاں اور تختی لاؤ! ... یہ پائجامہ کا پائنچہ کیوں میلا ہے ! ہر سوال لاجواب اور پریشان کن۔ سب کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ بزرگوں کا بھی یہی حال ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب، ماسٹر صاحب اگر موجود ہوئے، اور بابا، سب خاموش تماشائی معلوم ہوتے تھے۔ احترام بے حد اس لیے کہ موصوف رشتہ اور عمر دونوں میں بابا سے بڑے تھے۔ علی حیدر بیچارہ سب سے زیادہ ان کی خون آشام تادیب و تعزیر کا نشانہ بنا کرتا تھا۔ پٹائی کرنے میں انکے ہاتھ الٹے سیدھے دونوں رخ سے کام کرتے تھے۔ ان کے دوران قیام میں صرف ان کا وضع کردہ قانون اور حکم چلتا تھا۔ پڑھائی لکھائی معطل، کھیل کود موقوف۔ کھانے ان کی مرضی کے پکتے تھے۔ مالی ان کی مرضی کی باغبانی کرتا تھا۔ پہرہ کا سنتری ان کی بتائی ہوئی ترکیبوں سے پہرہ دیتا تھا۔ کوچوان ان کی سکھائی ہوئی ترکیب شہسواری پر عمل کرتا تھا۔ بابا سے ملنے والے پہلے ان سے مل کے بابا سے ملنے جاتے تھے۔ کوٹھی میں ہر بچے کا اور چند نوعمر ملازمین کا سر منڈا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گھر بھر میں

سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ان کی اور محض ان کی کڑکدار آواز سنائی دیتی تھی یا کبھی کسی بچے کے رونے کی چیخ۔ موصوف کچھ ہکلاتے بھی تھے اور جب کسی بات پر الجھتے تھے یا طیش میں آتے تھے تو یہ طلاقتِ لسانی مزید طوالت پذیر ہو جایا کرتی تھی۔ اور ہم سب بچے پٹ پٹا کر سیدھے ہو جاتے اور پچھلے تمام سبق بھول جاتے تھے تو موصوف بغیر کسی نوٹس یا اطلاع کے تانگہ کھنچوا کے اسٹیشن روانہ ہو جایا کرتے۔ معلوم نہیں کہاں کے لیے، اور کوٹھی کئی دن کے بعد اپنے معمولات پر واپس آتی تھی۔

ان کو چڑیوں سے بہت دلچسپی تھی۔ میرے کبوتر خانہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اپنے کبوتر خانہ میں میں نے آسٹریلیا کے پاوٹر سے لیکر بغداد کے گولے، لکھنؤ، شاہجہاں پور، رام پور اور حیدر آباد تک کے گرہ باز، بحری مار، تارے، کالے، ہرے، ہردے، گجرے، لقّے، لوٹن اور عفور سب جمع کر لیے تھے، اور خالو مرحوم ہر ایک کا جداگانہ راشن متعین کرکے چلے جاتے تھے۔

خالو سید علی جعفر صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ان کا ڈھائی تین سال پہلے کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ موصوف کو جنات یا ہمزاد کو تابو میں رکھنے کا عجیب شوق تھا تو وہ بعد نماز عصر مصلے پر بیٹھ کر کوئی عمل کیا کرتے جس کو وہ "حاضرات" کہتے تھے۔ سامنے ایک پیلے رنگ کا کاغذ دس بارہ انچ لمبا چوڑا ہوتا تھا جس کے بیچوں بیچ میں دو انچ لمبا چوڑا سیاہ رنگ کا ایک مربع تھا اور جس کے گرد باقی جگہ میں لال روشنائی سے بد خط عربی کی عبارتیں غالباً دعائیں تحریر تھیں۔ اس کے آگے اگربتی جلتی رہتی اور وہ تسبیح پر دعائیں پڑھ پڑھ کر کاغذ کو دم کرتے رہتے تھے۔ اور تھوڑے وقفہ کے بعد آتشی شیشہ سے اسی سیاہ مربع میں کوئی چیز یا شکل تلاش کیا کرتے تھے اور یہ عمل گول کوٹھی کے بالا خانہ کی کھلی چھت پر ہوا کرتا کہ ایک دن ناگہاں کوٹھے سے زنانہ صحن میں گرجدار آواز آئی "وصی وصی" (میرے ہم عمر دوست اور مجھلے ماموں سید وصی احمد زیدی)۔ "بھینی۔ بھینی" (یہ میرا عرف تھا)۔ ادھر فوراً "آؤ" اور ہم دونوں ماموں بھانجے دو دو سیڑھی چھوڑ کر بالا خانہ پر ان کی خدمت میں سہمے ہوئے حاضر ہو گئے۔ "آداب آداب" "ہوں"۔ "بالکل پاک صاف ہو" "جی ہاں" حکم کی تعمیل میں نماز کی چوکی کے دائیں بائیں ہم لوگ اکڑوں بیٹھ گئے۔ "وصیّ۔ سر جھکا کر اور خوب غور سے دیکھ کر بتلاؤ کہ اسی سیاہی کی حد میں تم کو کوئی چلتی پھرتی شکل نظر آئی ہے اور وہ کیسی ہے۔ تم لوگوں کی نظریں تیز ہیں، مجھ کو کم دکھائی دیتا ہے"۔ تعمیل حکم میں وصیّ ماموں اس کاغذ پر جھک سے گئے اور کچھ دیر غور کرنے کے بعد بولے "دولھا بھائی ہمکو کوئی شکل نہیں دکھائی دیتی"۔ "غور سے دیکھو" غور سے دیکھنے پر بھی وہ کچھ دیکھنے

میں کامیاب نہ ہوئے تو اوپر سے سر پر ایک ایسا لپو ٹا پڑا کہ وصّن ماموں کی ناک اس سیاہ دھبّے سے ٹکرا کر تھوڑی دیر کے لیے چپٹی ہو گئی اور موصوف نے ان کے سر کے بالوں کو پکڑ کر ان کو سیدھا کھڑا کر دیا۔ "یہاں کھڑا رہ۔ نجس کہیں کا۔ پیشاب کر کے پانی نہیں لیتا" اور مجھ سے فرمایا "چھنّن تم پاک صاف ہونا۔ اب تم اس سیاہ نشان کو غور سے دیکھ کر بتلاؤ" میں وصّن ماموں کا حشر اور ان کو سسکتا ہوا دیکھ چکا تھا۔ سر جھکا کر بظاہر نقشہ کو دیکھتے ہوئے قدرے توقف سے میرا اختراعی بیان عالی شان شروع ہوا "ایک بہت بڑا میدان ہے۔ ایک طرف سے اجلے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ایک سوار آیا ہے۔ اس کی صورت پر کوئی کپڑا لٹک رہا ہے۔ پگڑی باندھے ہے۔ بائیں ہاتھ سے لگام تھامے ہے"۔ اوپر سے ایک بڑی سی آواز آئی۔ سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی کس میں ہمت تھی۔ "ہوں۔ شاباش۔ اور کیا دیکھ رہے ہو؟" "جی۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں تلوار یا بھالا ہے۔ صاف دکھائی نہیں پڑتا۔ اور اب وہ بیچ میدان میں آ گیا ہے۔ ادھر ادھر اونچا ہو ہو کر کچھ دیکھ رہا ہے۔ اب وہ گھوڑے کو ٹھوکر مار کر جلدی جلدی سیدھے جا رہا ہے۔" "ہاں ہاں اور کیا" "اب وہ دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گیا۔ اب کچھ نہیں دکھائی دیتا۔" "بہت ٹھیک بہت ٹھیک۔ تم ضرور پیشاب کر کے استنجا کرتے ہو گے" اور جو بالکل واقعہ کے خلاف تھا۔ اس کے بعد موصوف نے چوکی کے ایک کونے سے ٹین کا ایک ڈبہ اٹھایا اور ہم لوگوں کو دو دو تین تین چھوہارے دیے اور وصّن ماموں سے ڈانٹ کر فرمایا کہ اگر آج سے تم نے استنجا نہ کیا تو بہت ٹھوکوں گا"۔ اور ہم لوگ رخصت ہو کر جب سیڑھی پر دھڑ دھڑ کرتے ہوئے صحن میں پہنچے تو وصّن ماموں نے پوچھا "چھنّن کیا تم نے واقعی وہ سوار دیکھا تھا؟" "آپ کے پٹنے کے بعد مجھ کو تو اس میں فوجیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ تو جلد بازی میں ایک ہی سوار کا حال سنایا کہ جلدی چھٹی ملے" اور وصّن ماموں کے اس اعلان پر یہ قصہ ختم ہوا کہ "اب سے ہر ایسے موقع پر تم کو میں آگے رکھا کروں گا اور رہتا پیچھے میں"۔

ہمارے معلم خاص مولوی متوسط حسین صاحب اور جب ان کے احباب جمع ہو کر گفتگو کرتے تھے تو وہ سننے کے لائق ہوتی تھی۔ ان میں کا ہر ایک فارسی اور اردو ادب بالخصوص شاعری کا مبصر اور عالم معلوم ہوتا تھا۔ یہ حضرات زیادہ تر مرزا دبیر کے ماننے والے ہوتے تھے اور مرزا انیس کے دلدادگان۔ موازنہ انیس و دبیر پر مولانا شبلی کی وہ دھجیاں اڑتی تھیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ بابا اور ہمارا پورا خاندان انیسیئے تھے۔ ہمارے عم محترم سید محمد مرتضیٰ صاحب اور ان حضرات میں جب کوئی ادبی بحث چھڑ جاتی تھی تو کئی کئی دن چلتی تھی۔ میں اور میرے مجھلے بھائی حسن مجتبیٰ عرف حسنا نے ان صحبتوں سے جو کچھ حاصل کیا وہ آج تک ہمارے کام آ رہا ہے۔

لکھنؤ سے ایک مولانا آیا کرتے تھے جن کی عام روزمرہ کی گفتگو سن کر لوگ کانوں پر انگلی دھرتے تھے۔ مثلاً کوئی امرود بیچنے والی آگئی تو مولانا اس سے یہ نہ کہتے تھے کہ اے کنجڑن تو ان امرودوں کو وزن کے حساب سے بیچتی ہے یا گنتی سے بلکہ فرماتے تھے "اے عجوزہ تو ان ثمرا کو عدداً بیع کرتی ہے یا کیلاً" یا کسی بزاز سے پوچھتے تھے "اے صاحب دکان پارچہ فروش اس بُرد میں طلائع ظاہری ہی ہے یا کچھ معنویت بھی"۔ ہمارے استاد مولوی متوسط حسین صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ "آج شب میں برودت کی وہ شدت تھی کہ جوڑ جوڑ انجماد کا شکار ہو گیا، جو دست و پا میں تشنج کا باعث ہے"۔

جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو میور سنٹرل کالج الہ آباد سے تبدیل ہو کر شیخ مہدی حسین ناصری صاحب ہمارے ہیڈ ماسٹر ہو کر بارہ بنکی آگئے تھے۔ ان کے علم و فضل، ان کی قابلیت ان کی شخصیت ان کا حسن اخلاق، ان کی گلبار تقریریں، سب کے ساتھ ان کی شفقت و محبت مثالی تھی۔ وہ شاعر بے بدل تھے۔ اپنا کتبہ لحد (Epitaph) مرحوم نے خود ہی کہہ لیا تھا:

طول کھینچا ہے یہاں تک شب تنہائی نے ناصری قبر پہ عبرت کے لئے لکھوا دو

۱۹۲۵ء میں ناصری صاحب نے گورنمنٹ اسکول بارہ بنکی میں ایک بڑا مشاعرہ کیا جس میں موصوف نے صرف لکھنوی شعرا اور بارہ بنکی کے مقامی شعرا کو دعوت شرکت دی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا اور اسکول کے شمالی جانب وسیع لان پر چار پانچ بڑے تختوں کا ایک ڈائس۔ صدارت صفی صاحب کی اور نظامت کے فرائض خود ناصری صاحب ادا کر رہے تھے۔ لکھنؤ سے آئے ہوئے سب اساتذۂ فن ڈائس پر جلوہ افروز تھے اور باقی سب لکھنؤ اور بارہ بنکی کے مقامی شعرا اور سامعین سامنے سفید براق فرش پر تشریف فرما تھے۔ ناصری صاحب نے طرحی مشاعرے کی افادیت پر مختصر تقریر کرنے کے بعد مشاعرہ کا آغاز کرنا ہی چاہا تھا کہ حضرت قرار بارہ بنکی کے انتہائی معتبر اور کافی ہر دلعزیز اور مسلم الثبوت استاد جو صفی صاحب کے ہم عمر بھی تھے فرش پر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ناصری صاحب کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ "جناب ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کے اسکول کے اس مشاعرہ میں آپ کی دعوت پر میں مع اپنے شاگردوں کے اس امید بلکہ یقین کو دل میں لیے ہوئے آیا تھا کہ آپ خود شاعر اور صاحب نظر ہیں اور بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں اس لیے آپ یہاں کے اساتذہ کی ادبی حیثیت سے کماحقہ واقف ہوں گے اور ڈائس پر ان کو وہی مقام دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں مگر مجھ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے اس امر میں بے توجہی سے کام لیا ہے۔ یہ سامنے ڈائس پر جو لکھنوی شعرا بیٹھے ہوئے ہیں ان میں اگر میں

سب سے بہتر شاعر نہ مانا جاؤں تو کسی سے بھی کم حیثیت کا مالک نہیں ہوں۔ اس ضمن میں میری ہی نہیں بلکہ اہل بارہ بنکی اور یہاں کے مدرسۂ شاعری کی آج جو توہین ہوئی ہے اس پر اظہار بیزاری کے طور پر جناب والا میں چلا۔ یہ میرے چند شاگرد ہیں ان کی غزلیں آپ اور حضرات لکھنؤ سن لیں اور میں اپنے گھر پر یہ سننے کے لیے بیقرار ہوں گا کہ ان چند نوجوانوں نے لکھنؤ والوں کی تمام غزلیں پھیر ڈالیں"۔ یہ کہہ کر قرار صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے یہ جا اور وہ جا۔ جملہ سامعین اور ڈائس پر بیٹھے ہوئے شعرائے لکھنؤ سناٹے میں آ گئے اسکول کے طلبا بہت دوڑے دھوپے ان کے قدموں پر گرے مگر قرار صاحب کسی طرح مشاعرہ میں واپس جانے پر راضی نہ ہوئے جس کا ناصری صاحب کو بیحد صدمہ تھا۔ اس کے بعد ہوا بھی ایسا ہی کہ قرار صاحب کے تلامذہ کی غزلوں کے آگے لکھنؤ کے کسی شاعر کا چراغ نہ جل سکا۔ اصلیت یہ تھی کہ وہ غزلیں خود قرار صاحب کی تخلیقات تھیں وہ بڑے صاحب طرز اور بے پناہ صلاحیتوں کے فنکار تھے اور غزل کے معاملہ میں لکھنؤ کے کسی شاعر میں ان سے ٹکر لینے کی ہمت نہ تھی۔ قرار صاحب کی کمزوری (Handicap) یہ تھی کہ بارہ بنکی کے باہر قدم نہ نکالتے تھے اور اپنی ایک خاص طرز زندگی کے معمار تھے جسمیں لکھنؤ کی ادبی مرکزیت کا بھی گذر نہ تھا۔ نتیجہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ خمار بارہ بنکوی قرار صاحب کے بھتیجے ہیں اور شاگرد بھی جو اپنے عم محترم کے کمال شاعری تک تو نہ پہنچ سکے مگر نام ان سے کہیں زیادہ پیدا کیا۔ بڑے اور چھوٹے شہروں کے ادیبوں میں شہرت کے مصنوعی فرق کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔

ناصری صاحب سے بابا کے بڑے گہرے تعلقات تھے اور میرے عم محترم محمد مرتضیٰ صاحب کے تو وہ الہ آباد میں استاد ہی رہ چکے تھے۔ موصوف کے بارہ بنکی آنے کے بعد سے مجھ کو بھی اسکول میں مقررہ اوقات سے زیادہ ٹھہر جانے کی چھوٹ مل گئی تھی۔ ان کے صاحبزادے نصیر اور ان کے ایک قریبی دوست کے بیٹے غضنفر کاظمی سے میرے برادرانہ تعلقات تھے۔ گجّن میرے ہم جماعت بھی تھے۔ نہایت صالح سنجیدہ اور پڑھنے لکھنے والے طالب علم تھے اور میں آزاد منش کھیل تماشہ والا آدمی۔ مزاجوں کے متضاد ہونے کے باوجود ہم لوگوں میں بڑی دوستی تھی۔ بارہ بنکی کے احباب اور ہم سنوں میں بس اب ہم دو باقی ہیں جنھوں نے ابتک زندگی سے ہار نہیں مانی ہے۔

اسی زمانہ میں بوبو کے پھوپھی زاد بھائی یعنی ماموں سید محمد جعفر صاحب بن منصف محمد باقر صاحب (اپنے دور کی خطاطی میں میر علی اور میر عماد ثانی) اور شیخ ممتاز حسین جونپوری کے تلامذہ منصف صاحب ہر دو

صاحبان سے میں نستعلیق فن خطاطی کے سبق بھی لیا کرتا تھا۔ نسخ سے مجھے اس لیے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ محض کاریگری ہے فن نہیں ہے۔ جب کہ نستعلیق وہ فن ہے جو دائرے، مد کی کشش اور جوڑ بند میں بال برابر فرق یا لغزش کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک نظر میں اس میں درک رکھنے والوں کو عیب دکھائی دینے لگتا ہے۔ نستعلیق میں غلطیوں کو چھپایا ہی نہیں جا سکتا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر خطاط اپنے خاص اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔ فرق نہیں تو شناخت کس طرح ہو جاتی ہے، اس راز کو کوئی آج تک سمجھا نہ سکا۔ نستعلیق کی دو قسمیں میں ایک مدور اور دوسری بیضوی۔ ہمارا مدرسہ خطاطی بیضوی ہے۔

بارہ بنکی میں بابا کے احباب کی فہرست بہت طویل تو نہ تھی مگر جو تھی وہ نمائندہ تھی۔ مثلاً چودھری محمد علی جمرد۔ چودھری ارشاد حسین۔ مسیح الدین بیرسٹر۔ چودھری مجتبیٰ حسین۔ سردار نہال سنگھ۔ ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ۔ گدیہ کے مشیر حسین قدوائی اور زیدی کے شاہ حیات احمد۔ بابا کے ساتھ زیدی کے عرس میں شاہ صاحب کی خانقاہ پر میں بھی کئی بار گیا ہوں۔ ان کے یہاں کی قوالی واقعی محفلِ سماع ہوا کرتی تھی۔ عربی، فارسی اور برج کے علاوہ دوسری زبان کی قوالی گانے کی اجازت نہ تھی بلکہ سخت (Taboo) امتناع تھا جو اجمیر شریف اور پیران کلیر میں بھی نہ تھا۔

۱۹۲۶ء میں ہائی اسکول امتحان کے دن قریب آ گئے۔ اس زمانہ میں بارہ بنکی کے طلبا کا سنٹر گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنؤ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۶ء میں شیخ تفضل حسین صاحب مختار کی معیت میں میں اور ان کے چھوٹے بھائی منور عباس امتحان دینے لکھنؤ گئے۔ سال بھر تو کچھ نہیں پڑھا۔ لکھنؤ پہنچ کر نماز پنجگانہ شروع کر دی۔ روزانہ باہر سے (HINTS) اشارات آیا کرتے تھے اور جیسی مجھ کو بڑی فکر رہا کرتی۔ شب میں دیر تک انہی اشارات کی روشنی میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا تھا اور منور عباس ڈلائی تان کے آرام کی نیند سوتے تھے اور پرچوں میں دوسرے دن کوئی ہنٹ کام نہ آتی تھی۔ نکوائی کے خمار میں پورا امتحان دیا۔ میں امتحان گاہ سے منہ لٹکائے ہوئے نکلتا تھا اور منور عباس اپنی کرنجی آنکھوں میں ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ اللہ اللہ کر کے امتحان ختم ہوا اور ہم لوگ اپنے اپنے مستقر یعنی بارہ بنکی واپس آ گئے۔ نتیجہ کے انتظار میں روزانہ شب میں بستر پر پرچے نکال کر بڑی دریا دلی سے اپنے کارناموں کا جائزہ لیتا اور نمبروں کا تعین کرتا تھا۔ مگر کسی پرچے میں ۲۵ - ۳۰ فیصد سے زیادہ نمبر نہیں ملتے تھے۔ بابا اور اساتذہ بھی میری کامیابی کی طرف سے مایوس تھے اور میں روز نیت کرتا تھا کہ آئندہ سال

خوب محنت کرکے امتحان ضرور پاس کروں گا۔ اخبار میں نتیجہ کے اعلان کا دن آجتک یاد ہے۔ ۲۱ر جون ۱۹۲۶ء کو جیلر صاحب کا لڑکا جو میرا ہم جماعت تھا I.O.T. اخبار لکھنؤ لیے ہوئے میرے گھر آیا کہ لو یار مبارک ہو۔ ہم اور تم دونوں پاس ہو گئے (مطلب یہ کہ تھرڈ ڈویژن میں) اور منور عباس نے تنہا پورے کلاس میں فرسٹ ڈویژن پایا ہے۔ نکرجی کا طلائی تمغہ اُسی کو ملے گا۔ مگر میں بدستور مغموم رہا۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے ممتاز بھائی محمد آبادی نے دریافت کیا کہ اب غم کس بات کا ہے تو میں نے ان کو بھائی رضا حسین زیدی مرحوم کا قصہ انھی کا بیان کیا ہوا ان کو سنا دیا کہ "غم اس بات کا ہے کہ اب نئی کتابیں پڑھنا پڑیں گی" ——

نتیجہ کے بعد بزرگوں کا کابینہ یہ طے کرنے کے لیے بیٹھنے لگا کہ انٹر کے لیے کہاں بھیجا جائے گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنؤ؟ میں نے کہا وہاں کی پڑھائی بہت سخت ہے ہم سے نہیں چلے گی اور لکھنؤ اتنا قریب ہے کہ ہم روز یہیں دھرے رہیں گے۔ میری تجویز علیگڈھ کی تھی جس کو بابا نے یہ کہکر مسترد کر دیا کہ "وہاں کا معیار تعلیم پست ہے اور فاصلہ اتنا ہے کہ وہاں تمہاری نگرانی مشکل سے ہو سکے گی۔ بالکل آزاد ہو کر کھیل کود میں وقت برباد کرو گے اور بیّنے سرے کے لوفر ہو کر نکلو گے سرسیّد والا علیگڈھ اور تھا۔ اس لیے میرا آخری فیصلہ یہ ہے کہ گورنمنٹ انٹر کالج فیض آباد میں داخلہ کی درخواست بھیجدو۔ وطن اور بارہ بنکی کے درمیان میں ہے بھی اور چونکہ میں تم کو انجینئر دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے تمہارے مضامین ہوں گے فزکس کمسٹری ریاضی اور انگریزی"۔ چونکہ ہائی اسکول کے مقابلہ میں انٹر کے ان مضامین کا مجھ کو کوئی اندازہ نہ تھا اس لیے میں نے فوراً جواب دیا جی ہاں جو حکم ہوا اور بات ختم ہو گئی۔

بارہ بنکی میں ۱۹۲۱ء سے ہی حکومت برطانیہ کے خلاف تحریک آزادی شروع ہو گئی تھی بعد میں تحریک خلافت اور تحریک آزادی مل کر کام کر رہی تھیں۔ کبھی علی برادران آتے تھے کبھی مہاتما گاندھی۔ حکومت نے پھوٹ کی پالیسی بھی شروع کر دی تھی مگر بارہ بنکی میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ قوم پرست ہندو مسلمان دونوں جوق در جوق جیل جاتے تھے اور چھوٹ چھوٹ کر واپس آتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہمارے اسکول میں ہر سال آرمسٹس ڈے منایا جاتا تھا جس میں گھنٹہ بجنے پر پڑھائی ملتوی کر کے ہر جماعت اور اساتذہ جو جہاں ہیں وہیں کھڑے ہو کر پانچ منٹ تک خاموش رہتے

تھے۔ اس روایت کو توڑنے اور حکومت برطانیہ مردہ آباد کا نعرہ لگانے پر موجدار ہیڈ ماسٹر کے زمانہ میں دو طالب علموں کا (Rustication) اسکول سے عارضی اخراج ہوا تھا۔ ایک نعیم الدین احمد کرمانی (اب I.A.S.) اور دوسرے مشرف حسین / یا شرف الدین (ان دو میں سے کوئی ایک تھا جو صحیح یاد نہیں ہے) جس پر بارہ بنکی کے تمام اسکولوں کے طلبا میں کافی ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اور جس کو فرد کرنے کے لیے افسران ضلع کو پولیس کی مدد لینا پڑی تھی۔ اُس زمانے میں میں عجیب ذہنی کشمکش سے گذر رہا تھا۔ اُدھر اسکول میں گورنمنٹ کے خلاف فضا دوسرے طرف گھر پر سب برطانیہ کے پرستار اور اور مجھ پر تاکید کہ ان تحریکوں سے بالکل دور رہو۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ناپختہ ذہن اسی نظریاتی تصادم میں کس کرب سے گذر رہا ہوگا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال کہ بابا کوئی غلط رائے نہیں دے سکتے۔ دوسری جانب زیادہ تر طلبا، چند اساتذہ اور عام اہل شہر کے خیالات اس کے بالکل برعکس جن کوسن کے حکومت کے خلاف جذبہ سر اٹھاتا تھا۔ ایک طرف گھر کی نوکر شاہی فضا دوسری طرف اسکول کا کھلا میدان۔ دل میں غیر فیصلہ کن حلش اپنی جگہ مگر بظاہر بزرگوں کے احکام پر عمل کرنے میں مفر نظر آتا تھا۔ بزرگوں اور بالخصوص والدین اور اساتذہ سے کسی قسم کی سرتابی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کے عوض میں بزرگوں سے وہ شفقت اور محبت ملتی تھی کہ شاید و باید۔ اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ برملا انحراف کر سکتا تھا۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک وقت عزیز بہت برباد ہوا۔ عدم اطمینان کے اظہار کا بہت مہنگا مگر موثر طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ تعمیل حکم میں کہیں سے کوئی بھول نظر نہ آئے۔ اُس زمانہ میں طالب علم کے (Aptitude) فطری رجحان کا بھی بالعموم کوئی تصور نہ تھا۔ فی الاصل مجھ کو انجینئر بنانے کے فیصلہ میں بابا کے مغالطہ کا سبب میرے بچپن اور نوجوانی کے عوامل اور دلچسپیاں ہوئیں۔ گھر میں سلائی کی مشین خراب ہوئی میں نے تیل ویل دے کے چلا دیا۔ تیل سے چلنے والے پنکھے خراب ہوئے ان کو درست کر دیا۔ موٹر کار میں کوئی اڑچن پیدا ہوئی اس کو ٹھونک ٹھانک کے اسٹارٹ کر دیا۔ گھڑیوں کی مرمت کر لیتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی میز کرسیوں کو ٹھیک کر لیتا تھا۔ لوہے کے بیکار ٹکڑوں کو تار سے جوڑ جاڑ کے کوئی مجسمہ تشکیل کر لیتا تھا۔ تصویریں بنا لیتا تھا۔ کلاس میں جغرافیہ کے نقشے بنانے میں ہمیشہ اول آتا تھا ڈرائنگ کلاس میں پھول پھل پتیوں میں رنگ آمیزی کرنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر ان سب

صلاحیتوں کا انجینئرنگ سے تعلق بہت دور کا ہے - یہ سب براہ راست فطری ایجادکاری اور تخلیقی فطانت کے مظاہرے تھے - جبکہ انجینئرنگ خالص ریاضی فارمولوں اور تھیوریوں کا نام ہے جنکا حفظ اور ذہن نشین کرنا میرے بس کا روگ نہ تھا - دونوں میں بنیادی فرق کا یہ راز اس وقت کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

غرض کہ بارہ بنکی سے فیض آباد جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں - بارہ بنکی چھوٹنے کا مجھ کو بڑا غم تھا - بارہ بنکی سے مجھ کو ہمیشہ ایک جذباتی لگاؤ رہا ہے - یہاں میرا بچپن گذرا ہے - یہاں سے مجھ کو نوجوانی ملی ہے - یہاں میری معصومیت کی قبر ہے - یہ باب ختم ہونے جارہا ہے اور میں اب یہاں سے مجبوراً کوچ کر رہا ہوں - اور اس وقت انگنت مزید چھوٹی چھوٹی یادیں ذہن میں سر اٹھا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں " او ناداں تو ہم کو اتنی جلدی بھول گیا - ہم کو تجھ پر بڑا بھروسہ تھا - تو نے اس لیے ہمارا ذکر نہ کیا کہ ہم کو غیر اہم سمجھتا ہے - تو نے شاید یہ فرض کر لیا کہ ہم نے تیری شخصیت کے ارتقا میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا - مگر یہ تیری غلطی ہے - کیا ٹھاکر جے کیرت سنگھ بھبشٹ ڈپٹی کلکٹر نے پولیس لائن کے کھیل کے میدان میں گھونسے مار مار کر تجھ کو فٹبال کھیلنا نہیں سکھلا دیا - کیا تو علی شیر کے ساتھ فٹبال کھیلنے میں فخر نہیں محسوس کرتا تھا - کیا تو نے بابو کے بڑے بھائی موہن کے ساتھ ہاکی نہیں کھیلی - کیا تو نے شمس الدین کے ٹٹو پر بیٹھ کر گھوڑسواری نہیں سیکھی تھی - کیا تو نے ہر جمعرات کو چیوا فقیر کے چکارے پر اس کے فی البدیہہ اشعار نہیں سنے تھے - کیا تو بیگم گنج کے لبا بچی کی ہانک سن کر اور بزرگوں سے آنکھ بچا کر پھاٹک باہر سڑک پر نہیں آجایا کرتا تھا - کیا تو نے ملک کے بہترین مقررین مثلاً مولانا سبط حسن صاحب مولانا ابن حسن صاحب نونہروی صاحب اور حکیم مرتضی حسین کو پہلی بار یہاں نہیں سنا - دولھا صاحب نبیرۂ انیس کو تازہ کلام تحت لفظ پڑھتے نہیں دیکھا تھا - کیا تو نے سجاد حسین اور منجھو صاحب کی سوزخوانی پہلی بار یہاں نہیں سنی تھی - کیا تو نے ماسٹر راحت کی قوالی یہاں نہیں سنی تھی - کیا تو کوٹھی اور جمریا نالے کے درمیان لمبے میدان میں اپنے ہم جماعت نجم الدین صراف سے کنکوں کے پیچ نہیں لڑایا کرتا تھا - کیا تو ماسٹر کبیر کے ساتھ جمریا نالے کے پل کے قریب بسے ہوئے گھوسیوں کی جوان اور حسین لڑکیوں کو گوشۂ چشم سے جھانکنے تانکنے نہیں جایا کرتا تھا کیا یہاں کی مٹی نے تیرے ان سوئے ہوئے جذبۂ بغاوت و انحراف کے شعلے نہیں ہلائے تھے جو تیرے صلب میں تیرے جد امجد مولانا حشمت علی صاحب سے تجھ کو ملا تھا اور جو تحتی پشت میں جس نے سر اٹھایا تھا - (اس کا کوئی دستاویزی ثبوت تو نہیں ہے البتہ متعدد بزرگوں کی زبانی بڑے رازدارانہ

لہجہ میں سن چکا ہوں۔ اور جس کو ہتک عزت تصوّر کرتے ہوئے بزرگان خاندان ہمیشہ پوشیدہ رکھنا پسند کرتے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ زمانہ ۱۸۵۷ء میں جد امجد کا ایک حکم نامہ ان کے کارندہ کے نام پکڑا گیا جسمیں تحریر تھا "اور باغیان کو اجرت پوری دینا"۔ اس پر موصوف سرکاری حراست میں لے لیے گئے تھے اور وہ وقت قریب تھا کہ پھانسی دیدی جائے مگر چونکہ ان کے بڑے صاحبزادے سید علی احمد صاحب الہ آباد ہائی کورٹ کے بڑے وکیل اور انگریزوں کے پیارے تھے ان کے سمجھانے بجھانے پر کہ یہ لفظ "باغیان" نہیں ہے بلکہ "باغبان" ہے۔ انچارج انگریز فوجی افسر نے ان کی بات مان لی اور موصوف کو حراست سے آزادی ملی جس کو موصوف نے پسند نہ فرمایا تھا اور بہ طیب خاطر گھر واپس لائے گئے تھے۔

بارہ بنکی کے کلچر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اسکے ایک قصبہ رودلی کا کلچر ہے جو لکھنؤ کے کلچر سے بالکل مختلف ہے۔ لکھنؤ کے کلچر میں قدرے تصنع ہے جو ہر مرکزی تہذیب میں ہوتا ہے۔ اور جو بارہ بنکی میں نہ تھا۔ بارہ بنکی کے لوگوں میں اخلاص، گھریلو پن اور بے تکانی بے تکلفی ملتی تھی۔ اس تہذیب کی چند نمائندہ شخصیتیں یہ ہیں جن سے میرا بچپن اور جوانی متاثر ہوئی تھی۔ چودھری محمد علی چیرو، شاہ حیات احمد، جمیل الرحمٰن قدوائی، سیتا رام وکیل، چودھری صاحبان بیار، مصطفیٰ کامل قدوائی، انیس باجی قدوائی اور امجاد بھائی وغیرہ۔ یہ حضرات آپس میں "آیبا، جیبا، کھیبا، اینگھے، ادنگھے" بولتے تھے مگر جب کسی ادبی یا ثقافتی صحبت میں ہوتے تھے تو معیاری لکھنوی زبان میں گفتگو کرتے تھے کہ منھ سے پھول برستے تھے۔ میں نے اپنے وطن کے بعد کسی جگہ کو بہت پسند کیا تو وہ بارہ بنکی تھا اور اب بھی ہے۔

۲۶ء میں بارہ بنکی چھوٹنے کے سالہا سال بعد ۱۹۴۵ء میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس حیدرآباد کے دوران کیفی اعظمی نے مجھ کو بتلایا کہ وہ بارہ بنکی کے زمانہ سے مجھ کو جانتے ہیں وہ اپنے والد بزرگوار فتح حسین صاحب (سربراہ کار بلہرہ) کے ساتھ بلہرہ میں زیر قلعہ رہتے تھے اور مجھ کو برابر وہاں آتے جاتے دیکھتے تھے ملنے کو دل بہت چاہتا تھا مگر کچھ انا روکتی تھی اور کچھ ان کے والد بھی اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیفی سے یہ واقعہ سن کر مجھ کو کتنا صدمہ ہوا کہ میرا ایک ساتھی مجھ سے اس قدر قریب رہ کر اتنا دور تھا اور ۲۰ سال بعد ملا۔ یہ لعنت اس وقت کی نوکر شاہی کی منظر تھی جو افسر کے بچوں کو ماتحت کے بچوں سے ملنے نہیں دیتی تھی اور جب ضرورت ہوتی تھی تو ملتے بھی تھے۔

اس میں ہمارے بزرگوں کا کچھ طبقاتی احساس نامراد بھی شامل تھا۔



۸ر جولائی ۱۹۲۶ء کو میں دہرہ دون اکسپریس سے فیض آباد جا رہا تھا۔ ذہن میں بہت سے جالے اور خاندانی بوڑھا ماحول سے عدم آسودگی کا سر اٹھاتا ہوا اور گھٹن سے دبا ہوا جذبہ لیے ہوئے کھٹملوں سے بھری ہوئی سواری جیسی زندگی کا یہ پہلا موڑ تھا۔ ۹ر جولائی کو گورنمنٹ انٹر کالج فیض آباد کھل گیا۔ اول جماعت F.Sc. اور ہوسٹل میں داخلہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ چند ہی دنوں میں بہت سی پرانی شکلیں نظر آنے لگیں اور بہت سے نئے احباب پیدا ہو گئے۔ مثلاً زین العابدین پسر ماسٹر جواد صاحب، ابن الحسن کلاں پوری اور بھائی مہدی حسن پسر احمد حسن صاحب زمیندار رانی مئو جونپور وغیرہ اور زندگی لطف سے گذرنے لگی۔ پڑھنے لکھنے میں دل تو کم ہی لگتا تھا۔ لہو و لعب سے جو دلچسپی رہی اگر اس کی نصف توجہ نصاب کی کتابوں کی طرف دیتا تو بہت ممکن تھا کہ بابا کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔ ہمارے مضامین کے اساتذہ بھی ماہر اور اچھے معلمین تھے۔ سورج نرائن کچلو انگریزی نثر۔ دت بابو انگریزی نظم۔ خونخوار چہرے بشرے والے فیض بخش ریاضی۔ بھنگ سے چڑھی ہوئی قندیل ایسی آنکھوں والے پنڈت شاما چرن مسرا فزکس، اور بنرجی کیمسٹری کے اساتذہ تھے۔ پنڈت ہریش چند مسرا استاد تاریخ ہمارے ہوسٹل کے وارڈن اور گیمس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور سب کے سب بیحد شریف النفس اور قول و فعل کے سچے لوگ تھے۔ مگر میں اپنی افتاد سے مجبور تھا۔

بہر حال F.Sc. پاس کر کے فیض آباد چھوڑتے تک کچھ تو کرتے ہی رہنا تھا چنانچہ میں نے اپنی تمام صلاحیتیں ہاکی، فٹ بال کے کھیلوں میں لگا دیں اور کالج کی دونوں ٹیموں میں آ گیا۔ باقی اوقات میں جتنی قدیم داستانیں اور سفر نامے دستیاب ہو سکے تقریباً سب پڑھ ڈالے۔ مثلاً ابن بطوطہ، ہیون سانگ اور مارکوپولو وغیرہ۔ کھیل کسرت سے کچھ صحت بھی اچھی ہو گئی تھی اور جسم بھی کچھ نکل آیا تھا۔ اب جوان لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا تھا اور ان سے بے تکلف ہونے کو دل چاہنے لگا تھا۔ مگر کوئی بے نام سی قوت تھی جو اخلاقی مفروضات سے آگے قدم رکھنے سے روک دیتی تھی اور اوائل ۱۹۲۸ء میں یہ رکاوٹ دم توڑنے لگی تھی۔

یوں تو میں دوسرے تیسرے ہفتہ والدین اور بھائی بہنوں سے ملنے بارہ بنکی جاتا ہی رہتا تھا مگر اکتوبر میں حاجی وارث علی شاہ رح کے عرس یعنی دیوہ شریف کے میلے میں چار پانچ دن کے لیے ضرور پہنچ جاتا۔ عرس اور میلے کے ساتھ ضلع نمائش بھی ہوتی تھی۔ نمائش میں جملہ افسران کے خیمے نصب ہوتے تھے۔ وہیں کچہریاں بھی لگتی تھیں۔ ہاکی اور ٹینس کے ٹورنامنٹ بھی ہوتے۔ وہیں میں نے سب سے پہلے احمد حسین کو ٹینس کھیلتے دیکھا تھا۔ ان کے بیک ہینڈ ہاف والی کو کوئی واپس نہ کر سکتا تھا۔ کشتیوں کا دنگل بھی ہوتا تھا جس میں گاما جیسے پہلوان شرکت کرتے تھے۔ مویشیوں کا بازار بھی لگتا تھا اور کل ہند مشاعرہ بھی۔ حاجی صاحب کے مزار پر ملک کے بڑے بڑے قوال آتے تھے جن میں مقامی قوال محرم علی سب کے مقابلہ میں گا کر بڑا نام پیدا کرتا تھا۔ طوائفوں کی بھی محفلیں ہوتی تھیں اور بارہ بنکی کے آفیسرز کلب کی محفل بھی ہوتی تھی جس میں پیشہ ور گانے والیاں اور لڑکیاں اپنے والدین یا شوہروں کے ہمراہ آکر حصہ لیتی تھیں۔ اور مخصوص شائستہ اور مہذب محفلوں میں فن رقص و گلوکاری کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔ بابا کے ساتھ ان محفلوں میں کبھی کبھی میں بھی جایا کرتا تھا۔ اس سال بھی محفل میں وہی قیامت برپا تھی جس کا ذکر کہیں کہیں قصہ کہانیوں میں ملتا ہے۔ بیس بائیس سال کی حشر ساماں ہاہوش ربا بت طناز، دشمن دین آتش زیر پا رقص کر رہی تھی۔ نشست سفید فرش اور گاؤ تکیوں کی تھی۔ بابا اپنے احباب اور ساتھیوں کے پاس اگلی صف میں جا بیٹھے اور میں تین چار صف پیچھے آنے جانے والے راستے کی ڈوری سے لگ کر بیٹھا۔ اس کے رقص میں عجیب دلکش والہانہ پن تھا۔ ہر عضو جسم پردگی کو عبور کر کے عریانی کی سرحد میں آنے کے لیے کوشاں تھا۔ مگر میں شرافت ذاتی اور محفل کے سنجیدہ ماحول سے مجبور تھا۔ ایک سحر تھا جو حرکت میں تھا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا ———————— ایک جنونی کیفیت تھی جس پر قابو پانے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں خاموشی سے اٹھ کر اپنے خیمہ پر واپس چلا آیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدل بدل کے صبح کی۔ صبح پر ابھی سیاہی شب غالب تھی کہ میں بستر چھوڑ کر باہر اس تجسس میں نکلا کہ پتہ لگاؤں کہ وہ کافر ادا کون ہے کہاں سے آئی ہے اور وہ میلے میں کہاں رہتی ہے۔ باہر نکلتے ہی شکاری دوست اکبر میاں چپراسی سے ملاقات ہوئی۔ پورے میلے میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور میرے بے تکلف دوست اکبر میاں بیڑی جلائے تھے۔ صاحب سلامت کے بعد اُن سے سرگوشی کے انداز میں معلوم ہوا کہ رات محفل تین بجے تک جمی رہی

محفل ختم ہونے پر بابا مجھکو پوچھ رہے تھے۔ خیمہ پر آکے مجھکو سوتا ہوا پایا اور خود خیمہ کے بڑے کمرہ میں جاکر سو گئے۔ اب کہیں دس بجے تک جاگیں گے۔ میں نے دریافت کیا "اور وہ رقاصہ"۔ "ارے وہ۔ وہ تو کانپور کے ایک سوداگر کی بے بالک بیٹی ہے۔ کل رات وہ خوب ناچی۔ اس کی چھولداری وہ کیا دکھائی دے رہی ہے پچاس قدم پر۔ دو چھولداریاں ہیں۔ ایک میں اس کے ماں باپ سو رہے ہوں گے اور اس کے بعد والی میں وہ خود۔ بہت تھک گئی تھی"۔ اکبر میاں کی باتیں سنی ان سنی بظاہر برابر کرکے میں ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا۔ اور جب اکبر میاں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں جھٹ اس چھولداری کی جانب مڑ گیا۔

پڑھنے لکھنے میں کس مسخرے کا دل لگتا تھا۔ بارہ بنکی سے فیض آباد کی اس واپسی پر میں ایک بدلی ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ اب میں ایک صحت مند دل و دماغ اور پھرتیلا چست اعضا اور جسم رکھتا تھا۔ گفتگو میں خود اعتمادی آچلی تھی اور میچوں میں کھیل کے بہتر مظاہرے کرنے لگا تھا۔ اوائل ۱۹۲۸ء کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ابن الحسن مجھ کو ہمیشہ مُجّن کہہ کے خطاب کرتے تھے۔ ایک دن بولے کہ "مُجّن چلو آج تم کو گھر کی پکی ہوئی بہت اچھی سوّیاں کھلا لائیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہوسٹل میں رہنے والا طالب علم ہمیشہ اور ہر آن بھوکا رہتا ہے۔ چنانچہ میں چلنے پر فوراً تیار ہو گیا۔ ہوسٹل سے روانہ ہو کر گلاب باڑی سے ملی ہوئی اجودھیا روڈ کے کنارے ایک دو منزلہ مکان کی سیڑھی کے سامنے مجھ کو روک کر ابن الحسن نے دق الباب کیا۔ جواب میں ایک بڈھی خادمہ نے دروازہ کھولا اور ہم لوگ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ اس کا اوپری دروازہ ایک دالان میں کھلتا تھا جس کے بغل میں شمال جانب ایک بڑا کمرہ تھا جس کے تین دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرہ میں سفید چاندنی کا فرش تھا جس پر ایک ایرانی قالین اور چند گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ ایک تکیہ سے لگی ہوئی ۳۵-۴۰ سال عمر اور پکّے رنگ اور قد سے بھرے بھرے جسم کی ایک پُر وقار خاتون ناک میں ہیرے کی کیل پہنے بیٹھی تھیں۔ ابن الحسن نے انکو آداب کیا اور میں نے بھی۔ انھوں نے ہم دونوں کو دعائیں دیں۔ نزدیک بیٹھنے کی دعوت دی اور ابن الحسن سے بولیں کہ بیٹے اب تو تم نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ جب میں نے کئی مرتبہ امجد میاں سے شکایت کی اور سوّیوں کا پیغام بھیجا تب تم آئے ہو۔ ہے سرکار تو اب ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔ اپنی بہن کو دیکھو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میں تو خیر لونڈی ہوں مگر اولاد بہر حال اولاد ہے۔" "اختری اری او اختری آ دیکھ۔ کون آیا ہے۔ چھوٹے بھیّا آئے ہیں۔ اور بیٹے یہ تمھارے دوست کون ہیں؟" "یہ میرے عزیز

دوست اور کلاس فیلو احمد مجتبیٰ ہیں۔ یہ بھی جونپور کے رہنے والے ہیں۔ ان کو آپ کے ہاتھ کی پکائی ہوئی سویاں کھلانے گھسیٹ کے لایا ہوں۔" "اے لو تو تم میں اور ان میں کیا فرق رہا۔ اری او اختری جلدی سے یہاں آ۔ کسی سے پردہ نہیں ہے۔" اس آخری اطلاع پر بغل کے کنارے کے ایک کمرہ کا پردہ سرکا اور ۱۳-۱۴ سال کی چھریرے بدن کی ایک گوری چٹی لڑکی سفید جالی کی اوڑھنی سے سر ڈھانکے سفید چکن کا کرتہ اور پنج پی یا چالیس ہزار چھالٹین کا چوڑی دار پاجامہ پہنے سفید گڈ کا ناگرہ دروازے پر اتارتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی اور ادب سے تسلیم کرکے اپنی ماں سے قدرے سٹ کر بیٹھ گئی۔ کانوں میں ہیرے کی کیلیں تھیں اور ناک میں دو موتیوں اور ایک لالری کی چھوٹی سی نتھ پہنے ہوئی تھی۔ اس کے چند ثانیہ بعد ایک کشتی میں سوئیوں کا ایک بڑا پیالہ ایک پیا! بالائی سے بھرا تھا۔ شیشے کی دو گہری تشتریاں اور چمچ لیے ہوئے بوڑھی خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور ہم لوگوں کے آگے کشتی رکھ کر الٹے پاؤں چلی گئی۔ "اختری تم پنکھا ڈلاؤ اور میں پان بناتی ہوں۔ اور بیٹے تم لوگ سوئیاں نوش کرو۔" ابن الحسن نے کہا "ہم لوگ اکیلے تو نہیں کھائیں گے۔ آپ اور اختری بھی کھالیں تو ہم کھائیں"۔ اختری بولی "اے بھائی جان بس یہ نہ کہئے۔ کل سے ہم لوگ کیا کھا رہے ہیں۔ سوئیاں ہی تو۔ مولا کی سوگند پیٹ میں بالکل جگہ نہیں ہے"۔ "اچھا بھئی لو" اور ہم دونوں سوئیاں کھانے لگے۔ ابن الحسن نے اختری سے دریافت کیا کہ "آج کل کیا پڑھ رہی ہو؟" "اللہ نظر بد سے بچائے ابھی چار پانچ دن ہوئے ہیں کہ قرآن ختم کیا ہے۔ یہ سویاں اسی کی منتی نذر کی ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب روزانہ صبح آکر اردو پڑھاتے ہیں۔ زیادہ تر استادوں کی غزلیں جیسے میر، غالب، داغ اور جگر صاحب وغیرہ۔ سورج ڈوبے استاد لوگ آکر کچھ ٹھمریاں کرجاتے ہیں۔ آخر روزی کیسے چلے گی۔ رہی گھریلو تہذیب اور تربیت اس کی تعلیم میں خود دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہم غریبوں کے پاس کیا ہے۔ انشاء اللہ سرکار کو ہم سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی"۔ اُن خاتون کی یہ تمام باتیں میری سمجھ میں کچھ آرہی تھیں اور کچھ نہیں۔ "اب جب آیا کرنا تو اِن بھیا کو بھی ساتھ لایا کرنا۔ خاندانی شریف زادے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد ہم لوگ رخصت ہوئے اور سیڑھی تک اختری ہم لوگوں کو خدا حافظ کہنے آئی۔ میں جلد از جلد باہر نکل کر ان خاتون کے (Antecedents) (عواقب و تفصیلات) معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ابن الحسن کا بیان تھا "جب میرے والد اب سے ۱۴-۱۵ سال

قبل یہاں سب جج تھے تو انھوں نے چھوٹی مشتری بائی نامی اِن خاتون سے نکاح کر لیا تھا۔ طوائفوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں ایک قسم ڈیرہ دار کہلاتی ہے۔ جو آسودہ حال شرفا راجاؤں مہاراجاؤں اور نوابوں کے حرم میں داخل ہونا پسند کرتی ہیں اور عام طور پر جسم فروشی سے گریز کرتی ہیں۔ چنانچہ اختری میرے والد کی اولاد ہے اور میری بہن ہے"۔ اس کے بعد بھی ابن الحسن اور میں چھوٹی مشتری اور اختری بائی کے کوٹھے پر تبدیل غذا کے لیے آیا جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بہت اصرار پر اختری اپنے تان پورے کے سہارے دو ایک غزلیں بھی سنا دیا کرتی تھی۔ فن اور جوانی کی اٹھان تھی :"شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو"۔

اس سال F.Sc. کے امتحان میں میں تو فیل ہو گیا مگر ابن الحسن فرسٹ ڈویژن میں انٹر کر کے سانڈھرسٹ (انگلستان) ملٹری اکیڈمی میں داخل ہو گئے۔ اس کے برسوں بعد میں نے ان کو دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں نئی دہلی کی نارتھ کورٹ میں لفٹننٹ کرنل کی وردی میں دیکھا تھا اور اختری بائی بحیثیت بیگم اختر سے جگر صاحب کے ساتھ ان کے لال باغ لکھنؤ والے مکان میں ملا تھا۔ بیگم اختر کو فیض آباد میں ہم لوگوں کی طالب علمی کا زمانہ یاد تھا۔

فیض آباد میں گذرے ہوئے زمانہ تعلیم میں یوں تو ملکی سیاست اور دوسرے قومی مسائل پر توجہ کا موقع کم ملتا تھا۔ بالخصوص گورنمنٹ کالج میں تو بالکل سناٹا ہی رہتا تھا البتہ اسی زمانہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے طلبا اور اساتذہ کے ذہن و ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ المیہ اشفاق اللہ خاں کی پھانسی کا تھا جو فیض آباد سنٹرل جیل میں ان کو دی گئی تھی۔ حکومت برطانیہ کے بیشمار مظالم میں سے یہ ایک ظلم تھا جس نے مجھ جیسے بیفکرے کو بھی اشفاق اللہ زندہ باد مہاتما گاندھی زندہ باد، انگریز حکومت مردہ باد، برطانیہ مردہ باد کے نعرے لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور بارہ بنکی کی وہ دبی ہوئی چنگاری پھر چٹخنے لگی تھی۔ اب ریاست بلہرہ بھی واگذار ہو چکی تھی اور بابا ایک ملی رخصت لیکر نیم تعمیر شدہ لال کوٹھی گجگاؤں جونپور میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ کسی تعطیل میں وطن جانا ہوا تو وہاں گول کوٹھی میں ماموں سید علی حماد صاحب اور اس کے شمالی اور مشرقی حصہ میں میرے نانا خان بہادر زین العباد صاحب مرحوم کے برادر خرد حاجی سید علی اصغر صاحب (یعنی حاجی نانا) مقیم تھے۔ حاجی نانا کھانے اور پوشاک کے معاملہ میں، بیحد بلند مذاق رکھتے تھے۔ ان کو ہندوستانی موسیقی

میں بڑا درک تھا۔ ان کے پاس کئی گراموفون اور ریکارڈوں کے لاتعداد البم تھے۔ ان کا ہال کمرہ کٹ گلاس کے برتنوں اور جھاڑ فانوس سے سجا رہتا تھا۔ انواع و اقسام کے سگریٹ کے از حد شوقین تھے۔ ان کے سامنے تخت پر ۵۵۵، ۹۹۹، اسٹیٹ ایکسپریس، تھری کیسل، گولڈ فلیک، کریون اے، عبداللہ، اور دوسرے قیمتی سگریٹوں کے ڈبے رکھے رہتے تھے۔ قینچی اور پیلڈر کی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ تقریباً روزانہ صبح شام میں ان کی خدمت میں حاضری دینے جایا کرتا تھا۔ ایک دن موصوف نے سگریٹ کے کسی ڈبے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "لو تم بھی پیو" میں نے کہا "جی۔ مگر میں ــــ" "مگر وگر کچھ نہیں۔ میں جانتا ہوں آج نہیں تو کل، آگے چل کے پیو گے۔ ضرور پیو گے۔ نوکروں میں بیٹھ کے پیو گے۔ اس سے بہتر ہے کہ میرے ساتھ پیو میرے سامنے پیو"۔ چنانچہ میں دونوں وقت ان کے یہاں جاکر سگریٹ پینے لگا۔ جب تعطیل ختم ہونے کو آئی تو موصوف نے کریون اے کا ایک ڈبہ یہ کہتے ہوئے عطا فرمایا کہ "یہ سب سے ہلکا اور مزیدار برانڈ ہے۔ نئے شائقین کے لیے نہایت مناسب"۔ فیض آباد پہنچ کر میں نے اس ڈبہ کو پچیس دن تک چلایا۔ اس کے بعد بیڑی پینے لگا کہ میرا جیب خرچ سگریٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کتابوں اور کاپیوں سے بچائے ہوئے پیسے بھی ہوسٹل میں خوانچہ والوں کی نذر ہو جایا کرتے تھے مگر میں قرض لینے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ کسی سے نظر نیچی کرکے یا دب کے رہنا میری افتاد طبع کے خلاف تھا۔ سگریٹ چھوڑ کر بیڑی پینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سب سگریٹ اس زمانہ میں برطانیہ سے آتے تھے اور سودیشی تحریک چل چکی تھی مگر ۱۹۲۹ء میں F.Sc. پاس کرنے کے بعد فیض آباد چھوڑتے ہوئے بیڑی بھی چھوڑنا پڑی کہ اس نے کپڑے بہت جلائے تھے۔



گھر میں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ B.Sc. میں کہاں داخلہ لیا جائے۔ الہ آباد، لکھنؤ یا علیگڑھ۔ بابا کا کہنا تھا کہ اگر کسی مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنا ہے تو الہ آباد میں داخلہ لو۔ اگر علم و دانش و ادب و فنون لطیفہ سے دلچسپی ہے تو لکھنؤ سے اچھی کوئی یونیورسٹی نہیں اور اگر کھیل کود اور سیاست میں نام پیدا کرنا ہے تو علی گڑھ جاؤ۔ چونکہ تم کو رڑکی کے مقابلہ میں بیٹھنا ہے اس لیے الہ آباد جاؤ مگر چونکہ وہاں B.Sc. میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے اس لیے لکھنؤ میں B.Sc. کا فارم بھی بھر دو"۔

الہ آباد یونیورسٹی جولائی میں کھلتی تھی اور لکھنؤ یونیورسٹی یکم اگست کو جب الہ آباد میں میرا نام B.Sc. میں داخلہ کی انتظاریہ فہرست میں ڈالدیا گیا تو میں نے بغیر بابا کو اطلاع دیئے ہوئے عارضی طور پر B.A. میں داخلہ لے لیا۔ اسی اثنا میں مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جہاں میرا قیام تھا Introduction Night شب تعارف آ گئی۔ کسی نئے طالب علم کو خبر نہ تھی کہ یہ بلا کب نازل ہونیوالی ہے کہ ۲۷۔۲۸ جولائی کی درمیانی شب میں ۲ بجے تازہ واردان بساط علم پر پانی کے گھڑے اور صراحیاں ٹوٹنے لگیں اور پلنگ اُلٹے جانے لگے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ دس پندرہ منٹ تک پورے ہوسٹل میں بادل پھٹ جانے کا منظر رہا۔ ہوسٹل کیا تھا ایک گھٹا ٹوپ بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد روشنی ہو گئی اور سب نئے لڑکے مویشیوں کی طرح ہنکا کر ہال میں لائے گئے اور ایک ایک کر کے قیدی کا میز پر کھڑا کیا جانے لگا اور اس سے انواع و اقسام کے سوالات کیے جانے لگے اور ہر جواب پر پرانے اہل اقامت گاہ قہقہہ لگاتے تھے اور بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے تھے اور میں اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہوا جا رہا تھا کہ میرا نمبر آ گیا۔ کسی نے سوال کیا اپنا نام بتاؤ۔ میں نے جواب دیا کس جرم میں۔ کسی نے کہا نام بتلاتے ہو کہ نہیں۔ میں نے کہا on point of order پہلے اپنے سوال کو تہذیب کے دائرے میں لائیے یعنی دریافت کیجیے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔ اور آپ حضرات میں کوئی ایک یا دو صاحب چور ہیں جنھوں نے میرے بکس کا تالا کھول کر میری ڈائری چرالی ہے۔ میرا یہ انداز گفتگو ان سب کے لیے نہایت غیر متوقع بات تھی۔ بہر حال جھینپ مٹانے کے لیے سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور دریافت کیا کہ تم کو ہنسنا آتا ہے۔ آتا ہے مگر بے محل نہیں۔ رونا آتا ہے۔ کسی کے حال پر آپ کے حال پر یا اپنے حال پر۔ گانا آتا ہے۔ جی ہاں مگر کوئی سمجھنے والا ہو تب۔ ان دنداں شکن جوابات پر ان میں چند حضرات مجھ سے عملی مذاق کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ انھیں میں سے ایک طویل القامت پھرتیلے بدن اور تقریباً میری ہی عمر کا طالب علم بڑھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مجھ سے تقریباً چھ انچ قد میں اونچا۔ اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ "میاں تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں نے کہا "شیراز ہند جونپور کا" "وہاں کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہو؟" میں نے جواب دیا جس میں بزرگ "حضور" کے لفظ سے خطاب کیے جاتے ہیں اور خرد "آپ اور صاحب" سے۔ "آپ کا اسم گرامی؟" "خاکسار کو احمد مجتبیٰ کہتے ہیں" اور میں نے مزید لقمہ دیا کہ "یہ تو یکطرفہ تعارف ہوا۔ آپ بھی تو اپنا نام نامی ارشاد فرمائیں"۔ "میرا نام محمد اسلم خاں رامپوری ہے" اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ "یار و یہ اصیل ہے۔ چابک اور جمیز

برداشت نہیں کر سکتا ہے"۔ میں نے کہا "خاں صاحب آپ درست فرماتے ہیں۔ ہم اناپرگردن کٹوا سکتے ہیں۔ گردن جھکا نہیں سکتے"۔ اس کے بعد ہال سے نکل کر میں اپنے کمرہ کی جانب چلا گیا۔ ہال میں اور دوں پر کیا گذری مجھ کو علم نہیں۔ غالباً سب کو چھٹی مل گئی کہ ہوسٹل چار پانچ منٹ میں معمول پر آگیا تھا۔ مگر پرانے طلبا سب مجھ سے کھنچے کھنچے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرے دن لکھنؤ سے .B.Sc میں داخلہ کی اطلاع آگئی۔ دوپہر میں سناٹا تھا۔ میں نے روانگی کی تیاری کر لی اور بستر گول کر لیا۔ سہ پہر کو تلاش کرتا ہوا اسلم خاں کے کمرہ پر پہنچ گیا۔ "خاں صاحب اب اجازت دیجئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ لکھنؤ میں .B.Sc میں داخلہ مل گیا ہے۔ آج شب کی ٹرین سے چلا جاؤں گا۔ اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔ خدا حافظ"۔

لکھنؤ پہنچے تو اقامت کے لیے محمود آباد ہوسٹل میں کمرہ ملا۔ زین العباد پسر ماسٹر جواد صاحب بچھرلے افتخار حسین عرف آغا پسر محمد مختار صاحب مچھلی شہری ڈپٹی کلکٹر ملے۔ عبدالرحمن رانجھا ملے۔ اشتیں قطب ملے۔ آنند جوشی (پی سی جوشی کے بھتیجے) ملے۔ اور طیب حسین سیتاپوری ملے۔ ہم لوگ محض نام کے دوست ہی نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے کے لیے بہت ضروری بھی تھے۔ کوئی دیو قامت پہلوان تھا۔ کوئی اوّل درجہ کا طالب علم تھا۔ کوئی اچھا کھلاڑی تھا۔ کوئی Mess یا باورچی خانے کے معاملہ میں اچھا منتظم کوئی لباس پر حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ کوئی مخبری بہت اچھی کرتا تھا تو کوئی بھیس بدلنے میں ماہر تھا۔ غرض کہ جیب کا کوری ڈکیتی کیس کے سلسلہ میں پی۔ سی۔ جوشی کا وارنٹ گرفتاری ہوا تھا تو وہ آنند جوشی کے توسط سے ہمیں لوگوں میں آکر ہفتوں روپوش رہے تھے۔

ادھر یونیورسٹی میں پڑھائی شروع ہوئی اور ادھر اردو کے کلاسیکی ادب کے مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اسی دوران میری شادی بھی ہو گئی اور میں ایک لڑکے کا باپ بھی بن چکا تھا۔ بابا اس وقت لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لکھنؤ سے قربت ہونے کی وجہ سے میں تقریباً ہر ہفتہ لکھیم پور جایا کرتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے یعنی .B.Sc پاس کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک طرف اپنی غیر ذمہ داریوں کا مجرمانہ احساس دوسری طرف مستقبل کا بھوت کھائے جا رہا تھا۔ چنانچہ ہمت کر کے میں نے بوبو کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اپنی نااہلی کے اعتراف کے ساتھ سفارش چاہی کہ .B.A میں داخلہ کی اجازت بابا سے دلوا دیں۔ ماں کا دل تھا پسیج گیا اور مجھ کو از سر نو .B.A کرنے کی اجازت مل گئی۔ انگریزی ادب پروفیسر سدھانت

پروفیسر سرشتا اور ڈاکٹر ہادی پڑھاتے تھے۔ سیاسیات پروفیسر وی کے۔ این۔ مینن، ڈاکٹر اسیرودم اور چودھری سلطان پڑھاتے تھے۔ اردو فارسی مولوی محمد حسین صاحب عرف محمد نواب پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی مسعود حسین صاحب ادیب بھی کلاس لیا کرتے تھے۔ نجی طور پر میں نے احمد علی صاحب سے ملٹن پڑھا تھا جو اپنے زمانے میں انگریزی کے بہترین طالب علم مانے جاتے تھے۔

سائنس کے مقابلہ میں B.A. کا نصاب بہت ہلکا اور ناکافی معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے میرا ذہن اپنے پرانے ڈھرّے پر چل نکلا تھا۔ سب سے پہلے تاریخ انگریزی ادب مولفہ کرامپٹن اینڈ رکیٹ پڑھ ڈالی۔ ابو طاہر داؤد کی ترغیب پر لارڈ لٹن، میری کوریلی، وکٹر ہیوگو، الگزنڈر ڈوما، ڈکنز، ٹامس ہارڈی کے جتنے ناول یونیورسٹی لائبریری میں تھے پڑھ ڈالے اور اس وقت سے آج تک کئی ہزار انگریزی کے ناول اور افسانوں کے مجموعے پڑھ چکا ہوں۔ جن میں فرانسیسی اور روسی ناول کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ مثلاً فلابیر، ایمل زولا، گائی ماپساں، اناتول فرانس، ٹالسٹائے، گورکی اور دستاوسکی وغیرہ۔ اردو میں محمد حسین آزاد، شبلی، حالی، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کی تقریباً جملہ تصانیف کا مطالعہ کیا۔ ابھی چند سال پہلے رینالڈس کی مشہور تصنیف "مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن" جو دس ضخیم جلدوں میں ہے ختم کی ہے۔ فکشن کی کوئی صنف ایسی نہیں جس کی بہترین مثالیں ان جلدوں میں نہ ملتی ہوں۔

ان سب دل بہلاوے کے باوجود خاندانی تضادات اور روایات کی گھٹن، سیاسی اور ثقافتی معاملات میں غیر فیصلہ کن انداز فکر جو ۱۹۲۶ء میں گھر سے لیکر نکلا تھا ۱۹۳۲ء تک مستقل الجھن اور بے مقصد زندگی کا احساس دلاتا رہا تھا۔ کیا مقصد زندگی بس یہی ہے کہ انسان نوکری کرے، تنخواہ لے کھائے پیئے اور مر جائے۔

آب حیات کا متلاشی ظلمات میں سفر کر رہا تھا کہ روشنی کی ہلکی سی ایک کرن نظر آئی اور زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ یعنی چند احباب کی ہمراہی میں مجھ کو پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی جیسا خضر راہ مل گیا۔ ان کی قربت اور محبتوں نے آزادی فکر و نظر کے وہ راستے دکھائے کہ روایات اور ان کے تضادات کی گتھیاں اور بندھن ایک ایک کرکے ٹوٹنے لگے۔ ان کی تعلیمی شخصیت اور ارشادات نے میرے سیاسی سماجی فنی اور جمالیاتی شعور کو وہ جلا بخشی جس کی روشنی میں آج تک کسب ضیاء کر رہا ہوں۔ دھیمی دھیمی آنچ جیسے نرم لہجے میں ان کی عالمانہ گفتگو نے میرے زندان ذہن میں ایسے دریچے کھول دیئے تھے کہ تمام الجھنیں دور ہونے لگیں اور ہر نوعیت کی غلامی کی فصیلوں میں دراڑیں پڑتی دکھائی دینے لگیں۔ ——

موصوف اقتصادیات کے استاد تھے اور جمالیات، فنون لطیفہ اور سیاسیات کے ماہر۔ وہ بڑے قوم پرست اور انقلاب پسند تھے۔ وہ انگریزوں سے کھلم کھلا اظہار نفرت تو نہ کرتے تھے تاہم ملک پر ان کی حکومت کو بالکل پسند نہ کرتے۔ وہ بڑا دردمند دل رکھتے تھے اور انتہائی نرم مزاج ہونے کے باوجود اصول اور نظریات کے معاملہ میں کسی بھی سمجھوتے کو جرم تصور کرتے تھے۔ ان کے جاننے والے ان کو یونانیت کا ایک نمونہ کہتے تھے مگر فی الواقعی وہ شانتی نکیتن کی اُس روح کی نمائندگی کرتے تھے جو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے خوابوں میں رواں دواں رہتی تھی۔ ان کے چہرے بشرے کے گرد آزاد فضا کا ایک کنڈل نظر آتا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب بنّے بھائی سجاد ظہیر ادبی محاذ پر رجعت پسندی اور غلامی سے جنگ کر رہے تھے۔ پنڈت نہرو اور سروجنی نائیڈو کی سرپرستی اور منشی پریم چند کی صدارت میں ۹-۱۰-۱۱ اپریل ۱۹۳۶ کو لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی۔ جب آغا میر کی ڈیوڑھی کے قریب رفاہ عام کلب میں یہ کانفرنس ہوئی تھی تو پروفیسر ڈی۔ پی نے مجھ سے کہا کہ میں اس میں شرکت ضرور کروں۔ اس سے دو سال پہلے باقر ظہیر بنّے بھائی کے چھوٹے بھائی اور میں نے مل کر لکھنؤ یونیورسٹی میں "انگارے" کی دو سو کاپیاں فروخت کی تھیں۔ اس کے کچھ ہی دن بعد افسانوں کا یہ مجموعہ بحق سرکار ضبط ہو گیا تھا۔ فنی اعتبار سے یہ کتاب معیاری تو نہ تھی مگر ترقی پسند ادبی تحریک کی پہلی پیش کش کی حیثیت سے اس نے جدید اذہان کی بڑی رہنمائی کی۔ جب گرو کے کہنے پر میں رفاہ عام کلب پہنچا تو علاوہ ملک کی ہر زبان کے ادیبوں کے کانفرنس میں اردو کے اُن ادیبوں کو میں نے وہاں دیکھا جو ڈائس پر اور اس کے سامنے پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے جن کو میں پہچانتا تھا مثلاً چودھری محمد علی ردولوی، حسرت موہانی، ساغر نظامی، کننگ کالج کے مشہور طالب علم احمد علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم۔ اس کانفرنس کے فیصلوں اور بالخصوص منشی پریم چند کے خطبہ صدارت سے نوجوان ادیبوں کے دل و دماغ میں بجلی دوڑ گئی۔ رجعت پسندی، توہم پرستی اور خوف و ہراس کی زنجیریں ٹوٹ کر رہ گئیں اور اہل قلم کی نظریں فکر و فن کے ایک نئے افق پر رقص کرنے لگیں۔ کاروان ادب اس نئے افق کی جانب نئی امنگوں اور نئے ترانوں کی گونج میں بڑھنے لگا۔ میں محو حیرت تھا کہ یہ لوگ کس قدر خوش بخت اور بہادر ہیں کہ ان کے منہ میں زبان بھی ہے اور ہاتھ میں قلم بھی۔ شعلہ نفس شمشیر بکف۔

جب میرے برادر خورد حسن مجتبیٰ عرف حسنا جوبلی کالج لکھنؤ سے F.A. کر کے B.A. میں داخل ہو گئے تو میں محمود آباد ہوسٹل سے سیوٹ ہوسٹل میں منتقل ہو گیا۔ ہم دونوں بھائیوں کو ۱۰۷ نمبر کا ڈبل کمرہ مل گیا تھا۔

سلمان احمد علی پسر چودھری محمد علی چمرو بھی میوٹ ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان کو دیکھنے کے لیے چودھری صاحب تقریباً ہر پندرھویں بیسویں دن ہوسٹل آیا کرتے تھے۔ موصوف ہم لوگوں سے بیشتر جنسیات کے موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ والدین سے بڑھ کر اولاد کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ فرماتے تھے کہ آدمی کے دل و دماغ اور ذہن کی گندگی اور صفائی دونوں آنکھوں اور چہرے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ داخلی گندگی سے بچنے کے لیے لڑکے لڑکیوں کو آپس میں کھل کے باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کے نتیجہ میں ضروری نہیں کہ جس لڑکی یا جوان عورت سے آپ کی بے تکلفی ہو وہ آپ کی محبوبہ یا داشتہ بھی ہو جائے۔ معاملات اور اذہان ایسی صورت میں صاف ہو سکتے ہیں جیسے بے تکلف ملاقات سے دوستی کا آغاز ہو۔ ذہین اور روشن خیال عورتوں کی تربیت سے مردوں کو ذہنی آسودگی اور انداز فکر کو جلا ملتی ہے۔ اس لیے میرے پیارو جس سے ملو کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے ملا کرو۔ عورتوں سے بلاوجہ شرما کر جو آنکھ چرائے وہ ضرور دل میں شہوانی خواہش کا چور رکھتا ہے اور چھپا ہوا چور پکڑا جاتا ہے"۔

۱۹۳۶ء میں میں ہوسٹل یونین کا سکریٹری بھی ہو گیا تھا۔ میرے ماموں زاد بھائی علی حسین جعفری بن محمد جعفر صاحب اور رانی سوجو پور کے مہدی بھائی جن کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ بھی اسی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان کے اور دوسرے باذوق احباب کے اصرار پر ہوسٹل میں میں نے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا۔ یونین میں ثقافتی کاموں کے لیے فنڈ بھی معقول موجود تھا۔ غالباً دسمبر کا مہینہ تھا اور اچھی خاصی خنکی تھی اس لیے بہت بڑے ہر چہار جانب سے بند پنڈال کا انتظام کیا گیا تھا۔ انگیٹھوں میں دہکتے ہوئے کوئلے اور گرم کشمیری چائے کا اہتمام بھی تھا۔ جن شعرا نے ہماری دعوت سخن قبول کر کے مشاعرہ میں شرکت کی تھی ان کے اسمائے گرامی ہیں بیخود دہلوی، نواب سائل دہلوی، بیخود موہانی، حسرت موہانی، مجذوب، صفی لکھنوی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، وصل بلگرامی، روش صدیقی، آرزو لکھنوی، حکیم آشفتہ لکھنوی، سراج لکھنوی، وزیر لکھنوی، افسر میرٹھی، ثاقب لکھنوی، آسی لکھنوی، شوکت تھانوی اور ظریف لکھنوی۔ اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے رفیع احمد خاں ملیح آبادی جو اس عہد میں اشعار کے سب سے بڑے مقامی مبصر اور فحشیات کے خدائے سخن مانے جاتے تھے تشریف رکھتے تھے۔ جب کسی خلوت میں ان کا تعارف علامہ اقبال سے کرایا گیا تھا تو ان کے ناقابل اشاعت اشعار سن کر علامہ نے فرمایا تھا کہ خیریت ہوئی کہ خاں صاحب اس رنگ میں ڈھل گئے ورنہ اگر سنجیدہ شاعری کی طرف توجہ کرتے تو ہم میں سے بہتوں

کو تاریخ ادب میں جگہ نہ ملی۔

مشاعرے میں دو دور ہوئے تھے۔ پہلا دور طرحی غزلوں کا جو ۹ بجے شب میں شروع ہوا اور گیارہ بجے ختم ہوا۔ چائے کے دور کے بعد غیر طرحی اور فرمائشی کلام کا دور شروع ہوا جو چار بجے صبح تک چلا۔ چونکہ کئی سال سے یونیورسٹی میں کوئی مشاعرہ نہیں ہوا تھا اس لیے طلبا اور اہل شہر سامعین کا بڑا اجتماع تھا۔ سامعین نے جی بھر کے اساتذہ سے ان کی مشہور غزلیں اور نظمیں سنیں۔ مشاعرہ میں جگر صاحب اور جوش صاحب بہت کامیاب رہے اور ان باکمالوں نے ایک سے ایک غزلیں اور ایک سے ایک نظمیں سنائیں۔ جوش صاحب کی تازہ ترین نظم "اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی :. کہ بدمستی بہ از زہد ریائی" بہت پسند کی گئی تھی۔ مشاعرہ ختم ہونے پر مہمانوں کو چائے پیش کر کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بہلایا گیا۔ صبح ہوتے ہی متعدد تانگوں پر رخصت کیا گیا۔ اور جوش صاحب اور جگر صاحب کو روک لیا گیا اور ان کو کمرہ نمبر ۱۰۷ میں سلادیا گیا اور پھر ایک بجے دن کو کھانے کے لیے جگایا گیا۔ کھانے کے بعد چائے کا ایک اور دور ہوا اس کے بعد یونین ہال میں طلبا کی ایک نجی نشست ہوئی جس میں ان مشاہیر سے کئی کئی غزلیں اور کئی کئی نظمیں سنی گئیں۔ شام کو اپنی سواری سے گورکھپور کے رئیس مولوی سبحان اللہ صاحب جوش اور جگر کو تلاش کرتے ہوئے ہمارے ہوسٹل پہنچے۔ ... کی عمر میں اتنا خوب رو انسان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جیسے سبحان اللہ صاحب تھے۔ بقول جوش صاحب کے فضیلت کا وقت قریب تھا اس لیے یہ حضرات ہم طلبا سے رخصت ہو کر رات کو دن بنانے غالباً نادان محل روڈ والے فلیٹ کی طرف چلے گئے۔

ہیوٹ ہوسٹل میں ہولی بڑی زوردار کھیلی جاتی تھی اور جب میں ہوسٹل یونین کا سکریٹری ہوا تھا تو اس سال اور زوردار ہولی کھیلی گئی۔ رنگ کھیلتے کھیلتے جب کچھ تکان محسوس ہونے لگی تو ہم سب لوگ کامن روم میں لے جائے گئے وہاں بے شمار پھل اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں تھالیوں میں میزوں پر سجی ہوئی تھیں۔ میٹھا میری پیدائشی کمزوری رہا ہے۔ اس لیے میں برفی کی ایک پلیٹ پر ڈٹ گیا اور سب ہی نے کچھ نہ کچھ کھایا۔ اب دن کے بارہ بج چکے تھے سب طلبا صاف کپڑے لے کر ہیوٹ ہوسٹل کے بے پردہ غسل خانوں میں چلے گئے۔ میں بھی گیا۔ خوب نہایا۔ جسم سے رنگ چھڑایا اور اپنے کمرہ کا دروازہ بھیڑ کے سو رہا۔ خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان کی طرف اڑے چلے جارہے ہیں اور اکدم وہاں سے گرتے ہیں تو بستر پر دم لیتے ہیں۔ پھر محسوس ہوا کہ چیل کووں کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ پر غائب ہوئے

تو ہم پھر اپنے بستر پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ بڑے بڑے پہلوانوں سے اکھاڑہ ٹنگ ہو رہا ہے اور ہم ہر پہلوان کو شکست دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ چار یا پانچ بجے تک جاری رہا۔ جب عبداللہ نوکر چائے کر آیا تو اس نے میری لال لال آنکھیں دیکھ کر کہا کہ بھیا رنگ کھیلنے میں اتنی برائی نہیں ہے جتنی بھنگ کی ٹھنڈائی پینے میں ہے۔ یہ بہت خراب نشہ ہوتا ہے۔ لوگ اس کو کھا کے پاگل ہو جاتے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن زندگی میں بہت سے مواقع آئے مگر میں نے ٹھنڈائی پینے سے ہمیشہ انکار کیا۔

۱۹۳۴ء میں .B.A پاس کر کے Leads University Scotland سے B. Ed. کرنے کا ارادہ کیا مگر چند نجی وجوہ کی بنا پر یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ایک سال مزید برباد ہوا۔ اب بجز وکالت کا امتحان پاس کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں B.L.L میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں وکالت پاس کر کے لکھنؤ سے نکلا۔ اور احباب سے مذاق مذاق میں کہا کرتا تھا کہ "لو بھئی آخری منزل پر پہنچ کر اس فرسٹ کلاس نے کیرئیر بنا دیا۔ دراں حالیکہ واقعہ یہ ہے کہ عملی پیشہ وکالت میں .L.L.B کا نصاب بمشکل دس فیصد کام آتا ہے۔ ۱۲ سال پر پھیلی ہوئی زندگی کی داستان کا خلاصہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۶ء میں گھر سے انجینئر بننے نکلے تھے اور وکیل بن کر ۱۹۳۷ء میں گھر واپس آ گئے۔

••

چوتھا باب

فیض آباد: وکالت اور آغاز شاعری

وکالت کا امتحان ۱۹۳۷ء میں پاس کرنے کے بعد وکالت کی پریکٹیکل ٹریننگ بابو گنپت سہائے ایڈووکیٹ سلطان پور سے لی۔ بابا کی پوسٹنگ اس زمانہ میں سلطان پور میں تھی۔ بابو جی وہاں کے سب سے بڑے اور اچھے وکیل سمجھے جاتے تھے مگر ان کے یہاں بجائے وکالت کی ٹریننگ کے سیاست کی ٹریننگ زیادہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی رہنمائی میں زور پکڑ رہی تھی۔ مسلم لیگ کانگریس سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ یورپ کے افق سے جنگ کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے۔ ہندوستان میں انگریز حکومت گرفت مضبوط کرنے کے لیے زیادہ سختی سے کام لے رہی تھی اور وطن کے قوم پرست عناصر جیل میں بھیجے جا رہے تھے۔ اس جارحیت کے خلاف بابو گنپت سہائے نے جو انگریزوں کے خاص آدمی تھے بغاوت کا اعلان کر دیا اور ایک بہت بڑے شہری جلوس کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے بنگلہ پر جا کر رائے بہادری کے خطاب کا (citation) سند، خلعت، طلائی تمغہ اور تلوار واپس کر دی اور کانگریس میں شرکت کر کے ستیہ گرہ کرتے ہوئے جیل کے آہنی پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ وکالت کے پیشے میں ان کے کئی شاگرد اور جونیر وکلا تھے جن میں ایک مَیں بھی تھا۔ ہم سب پر بابو جی کے اس اقدام کا بڑا اثر ہوا۔ ایک ہی ماہ کی حراست کے بعد حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ اس کے دو تین ماہ بعد میری ٹریننگ ختم ہو گئی اور وکالت کرنے جنوری ۱۹۳۸ء میں فیض آباد پہنچ گیا جہاں اپنے ایک بزرگ اور عزیز قریب سید علی ضامن صاحب گورنمنٹ پلیڈر یعنی سرکاری وکیل کے بنگلہ پر قیام کر کے وکالت کی واقعی عملی ٹریننگ لینے لگا۔ عرضی دعویٰ، جواب دعویٰ لکھنا، ہزاروں کتابوں میں سے اپنے مطلب کی Rulings یا قانونی نظیریں اور فیصلے نکالنے کی عملی تعلیم لینے لگا۔ ۳ مارچ کو چیف کورٹ لکھنؤ سے اجازت نامہ آ گیا اور میں نے

اپنے بل بوتے پر وکالت شروع کرنے کا نقشہ بنا ڈالا۔ ایک اوسط درجہ کا مکان لب رہگذر، ایک مددگار منشی اور چند ضروری قانونی کتابیں اور قانونی ڈائجسٹ وغیرہ۔ چار چھ دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وکالت کے یہ جملہ عناصر ترکیبی مہیا ہو گئے۔ ہمارے منشی جی تھے بڑے گھسے ہوئے۔ منشی کم دلال زیادہ۔ تنخواہ لینا پسند نہ کرتے تھے۔ انھوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ آمدنی کا چالیس فیصد وہ لیا کریں گے۔ میں نے ان کی یہ شرط بغیر کسی رد و قدح کے فوراً اس لیے قبول کر لی کہ بابا نے سال بھر کے لیے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ وکالت جمانے کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ مکان کے پھاٹک پر وکالت کا بورڈ لگنے کے تیسرے ہی دن منشی جی ایک ۳۲۳ دفعہ تعزیرات ہند کے ملزم کی صفائی کی طرف سے مقدمہ لائے جو تیسری ہی پیشی میں ختم ہو گیا اور میرا موکل رہا ہو گیا۔ اس مقدمہ میں یاد ہے کہ دس روپے پیشی کے حساب سے کل تیس روپے ملے تھے جس میں ہر پیشی میں منشی جی مجھ سے چار روپے لے لیتے۔ کچہری علی ضامن صاحب اپنے ساتھ کار پر لے جاتے تھے۔ اور سہ پہر کو واپس لاتے تھے۔ سال بھر کے اندر اندر وکالت اچھی خاصی چل نکلی اور اب میں نے بابا کو زیر بار کرنا بند کر دیا کہ وکالت کی آمدنی سے خود کفیل ہو گیا تھا۔ زیادہ تر فوجداری کے مقدمے ملتے یا پھر بے دخلی وغیرہ کے مال کے چھوٹے موٹے مقدمے۔ علی ضامن صاحب میرے کام سے بہت خوش رہتے تھے۔ دو سال کے اندر سیشن کے مقدماتِ صفائی ملنے لگے جن میں براہ راست استاد معظم علی ضامن صاحب وکیل سرکاری کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ توقع تھی کہ موصوف کچھ رحم و کرم سے کام لیں گے مگر میری توقع کبھی پوری نہ ہوئی۔ فوجداری اور ڈکیتی وغیرہ کے مقدمے ہوتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اگر مقدمہ میں دس ملزمان ہیں تو بارہ کو سزا ہو جائے یعنی ملزمان کے ساتھ میری اور میرے منشی کی بھی۔ سب پر جرم ثابت کرنے کا کوئی ہتھکنڈہ باقی نہیں رکھتے تھے اس طرف بھی ملزمان کو بری کروانے کی کوشش اور دلیلیں کچھ کم نہ ہوتی تھیں، اور یہ کہ ثبوت کے سب گواہ وکیل سرکار کے بڑھائے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ دو ایک کو سزا ہو جاتی اور باقی سب چھوٹ جاتے تھے اور اس طرح کھانے کمانے کا انتظام بہ سے بہتر ہوتا جا رہا تھا مگر واہ رے زندگی، تیری بوقلمیت کا کوئی جواب نہیں۔ "اچھا اس کو دو وقت اطمینان اور چین سے دو روٹیاں مل رہی ہیں۔ ٹھہرو۔ اس کا دماغ ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں"۔

جیسے جیسے دن گذرتے رہے حلقۂ احباب بڑھتا گیا۔ ڈاکٹر اختر نے بھی ڈاکٹری اسی زمانہ میں شروع کی تھی جب میں نے وکالت۔ دوسری جانب سے حکیم مجے دریابادی اور حکیم ابن تے

حکمت شروع کی۔ حکیم مجےؔ کو میں نے اپنی کوٹھی کا ایک حصہ دیدیا تھا۔ ان دوستوں کے مطب بھی زور و شور سے چلنے لگے۔ میں بھی اپنی بیگم اور چھوٹے بیٹے باقر کو فیض آباد لے آیا۔ بڑے بیٹے شموںؔ کو بابا اور بوبو نے لے لیا تھا۔ دونوں حکیموں کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور آئے دن ان لوگوں کے یہاں خمار بارہ بنکوی، مجروحؔ سلطانپوری آیا کرتے تھے اور خوب شعر و شاعری کی نشستیں رہا کرتی تھیں۔ تیسری جانب سلام مچھلی شہری جو فارسبس ہائی اسکول میں پڑھتے تھے ترقی پسند شاعری کا جھنڈا گاڑے ہوئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پیش کش میں سلام مچھلی شہری کا مجموعہ نظم "میرے نغمے" شائع ہو کر آگیا تھا۔ غرض کہ ملا جلا کر اچھا خاصہ فیض آباد میں ایک ادبی ماحول بن گیا تھا۔ چند مقامی شعرا نے استاد خلیق فیض آبادی کی صدارت میں ایک ادبی انجمن بھی بنائی تھی اور ڈاکٹر قریشی کے مکان پر تقریباً ہر پندرھویں دن طرحی مشاعرہ ہوا کرتا۔ لکھنؤ کے ثقافتی ماحول اور ادبی صحبتوں نے اچھے برے شعر و شاعری کا شعور اور تنقیدی مذاق تو پیدا ہی کر دیا تھا۔ ان مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگا مگر وہاں بالکل فرسودہ قسم کی شاعری ہوتی تھی اور زیادہ تر مقامی شعرا خراب اشعار کہتے تھے۔ جو شعر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس کی بہت تعریف ہوتی تھی۔ چنانچہ تفنن طبع کے طور پر میں نے دو ایک معتبر نوجوانوں کو مہمل اشعار نظم کر کے دینا شروع کر دیئے، مشاعروں میں جن کی خوب تعریفیں ہوتی تھیں۔ جب حکیم مجےؔ کو معلوم ہوا کہ وہ میرے اشعار ہیں تو وہ بے تکلفی کی بنا پر مصر ہوئے کہ دوسروں کو شعر کہہ کر دینا بند کرو اور اپنے اشعار خود پڑھو۔ میں نے بھی سوچا کہ جب مجروحؔ، خمارؔ اور سلامؔ اشعار کہہ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کہہ سکتا۔ اور جنوری ۱۹۴۴ء کے پہلے مشاعرہ میں میں نے ایک طرحی غزل کہہ کر پڑھ ڈالی۔ اتفاق تھا کہ تیر نشانہ پر بیٹھا اور احباب نے اس کو بہت پسند کیا۔ مشاعرہ کے بعد خمارؔ اور مجروحؔ نے سنا اور پسند کیا مگر سلامؔ نے بہت ناک بھوں چڑھائی کہ بھائی صاحب یہ سب بکواس ہے۔ دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ ہم لوگ جنگ آزادی لڑ رہے ہیں اور آپ زلف قافیہ غزل کہہ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا خیر آپ میری اصلاح کرنے کا خیال چھوڑیئے۔ مجھ کو پہلے شعر موزوں کرنے کی مشق کرنے دیجیے آگے دیکھا جائیگا۔ پہلے شیداؔ تخلص کرتا تھا مگر چند ہی ماہ میں ایک ایسے تخلص کا خیال آیا جو ملک میں شاید ہی کسی اور کا ہوگا۔ میں نے وامقؔ تخلص اختیار کیا۔ وامقؔ معنوی اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ اس کے بعد میں نے ماہنامہ "نیا ادب" منگوانا شروع کیا جس میں جوشؔ، مجازؔ، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، مسعود اختر جمال اور سردار جعفری وغیرہ کا کلام اور مجنوں گورکھپوری

احتشام حسین اور دوسرے ترقی پسندوں کے مضامین شایع ہوتے تھے - اس ضمن میں مارکسزم کا بھی مطالعہ ضروری معلوم ہوا - انگریزی میں (Tas capital) تاس کیپٹال کی تلخیص پڑھی مگر علاوہ چند بنیادی باتوں کے Dialectical & Historical metarialism کی تفصیلی بحث اور اس کے نکات زیادہ سمجھ میں نہ آتے تھے (اور جس کو وکالت ترک کرنے کے بعد دہلی میں ۱۹۴۲ء میں مَیں نے ایم - ان - رائے اور ان کی بیوی ایلن رائے سے سمجھا تھا - اسی زمانہ میں ان کی کتاب Histor-ical Roll of Islam شایع ہوئی تھی جس کو پڑھ کر بیحد لطف آیا تھا) -

غرض کہ سال بھر کے اندر اندر غزلوں میں حقیقت نگاری اور مقصدیت کا شائبہ سا آنے لگا اور قرب جوار میں بحیثیت شاعر کے میرا نام لیا جانے لگا اور اواخر ۱۹۴۱ء میں گورکھپور میاں صاحب اسلامیہ کالج کے مشاعرہ کا دعوت نامہ آگیا جس کو حکیم چچا دیکھ کر بہت خوش ہوئے - مشاعرہ غیر طرحی تھا اور جب سلام مچھلی شہری شام کو حسب دستور سگار کا راشن مجھ سے طلب کرنے آئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اس مشاعرہ میں شرکت کر رہے ہیں اور ترقی پسند شعرا کا پورا گروپ اسی میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ سے آ رہا ہے - یہ سنکر دل بلیوں اچھلنے لگا - ایک جنگ آزادی اور دوسری طرف جنگ عالم گیر اپنے شباب میں داخل ہو رہی تھیں - مشاعرہ گورکھپور کے دن کٹنے مشکل ہو رہے تھے - تا آنکہ مشاعرہ کی تاریخ آگئی جس میں سلام اور میں شرکت کرنے گورکھپور پہنچ گئے - مشاعرہ میں مجازؔ، علی سردار جعفری اور مسعود اختر جمال سے پہلی ملاقات ہوئی - بستی سے آئے ہوئے شائقین ادب عدیل عباسی، جلیل عباسی، عبید الرحمٰن اور شفیق بستوی جیسے وطن پرستوں سے مل بیٹھنے کا موقع ملا - جگر صاحب، انگریزی کے استاد مجنوں گورکھپوری، سینٹ اینڈریوز کالج گونڈا کے جوان سال شاعر کرشن چندر حیرت اور فراق گورکھپوری سے بھی ملنا نصیب ہوا - مشاعرہ کا پنڈال میاں صاحب کالج کے برآمدہ سے ملا ہوا تھا جس کے عقب میں خواتین کے لئے چقیں پڑی تھیں - اور سامنے کھلا ہوا دری اور چاندنی کا فرش تھا جس پر ہزار ہا سامعین اور کالجوں کے طلبا جم کے بیٹھے ہوئے تھے - کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر یا منیجر شاکر علی بیرسٹر جن کی عمر ۶۰-۶۵ رہی ہوگی اور جو قدرے ہکلے اور بہرے بھی تھے مشاعرہ کی مسند صدارت پر جلوہ افروز تھے - مشاعرہ ٹھیک ۹ بجے شب میں شروع ہوا - پہلے ۹-۱۰ کالج کے طلبا اور مقامی شعرا نے کلام سنایا جن میں جگر گورکھپوری ہندو شاعر اور ہندی گورکھپوری کا کلام سامعین نے پسند کیا - اس کے بعد

مہمان شعرا کا نمبر تقریباً ۱۱ بجے آیا جس میں مَیں بھی تھا۔ جو غزل میں نے سنائی تھی سب اشعار تو یاد نہیں البتہ مطلع یاد ہے ؎

آہ کی نارسائیاں نہ گئیں　　آسماں تک دہائیاں نہ گئیں

یہ میرا پہلا کل ہند مشاعرہ تھا اور غزل بہت پسند کی گئی تھی جس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ اور ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ غزل نے وہ سماں باندھا تھا کہ میرے بعد دوسروں کی اچھی غزلیں سپاٹ گئیں۔ تقریباً ۱۲ بجے نیم شب کے وقت سلام کو دعوت سخن دی گئی۔ سلام نے اپنی ایک تازہ نظم سنانا شروع کی جس کا عنوان تو یاد نہیں البتہ موضوع یہ تھا کہ گرلس کالج کی بس میں جوان لڑکیاں رنگ برنگے لباس میں بس پردہ سے اپنے ڈوپٹے لہراتی ہوئی اور آدھے دھڑ سے جھانکتی ہوئی جا رہی ہیں اور جوان سال شاعر اس دعوت نظارہ کو پا کر بس (لاری) کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔ نظم قدرے طویل معلوم ہوتی تھی اور ابھی اپنے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچی تھی کہ صدر صاحب نے انتہائی غیظ میں سلام کو نظم سنانے سے روک دیا کہ ان کی بہو بیٹیاں پردہ میں اس مخرب اخلاق نظم کو سن رہی ہوں گی۔ جس کو موصوف پسند نہیں کرتے تھے۔ اور سلام کو رُک جانا پڑا۔ مگر چونکہ زیادہ تر سامعین اور طلبا اسکو دلچسپی سے سُن رہے تھے سامعین نے شور مچانا شروع کیا کہ سلام کی نظم سنیں گے۔ سنیں گے۔ سنیں گے۔ مگر صدر صاحب اپنا فیصلہ واپس لینے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے اور کسی دوسرے شاعر کو پڑھنے کی دعوت دی اس پر تمام طلبا بغاوت پر آمادہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور جن کا سخت مطالبہ تھا کہ جب تک سلام اپنی پوری نظم نہ سنا لیں گے وہ کسی دوسرے کو پڑھنے نہ دیں گے۔ باہر سے آئے ہوئے تمام ترقی پسند شعرا کا بھی یہی مطالبہ تھا کہ سلام کی نظم کے بعد ہی وہ کلام سنائیں گے۔ اور یہ مشاعرہ FISH MARKET (مچھلی بازار) معلوم ہونے لگا اور بیرسٹر شاکر علی کو مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ جب یہ ہڑبونگ رفع دفع ہو گئی تو کالجوں کے طلبا نے مشاعرہ گاہ سے ذرا ہٹ کے ایک ہنگامی جلسہ کیا جسمیں یہ طے پایا اور وہیں اعلان ہوا کہ کل شب میں کالج سے دور ایک ترقی پسند مشاعرہ ہوگا جس کا آغاز سلام مچھلی شہری کو اسی نظم سے ہوگا۔ دوسرے روز دن بھر اس مجوزہ مشاعرہ کا یکوں پر اعلان ہوا۔ اس وقت ہم لوگوں کو مجنوں گورکھپوری کا پورا تعاون حاصل تھا اور انھیں کی قیام گاہ پر ترقی پسند ادیبوں اور تحریک سے دلچسپی رکھنے والے طلبا اور شہریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں گورکھپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کے قیام اور اسکو فعال بنانے کا

اعلان ہوا۔ شب میں اسی انجمن کا مشاعرہ ہوا جس میں بیحد جوش و خروش تھا۔ انقلابی نعرے بھی لگے تھے اور سامعین کی تعداد کالج کے مشاعرہ سے کہیں زیادہ تھی۔ اور جس میں جملہ ترقی پسند شعرا نے اپنا انقلابی یا غیانہ کلام سنایا۔ جو بہت ذوق و شوق سے سنا گیا۔ میرے پلّے ترقی پسند کلام کا کوئی ذخیرہ تو نہ تھا البتہ تحریک میں اپنی شمولیت کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے جو قطعہ میں نے وہاں سنایا وہ یہ تھا:

دریا میں تلاطم برپا ہے کشتی کا فسانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمہیں تنکے کا سہارا کیا معنی
یہ نوحۂ کشتی بند کرو خود موجۂ طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا ساحل کی تمنا کیا معنی

فیض آباد کی واپسی پر میں ایک بالکل بدلی ہوئی امنگوں، خوابوں اور شخصیت کا مالک تھا۔ انھیں ایام میں ایک نہایت پرجوش نظم کہی جس کا مرکزی خیال تھا کہ غلاموں کی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی اور اس کو ایک اسلامی جلسہ میں پڑھ دیا۔ نظم علی اظہر صاحب عرف اچّن کے ہفت روزہ اخبار "اختر" میں شائع ہوئی۔ خفیہ پولیس نے ضلع مجسٹریٹ فیض آباد کے یہاں میرے خلاف رپورٹ لگادی۔ ڈی ایم بابا سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے اردلی کے ذریعہ مجھ کو اپنے گھر پر طلب کیا اور فرمایا کہ تم فوراً فیض آباد چھوڑ دو۔ میں نجی تعلقات کی بنا پر اس معاملہ کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔ مگر میں نے سنی ان سنی برابر کردی اور فیض آباد میں ڈٹا رہا چند ہی دنوں بعد بابا کا حکمنامہ پہنچا وقت نکال کر تم اٹاوہ آجاؤ جہاں موصوف اس وقت کلکٹر ضلع تھے اور میں اسی دن شب میں اٹاوہ کے لیے روانہ ہو کر دوسرے دن وہاں پہنچ گیا اور جیسے ہی میرا تانگہ کوٹھی کی غلام گردش میں پہنچا بابا برآمدہ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی برس پڑے کہ تم عین قمر در عقرب میں یہاں آئے ہو۔ خود بھی گردش میں پڑوگے اور مجھ کو بھی گردش میں ڈالوگے۔ اسی وقت جہاں سے آرہے ہو واپس جاؤ۔ مگر میں بجائے فیض آباد کے جونپور اپنے بڑے ماموں کے پاس وطن چلا گیا۔ اصلیت یہ تھی کہ بابا نجوم کے عالم باعمل تھے اور اس پر راسخ اعتقاد رکھتے تھے۔ اور میں باوجود بابا کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے نجوم کا بالکل قائل نہ تھا۔ میرا ایک زائچہ بابا نے خود بنایا تھا اور ایک دوسرا زائچہ کلکتہ کے ایک بہت بڑے منجم سے بنوایا تھا۔ دونوں زائچوں میں کافی مماثلت تھی اور ستر برس کی عمر یعنی ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۹ء تک پیش آنے والے سوانح کا تفصیلی ذکر تھا اور اختتام اس پیش گوئی پر ہوا تھا کہ اس کے آگے ستارے کچھ نہیں بتلاتے۔ خاموش ہیں۔ مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ میں ستر برس کی عمر تک زندہ رہوں گا مگر

افسوس کہ یہ بالکل غلط ثابت ہوا اور آج ۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۵ر کو زندگی کے ۷۶ سال اور چھ دن پورے کر کے بالکل زندہ ہوں ۔ اپنی سوانح عمری تلمبند کر رہا ہوں ۔ اور اپنے فطری جذبۂ بغاوت پر بابا کی روح سے شرمندہ ہوں ۔

اس قیام وطن کے چند ماہ کے اندر ایک بار فیض آباد گیا اور خاموشی سے قانونی کتابیں اور فرنیچر وغیرہ وکلا احباب میں تقسیم کر کے مکان کو خالی کر کے اور اس کا کرایہ ادا کر کے یعنی پیشۂ وکالت کو خیر باد کہہ کے وطن واپس چلا آیا ۔ اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ۱۹۴۰-۴۱ر میں جتنی مشق سخن کے لیے روایتی قسم کی غزلیں کہی تھیں سب کو تلف کر ڈالا اور ترقی پسند تحریک کی بتلائی ہوئی حقیقت نگاری کی راہ پر اپنا دین و ایمان سمجھ کر گامزن ہو گیا ۔

دہلی : تلاش معاش اور ارباب ادب سے ملاقاتیں

ترک وکالت کے بعد چند دن وطن میں رہا اور بیکاری سے تنگ آکر تلاش معاش میں دہلی چلا آیا ۔ وہاں پہنچ کر یہ علم پختہ ہو گیا کہ جنگ عالمگیر شباب پر ہے مگر دارالسلطنت میں جنگ آزادی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے ۔ آفتاب احمد بلگرامی، جلال ملیح آبادی (جوش کے عزیز قریب) اور یوپی کے دوسرے احباب گول ڈاکخانہ سے ملحق چمریوں میں سے ایک چمری میں رہتے تھے ۔ میں بھی اسی چمری کا ایک ممبر بن گیا ۔ سب Bachelor (غیر شادی شدہ) تھے ۔ میں بھی ان کے ساتھ ہمہ ہونے کی وجہ سے کنواروں کی زندگی بسر کرنے لگا ۔ معمول یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی سب کے سب ناشتہ کر کے دفتروں اور کارخانوں کی طرف نکل جاتے اور میں تنہا رہ جاتا تھا اس لیے میں بھی دہلی کے دفتروں، کارخانوں اور بازاروں کا چکر کاٹنے لگا ۔ سہ پہر کے بعد سب پھر چمری میں مجتمع ہو جاتے اور چار کے ساتھ کچھ کھا پی کر کناٹ پلیس، چاندنی چوک، اردو بازار، جامع مسجد یا پارکوں میں تفریح کیا کرتے تھے ۔ چمری میں بڑے بڑے کمرے تھے اور ہر کمرہ سے منسلک ایک باورچی خانہ ایک اسٹور روم اور ایک جدید طرز کا غسل خانہ مع W.C. (فلش) کے تھا ۔ اور ایک باورچی تھا جو چاء، ناشتہ اور کھانا وغیرہ تیار کر دیا کرتا تھا ۔ ۸-۹ بجے تک ہم لوگ واپس آکر کھانا کھاتے تھے تھوڑی دیر گپ شپ لڑاتے، کچھ پڑھتے لکھتے

اور ۱۱-۱۲ بجے تک بستروں پر خراٹے لینے لگتے تھے۔ میں خراٹے لینے والوں کے قریب نہیں سو سکتا مگر تھوڑی ہی مدت میں خراٹوں کا عادی ہو جانا پڑا۔

ایک شام ہم لوگ کناٹ سرکس کے اندرونی دائرہ کے برآمدہ سے گذر رہے تھے کہ ایک چینی رستوراں نظر آیا۔ چینی ہری چائے کا ذکر سننے اور پڑھنے میں بہت آ رہا تھا۔ ہم لوگ بغیر کسی مشورہ کے اس کے اندر داخل ہو گئے۔ چائے خانہ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ چار پانچ آدمی تھے جو ایک بڑی گول سنگ مرمر کی میز کے گرد دوسری میزوں سے کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ایک چینی بیرا آواز سنکر نمودار ہوا اس سے دریافت کیا گیا کہ چینی ہری نفیس چائے ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو ہم میں سے کسی نے پانچ آدمیوں کے لیے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ چار پانچ منٹ بعد جب وہ اپنی پینٹری کا پردہ ہٹا کر سامنے آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر ایک بڑی سی کشتی تھی اور اسی کشتی کے وسط میں ایک Grand father Tea pot یا بڑے جید سائز کی کیتلی تھی جس کے گرد پانچ بے ہتھی پیالیاں سجی ہوئی تھیں۔ اس کشتی کو وہ بیچ میز پر رکھ کر چلا گیا اور ہم لوگ ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ کسی نے اس سے قبل نہ اتنی بڑی کیتلی دیکھی تھی نہ یہ سر و سامانی۔ چائے کے ساتھ نہ شکر دان نہ دودھ دان اور نہ چمچے نہ چھنا۔ اس خیال سے کہ بیرا شاید یہ لوازمات لا رہا ہوگا ہم لوگ کچھ دیر منتظر رہے۔ جب وہ نہ آیا تو ہم میں سے کسی نے بیرے کو آواز دی۔ آواز سنتے ہی وہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا "یس سر"۔ "ارے جناب بیرے صاحب یہ کیا ہے۔ نہ شکر ہے نہ دودھ ہے اور نہ چمچے وغیرہ"۔ "نہیں شاب یہ بڑا اچھا ٹی ہے۔ اسکو ہمارا ملک میں جو شاب لوگ شنزک پیتا ہے وہی کھانے سکتا ہے"۔ "اچھا تو اس کی قیمت کیا ہے"۔ "اِش پوٹ میں اکیس پیالہ ٹی ہے اور یہ اکیس روپے کا ہے"۔ اس مکالمہ کے بعد وہ بغیر مزید ٹھہرے ہوئے الٹے پاؤں واپس چلا گیا اور ہم لوگوں نے چائے زہر مار کرنے کا فیصلہ کیا۔ پیالیوں میں چائے انڈیلی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ چائے بیحد خوش رنگ تھی۔ اسمیں مختلف زاویوں سے دو رنگ جھلکتے تھے ہلکا سبز اور ہلکا گلابی۔ بس ایک ایک گھونٹ پینے سے معلوم ہو گیا کہ نہایت اچھے گل بنفشہ کی گنید ہے جس میں دو قطرہ بیلے یا چمیلی کا تیل ملا دیا گیا ہے۔ "لاحول ولا قوت"۔ ارے یار و یہ جوشاندہ کس طرح پیا جائیگا۔ "بیرہ" "تھوڑی سی شکر لاؤ"۔ "شاب شکر کا ایک روپیہ اور لگے گا"۔ "ہاں جی معلوم ہے۔ تم شکر لاؤ"۔ "شاب اسی میں دودھ یا شکر نہیں پڑتا ہے"۔ "ہاں ہم کو یہ بھی معلوم ہے۔ مگر تم شکر لاؤ"۔ چنانچہ بیرا واپس گیا اور بیحد خراب منھ بنائے ہوئے شکر لایا۔ ہم لوگوں

نے پیالوں میں ایک ایک چمچ شکر ملا کر جو دوسرا گھونٹ لیا تو اس کا ذائقہ بد سے بدتر ہو گیا۔ "بیرا ٹھیک ہی کہتا تھا"۔ سب نے اپنا پیالہ (SINK) میں دھویا اور متصل ایک ایک پیالہ عرق بنفشہ پیلے میں لیا ہوا یہ سمجھ کر پی ڈالا کہ آغا پیسہ کھا رہا ہے۔ سب نے چار چار روپے اپنے سروں پر نثار کر کے Pool (جمع) کئے۔ جلال کی جیب خالی تھی اس لیے ان کی کمی لوئی قرار پائی۔ بیرے کو بلا کر بائیس روپئے International delicacy (بین الاقوامی لطیف چائے) کی قیمت اور دو روپئے بیرے کو شین قاف کے خون بہا کے طور پر ادا کر کے خالی جیبوں کے ساتھ حجرے واپس آئے۔ راستہ بھر سب خاموش رہے اور مستقر پر پہنچتے ہی وہ زوردار قہقہہ لگایا گیا کہ پورا حجرہ گونج اٹھا اور دوسرے کمروں سے کرایہ دار باہر نکل آئے اور خیریت دریافت کرنے لگے۔ ہم لوگوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم لوگ نشہ میں ہیں۔ کل آپ لوگوں کو پوری داستان سنائیں گے۔ وہ سب اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے مگر جلال ملیح آبادی بگڑ گئے "کہ آپ لوگ نشے کا مذاق اڑاتے ہیں"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ چائے دنیا کے مشروبوں میں سب سے نازک مزاج مشروب ہے۔ اس کا انتخاب اور اس کا Brue (کشید) کرنا مشکل کام ہے جس کی تفصیل کم وقت میں مشکل تر ہے اس لیے فی الوقت محض اس کے استعمال پر روشنی ڈالوں گا۔ سفید لیبل لپٹن اور برطانیہ کی Blend (مخلوط) ریڈ انسائن چائے کے ناپید ہونے کے بعد جتنی چائے کی اقسام میسر ہیں ان میں ہری لیبل لپٹن چائے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ بشرطیکہ اس کو کشید کرتے کے جملہ لوازم روبکار لائے جائیں اور وہ بغیر شکر اور دودھ کے Net (خالص یعنی بغیر کسی نامحرم شئے کی آمیزش کے سِپ کی جائے۔ اس کے لیے اپنے میں صحیح مذاقِ لطیف پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ چائے کی معراج ہے جو بالخصوص ہندوستان میں چائے کے بگڑے ہوئے مذاق سے لگّا نہیں کھاتی۔ دنیا میں علاوہ اپنے برصغیر اور یہاں سے واپس گئے ہوئے انگریزوں کے چائے میں شکر اور بالخصوص دودھ کہیں نہیں استعمال ہوتا۔ دوسرے نمبر پر ہمارے ملک میں چائے کا جو مخلوط "دودھ اور شکر کی آمیزش کو برداشت کر کے اپنا معیار اور وقار قائم رکھے ہوئے ہے وہ نصف ہری لیبل لپٹن اور نصف بُرک بانڈ کی تاج محل کا مخلوط ہے۔ یہ اپنے ذائقہ اور خوشبو کے اعتبار سے ہمارے قومی معیار اور مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ جبکہ خالص ہری لپٹن چائے کی کشید مجبوراً اور صحیح ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف رکھنے والے Connoisseurs (ماہرین) کے لیے غذائے

روحانی بن جاتی ہے۔ اور میرا کیا۔ میں چائے کا عادی ہوں شوقین نہیں۔ دو پیالی چائے صبح اور ایک یا کبھی بہت اچھی بن گئی ہے تو دو پیالی سہ پہر کے وقت مجھ کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ اصرار بیجا و بعد کے دباؤ میں آکر کوئی اور چائے پی لینا دوسری بات ہے ورنہ زیادہ تر احتراز کرتا ہوں۔ ہاں مجھ کو چائے کا ایک اور concoction recipe (یکوان) پسند ہے جسکو عرف عام میں کشمیری زعفرانی گلابی چائے کہتے ہیں جس کا لب سوز، لب دوز، لبریز اور لیدھڑ ہونا ضروری ہے۔ بالائی سے وہ لیدھڑ بنتی ہے جو پی نہیں جاتی بلکہ بطور رغدا کھائی جاتی ہے۔

پہلے خیال تھا کہ یہ چمبریاں چمار ذات کے سرکاری نوکروں یعنی کلاس چار کے لیے بنائی گئیں تھیں مگر یہ خیال غلط نکلا۔ ہر چمبری کے یہ چار چار چھ کمروں کے سوٹ بے تکلف دوستوں یعنی chums (چمس) کے لیے مخصوص تھیں جس میں کنوارے بابو لوگ مل جل کر قیام کرتے تھے اور سرکار کو کرایہ دیتے تھے۔ ہم لوگ بھی اپنے کمرہ میں ایک خاندان کیطرح رہتے تھے۔ کوئی ایک ممبر کوئی منصوبہ بناتا تھا اور سب اس پر بے چون چرا عمل کرتے تھے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جلال نے ایک اتوار کو ہر ممبر سے ڈیڑھ ڈیڑھ روپئے وصول کئے۔ پانچ ملازم کو دیے کہ گول مارکیٹ سے اپنے سامنے کٹوا کر قیمہ لانا اور شامی کباب بنانا ۶-۷ بجے تک تیار ہو جائے اور جو فرائی پین میں انگاروں پر گرم رہے یہ احکامات جاری کر کے اور تیر دانی کندھے پر ڈال کر کسی طرف نکل گئے۔ ہم لوگ بھی تتر بتر ہو گئے اور تقریباً ایک بجے دوپہر کے وقت میں کنونڈ رس میکنم کے کشش لگاتا ہوا کناٹ سرکس کی طرف چلدیا۔ جب اشتہا محسوس ہوئی تو روسی cuisine (پکوانوں) کے رستوراں Volga (والگا) میں داخل ہو گیا اور ایک گوشے کی چھوٹی سی میز سے لگ کر بیٹھ گیا۔ رستوران کھچا کھچ کھانے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فہرست اغذیا میں سب سے ارزاں کھانا Custurd Saled (کسٹرڈ سیلڈ) معلوم ہوا جس کی ایک بڑی پلیٹ کی قیمت صرف ڈھائی روپے تھی۔ آرڈر دیا۔ بیرے نے جب کسٹرڈ سیلڈ سے بھری ہوئی چوڑی دار پلیٹ لاکر مع کانٹے چھری کے سامنے رکھی تو طبیعت خوش ہو گئی۔ کھانے کا لحاظ اور سجاوٹ اس قدر اشتہی تھی کہ کہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس ایک پلیٹ میں جس کا قطر دس انچ کا رہا ہوگا ہلکی ترش کریم کے اندر باہر کیا کیا تھا سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ بے کانٹوں کی مچھلی کے لختے۔ کئی جھینگے۔ ابلے ہوئے انڈے کے تراشے۔ بچھڑے کی پسلیوں کی لانبی لانبی چربی۔ تھوڑے سے چاول۔ مرغ کے نصف سینے کا ایک سفید اور نہایت گلا ہوا ٹکڑا

سلاد اور کسی سفید ترکاری کے چاول جیسے ٹکڑے اور کریم کسٹرڈ میں رائی سوس کی لطیف آمیزش ۔ سب مل جل کر اس قدر لذیذ کہ اس کو بس کام و دہن ہی محسوس کر سکتے تھے ضبط تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔ بیرا بل لایا تو اس کو میں نے بجائے ڈھائی کے چار روپے دیئے ۔ خوش خوش چمری واپس پہنچا اور شام تک تان کر سویا ۔

آنکھ کھلی تو اچھا خاصہ اندھیرا ہو چکا تھا ۔ اور احباب کھانے کی میز اور کرسیوں کو جھاڑ پونچھ رہے تھے میں دوسری کروٹ لے کر پھر اونگھ گیا ۔ آٹھ بجے کے قریب جگایا گیا ۔ میز کے گرد سب ممان چمری بیٹھ چکے تھے ۔ میز کے بیچ میں ایک شمع روشن تھی ۔ ایک بڑے قاب میں رکھے ہوئے کبابوں کی سوندھی سوندھی خوشبو شامہ کو فرحت بخش رہی تھی ۔ اور اشتہا پھر عود کر آئی تھی ۔ ہم لوگوں نے ایک ایک کباب بائیں ہتھیلیوں پر لے لیا اور بڑے حضور قلب اور نزاکت کے ساتھ کلمہ کی انگلیوں سے اس کو چکھنے لگے ۔ پیاس بھی لگ رہی تھی کہ جلال نے خالی شیشے کے گلاسوں میں ایک جگ سے صاف شفاف پانی انڈیل دیا ۔ میں نے پیاس بجھانے اور کباب کو حلق سے نیچے اتارنے کے لیے اس کے دو لمبے گھونٹ لے لیے ۔ پانی میں زیادہ کلورین تو پہلے بھی آتی تھی مگر ان گھونٹوں میں اور زیادہ تلخی کا احساس ہوا ۔ کباب کا مزا چمک اٹھا اور سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ کباب اور زیادہ کھانے کو جی چاہنے لگا چنانچہ آدھی ٹکیہ سے زیادہ جو کباب ہاتھ میں باقی تھا منھ میں بھر لیا ۔ کباب اتنا زیادہ خوش ذائقہ پہلے کبھی نہ لگا تھا اور گلاس میں باقی پانی بھی میں پی گیا ۔ دوسرے چھ مسکیٹرز بھی یہی کچھ کر رہے تھے اور کوئی کسی سے بول نہیں رہا تھا ۔ یہ عمل ہم سب نے تین بار دہرایا ۔ اب نہ قاب میں کباب باقی رہ گئے تھے اور نہ جگ میں پانی ۔ اس کے بعد سب نے اپنے اپنے سگریٹ جلائے اور میں نے اپنا کوینڈس میکسچر ۔ ایک دو کش کے بعد باتیں شروع ہوئیں ۔ کسی نے جلال سے دریافت کیا کہ اماں یہ کہاں سے مل گئی ۔ ملٹری کینٹین سے ارزاں مل گئی ۔ کباب اور Gin (جن) میں ایک دوسرے کے لیے بڑا میلان ہے ۔ جن تو واردان خرابات کے لیے سب سے ہلکی اور ارزاں شراب ہے ۔ اور اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کو پانی کے گلاس میں کھلے عام پی سکتے ہیں " ۔ اور تب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں نے کلورینائڈ پانی نہیں شراب پی ہے ۔ میں نے جلال سے کہا کہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتلایا کہ یہ شراب ہے ۔ جلال نے جواب دیا مجھ کو کیا معلوم کہ تم شراب نہیں پیتے ۔ میرا تو خیال ہے کہ شاعر یا فنکار بغیر شراب پیئے ہوئے کوئی تخلیقی کام کر ہی نہیں سکتا ۔ ایسے فنکار بھی ہیں جو بھنگ کے عادی ہوتے ہیں مگر وہ

سب سے خراب نشہ ہے اور تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ شراب سے بہتر دنیا میں کوئی نشہ نہیں - اور میں خاموش جلال کا تجربہ کاری پر عش عش کرتا رہا -

چند دنوں بعد آفتاب نے مجھ کو M.N.ROY اور ان کی اہلیہ Allen Roy سے ملایا - مارکسزم کا پہلا باقاعدہ سبق میں نے M.N.Roy ہی سے لیا تھا اور انھوں نے مارکسزم پر چھوٹے چھوٹے بہت سے پمفلٹس دیے - اسی زمانہ میں چوری چورا کی عظیم آتش زنی کا واقعہ ہوا جس پر وہ بہت برہم تھے ہٹلر کے خلاف جنگ کے معاملہ میں وہ انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے -

آفتاب اور جلال نے مجھ کو خواجہ محمد شفیع (مٹیا محل) سے ملایا - ان کے گھر کے بالاخانہ پر ہر اتوار کی شام کو بلاناغہ شعری نشست ہوتی تھی - چنانچہ ہم نے بھی وہاں پابندی سے جانا شروع کر دیا - خواجہ صاحب کا شعری اور ادبی مذاق بہت ستھرا تھا - دہلی کی ٹکسالی اردو ان سے بہتر کوئی نہیں بول سکتا تھا - شعرا کا تعارف اور ان کے کلام پر مختصر تنقید بڑی خوش اسلوبی سے وہ خود کیا کرتے تھے اور اس فن میں سر رضا علی (مرادآباد) سے وہ کافی متاثر معلوم ہوتے تھے - تقسیم ملک میں ان کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد یہ کام دہلی میں کنور مہندر سنگھ بیدی نے سنبھال لیا اور بڑی حد تک خواجہ صاحب کی کمی کو پورا کرتے رہے - پھر کچھ مدت گذرنے کے بعد نہ معلوم کن وجوہ کی بنا پر کنور صاحب کا انداز نظامت بالکل بدل گیا - غالباً حالات کے تحت ہر چیز بدل رہی تھی تو ان کا انداز کیوں نہ بدلتا - بجائے شعرا کا مختصر تعارف کلام پر مناسب تبصرے کرنے کے قصے کہانیاں اور چٹکلے سنانے لگے جو بسا اوقات نامناسب اور غیر ضروری گفتگو کا رنگ اختیار کر لیتے تھے - سامعینِ مشاعرہ کو کیا معلوم کہ مشاعرہ کس اخلاقی اور ادبی پستی کی طرف جا رہا ہے - وہ تو اسی کو معیار سمجھنے لگے - ملک کے دوسرے ادیبوں نے جو اپنے اپنے منطقوں میں نظامت کا کام انجام دے رہے تھے یا کرنا چاہتے تھے، آنکھ کھول کر یہ رنگ دیکھا اور سب کے سب اسی رنگ میں ڈھلتے چلے گئے - افسوس کہ بہت اچھے اچھے اور قابل ارباب ادب اس رائج الوقت انحطاط کا شکار ہوئے - اس روش نے بجائے سامعین اور مشاعروں کی اصلاح کرتے، اور بزم شعر و ادب کو باوقار اور ثقافت کا معیار بنانے کے بجائے اس کو اب اس پستی تک پہنچا دیا ہے کہ

اس کا احیا مشکل معلوم ہوتا ہے اور جو سنجیدہ مذاق رکھنے والے صاحب نظر ادبا کے لیے انتہائی مایوسی کا سبب بن گیا ہے۔ میرا تجربہ بتلاتا ہے کہ اگر یہ سب حضرات خود انتقادی اور جرأت سے کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مشاعروں اور بزم شعر و ادب کے وقار اور معیاری حیثیت کی بازیافت نہ ہو سکے۔ ع رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا خواجہ محمد شفیع کے یہاں نشستوں کا۔ یہ وہ نجی ادارہ تھا جہاں شعرائے دہلی اور باہر سے آئے ہوئے ادیبوں میں بیک وقت اور بیک مقام ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ تابشؔ دہلوی، رئیسؔ امروہوی، اختر الایمان، جمیل الدین عالیؔ، منیرؔ جھنجھانوی، سرخوشؔ، آغا قزلباش، مجتبیٰ جارچوی، صابرؔ دہلوی، ماہر القادری، انور صابری، کنور مہندر سنگھ بیدی، زیباؔ ردولوی، اور سید محمد جعفری سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد یہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔

ابھی دہلی آئے ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ بابا کا ایک مفصل خط اور ساتھ ہی ایک بڑی رقم کا بیمہ ملا۔ خط میں حکم تھا کہ "فلاں فلاں اشیا جو یہاں اچھے قسم کی نہیں ملتیں دہلی میں خرید کر ایک ہفتہ کے اندر اندر وطن واپس آجاؤ"۔ معصومہ یعنی میری سب سے چھوٹی بہن کی اختر عباس سے شادی تھی۔ اور میں ضروری خریداری کر کے سات آٹھ دن میں لکھگاؤں پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر جب تقسیم کار ہوئی تو براتیوں کو مناسب جگہوں پر ٹھہرانا اور ان کے آرام کا انتظام میرے سپرد ہوا۔ نام تو میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب الٰہ آبادی سے یہ میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کو میں نے سب سے الگ ایک خیمہ میں ٹھہرایا تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے۔ میں ان کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوا تو اخلاق اور اخلاص کے مجسمہ تھے۔ ایسے بے نفس اور بے تکلف لوگ کہاں ملتے ہیں۔

۱۹۴۲ء کے اختتام پر میں لکھنؤ چلا گیا۔ وہاں مجازؔ، سبط حسن، سعید ماموں، ڈاکٹر رشید جہاں، جوشؔ صاحب، علی عباس حسینی صاحب، نیاز فتحپوری اور ان کے داماد مجد و نیازی سے خوب ملاقاتیں رہتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مجازؔ کی نظم آوارہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جوشؔ صاحب کی نظم "فرزندانِ ایسٹ انڈیا کمپنی سے خطاب" انگریز حکمرانوں کو بوکھلائے ہوئے تھی اور احتشام صاحب کی علمیت قابلیت اور ذہانت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھنے لگا تھا۔ زیادہ شعری نشستیں نشاط سینما کے سامنے ڈاکٹر

رشید جہاں کی قیام گاہ پر ہوا کرتی تھی۔ عجیب و غریب خاتون تھیں۔ شہر بھر کے کمیونسٹوں اور ترقی پسند ادیبوں کی صحت کی ذمہ داری اپنا فرض جانتی تھیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اپنے کو اس کام کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ہاتھوں میں شفا بھی تھی، سرتاپا محبت اور مجسمہ قربانی۔ اور اگر کسی ادیب یا کامریڈ کی کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر بگڑ جائیں تو آگ بگولا۔ ہم جیسے نو واردانِ تحریک کی تربیت اور ہمت افزائی کو اپنا فرضِ اولیں سمجھتی تھیں۔ مختصر یہ کہ کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند تحریک پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔ انھیں کے یہاں کی نشستوں میں مجھ کو وثوق سے یہ بھی علم ہوا کہ ایم این رائے کی سازباز حکومت برطانیہ سے ہے اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ان کو Renegade یعنی اشتراکیت کا مرتد تصور کرتی تھی۔ (دہلی کے دوسرے سفر میں یہ افواہیں غلط نہیں ثابت ہوئیں)۔

تحریک کے سلسلہ میں بہت سے کام کیے اور بیکاری کا غم کھائے جا رہا تھا تو چند ہفتوں کے لیے میں افتخار حسین (آغا) کے پاس جھانسی چلا گیا اور بندیل کھنڈ کے جنگلات میں خوب شکار کھیلا۔ وہاں کی جنگلی قومیں بھی بندیلا راجپوتوں کی طرح۔ بیحد اکھڑ، مہمان نواز اور جفاکش تھیں اور جو شکار کے معاملہ میں کافی مددگار ثابت ہوتی تھیں۔

وہاں سے گوالیار اور آگرہ ہوتا ہوا میں پھر دلی پہنچ گیا۔ اس بار میں جعفری میں نہیں ٹھہرا تھا۔ محمد جعفری بہت خوش ہوئے جب میں ان کے سرکاری مکان منٹو روڈ میں اپنے بستر اور اٹیچی سمیت داخل ہوا۔ جعفری عربی کے ایم اے اپنی گفت و شنید اور طنزیہ شاعری کے لیے بڑے صاحب طرز مانے جاتے تھے۔ دہلی کے اس سفر میں میری ملاقات الہ آباد کے تین انتہائی ذہین ترقی پسندوں سے ہوئی۔ سردار حسین، محمد اشرف اور احمر (The red) — جعفری حکومت کے محکمہ اطلاعات میں افسر اطلاعات تھے اور یہ تینوں کامریڈ اسی محکمہ میں معاونین کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ دہلی میں میرے علاوہ کوئی بیکار دکھائی نہیں دیتا تھا شاید اس لیے کہ مجھ کو نوکری حاصل کرنے کا گر نہیں آتا تھا۔

جنگ عالمگیر اپنے پورے شباب پر تھی۔ جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا تھا اور امریکہ اپنی پوری طاقت، ذرائع اور وسائل کے ساتھ اتحادیوں میں شامل ہو چکا تھا۔ مشرقی محاذ پر جاپان، برما فتح کر کے ہندوستان کی سرحد بنگال اور آسام پر حملے کر رہا تھا۔ دونوں محاذوں پر لاتعداد جانیں جا رہی تھیں اور لامحدود انسانی محنت کی کمائی دھواں بن بن کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اور ہندوستان جنگ آزادی

کے آخری مورچہ تک پہنچ چکا تھا۔ دہلی میں جیپیں دوڑنے لگی تھیں اور امریکی سپاہی "ڈیم جی" کے نام سے مشہور ہو رہا تھا۔ تانگے والے امریکی سپاہیوں اور ویکانیئر کے انتظار میں پہروں کھڑے رہتے تھے اور ہندوستانیوں کی سواری نہیں لیتے تھے۔ کناٹ پلیس سے دریا گنج تک کا کرایہ جب تانگے والا "یانکی" سے پچیس روپے طلب کرتا تھا تو وہ اس کو دس دس روپیوں کے تین نوٹ دیتے ہوئے کہتا تھا ڈیم چیپ" چنانچہ ہر تانگہ والا ہر یانکی کو "ڈیم چی" کہنے لگا تھا۔

اب ہمارے پاس فاشزم کے خلاف اور ملک کی آزادی کے علاوہ کوئی موضوع سخن نہ تھا۔ دن بھر اخبار پڑھتے تھے اشعار کہتے تھے اور دہلی میں مقیم ادیبوں سے ملتے رہتے تھے۔ کبھی اختر الایمان کے ساتھ میراجی اور مختار صدیقی سے ملنے چلے جاتے۔ کبھی پروفیسر احمد علی سے ملاقات ہوتی، کبھی ریڈیو اسٹیشن پرن۔ م راشد اور پطرس بخاری سے ملتے۔ کبھی کبھی شام کی یادگار نشستیں ہو جاتی تھیں اور مختلف ادبی مسائل پر بحثیں اور تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے "رات کے دو بجے" اور "زویا تانیا" نظمیں لکھی تھیں۔ اور محمد اشرف نے ایک تنقیدی مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "اردو دواوین کے دیباچے" جس پر پنجابی ادبا بہت چیں بر جبیں ہوئے تھے۔ محمد جعفری نے "آزاد نظم" پر ایک طنزیہ نظم لکھی تھی جس کے یہ دو مصرعے بہت مشہور ہوئے تھے۔

"ایک مصرع فیل بے زنجیر کی زندہ مثال
دوسرا اشتر کی دُم"

اور ان دو مصرعوں سے آزاد نظم کی ضرورت اور جواز ثابت ہوتے تھے۔ جب میں نے یہ نکتہ محمد جعفری سے بیان کیا تھا تو وہ کہنے لگے کہ واحق پیارے کہتے تو ٹھیک ہو، جادو سر پر چڑھ کے بولا ہے۔

دہلی کے چند دلچسپ واقعات اور تجربات

پہلا واقعہ دہلی میں روزی کی تلاش تو تھی ہی کہ اپنے ایک دیرینہ لکھنؤ کے ہم جماعت مقبول الرحیم سے راہ چلتے ملاقات ہو گئی۔ مقبول میرا بہت سید ھا اور مخلص دوست تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا ڈنڈے بجا رہا ہوں۔ تو اس نے کہا یہ کیا بات ہوئی، مجھ کو دیکھو میں اس وقت گھر بیٹھے ہزار پندرہ سو ماہوار کما لیتا ہوں، دو تین برس

شروع میں محنت اور دوڑ دھوپ کی اور اب بڑے آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔" ارے بھئی تو وہ جادو کی لکڑی ہم کو بھی دیدو۔ آخر تم کر کیا رہے ہو۔" "پہلے سن لائف انشورنس کمپنی کناڈا کا ایجنٹ تھا اب دہلی میرٹھ حلقہ کا انسپکٹر ہوں۔ آؤ تم کو اپنے زونل سپرنٹنڈنٹ سے ملاؤں۔ بہت معقول اور خاندانی سکھ ہیں۔ کناٹ سرکس کے ایک فلیٹ میں ہم لوگ پہنچے تو واقعی ایک انتہائی نیک خندان اور خلیق انسان سے ملاقات ہوئی۔ مقبول نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ اور مجھ کو ایجنٹ مقرر کرنے کی اُن سے استدعا کی۔ جس کو سردار صاحب نے بخوشی منظور کیا اور مجھ کو Agency Authorizaton (مجاز نمائندگی) دیتے ہوئے ایک نئے چمڑے کے پورٹ فولیو میں بیمے کا جملہ لٹریچر اور فارم وغیرہ دیا اور کہا کہ آج ہی سے یہ کام شروع کر دیجئے۔ مقبول صاحب ان کو تانگے پر کنٹونمنٹ کی انگریز بیرکس کی طرف لے جائیے۔ بالکل تازہ ولایت سے نئے نئے چھوکرے سیکنڈ لفٹننٹ ہو کر آئے ہیں اور ایک ماہ کے اندر اندر برما فرنٹ پر بھیج دیئے جائیں گے، اگر ایک مہینہ میں ان انگریز چھوکروں کی دس بارہ ایک ایک لاکھ کی پالیسیاں انکو مل گئیں تو بہت اچھی شروعات جانئے، بس ان جنگلیوں کو مناسب طور پر ہینڈل کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلے سردار صاحب نے ناشتہ کا حکم دیا اور جب ہم تینوں افراد ناشتہ کر چکے تو انھوں نے اپنے پہاڑی نوکر سے چھاؤنی کے لیے ایک تانگہ رکوانے کو کہا۔ تانگہ آنے پر ہم لوگوں کو انھوں نے خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ تانگہ والے نے گھوڑے کو ہلکا سا چابک لگاتے ہوئے کہا "چل غازی مرد ڈپٹی صاحب کی طرف" اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ میں ہماری سواری انگریزی بیرکوں کے پاس پہنچ گئی۔ تانگے والے کو انتظار کرنے کو کہتے ہوئے مقبول الرحیم اور میں ان کے پیچھے تیر کی طرح پہلی ہی بیرک کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ ہم دونوں سوٹ میں تھے۔ مقبول پھدک پھدک کر چلنے کے عادی تھے۔ اس بیرک کے سب دروازے بند تھے۔ اسی طرح ہم لوگوں نے تین چار بیرکیں بند پائیں۔ پانچویں بیرک کا ایک کواڑ کھلا ہوا ملا۔ جس میں ایک گورا چھوکرا نیم برہنہ صرف ایک نیکر میں ہم لوگوں کی جانب پشت کئے ہوئے دیوار سے آویزاں ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑا شیو کر رہا تھا۔

مقبول الرحیم نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے دروازے کو تین بار تھپتھپایا اور بغیر دوسری جانب سے کوئی جواب پائے ہوئے کمرے میں گڈ مارننگ لفٹننٹ کہتے ہوئے داخل ہو گئے۔ دوسری طرف سے ایک ڈانٹ سنائی دی "دوٹ ڈوئی وونٹ۔ فک اوف۔ تھن ڈوئن" مگر مقبول کب کسی کی

سننے والے تھے بولے کہ "لفٹننٹ سر۔ آئی ہیو کم ٹو ہیلپ یو"۔ "ای ہیلپ می وویٹ" اور یہ کہتے ہوئے وہ چوٹ کھائے ہوئے گلدار کی طرح گھوم پڑا اور قریب تھا کہ داہنے ہاتھ میں استرا لئے بائیں مٹھی سے ایک سوئنگ دے کہ مقبول پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگے۔ مقبول آگے آگے اور پیچھے وہ "یو بلڈی ویٹ ای وونٹ ہیلپ یو۔ سٹوپ" مگر مقبول رُکے نہیں۔ میں پہلے ہی برآمدہ سے گریلوں پر کود چکا تھا کہ وہ میرے پاس آکر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے فرنگنی پنیا کی جھاڑی کو پھلانگتے ہوئے سڑک پر آگئے اور وہ گورا کمرہ کے دروازے سے ناقابل تحریر مادری زبان میں بولتا اور گھونسے دکھلاتا رہا۔ میں نے مقبول سے کہا۔ آؤ یار واپس چلیں۔ مقبول نے کہا "واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اس پیشے میں اس طرح کے ایکسیڈنٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میرٹھ چھاؤنی میں میں نے بڑے بڑے افسروں کا بیمہ کیا ہے آؤ آگے چلیں دوسری بیرک دیکھیں"۔ میں نے خیال کیا ممکن ہے مقبول ٹھیک ہی کہتے ہوں گے آگے چل کر دیکھیں کیا ہوتا ہے یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ چنانچہ ہم لوگ کچھ دور چل کے دوسری بیرک میں داخل ہوئے۔ بیرک کے سات آٹھ بند دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک کھلے دروازے کے سامنے رُکے۔ مقبول الرحیم نے ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑے ہوکر اپنی پینٹ اونچی کی۔ پیٹی کسی۔ ٹائی درست کی۔ کوٹ کا کوٹ فلیپ جھٹکا اور جیب سے سرخ ریشمی رومال نکال کر چہرہ کا پسینہ پونچھا اور ایک لمبا سانس لیکر کھلے دروازے کے سامنے پہنچ گئے اور میں بھی ان کے پیچھے۔ اندر کمرے میں ایک دوسرا جنٹلمین کیڈٹ ڈک چیر پر ننگی ٹانگیں پھیلائے ہوئے انگریزی کا کوئی اخبار پڑھ رہا تھا جس میں اس کا چہرہ بالکل چھپا ہوا تھا کہ مقبول نے کھنکھار کے اپنا گلا صاف کیا اور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اس نے چہرے سے اخبار ہٹا کر ہم لوگ کو غیر یقینی اور مشکوک نظر غلط انداز سے دیکھا اور غرایا "ہو یو۔ وٹ ڈو ئی وونٹ"۔ مقبول نے بغیر ایک لمحہ انتظار کئے ہوئے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا "(brave) بریو کیپٹن سر۔ وی آر لائف انشیورنس ایجنٹس آف کناڈا" اس نے پھر غرا کر کہا "یو بلڈی فکن باسٹرڈ فرام کینیڈا۔ یو سن اف اے بچ فکن جیٹ۔ بی گوئنگ انڈگٹ آوٹ اور آئی کک اٹ یور پوسٹریر ڈ وای لسن" مقبول نے کہا "بٹ سر..." بس اتنا ہی وہ کہہ پائے تھے کہ اس نے اخبار کا گولا بنا کر کھینچ مارا اور کھڑا ہوکر دونوں مٹھیاں بھینچے ہوئے تیزی سے باہر جھپٹنے ہی والا تھا کہ میں آگے اور مقبول اور انسپکٹرس لائف انشیورنس کمپنی اوف کناڈا نے میرے پیچھے سرپٹ بھاگنا شروع کردیا اور وہ بھنا۔

ہوا گورا ہم دونوں کے پیچھے مگر چونکہ ہم لوگ جوتے پہنے ہوئے تھے اور وہ ننگے پاؤں تھا تیز دوڑ نہ پا رہا تھا۔ اس وقت ہم لوگ تانگہ کے پڑاؤ سے تقریباً ایک فرلانگ کھلی سڑک پر تھے۔ وہ پہلا گورا بھی ہم لوگوں اور اپنے ایک ساتھی کو پیچھا کرتے ہوئے دیکھ کر جھاڑیاں کو پھاند کر پیچھے ہولیا۔ قریب تھا کہ یہ دونوں ہم لوگوں کو جالیں ہم لوگ پڑاؤ کے نزدیک جاکر چھاؤنی کی سرحد پار کر چکے تھے۔ اور گوروں کو اس سرحد کے باہر جانے کی اجازت نہ تھی چنانچہ وہ دونوں پھاٹک پر دیر تک گھونسے دکھاتے اور گھونسے بازی کی دعوت دیتے رہے۔ ہم لوگوں نے اپنے تانگے کے قریب پہنچ کر لمبا سانس لیا۔ تانگے اور چار سگریٹ کی دوکان والے ہکا بکا تھے اور ہم رومال سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ میں نے دو پیالی چار بنوائی جسے پی کر اور ایک ایک سگریٹ جلاکر ہم دونوں تانگے پر بیٹھ گئے اور تانگے والے کو جلد از جلد کناٹ سرکس چلنے کا حکم دیا۔ مگر ایسی میں گھوڑے کی رفتار بہت سست تھی اور تانگے والا بھی بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ غالباً سوچ رہا تھا کہ کوئی سخت حادثہ ہوگیا ہے۔ جب سردار صاحب کے فلیٹ میں پہنچے تو وہ اپنی میز پر بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ کہئے صاحبو۔ ہمارے لئے کیا لائے۔ قبل اس کے کہ مقبول الرحیم کچھ بولیں میں نے کہا کہ جناب میرا استعفیٰ قبول فرمائیے یہ پیشہ میرے بس کا نہیں اور ان کو شروع سے آخر تک پوری داستان نا فرجام سنائی۔ جس پر وہ قہقہہ مار کر کہنے لگے۔ "کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ اس پیشہ میں شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ قدرے صبر سے کام لیجئے۔ کچھ مدت بعد کامیابی ضرور ہوگی۔" میں نے کہا صاحب مجھ کو تو اس کامیابی سے معاف رکھئے۔ آپ کی توجہ اور مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ، خدا حافظ۔

دوسرا واقعہ

مجاز بھی تلاش معاش میں لکھنؤ سے دہلی آچکے تھے اور ہر روز شام کو چلہ ترقی پسند اور پنجاب کے ارباب ذوق کی کہیں نہ کہیں نشستیں، مباحثے، شعر و شاعری اور دوسرے مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایک شام جب ہم سب جمع ہوئے جس میں پطرس بخاری، نون۔ میم۔ راشد، مختار صدیقی، محمد جعفری اور مجاز وغیرہ تھے۔ اردو زبان کے تلفظ پر بات چیت اور نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں مجاز نے یہ تجویز پیش کی کہ آج دوران گفتگو جس سے تلفظ کی کوئی غلطی سرزد ہوگی اس کو ناک میں بتی ڈال کر پانچ دفعہ چھینکنا پڑے گا یا اپنے اوپر گذرا ہوا کوئی دلچسپ واقعہ سنانا پڑے گا۔ اس پر پطرس بخاری نے کہا کہ یہ

تو غلط بات ہے اگر کسی کو چھینک نہ آتی ہو اور کوئی ایسا واقعہ بھی نہ یاد ہو تو وہ کیا کرے گا۔ مجاز نے چھوٹتے ہی مطالبہ کیا تو پھر آپ ہی سے اس کا تجربہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ آپ سے بڑی بھیانک تلفظ کی غلطی ہو گئی ہے۔ آپ نے غَلَط کو غلْط کہا ہے۔ اس پر زوردار قہقہہ لگا اور پطرس سوچ میں پڑ گئے کہ غلطی تو واقعی ہو گئی ہے۔ مجاز نے کہا کہ اچھا جلدی سے رومال نکال کر بتی بنائیے تاکہ جلسے کی کارروائی آگے بڑھے۔ پطرس نے کہا مجھ کو چھینکنے کا یہ فن تو آتا نہیں اس لیے آپ حضرات ایک دلچسپ واقعہ سن لیں ـــــــ کچھ پہلے کا واقعہ ہے کہ مجاز گھومتے گھامتے لہور پہنچے۔ مجاز نے پھر ٹوکا یہ دوسری غلطی ہے۔ لاہور کو آپ لہوّر کہہ رہے ہیں۔ پطرس بھی کم ذہین آدمی نہ تھے انھوں نے کہا جی نہیں ہماری مادری زبان میں لاہور کو لہوّر ہی کہتے ہیں۔ مجاز نے کہا خیر معاف کیا آپ کی مادری زبان تو پنجابی ہے۔ ہاں وہ قصہ سنائیے جس کا میں ہیرو ہوں۔ اور پطرس قدرے سنبھل کر بولنے لگے۔ "ہم سب ان کو وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ہمارے امکان میں جو ہو سکتا تھا ان کی خاطر کی۔ اور طے پایا کہ ان کو لاہور کی خوب سیر کرائی جائے۔ ہر مشہور بازار میں گھمایا جائے اور مشہور تاریخی مقامات دکھلائے جائیں۔ دن بھر سیر کرنے اور قابلِ ذکر مقامات دکھلانے کے بعد تھکے تھکائے گھر واپس آئے۔ کھانا کھایا گیا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا کہ مجاز صاحب لاہور کیسا لگا تو انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے کہا کہ واقعی لاہور بہت ہی خوبصورت اور قابلِ دید جگہ ہے مگر یہاں پنجابی بہت ہیں۔" اس جملہ پر سب لوگ بہت ہنسے۔ ن۔م۔ راشد بولے "ہے کوئی جواب اس کا"۔ مجاز نے کہا جی ہاں جواب تو کوئی نہیں ہے۔ ہمارے اطراف میں یعنی لکھنؤ میں عام طور پر لوگ ہر پنجابی کو بجر یعنی اکھڑ دیہاتی سمجھتے ہیں اور زبان کے معاملے میں تو بالکل غیر مستند جانتے ہیں۔ آل رضا کا بہت مشہور شعر ہے جو انھوں نے کہہ کے اپنے کسی شاگرد کو دیدیا تھا ؎

زباں داں اور ہوں گے ہم تو پنجابی رسالے میں
کھوا اردو کو چت کردیں کھوا اردو کو پٹ کردیں

سمجھ میں نہیں آتا کہ تلفظ بدلتے یا غلط ہوتے سے لفظ کا وزنِ شعری بدل جاتا ہے۔ مگر جب پنجابی شعرا شعر کہتے ہیں تو ان میں الفاظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حضرات بولتے ہیں پنجابی اردو اور نظم کہتے ہیں عروضی زبان میں۔

تیسرا واقعہ

میں بچپن ہی سے کان کی تکلیفوں کا مریض رہا ہوں۔ زیادہ تر درد کا شکار ہوا کرتا۔ دنیا کا کوئی

مرض نہیں جس دیہاتی علاج نہ ہو اور اس پر مستزاد یہ کہ جتنے منھ اتنے علاج - مگر مجھ کو اسپتال جا کر ہمیشہ آرام ہوا۔ Tincture opic (عقطر افیون) سے زیادہ تر میرے کان کو آرام ملا ہے۔ اسی قسم کی تکلیف دہلی کے قیام میں ایک مدت کے بعد ہوئی اور درد کا دورہ سخت تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی منٹو برج کے شمال مغرب جانب بہت اچھا ریلوے کا اسپتال ہے جس میں Out Door (باہری) مریضوں کا بھی علاج ہوتا ہے۔ جب میں وہاں کے E.N.T شعبہ میں پہنچا تو ہمارے ایسے مریضوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مریضوں کے اس جم غفیر کو دیکھ کر ایسا اعصابی جھٹکا لگا کہ میں دیوار سے لگا لگا کمرہ کے فرش پر Sink ڈھیر ہو گیا۔ جب درد کا احساس کم ہوا اور اعصاب کو آرام محسوس ہوا تو میں نے آنکھیں کھولیں اور ایک مسکراتے ہوئے حسین چہرے کو بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا پایا۔ "اے تم یہاں کہاں؟ تم کو تو ابھی چند ماہ ہوئے جھانسی کے فوجی اسپتال میں دیکھا تھا۔" "ہاں جی M.B.B.S. کرنے کے بعد وہاں ٹریننگ میں تھی۔ ٹریننگ ختم کرنے کے بعد یہاں میں سال بھر کے لئے پروبیشن پر ہوں۔" "تمہارا چھوٹا والا نام ڈاکٹر جے۔ پی۔ ہے نا؟" "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ آپ نے میرا نام بہت یاد رکھا۔" "اچھا یہ بتاؤ کہ میں اس کمرہ میں اس بستر پر اور تمہاری نگرانی میں کیسے آ گیا؟" "بس اس کو اتفاق ہی کہنا چاہیے۔ میں اب سے تقریباً دو گھنٹہ پہلے کسی کام سے E.N.T. میں گئی تو آپ کو زمین پر چرمرا دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان گئی کہ یہ وہی آغا کے دوست شاعر صاحب ہیں۔ آپ کسی درد سے کراہ رہے تھے۔ اس لیے قریب والی سرجیکل ڈسپنسری سے دوڑ کر میں مارفیا کا انجکشن لائی اور آپ کو لگا دیا۔ فوراً ہی کراہ وغیرہ بند ہو گئی اور اسٹریچر پر اٹھوا کر اپنے معائنہ کے کمرے میں لے آئی۔ اس وقت سے انتظار کر رہی ہوں کہ آپ ہوش میں آئیں تو آپ کی تکلیف معلوم کروں۔" "تکلیف کیا کان میں سخت درد تھا جو کچھ دیر کے لیے رک گیا تھا اور اب پھر شروع ہو رہا ہے۔" "ٹھیک ہے" کہتی ہوئی سفید ساڑی، سفید ہلکا کوٹ، نیلی بلٹ اور بالوں کے جوڑوں کے گرد سفید رنگ کی چنی ہوئی بیل میں یہ فرشتۂ رحمت باہر گئی اور تقریباً دس منٹ بعد ایک Ambulance Chair لیے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی اور بولی "۱۲ بج چکے ہیں۔ کھانے کا وقت بھی قریب ہے۔ ہمارا کوارٹر بھی اسپتال کے باہر بالکل ملا ہوا ہے۔ ضروری دوائیں بھی پرس میں رکھی ہیں۔ اب آپ اس پہیے دار کرسی پر آ جائیے۔ پانچ منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں"۔ میں نے کہا "یہ کرسی ورسی رہنے دو۔ ہیں تھوڑی دور تو

اپنے پیروں پر چل سکتا ہوں"۔ اور یہ کہتے ہوئے میں نے جوتے پہنے اور کھڑا ہو گیا۔ اور باہر نکلنے لگا۔ چلنے میں قدرے لغزش ہوئی تھی کہ ڈاکٹر جے۔ پی نے میری کمر میں ہاتھ دے دیا جس سے مجھ کو اپنے کو سنبھالنے میں بڑی تقویت ملی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم لوگ کوارٹر پہنچ گئے۔ جے۔ پی نے نوکر کو آواز دی۔ وہ ایک پہاڑی بھالو ٹو قسم کا باورچی تھا۔ "ہمارے کمرے میں ترنت اور ایک بستر لگا دو اور میز پر کھانا پروسو۔" "جی میم صاحب" کہہ کر پہاڑی اپنے کام میں لگ گیا اور ہم لوگ برآمدہ میں پڑے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ "کان میں دوا تو ابھی ڈالے دیتی ہوں، کھانا کھانے کے بعد آپ کو ایک سلیپنگ پل دے کر اور بستر پر لٹا کر اسپتال چلی جاؤں گی اور سہ پہر کو چار کے وقت آجاؤں گی۔ اس وقت تک آرام سے سوئیے گا۔ یہاں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں"۔ جے۔ پی نے کان میں دوا ڈالنے کے بعد ایک درد کش ٹکیا بھی کھلا دی تھی ــــ شام کو واپسی پر جے۔ پی نے مجھ کو بیدار کیا۔ ورنہ میں بڑی غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ مدتوں سے اتنا آرام نہیں ملا تھا

دوسرے دن مجھ کو میری قیام گاہ پر جانے کی اس شرط پر اجازت دی کہ اگلے اتوار کو کان دکھلانے ضرور آؤں گا۔ غرض یہ کہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔

اختر الایمان سے بھی برابر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جب میں ان کو کئی بار اتوار کے دن نہ ملا تو ان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے پوچھ ہی لیا کہ یار یہ ہر اتوار کو تم کہاں چلے جاتے ہو۔

علیگڑھ اور کلکتہ

مجاز نے دہلی میں ایک ملاقات میں کہا، چلو علیگڑھ چلا جائے۔ میں نے کہا وہ کس خوشی میں۔ "تم کچھ نہیں جانتے فنکار اور بالخصوص شاعر کے لیے ایک فن ہے (Public contact) عوام سے اختلاط اور قربت۔ علیگڑھ کے عوام یونیورسٹی کے طالبات اور طلبا ہیں۔ ان سے ملیں گے ملاقاتیں ہوں گی۔ یادیں تازہ ہوں گی۔ کچھ دھاچوکڑی رہے گی۔" میں نے کہا مگر میں تو وہاں کبھی طالب علم نہیں رہا۔ "اوتھ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہر جگہ کا طالب علم ایک قومی برادری کا فرد ہے۔ تم چلو تو۔ وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین بھی اچھا کام کر رہی ہے"۔

علیگڑھ پہنچ کر ہم دونوں سیدھے جاں نثار اختر کے مکان گئے جو جیل اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان میں کہیں واقع تھا۔ جاں نثار اختر اور صفیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ صفیہ مجاز کی بہن اور جاں نثار کی بیوی تھیں۔ بہت پڑھی لکھی سیاسی شعور رکھنے والی اور انتہائی ذہین خاتون۔ اور دونوں تحریک کے نہایت جوشیلے کارکن تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ علیگڑھ کے ادیبوں میں جو صحیح سیاسی شعور پیدا ہوا اس میں انھوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد مونس رضا، محمد انس، خورشید الاسلام، اطہر پرویز اور حسین امام وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ چند ہی دن بعد میں اخبار میں بنگال کے قحط پر ایک تفصیلی خبر پڑھنے کو ملی۔ خبر پڑھتے ہی میں وہاں سے وطن آیا اور بیوی سے کچھ روپے قرض لیکر سیدھا کلکتہ پہنچا۔ یہ اگست ستمبر ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ ہاوڑہ اسٹیشن سے نکلتے ہی فٹ پاتھ پر دو تین لاشیں نالیوں میں سر لٹکائے دکھائی دیں۔ پل پار کرتے ہی ایسا لگا کہ یہاں کسی جلوس پر مشین گن چلا دی گئی ہے۔ فضا میں عفونت کا بھی احساس ہوا۔ بڑے انتظار کے بعد ایک ٹن ٹن رکشا ملا۔ اس پر اپنا اٹیچی رکھ کے بڑا بازار ہوتا ہوا میں زکریا اسٹریٹ پہنچا۔ ناخدا مسجد کے سامنے احمدیہ ہوٹل میں پانچ روپیہ روز پر ایک کمرہ لیا۔ اٹیچی جس میں چند جوڑے کپڑے تھے۔ کمرہ میں بند کر کے پھر نکل کھڑا ہوا۔ جدھر سے گذرتا تھا لاشوں پر لاشیں ملتی تھیں۔ مردہ اور دم توڑتے ہوئے بوڑھے بچے، مرد عورت، جوان اور مُسن۔ جن میں بھیک مانگنے کی ابھی سکت باقی تھی ان کے چہروں پر علاوہ دانتوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اسپلانیڈ، چورنگی اور میدان میں بھی اسی طرح کے دل ہلا دینے والے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ گلی کوچوں میں تنگی کی وجہ سے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ کہیں کوئی کھانا یا چاول تقسیم کرنے والے بھنڈارا یا شامیانے نظر نہ آتے تھے۔ ہوٹل کھلے ہوئے تھے مگر دروازے بند کئے ہوئے بیرے سیڑھیوں پر بیٹھے دکھائی دے جاتے تھے۔ چند چلتے پھرتے شہریوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہوٹلوں اور غلہ کی دکانوں میں اشیائے خوردنی کی کوئی خاص کمی نہیں ہے مگر ان کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ باہر دیہاتوں سے آئے ہوئے فاقہ کشوں کی قوت خرید کے باہر ہیں۔ میونسپلٹی کے ٹرکس بھی ملے جن پر سڑی ہوئی لاشیں بوروں کی طرح کہیں لے جائی جا رہی تھیں۔ دنیا کی چوتھی سب سے بڑی آبادی والے شہر پر ہو کا عالم اور قبرستان سے کہیں زیادہ خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میری بھوک اور پیاس بالکل جواب دے چکی تھی اور آنتیں گلے میں آئی جا رہی تھیں۔ کمزوری سے بیدم ہونے کے بعد نیو مارکٹ

کی ایک سیڑھی پر بیٹھ کر کچھ دم لیا اور ہوٹل واپس جانے کے لیے کسی بھولے بھٹکے رکشا کا انتظار کرنے لگا کوئی رکشا تو دکھلائی نہ دیا البتہ گھڑگھڑاتی اور بالکل خالی ایک ٹریم کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے ہاتھ دکھانے پر وہ رک گئی اس میں علاوہ ڈرائیور اور کنڈکٹر کے پولیس کے دو سپاہی بھی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹریم لوور چیتور روڈ ہوتی ہوئی ہیسٹنگ اسٹریٹ جائے گی۔ چنانچہ میں ناخدا مسجد کا ٹکٹ خرید کر اس میں بیٹھ گیا اور زکریا اسٹریٹ کے موڑ پر پہنچ کر اتر گیا۔ چار قدم پر ہوٹل تھا۔ اسمیں پہنچ کر بیرا سے کمرہ میں چاء لانے کو کہدیا۔ باہر تنگ برآمدے کے ایک سرے پر لگے ہوئے واش بیسن میں منہ دھویا۔ کوشش کی کہ استفراغ ہو جائے مگر پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔ کمرہ پر واپس آکر بمشکل ایک پیالی چاء پی۔ بیرا سے پوچھا کہ بھئی تمہارے شہر کو کیا ہو گیا ہے۔" بس جناب اس کو قہر الٰہی کے علاوہ اور کیا کہا جائے۔ شہر اپنے گناہوں کا بدلہ بھگت رہا ہے۔ میں نے کہا نہیں بھائی مرنے والے تو سب باہر کے دیہاتی ہیں۔ "ٹھیک ہے مگر مرنے والے شہریوں کے ہی تو بھائی بند ہیں۔ یہ تو ہوتا آیا ہے دنیا میں گناہ کوئی کرتا ہے اور اس کی سزا دوسرے بھگتتے ہیں۔" "تو کیا شہر میں کھانا اور غلہ نہیں ہے کہ ان غریب بھوکے مہمانوں کی جان بچائی جا سکے۔" "دیہات سے آیا ہوا غلہ تو شہر کے گوداموں میں چھت تک لگا ہوا ہے۔ مگر حکومت اور غلہ بیوپاریوں کو کیا غرض کہ وہ اپنی دولت کو بلا عوض یا دھندہ لٹا دیں۔ ان بھک مردوں کے پاس دام کہاں۔ جو اپنی جوان عورتوں اور کام کاج کرنے والے لڑکوں لڑکیوں کو بیچ لیتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں۔" بیرا ردولی ضلع بارہ بنکی کا رہنے والا تھا اس کی یہ باتیں سن کر دل اور بیٹھنے لگا۔ بیرا نے کہا "رات کھانے میں کیا لیجئے گا۔" "ایک چپاتی اور تھوڑا سا کوئی سالن"۔ بیرا خالی چاء کے برتن لیکر چلا گیا اور مجھ پر کچھ کمزوری اور کچھ سفر کی تکان کی وجہ سے ہوٹل کے نرم بستر پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ بیرا جب کھانے کی ٹرے لیکر آیا تو میں نے میز پر اس کو رکھوا کر کمرہ اندر سے بند کر لیا کہ جب بھوک لگے گی تو کھالوں گا۔ اور دوبارہ آنکھ بند کرلی۔ اب کی نیند کا جھونکا سخت تھا اور میں غافل سو گیا۔ خواب دیکھا کہ سب لاشیں اٹھ اٹھ کے چلنے لگیں۔ بند دکانوں اور مکانوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کے جسموں کا گوشت پوست پگھل پگھل کر زمین پر گرنے لگا۔ اور چلتے پھرتے ہڈیوں کے ڈھانچے سڑکوں پر دوڑنے لگے۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ صفیں باندھ کر فوجوں کی طرح مارچ کرنے لگے۔ گوداموں اور دوکانوں کے تالے توڑ توڑ کر اندر داخل ہونے لگے۔ چاول کے بورے

نکال نکال کر باہر پھینکنے لگے۔ اور ان کے پکے چاولوں کو پھانکنے لگے۔ اور ڈلہوزی سے ہوتے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس کی جانب شور مچاتے ہوئے جانے لگے۔ ان کو آتے ہوئے دیکھ کر پہرے کے سپاہیوں نے مشین گنوں کی باڑھ کھول دی اور آنکھ جھپکتے ہی ہزاروں ڈھانچے زمین پر ڈھیر ہو گئے اور پھر سب پر گوشت پوست چڑھ گئے اور پھر لاشوں سے پٹا ہوا ایک میدان نظر آنے لگا۔ میرا حلق سوکھا ہوا تھا جس کی تکلیف سے آنکھیں کھل گئیں۔ کمرہ اندھیرا تھا۔ میں نے بڈ سوئچ آن کیا اور کشتی سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پی کر پھر سو رہا۔ صبح بیرا کے دروازہ کھٹکھٹانے پر میں بیدار ہوا اور رات کا کھانا واپس کرتے ہوئے بیرا سے دو توس ایک انڈا اور چا ہ لانے کو کہا۔

منھ ہاتھ دھونے کے بعد ناشتہ کر کے پھر نکل کھڑا ہوا۔ آج سیالدہ کی طرف گیا۔ اُدھر کی حالت ہاوڑا اور چورنگی منطقے سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہاں ایک بوڑھے بوڑھی کا جوڑا چلتے چلتے گر کر مرتا ہوا دیکھا۔ پہلے سے پڑی ہوئی سڑتی لاشوں کا تو کوئی ذکر نہیں۔ بالا خانوں سے پھینکے ہوئے کوڑے کرکٹ میں ترکاریوں کے چھلکے، روٹیوں کے ٹکڑوں اور بھات کے بچی کچی پر کتوں اور آدمیوں کو جھگڑا کرتے دیکھا۔ مویشیوں اور بلی کتوں کی لاشیں بھی دیکھیں۔ کسی گودام کے سامنے شور مچاتے ہوئے بھوکوں پر پولیس اور فوجی سپاہیوں کا لاٹھی چارج بھی دیکھا۔ قحط بنگال کو اس کی پوری بہیمانہ شکل میں دیکھ کر مزید کچھ اور دیکھنے کی اپنے میں تاب نہ پا کر اسی دن وطن واپس لوٹ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ٹرین میں بیٹھ جانے کے بعد ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں سڑتی ہوئی لاشوں کے ایک بہت بڑے دلدل سے نکل کر آرہا ہوں۔ وطن پہنچنے کے بعد کئی دن تک Nightmase کا لوس کا شکار رہا۔ رفتہ رفتہ جب طبیعت معمول پر آنے لگی تو میں نے قلم سنبھالا اور کئی دن تک منصوبہ بناتا رہا کہ اتنے بڑے المیہ کو کس انداز سے نظم کیا جائے کہ میرے ذہن میں جو تاثرات اور تصویریں ہیں وہ من وعن قاری کے ذہن واعصاب پر چھا جائیں کہ ایک شب بستر پر لیٹتے ہی یہ مصرع ذہن میں آیا "بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال"۔ زبان سیدھی سادی اور عام فہم تھی چنانچہ گیت کا پورا ڈھانچہ اس مصرع کی بنیاد یا Refrain پر میرے قالب میں آگیا۔ گیت کا مکھڑا تو ہاتھ آہی گیا تھا جس سے دل کو تقویت سی محسوس ہوئی اب پہلے بول یا مصرع کو ذہن میں کریدنے لگا اور وہ بھی جلد ہی ذہن میں آگیا:

پورب دیس میں ڈگی باجی پھیلا سکھ کا کال

اس کے بعد تو بول اس طرح ڈھل ڈھل کر قلم سے ترشح ہونے لگے جس طرح انگلی کٹ جانے پر خون کے قطرے۔

شاید اسی کو اصطلاحاً "القا" کہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں گیت کا مسودہ تیار ہو گیا اور دو ایک ساعت کی کاٹ چھانٹ کے بعد اس صورت میں آ گئی جس نے ملک میں اس موضوع پر تمام نظموں میں سرفہرست جگہ حاصل کی، اور تاریخ ادب کا ناقابل فراموش باب بن گئی ملک کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور "قومی جنگ" پارٹی کے اخبار میں اس کی اشاعت کے بعد مجھ کو وہ شہرت اور حیثیت ملی کہ اس کی گونج ابتک اسی دیرینہ شدّت سے سنی جا سکتی ہے جس قدر کہ آغاز میں تھی۔ اس کے بعد مجھ کو اپنی تخلیقات پر وہ اعتماد پیدا ہوا جو فن کو عظمت کی سرحد تک پہنچانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بدقسمت ہے وہ فنکار جس کو اپنی تخلیق پر پورا اعتماد نہ ہو یا اس کو نہ معلوم ہو کہ اس کی تخلیقات میں کس تخلیق کی کیا حیثیت ہے۔ گروہ بند، مفاد پرست اور اشتہار باز شعرا زیادہ تر Make belief مصنوعی اعتماد اور بڑبتیا کا شکار ہوتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور کچھ مدّت کے بعد یہ بیماری ضمیر کی روشنی کو بھی کھا جاتی ہے۔

پانچواں باب

بنارس

۱۹۴۴ء کا آغاز تھا اور میں شہرت اور ہر دلعزیز عام پسند شاعری کے نشے میں چور اپنی بے روزگاری سے تنگ آچکا تھا کہ کوئنس کالج بنارس کے مشاعرہ کا دعوت نامہ آیا۔ اختر انصاری P.C.S. سپلائی افسر بنارس خود شاعر بھی تھے اور بڑے ادب نواز اور اس مشاعرہ کے روح رواں۔ مشاعرہ میں سامعین کی فرمائش پر میں نے اپنا گیت 'بھوکا بنگال' سنایا جو سب نے بہت پسند کیا۔ مشاعرہ کے بعد انصاری صاحب نے مجھ کو ایک صاحب سے ملایا جو بنارس کے A.D.M. تھے۔ انھوں نے نظم کی تعریف کی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میری اکیڈمک کوالی فیکیشن دریافت کئے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ B.A. LL.B. ہوں تو مجھ کو اور اختر انصاری صاحب کو اپنی کار میں بٹھا کر اپنے بنگلہ میں لے گئے۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ مجھ کو اور اختر انصاری صاحب کو کھانے میں شریک ہونے پر اصرار کیا۔ اور اس کے بعد دبے الفاظ میں دریافت کیا کہ آج کل وکالت ترک کرنے کے بعد علاوہ شاعری کے آپ اور کیا کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا "بیفکری اور بیکاری کی جنت میں آرام کر رہا ہوں"۔ "آرام سے تھک جانے کے بعد اور کیا ارادہ ہے"۔ "پھر کسی طرف نکل کھڑے ہوں گے۔ پروگرام ہے کہ اس دور بے کاری میں اپنے ملک کو زیادہ سے زیادہ جتنا دیکھ سکوں دیکھ لوں"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحت سے بہتر تعلیمی ادارہ کوئی نہیں۔ اس پر میرے مہربان میزبان نے دبے الفاظ میں فرمایا کہ اگر طبع نازک پر گراں نہ ہو تو آپ کے سماجی نظریات کو جن کو میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں، عملی جامہ پہنانے کا ایک موقع آپ کے تجربہ کے لیے پیش کر سکتا ہوں۔ اور وہ ہے Hording and Profiteering provention Inspector کی جگہ۔ میں نے کہا چند دنوں کی اجازت دیجئے، والد سے مشورہ کر کے اطلاع دوں گا یا خود آجاؤں گا۔ "بہت مناسب ہے یہ اپر سبارڈینیٹ گریڈ کی جگہ ہے۔ کوئی گزیٹڈ پوسٹ خالی نہیں ورنہ اس کے لئے لکھا پڑھی کرتا۔ مگر مجھ کو قوی امید ہے کہ سال بھر کے اندر اندر آپ کا انتخاب ایریا راشننگ افسر آسامی کے لیے ہو جائے گا۔

وطن واپس آکر بابا کو پوری داستان سنائی۔ بابا نے فرمایا "خیر تمہاری شاعری جس کو میں نے تمہارے

لیے کبھی پسند نہ کیا کچھ تو کام آئی ۔ اگر تم نے وکالت نہ کرنے کا مصمم فیصلہ کر لیا ہے تو بیکاری اور شاعری سے تو یہ انسپکٹری ہی بہتر ہے کچھ کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہیئے ۔ مبارک ہو بنارس ضرور جاؤ"۔ چنانچہ میں تین چار دن کے اندر اختر انصاری صاحب کے دفتر جو سیتھا کوٹھی میں تھا پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھ سے ایک درخواست لکھوائی جس کو لیکر وہ فوراً کلکٹر ضلع کے پاس چلے گئے اور میری تقرری کا حکمنامہ لیکر واپس آ گئے اور میں نے محلہ ناٹی املی میں ایک مکان کرائے پر لیکر یہ دلچسپ کام شروع کر دیا۔ سرکاری خدمات کے لیے ایک اردلی اور علاوہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار تنخواہ کے سو روپیہ ماہوار سواری الاؤنس ملے تھے۔ دو ایک ہفتہ سائیکل پر شہر کا دورہ کرنے کے بعد میں نے محکمہ کو اوپر سے ایک کھلنے اور بند ہونیوالا پوری چھت کا رکشہ خرید لیا اور سو روپیہ ماہوار پر ایک رکشا پُلر نوکر رکھ لیا۔ میرے علاوہ تین Happo Inspectors اور تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ ہم لوگوں کے حلقہ کار تقسیم نہ تھے اور گرفتاری، معائنہ گودام، دوکان اور مکانات بلا وارنٹ اور اسٹاک مہر بند کرنے کے لامحدود اختیارات حاصل تھے ۔ کام شروع کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے آنے سے قبل دوسرے انسپکٹر صاحبان ان اختیارات کے سہارے بڑے مزے کر رہے تھے ۔ مجھ کو وہ ترکیبیں آتی تھیں اور نہ رشوت خوری کو میں گوارہ کرتا تھا چنانچہ یہ کام میں نے بڑے Bang (زور شور) سے شروع کیا۔ نفع خوری، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری سے میری پرانی دشمنی تھی۔ تقریباً روزانہ گرفتاریاں، گودام بندی اور چالان کرنے لگا۔ نتیجہ میں دوسرے انسپکٹر صاحبان بھی اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہو گئے اور بنارس کے دوکانداروں اور بیوپاریوں کے لیے Terror ثابت ہو گئے۔ وہ اس درجہ دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ دور سے میرا رکشا دیکھ کر دوکانیں بند کرنے لگتے تھے ۔ میں نے اس کام میں چھوٹے دوکانداروں پر کم ہی ہاتھ اٹھایا۔ کبھی ان کی کوئی غلطی پکڑی تو تادیب کر کے چھوڑ دیا تھا جبکہ بنارس کے تقریباً جتنے بڑے بیوپاری تھے، ساری بروکیڈ ریشم، دوائیں، گھڑی، بجلی کے سامان، کپڑے اور زندگی دوسری اشیاء ضروری ان کا یکے بعد دیگرے چالان یا گودام بندی ضرور کی۔ اس سختی کے نتیجہ میں بنارس میں ہر چیز مناسب قیمتوں پر بازار میں دستیاب ہونے لگی، اور مجھ کو مسرت محسوس ہوتی تھی۔

اپنی Happo انسپکٹری کے زمانہ کا ایک واقعہ اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج یاد آ گئے۔ ہوا یہ کہ کسی شام کو میں برنا پل اور بازار کی طرف سے تفریحاً گذر رہا تھا کہ چھاؤنی جانے والی سڑک اور ریل

کے بائیں کونے پر ایک دروازہ کی بہت مختصر سی فوٹوگرافر کی ایک دوکان نظر آئی ۔ باہر ایک ہزار واٹ کا قمقمہ دن کئے ہوئے تھا اور اندر چند نیلے پیلے بلب جل رہے تھے ۔ اگر دو چڑیوں کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی ایک تصویر کھنچوانے کا خیال بھی تھا اس لیے میں اس نہایت بچکانہ ہیئت کی دوکان میں داخل ہوگیا کہ ذرا اس فوٹوگرافر سے دو دو باتیں کروں شاید مناسب قیمت پر کوئی چلتی ہوئی تصویر کھینچ دے ۔ اندر جا کر دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا معقول صورت انسان ننگے سر کھدر کا صاف شفاف سفید کرتا اور بڑی مہری کا پائجامہ پہنے فراسٹڈ گلاس پر ایک Negative (نیگیٹو) سے کچھ شغل کر رہا ہے ۔ اور دیوار پر چار یا پانچ بے مثل پورٹریٹ آویزاں ہیں ۔ میں نے دریافت کیا کہ "کیا آپ ہی ان نادر تصویروں کے خالق ہیں" ۔ یہ سنکر وہ لوہے کا نوکیلا قلم ایک طرف رکھ کے کھڑے ہو گئے اور مجھ کو غور سے دیکھ کر گویا ہوئے "جی ہاں ان مرقعوں کے ساتھ میں نے ہی جھک مارا ہے ۔ فرمائیے آپ کون صاحب ہیں اور مجھ ناکارہ سے کیا خدمت لینا چاہتے ہیں ؟ زندگی میں میرے دو ہی Hobbies (مشغلے) ہیں ، زیادہ تر شکار کھیلنا اور Photogenic (عکس جلا) چہروں کی تلاش ۔ مگر ہاں میں نے آپ کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے ۔ یاد نہیں کہاں" ۔ میں نے کہا "ضرور دیکھا ہوگا ۔ اسی وقت تو میں آپ کے پاس ایک گاہک کی حیثیت سے آیا ہوں اور میرا نام ہے احمد مجتبیٰ ۔ آپ کا اسم گرامی ؟" "جی مجھ کو سرفراز کہتے ہیں ۔ تو آپ تصویر بنوانا چاہتے ہیں" ۔ میں نے کہا "جی ہاں" "تو پھر انتظار کاہے کا ۔ چلئے بغل کے کمرے میں" "مگر میں تو گھر سے یوں ہی ہواخوری کے لیے چل کھڑا ہوا تھا قمیص اور پینٹ میں ۔ تصویر کھنچوانے کا تو خیال بھی نہیں تھا ورنہ مناسب کپڑے پہن کر آتا" ۔ "یہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں کہ فوٹو کے لیے کس پر کس وقت کون لباس مناسب ہے ۔ آپ کی تصویر ابھی اور اسی سفید قمیص میں کھنچیگی" اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اسٹوڈیو میں لئے چلے گئے اور ایک کرسی پر بٹھا کر محض ایک بلب کی روشنی میں میری تصویر کھینچ لی ۔ "میں نے کہا بس ایک ہی اکسپوزر" "جی ہاں ۔ بس ایک ہی کافی ہے ہر لمحہ شخصیت بدلتی رہتی ہے ۔ پہلے اکسپوزر میں جو آپ تھے وہ دوسرے میں نہیں ملیں گے" ۔ بہرحال سرفراز صاحب آپ سے مل کر بےحد خوشی ہوئی اور بہت بہت شکریہ ۔ تصویر کی چھ سات کاپیاں بنا دیجئے گا ۔ اور ہاں دوبارہ آپکو تکلیف دینے کب آؤں ۔" "بس کل آجائیے" "پرسوں چکیا کے جنگل میں شکار کھیلنے جا رہا ہوں ورنہ پرمٹ کی تاریخ ختم ہو جائے گی ۔ آپ کو شکار سے کوئی شغف نہیں ہے ؟" "اس سلسلہ میں کل جب

تصویریں لینے آؤں گا تب مزید گفتگو ہو گی۔ میں آپ کی فنکارانہ شخصیت اور رموز فن پر آپ کی گفتگو سے بہت متاثر اور مرعوب ہوا ہوں"۔

دوسرے روز کچھ دن رہے ہی میں سرفراز صاحب کے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ اور ان کو پوسٹ کارڈ سائز پر اپنے پورٹریٹ کے گوشے تراشتے ہوئے پایا۔ "پورٹریٹ میں شخصیت کی ہو بہو عکاسی ہونی چاہیے اس لیے میں روشنی سے بس بھر کام لیتا ہوں۔ زیادہ تراشی خراش کو میں غیر فنکارانہ فعل تصور کرتا ہوں۔ یہ لیجیے" کہہ کر انھوں نے تصویریں میرے سامنے رکھ دیں ۔ "سرفراز صاحب آپ نے آج مجھ کو نرگسیت کا شکار بنا دیا یعنی اپنی تصویر پر میں خود عاشق ہو گیا ہوں۔ کیا میں کوئی گستاخی کر سکتا ہوں" "حکم دیجیے۔ تعمیل میرا فرض ہے" میں نے نہایت ناپے تلے الفاظ میں ان سے کہا "یوں تو ان تصویروں کی قیمت کا کوئی تعین نہیں کر سکتا مگر زندہ رہنے کی لعنت انسان سے وہ افعال سرزد کرواتی ہے جس سے اس کا ضمیر مجروح ہوتا ہے۔ تو کیا میں معذرت کے ساتھ آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ ان تصویروں کا ہدیہ کیا ہوا"۔ "مجتبیٰ صاحب معاف فرمایئے گا۔ صورت سے تو آپ اتنے بدمذاق نہیں معلوم ہوتے۔ ارے صاحب فن کی کوئی قیمت نہیں۔ تخلیق سے حاصل ہونے والی تسکین ہی اس کی قیمت ہوا کرتی ہے۔ آپ نے شکار کے متعلق اپنے خیالات نہیں ظاہر کیے"۔ "میں شکار اور صحرانوردی کا از حد شوقین ہوں۔ بندوق بھی ہے مگر اب شکار کھیلنے کا وقت کم ملتا ہے۔ کچھ بہت ہی غیر لطیف مشاغل میں گھرا ہوا ہوں" "تو ان تصویروں کی قیمت میں کیا آپ تین چار دن کے لیے میرے ساتھ شکار کھیلنے کا وقت نکال سکتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی اور شکار کے علاوہ مناظر فطرت اور شاموں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے گا۔" "میرے پاس مع ٹریلر کے شکاری لینڈ روور ہے اور ہر نوعیت کے شکار کے اسلحے موجود ہیں۔ چار پانچ دن میں واپس آجائیں گے" میں نے جواب دیا "ضرور چلیں گے۔ کل صبح سویرے آ کر مجھ کو لے لیجیے گا۔ میں دہیں بڑے بھیا کے پاس والے مکان کے دروازہ پر آپ کو مل جاؤں گا"۔ گھر واپس ہوتے ہی میں نے ٹیلیفون پر S.O.D سے پانچ دن کی رخصت اتفاقیہ لے لی۔

دوسرے روز صبح جب وہ اپنی لینڈ روور کا ہورن بجا رہے تھے میں اپنے مستقر سے مع ایک بھرے ہوئے لقمہ کیریر بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی کے باہر آ رہا تھا اور ایک اٹیچی لیے ہوئے میرا باورچی میرے پیچھے تھا۔ یہ تمام جھام دیکھ کر سرفراز صاحب بولے "ان سب چیزوں کی کیا

ضرورت۔ فقیر کی جھولی میں ضرورت کی ہر چیز ہے۔ باورچی اور خادم تک" وہ بڑبڑاتے رہے اور میں سامان کار میں ٹھونستا رہا اور بائیں جانب ان کی بغل میں بیٹھ گیا۔ کار واپسی گھما کے یہ شکاری پارٹی مغل سرائے کی طرف روانہ ہو گئی۔

اب پیر آؤٹ ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ گنگا کا پل پار کرتے ہی سرفراز کھانستے ہوئے مخاطب ہوئے "ہاں احمد مجتبیٰ صاحب۔ اب آپ کی جان میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس لیے بے کم و کاست بتلا دیجیے کہ آپ بنارس میں کیا کرتے ہیں۔ زندگی کیسے چلتی ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اور آپ کا وقت کن مشاغل میں کٹتا ہے؟" ایک سانس میں اتنے سارے سوالات؟" میں اب تک حقیقتاً "گر خفائے حقیقت کا مرتکب رہا ہوں وہ محض اس خیال سے کہ اگر میں آپ کو اپنے متعلق سب کچھ پہلی ہی ملاقات میں بتلا دیتا تو آپ کی نظروں میں میری مجرد شخصیت کی طہارت ختم ہو جاتی اور آپ اس کے بعد جو کچھ کرتے یا آپ نے جو کچھ کیا اس پر میری نظروں میں خود آپ کا بھی کردار ملوث نظر آتا۔ مگر اب ہم لوگ تعلقات کی اس منزل پر آ گئے ہیں کہ احباب کے درمیان لاعلمی یا راز کا کوئی پردہ حائل نہ رہنا چاہیے، تو سماعت فرمائیے۔ میرا خاندانی نام ہے تو احمد مجتبیٰ ضرور مگر عرف میں میں واثق جونپوری کے تخلص سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔ یہاں بنارس میں تھوڑی مدت سے Happo lms-pector ہوں۔ موضع بھگاؤں ضلع جونپور کا رہنے والا ہوں۔ نوکری پیٹ پالنے کے لیے کرتا ہوں ورنہ اصلی پیشہ ادب اور شاعری کا ہے۔ ان کے علاوہ خطاطی، مصوری اور باغبانی کا شوق ہے۔ ان سے جو وقت بچ رہے انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ موسیقی سے بڑی دلچسپی ہے ذرا آنا لیکن تو دگا نہیں سکتا۔ اشعار ترنم سے بھی پڑھتا ہوں جس میں موسیقیت نام کو نہیں ہوتی۔ امانت اور دیانتداری پر جان دیتا ہوں اور بے ایمانوں سے اللہ واسطے کا ازلی بیر ہے۔ نظریۂ حیات اشتراکیت اور ترقی پسندی ہے۔ شاید اس قدر تعارف آپ کے لیے کافی ہوگا۔" "اتنا میرے لیے بہت کافی ہے۔ اس میں بہت سی باتیں تو پہلے ہی میرے ذہن میں آ چکی تھیں باقی آپ نے بتا کے پوری کر دیں۔ میں بھی حتی المقدور مطالعہ کا عادی ہوں۔ واپسی پر آپ کو ایک نئی کتاب دوں گا۔ "ڈراکولا" بڑا بھیانک ناول ہے"۔ "ضرور"۔

ہم لوگ ڈھائی تین گھنٹے میں چکیا پہنچ گئے۔ ڈاک بنگلہ میں جو ایک بلند مقام پر

واقع تھا قیام کا انتظام تھا۔ ڈاک بنگلہ جائے وقوع کے اعتبار سے حد درجہ منظر نما اور فرحت بخش تھا۔ ہم لوگوں نے وہاں جی بھر کے شکار کھیلا۔ سرفراز نے ایک جھانکھ اور آدی باسیوں کی مدد سے ایک تیندوا مارا اور میں رات کے کھانے کے لیے دو چار جنگلی مرغ مار لیتا تھا۔ پانچویں دن ہم لوگ بنارس واپس آ گئے۔

اس کے بعد تو میرے ان کے تعلقات اتنے گہرے ہو گئے تھے کہ بنارس چھوڑنے کے بعد جب میں بنارس جاتا تو ان ہی کے یہاں قیام کرتا تھا۔ افسوس کہ وہ اب نہیں رہے۔

سال بھر کے اندر ۱۵ر فروری ۱۹۴۵ء کو میں ایریا راشننگ آفیسر ہو گیا۔ یہ محکمۂ راشننگ محکمۂ رسپلائی سے بھی زیادہ محنت اور مستعدی چاہتا تھا۔ غلّہ کی راشننگ۔ شکر کی راشننگ۔ پٹرول کی راشننگ اور راشننگ کارڈ میں صحیح اکائیاں برقرار رکھنے کے لیے مسلسل پڑتال وغیرہ۔ غلّہ اور اشیا خوردنی کی محدود رسد رسانی کے سبب سے ہر خاندان کو ضرورت سے کم غلّہ ملتا تھا۔ میرا خود راشن بالخصوص گندم اور چاول ہر مہینہ کی ۲۰-۲۵ تک ختم ہو جاتا تھا اور چپاتیاں دال منڈی میں اتاترک ہوٹل سے منگوانا پڑتی تھیں۔ راشننگ افسر ہونے کے بعد میری قیام گاہ اور دفتر دونوں پرانے ڈاک خانہ واقع نیچی باغ میں آ گیا تھا۔ یہ عمارت بہت وسیع اور دو منزلہ ناف شہر میں ہے۔ بالا خانہ اس کا زنانہ حصہ تھا۔ نیچے دو تہائی عمارت میں ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں دیوار کھنچوا کر دفتری کام کے لیے cubicle (مکعبی) کمرے بنوا لیے گئے تھے۔ باقی ایک تہائی میں میرے ڈرائنگ روم مہمانوں اور کھانے کے کمرے تھے۔

غلّہ اور مٹی کے تیل کی کمی سے دیہات بھی متاثر تھے۔ چنانچہ میرے ایک ہم وطن پرائمری اسکول کھگاؤں کے ہیڈ مدرس مولوی غلام حیدر صاحب دوسرے تیسرے ہفتے آ کر میرے مہمان ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ کسی مہینے کی آخری ایام میں تشریف لائے۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ گھر میں آٹا یا پکا ہوا تیار کھانا موجود نہ تھا اور سوء اتفاق سے چپراسی اور باورچی کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب لمبا سفر کر کے آئے ہوئے گرسنہ بھی معلوم ہو رہے تھے اس لیے میں نے جیب سے پانچ روپئے نکالے اور ان کو دیے کہ گھر میں تو کچھ کھانے کے لیے ہے نہیں۔ آپ تکلیف کر کے اتاترک ہوٹل ڈائمنڈ چلے جائیے اور وہاں سے کھانا کھا آئیے۔ سائیکل تو آپ کے پاس موجود ہی ہے۔" میرے اس نئے انداز مہمان نوازی سے وہ بہت بیزار ہوئے اپنی سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر سائیکل

چلاتے ہوئے الٹے پاؤں وطن واپس چلے گئے اور بابا سے میری اس کج خلقی اور بدتمیزی کی شکایت کی۔ اس پورے وقفہ میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے موصوف گدّی پر بیٹھ کر سائیکل نہیں چلا سکتے تھے۔ جونپور سے بنارس کا سفر چالیس میل کا ہے۔ آنا اور سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر پھر واپس جانا ایک دن میں پورے اسّی میل ہوئے۔

A.A.O. کا چارج لینے کے پہلے ہی دن یہ ہوا کہ دفتر کے بڑے بابو بغل میں ۱۵-۱۶ مثلیں دبائے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کر کے اُن موٹی موٹی مثلوں کو ایک طرف میری میز پر رکھ دیا۔ اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہ کر بولے کہ "اگر اجازت ہو تو میں ان بہت پرانی فائلوں کو جن پر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں لیا جا سکا ہے تھوڑا تھوڑا سمجھا دوں۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا" آپ مجھ کو فائلیں سمجھائیں گے۔ آپ مچھلی کے بچے کو تیرنا سکھلائیں گے۔ آئندہ سے کبھی ایسی جرأت نہ کیجئے گا۔ آپ فائلیں یہیں چھوڑ کر واپس جا سکتے ہیں"

میں نے دفتری کام گھر پر کبھی نہیں کیا مگر اس دن چپراسی سے کہا کہ "ان فائلوں کو اوپر لے جا کر میرے بستر کے قریب رکھ دو" شب میں کھانے کے بعد میں نے ان فائلوں کے شروع کے درمیان کے اور آخر کے دو دو اوراق پڑھ پڑھ کر صبح دو بجے تک تمام فائلوں پر حکم لگا دیے اور ایک مہینہ کے اندر اندر سب کا نفاذ ہو گیا۔ دوسرے دن جب بڑے بابو آئے تو میں نے ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی اور بڑی نرمی اور خوش مزاجی سے ان کو بتلایا کہ" آپ میرے فیصلے دیکھئے۔ یہ تو میری ہوم انڈسٹری ہے اس میں کوئی میری رہنمائی کیا کر سکتا ہے"

نوکری تو زمین پر پیر جلنے کا ایک بہانہ تھی۔ اس تھوڑی سی مدّت میں تحریک کی جو خدمت کر سکا اس کو میں اپنا فرض اولین جانتا تھا۔

بنارس کے مقامی شعرا مثلاً حکیم کاظم۔ نذیر بنارسی۔ محشر بنارسی اور فرخ بنارسی سے رابطہ قائم کر کے انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک ہیولا بنایا۔ اس کی نشستوں میں وہاں کے نوجوان شعرا بھی شرکت کرنے لگے اور مختلف نظریات ادب کے ماننے والوں کی شرکت سے مشترک محاذ کی نمائندگی ہونے لگی۔ میں نے ان کو ادب کے بدلے ہوئے موضوعات، انداز فکر اور اسلوب سے روشناس کرایا۔ پرانے لکھنے والوں میں تو کوئی خاص تغیر نہیں آیا البتہ نذیر بنارسی اور دوسرے نوزاداں شہر ادب کچھ کچھ یقیناً متاثر ہوئے آزاد اور نظم کی اہمیت اور شعری ضرورت سے ان کو روشناس کرایا۔ ہم سے پہلے مسعود اختر جمال ترقی پسند ادب پر کچھ

کام کر چکے تھے اور ایک ماہنامہ کے ذریعہ ترقی پسند خیالات اور موضوعات سے یہاں کے ادیبوں کا تعارف کرا چکے تھے۔ مگر ان کا اسلوب اور لغت روایتی ہونے کے سبب سے نئے لکھنے والوں میں وہ کوئی نیا شعور پیدا نہ کر سکے ان کے بعد منظر شاہجہاں پوری کے برادر خرد محمود احمد ہنر نے جو ایک روشن خیال ادیب اور گاندھی وادی صحافی تھے تھوڑی مدت تک ایک اچھا ادبی رسالہ نکالا تھا مگر وہ افسانوی ادب تک محدود تھا۔ ان کے جانے کے بعد میرے ساتھی کچھ کامیاب ہوئے اور تخلیقی ادب میں Breakthrough (نئی راہ) نظر آنے لگی۔ اسی زمانہ میں B.H.U. میں ہندی کے ابھرتے ہوئے کوی شیومنگل سنگھ سُومن ڈاکٹریٹ کرنے آگئے تھے۔ وہ اسی وقت بڑے آتش نوا ترقی پسند ہندی کے شاعر تھے۔ ان کو بھی کسی ایسے مرکز اور مل بیٹھنے کی جگہ کی تلاش تھی کہ ان کی مجھ سے ملاقات ہوئی اور ہم دونوں نے U.H.B. میں اردو ہندی کی ایک ملی جلی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور کافی زور شور سے کام شروع ہو گیا۔ کبھی B.H.U. میں کبھی میرے گھر پر اس کی نشستیں ہونے لگیں۔ باہر سے مجاز، راہی معصوم رضا اور ممتاز حسین بھی آکر اس میں شریک ہونے لگے۔ سُومن نے ویتنام کی جنگ کے خلاف ایک بہت اچھی نظم لکھی تھی۔ میں نے بھی اپنی مشہور نظم "مینا بازار" اور "رہزن کی آڑ سے" اسی زمانہ میں لکھی تھی۔ راہی نے بھی مصوری چھوڑ کر بہت خوبصورت ترقی پسند غزلیں کہیں، اور ممتاز حسین نے ترقی پسند اصولی تنقید پر مقالے لکھنے کا آغاز کیا اور تحریک بنارس کی ادبی فضا پر پوری طرح چھا گئی۔ کبھی کبھی کسی کالج میں کبھی دالمنڈی کے عقب میں بنیا باغ میدان میں ملے جلے مشاعرے اور کوی سمیلن ہونے لگے۔ خاص بات یہ تھی کہ پرانے اساتذہ اور شعرا بھی ان اجتماعات میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے تھے اور سامعین میں آزاد اور رسمی نظموں اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ خیالات سننے کی ہمت اور صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ چونکہ یہاں کی کانگریس کمیٹی بہت مضبوط اور افسران ضلع پر کافی حاوی تھی جس کے سربراہوں میں ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ اور کملاپتی ترپاٹھی جی تھے، اور افسران ضلع بھی زیادہ تر قوم پرست خیالات رکھتے تھے اسلئے ہم لوگوں کو جنگ آزادی کے ادبی محاذ پر کام کرنے میں کوئی فوری خطرہ اور رکاوٹ نظر نہ آتی تھی چنانچہ جب مجھ کو ۱۹۴۵ء میں کل ہند ترقی پسند مصنفین حیدر آباد کا دعوت نامہ ملا تو میں اور ممتاز حسین اس میں شرکت کرنے حیدر آباد پہنچ گئے۔

حیدر آباد کی یہ کانفرنس کئی اعتبار سے بہت اہم تھی۔ دس سال کے اندر ترقی پسند ادبی تخلیقات کا جائزہ۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی ازم کے خلاف متحدہ محاذ کی فتح کے لئے ادیبوں کے بدل پر نظر ثانی

اور ملک کی جنگ آزادی میں ادیبوں کی جد وجہد کو مزید تقویت پہنچانے کے زیادہ مؤثر ذرائع کا استعمال۔ یہاں نظام شاہی کی پیدا کردہ رکاوٹوں کے باوجود اس کام کے لیے ایک بڑا اسینما ہال چار یا پانچ دن کے لیے اس لیے مل گیا تھا کہ اس کا مالک تحریک کے ہمدردوں میں تھا۔ پورے حیدرآباد کے عوام اس میں حصہ لینے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ہال میں "جائے تنگ است و مرداں بسیار" ہونے کے خیال سے باہر دُور دُور تک ریاست کے حکم اور قاعدہ کے خلاف لاؤڈ اسپیکرس لگادیے گئے تھے۔ پولیس اور قانون کے ہاتھوں میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ ان Formalities (تنصیبات) کو ہاتھ بھی لگا سکیں۔ نظام شاہی کا سنگھاسن ڈانواڈول نظر آرہا تھا۔ اور ارباب اقتدار سہمے ہوتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کانفرنس کے ختم ہوتے ہوتے کم از کم بلدہ حیدرآباد میں نظام شاہی ختم ہو جائے گی اور دار الامارة پر عوام کا قبضہ ہو جائے گا۔

وہاں کے چوٹی کے ادبا اور صحافی مثلاً قاضی عبدالغفار اور اختر حسن صاحب، اکبر علی خاں، مخدوم، راج بہادر گوڑ، عالم خوندمیری، جواد رضوی، سلیمان اریب، لاہوتی، ابراہیم جلیس وغیرہ دامے درمے قدمے سخنے تحریک کے ساتھ تھے۔ کانفرنس کی صدر مسز سروجنی نائیڈو تھیں جنھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں صاف الفاظ میں ترقی پسند ادیبوں کے ادبی مساعی کو حصول آزادی کا مؤثر ترین حربہ تسلیم کیا تھا اور جس کے ذریعہ ملک کی آزادی کا یقین دلایا تھا۔ اور تحریک کے مستقبل کو بہت روشن بتلایا تھا اور ہم لوگوں کے دل بڑھ رہے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک نہایت تجربہ کار کمانڈر جنرل اپنی فوج کو ساتھ لئے فتح کے سنگین پھاٹک پر دق الباب کر رہا ہو اور سپاہیوں کو اس کو بمبارڈ کر کے شہر آزادی کی سرحد میں درانہ وار داخل ہو جانے کا آخری فیصلہ سنا رہا ہو۔ (بعد میں جس کا نقشہ تلنگانہ کی جنگ میں دیکھا جا سکتا تھا)۔

دوسرے ادبی اجلاس کی صدارت کرشن چندر نے کی تھی جس میں انھوں نے بہت ہی خوبصورت صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اس خطبہ کا جو حسن تھا وہی اس کی کمزوری بھی تھی۔ دس سال کے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کوئی گوشہ چھوڑا نہیں تھا مگر تصویر اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے انتشار میں مقصدیت دب کر رہ گئی تھی اور تصویر دھندلی پڑ گئی تھی

غرض کہ کانفرنس کا ہر اجلاس اپنے اپنے موضوع بحث پر بہت پُرمغز اور دھواں دھار ہوا تھا۔ ہر فرد ہر حرف اور ہر عمل میں بلا کا جوش و خروش دکھائی دیتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی کو اس سے پہلے کبھی اتنے جوش اور غیظ میں نہیں دیکھا گیا۔ موصوف کا طیش اس بات پر تھا کہ تحریک کے جریدہ کا نام "قومی جنگ"

کیوں رکھا گیا ہے۔ یہ غلط ہے اسے فوراً بدلا جائے۔ جرأت، اخلاص اور دیانتداری کا ان سے بہتر نمونہ ہندوستان نے نہیں پیدا کیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی جس پارٹی میں وہ رہے ان کو بیحد احترام اجلال اور شہرت ملی مگر عملی سیاست میں کبھی ان کو کوئی بلند مقام نہ دیا گیا۔ اور ہر دور میں ان کو Idealist (عینیت پسند) کہہ کر بیکار بنا دیا جاتا تھا۔

ملک کے نمائندہ ترقی پسند ادیبوں کا اتنا بڑا اجتماع اس کے بعد پھر کبھی نہ ہوا۔ حسرت موہانی، ملک راج آنند، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ساحر لدھیانوی، وشوا متر عادل، صہبا لکھنوی، قاضی عبد الغفار، سری نواس لاہوٹی، سبط حسن، کیفی اعظمی، جگر حیدرآبادی، عادل رشید، سردار جعفری، ممتاز حسین مخدوم محی الدین، نظر حیدرآبادی، ممتاز شیریں، صمد شاہین بنگلور ادارہ "نیا دور"، ڈاکٹر علیم، ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، خواجہ احمد عباس، شاہد صدیقی اور دوسرے بہت سے دانشور جن کے اسمائے گرامی یاد نہیں آئے۔

اس کانفرنس کے دوران اور مابعد بہت سے دلچسپ رموزِ نازیبا اور عجیب و غریب واقعات دیکھنے میں آئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین میں ہمیشہ چند ایسے خود غرض اور گروہ بند افراد رہے ہیں جو ہمیشہ ملک میں ہر جلسے، کانفرنس یا سیمینار میں دو چار دن پہلے سے پہنچ کر اپنے قدم جما لینے اور تقسیم کار کی لیڈرشپ جس قدر ممکن ہو اپنے ہاتھ میں لے لینے میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے ایسا ہی کیا اور ابتک ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ ان Promising Talents ہونہار صاحب قلم عناصر کو نظر انداز کرنے والوں نے اس کانفرنس میں بھی یہی نازیبا حرکت کی۔ کانفرنس کے پانچ چھ اجلاس ہوئے۔ ضمنی کمیٹیاں بنیں۔ مقالے اور مضامین پڑھے گئے یا تحریک کے مفاد کے لیے فیصلے لیے گئے۔ مگر ان لوگوں نے اپنے یا اپنے دم چھلوں کے علاوہ کسی دور افتادہ یا نئے ادیبوں کو عملی حصہ لینے کا کوئی موقع نہیں دیا۔
ممتاز حسین غازیپوری (اب پاکستانی) جو اب چوٹی کے نقادوں میں ہیں اس موقع کے لیے ایک محنت سے لکھا ہوا مقالہ لائے تھے۔ باوجود نام درج کرلانے کے ان کو پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ صمد شاہین اور ممتاز شیریں بنگلوری (ترقی پسند جریدہ "نیا دور" کے نامور مدیران) کو کانفرنس میں کوئی اہم یا نمایاں مقام دینا یا ان سے کوئی کام لینا تو درکنار ان مفاد پسند ادیبوں نے ان سے یہ تک نہ پوچھا کہ آپ ہیں کون اور کہاں سے آئے ہیں۔ ان میں کا ہر فرد بس اپنی حیثیت اور شخصیت کو Projects (نمایاں) کرنے میں منہمک

نظر آتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے نئے ادیا منھ لٹکائے رہے تھے۔ کانفرنس کا آخری اور سب سے زیادہ عوام پسند اجلاس مشاعرہ تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں آٹوگراف لینے والا اور طالبات کا مجمع مَیں نے ابتک کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اوّل اوّل تو پندرہ بیس آٹوگراف البم پر دستخطی اشعار لکھے اس کے بعد سوا دستخط گھسیٹنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مشاعرہ سرشام ہی شروع ہوگیا تھا۔ وہی جو روایت ہے کہ پہلے چند چوٹی کے مقامی شعرا نے اشعار سنائے اس کے بعد مطالبہ ہونے لگا۔ بھو کا بنگال وامق، تاج محل ساحر۔ مشاعرہ کی صدارت حسرت موہانی اور نظامت مخدوم محی الدین کر رہے تھے۔ ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اور اس سے بہت زیادہ مجمع دور تک ہال کے باہر تھا۔ پہلے ساحر نے اپنی نظم "تاج محل" سنائی جس کو سامعین نے بہت حضور قلب سے سنا۔ اس کے بعد مَیں کھڑا ہوا اور "بھو کا بنگال" سنانے سے معذرت چاہی کہ یہ گیت تنہا نہیں سنایا جاسکتا یہ تو کئی موسیقاروں کے مل کر گانے کا کورس ہے مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ مجبور ہوکر مجھ کو بھو کا بنگال شروع کرنا پڑا اور ابھی پورا ایک بول ختم نہ کرپایا تھا کہ ہوٹ ہوگیا اور میں یہ کہتے ہوئے بیٹھ گیا کہ بس جی بھر گیا۔

بچپن میں مولوی صاحب نے بتلایا تھا کہ ہر کہانی کا ایک سبق ہوتا ہے۔ تو میری اس کہانی کا سبق یہ ہے کہ شاعر کو اپنا وہ مشہور کلام مشاعرہ میں خود کبھی نہ سنانا چاہئے جس کو ماہرِ فن موسیقاروں یا فلم میں کسی شہرت یافتہ پلے بیک نے گایا ہو۔ "بھو کا بنگال" کو انڈین پیپلز تھیٹر کے موسیقار ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اور ہر زبان میں، گاکر کروڑوں سننے والوں کو رلا چکے تھے تو میرا ترنم کس شمار و قطار میں آتا تھا کہ میں ہوٹ نہ کیا جاتا۔ بالکل ایسا ہی ایک حادثہ آٹھ دس سال ہوئے مجروح سلطانپوری کے ساتھ بنارس میں ہوا جنکو میں گانے کے اس دور میں بھی ترنم کا بادشاہ سمجھتا ہوں۔ بنارس کا مشاعرہ ہزار ہا سامعین کا مجمع۔ اربابِ مشاعرہ نے کثیر رقم خرچ کرکے مجروح کو بلایا تھا۔ جیسے ہی ان کے پڑھنے کا نمبر آیا سامعین نے بیک آواز فرمائش کی کہ "وہ غزل سنائیے جس کا مطلع ہے۔ ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح"۔ مجروح کا ماتھا ٹھنکا مگر چونکہ ان کو اپنے ترنم پر پورا بھروسہ تھا انھوں نے یہ غزل اپنے خاص موثر اور پسندیدہ طرز ترنم میں شروع کردی۔ ابھی مطلع ختم نہ کرپائے تھے کہ سیٹیاں بجنے لگیں اور تالیاں لپٹ گئیں۔ ظاہر ہے کہ لتا منگیشکر نے فلم میں جس غزل کو پورے گلے سے گادیا ہو اس کی فرمائش سامعین کی حماقت اور اس سے زیادہ شاعر کی جرأتِ بےمحل کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ رہے وہ شعرا جن کے ترنم کا ڈانڈا سُر تال پر پوری موسیقی سے ملتا ہوا نکو

ان حالات میں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں ۔

کانفرنس کے اختتام پر حیدرآباد کے ایک بہت بڑے جاگیردار نے کانفرنس میں شرکت کرنے والے ادیبوں کو اپنے فصیل بند محل میں سہ پہر کی چائے پر مدعو کیا۔ چنانچہ ہم لوگ چار بجے وہاں پہنچ گئے۔ راجہ صاحب ہم لوگوں کا خیر مقدم کرنے محل کے پھاٹک تک آئے تھے۔ محل کے سپاہیوں نے ہم لوگوں کو گارڈ آف آنر دیا اور راجہ صاحب تھوڑی دیر کے لیے غیر حاضری کی اجازت چاہتے ہوئے اپنے سکریٹری سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ ان حضرات کو پہلے ہمارا کتب خانہ دکھلاؤ اس کے بعد عجائب خانہ اور Antique room (نوادر خانہ) میں چائے کی تیاری کرنے خود جا رہا ہوں۔ جب ہم لوگ لائبریری میں داخل ہوئے تو پہلا کمرہ انگریزی کتابوں کا ملا۔ شیشے کی سقف پوش الماریاں چمڑے کی جلد بند شعبہ وار مندرج فہرست کتابوں سے بھری ہوئی پائیں۔ تاریخ، سفرنامے، سوانح حیات، ادب، شاعری، مضمون نگاری، افسانے، ناول، ثقافت، جغرافیہ، فلسفہ اور سائنس وغیرہ پر کتابوں سے مزین۔ ایک طائرانہ نظر سے اندازہ ہوتا تھا کہ انگریزی ادب کی نمائندہ اور جدید ترین مطبوعات وہاں موجود ہیں۔ ملک راج آنند تو اپنا اس وقت کا تازہ ترین ناول "قلی" دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ ابتک ان کے ناشر نے ولایت سے ان کو اس کی کاپی نہیں بھیجی تھی جس کے وہ کئی ماہ سے منتظر تھے۔ لائبریرین نے بتلایا کہ دنیا کے جتنے بڑے اشاعت گھر ہیں سب میں راجہ صاحب کا اسٹینڈنگ آرڈر ہے کہ خاص خاص اشاعتیں ایک ماہ کے اندر ان کو بھیج دی جایا کریں۔ اس کے بعد اردو فارسی اور مخطوطات کا ذخیرہ دیکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ نجی کتب خانوں میں اس کا نمبر اول نہیں تو چند بہترین ذخائر میں شمار ضرور ہوتا ہوگا۔ کسی نے دریافت کیا کیا راجہ صاحب نے یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں ہیں تو لائبریرین نے جواب دیا کہ اگر سب نہیں تو بہت کافی تعداد میں ضرور پڑھ ڈالی ہیں۔ پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی اور شوق نہیں ہے، اعلیٰ حضرت سے تعلقات میں کچھ کشیدگی کا سبب بھی یہی ان کی کتب بینی کا شوق ہے جس کی وجہ سے دربار میں حاضری کم دے پاتے ہیں —— ہمارے راجہ صاحب بڑے ترقی پسند خیالات کے آدمی ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ پانچ سو مزارع کی تقاوی معاف کی ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ میوزیم میں لے جائے گئے۔

میوزیم میں آلات حرب و ضرب، جواہرات اور مصوری کے نمونے تو اس پیمانے کے نہ تھے جیسے سالار جنگ میوزیم میں ہیں تاہم اس کے بعد اگر نمبر آتا تھا تو وہ راجہ صاحب ہی کے میوزیم کا تھا۔ ہم لوگ مصوری کے سکشن سے

لطف اندوز ہو رہے تھے کہ راجہ صاحب چار بجے جانے کی غرض سے خود آ گئے۔ ہم لوگ بھی نوادر دیکھتے دیکھتے تھک چکے تھے۔ چائے پی گئی اور جب ہم لوگوں نے جانے کے لیے رخصت چاہی تو راجہ صاحب نے کہا "بس ایک درخواست اور۔ لان کی اس دیوار کی پشت پر میرا چمن ہے جس میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں اور فوٹو گرافر شکریہ ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔" اب ہم لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ ابتک ہم لوگوں نے ترقی پسندی کے مزاج کے خلاف کوئی جرم تو کیا نہیں۔ اور اگر چار بجے پی لی تو اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں البتہ اس جاگیر دار کے ساتھ تصویر کھنچوانا سخت مسئلہ ہے۔ مگر اخلاق اور مروت کی مار بہت بری ہوتی ہے۔ کسی سے کچھ بنائے بن نہ پڑی۔ بڑا بڑا جگادری کمیونسٹ اور ترقی پسند ہم میں موجود تھا۔ کسی نے چوں نہ کی اور سب لوگ کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے اور سب کے بیچ میں راجہ صاحب خود۔ فوٹو گرافر نے داہنے بائیں دونوں رُخ سے تصویریں لیں کہ تصویر دستیاب ہو جانے میں کوئی شک باقی نہ رہے۔ اس کے بعد ہم لوگ راجہ صاحب کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوئے اور راجہ صاحب ہم لوگوں کو رخصت کرنے محل کے پھاٹک تک گئے۔ واپسی میں کسی نے خوب ہی کہا کہ انقلاب آنے پر اس راجہ پر کون گولی چلا سکتا ہے۔ جواب آیا۔ حسرت موہانی، قاضی عبد الغفار، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر عبد العلیم اور دوسرے بہت سے انقلابی جو اس چھوٹے پن کا مظاہرہ کرنے یہاں نہیں آئے تھے۔ کسی نے کہا کہ ہم راجہ صاحب کی گردن اڑانے کے لیے بمبئی سے پی۔ سی۔ جوشی کو بھیجیں گے۔ کسی نے کہا کیا معلوم یہ راجہ تحریک کا دل سے ہمدرد ہو اور اپنی دولت کو انقلاب کی راہ میں ہمارے حوالے کر دے۔ شرمندہ سب تھے اور بھلا دے کی باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے مہمان خانوں میں پہنچ گئے۔

مہمان خانوں میں ہر کمرہ پر ایک ایک ملازم کی ڈیوٹی تھی کہ کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اگر راہ چلتے ہوئے کسی نوکر سے آپ کا بازو مس ہو گیا تو ملازم ہاتھ باندھے نیچی نظر کئے کہتا تھا "تقصیر" کام کرنے میں پشت آپ کی جانب ہو گئی "تقصیر"۔ آپ خود ملازم کی پشت سے ٹکرا گئے "تقصیر" دو تین تقصیروں کے بعد "تقصیر" کے اس اعتراف بیجا سے تنگ آ کر میں نے ایک ملازم سے دریافت کیا کہ "بھائی تمھاری کوئی غلطی ہو یا نہ ہو تم لوگ ہر غیر متوقع فعل پر "تقصیر" کی معافی کیوں مانگنے لگتے ہو۔ اس نے جواب دیا "تقصیر"۔

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد بالخصوص بلدہ کا پورا سماج نہایت کلچرڈ خوش پوشاک اور نقل و حرکت میں انتہائی مہذب ہوتا ہے۔ گفتگو میں اختصار ان کا بہت قیمتی ورثہ ہے۔ سب سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی آپ سے ملاقات کر کے رخصت ہونا چاہتا ہے تو کہتا ہے "حاضر ہوتا ہوں" اسی اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "اس وقت رخصت ہو رہا ہوں آئندہ پھر کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اہل حیدرآباد کے تلفظ پر شمالی ہندوستان کے باشندے ان کا مذاق اڑاتے ہیں" قرآن کو خران۔ تقریب کو تخریب یعنی ق کی جگہ خ کیوں بولتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض لسانیات اور صوتیات سے معترضین کی لاعلمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ تلفظ میں صوتیات کا فرق ہر منطقے کے جغرافیائی حالات، آب و ہوا اور غذائیات پر منحصر کرتا ہے۔ مصر والے جیم کو گاف بولتے ہیں۔ خراسان والے کاف کو چھے بولتے ہیں۔ یہ فرق مختلف مقامات کے جانوروں اور پرندوں کی آواز میں بھی ملے گا۔ حیدرآباد کے کوّے بجائے کائیں کائیں کے خائیں خائیں اور ہمارے یہاں کے کوّے کائیں کائیں بولتے ہیں۔ گرم ملک کی بلیاں میاؤں میاؤں اور برفیلے سرد مقامات کی بلیاں عاعوں عاعوں بولتی ہیں۔ پنجاب کا باشندہ قاف کو کاف بولتا ہے۔ ان سب باتوں کا علم اور لحاظ ضروری ہے۔ بغیر جانے بوجھے اعتراض کرنا نامناسب فعل ہے۔

اس کانفرنس کی ایک دین یہ بھی ہے کہ وہاں کیفی سے میری پہلی ملاقات ہوئی جبکہ بیس پچیس سال پہلے بچپن میں بارہ بنکی میں ہم ایک دوسرے سے بہت قریب رہ چکے تھے۔ دوسری دین یہ کہ کیفی سے آنسہ شوکت کی نسبتِ ازدواج وہیں طے ہوئی تھی اور قلیل مدت کے بعد شادی ہوئی تھی۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد ممتاز تو وطن واپس چلے گئے مگر میں بمبئی کے ادیبوں کے ساتھ بمبئی آگیا۔ ا۔ج۔ح کے کھیت وادی کمیون میں سردار، کیفی اور سبط حسن کے ساتھ ٹھہرا۔ بمبئی کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ دن بھر کیفی وغیرہ کے ساتھ شہر کی سیر کرتے تھے اور پارٹی کے دولت مند ہمدردوں سے ملتے تھے۔ مزدوروں کے محلے مغلپورہ میں انکی مہمان نوازی اور محبت پر فخر کرتے تھے۔ پی۔سی۔ جوشی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر جب ان کو معلوم ہوا کہ وامق کمیون میں کیفی کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو قمیض اور نیکر پہنے برہنہ پا کیفی کے کمرے پر آئے اور مجھ کو گلے سے لگایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمیون کے ہر کمرے میں لے گئے اور سب ساتھیوں سے یہ کہہ کر ملایا کہ

یہی واثق ہے جس نے "بھوکا بنگال" کا گیت لکھا ہے اور جس کے لیے ہماری پارٹی ان کی بہت Thank-
ful ہے۔ دوسرے دن خواجہ احمد عباس کے ساتھ ہم سب لوگ اندھیری میں IPTA کے ہیڈ کوارٹر
گئے۔ اس وقت وہاں خواجہ احمد عباس کی ہدایت کاری میں "دھرتی کے لال" فلم کا ریہرسل اور تیاری ہو رہی
تھی۔ جب وہاں بھوکا بنگال سونگ Ensemble (پارٹی) کو معلوم ہوا کہ میں واثق ہوں تو پریم دھون
عمر شیخ، بلراج ساہنی اور دوسرے اداکاروں نے مل کر مجھ کو "بھوکا بنگال" سنایا۔ اس وقت مجھ پر اور
وہاں موجود دوسرے سننے والوں پر ایک عجیب عالم طاری تھا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور میں اپنے کو کلکتہ کے
بڑا بزار، چورنگی اور سیالدہ میں کھڑا ہوا ایک پاگل محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے دن جب سرکاری نوکری کا اور رخصت ختم ہونے کا خیال آیا تو میں تمام دوستوں اور
ساتھیوں سے رخصت ہو کر بمبئی میل سے تیس گھنٹے میں مغل سرائے ہوتے ہوئے بنارس واپس پہنچ گیا۔

رات گئے کبھی کبھی میرے مکان نیچی باغ میں بنارس cell کی بھی میٹنگ ہو جایا کرتی تھی اور
میں ان لوگوں کو ضروری نمبر شمار سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

اس کانفرنس کے ایک مہینہ کے اندر اندر ہفت روزہ "نظام" بھوپال میں کانفرنس پر کرشن چندر
کا رپورتاژ "پودے" پڑھنے کو ملا جس کو کرشن چندر کا شاہکار کہنا درست ہوگا۔ یوں تو اس کانفرنس
میں بہت سے ترقی پسند ادیب ہیرو بنائے جا سکتے تھے مگر فنکار نے ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی جگر حیدرآبادی
ایک مزدور شاعر کو ہیرو بنایا تھا جس نے "پودے" کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

بنارس کے قیام میں علامہ سرفراز، حکیم کاظم اور نذیر بنارسی کے ایک اور خانوادہ سے میری بڑی دوستی
تھی اور وہ آغا حشر کا گھرانا تھا۔ آغا نشر ان کے بھائی، اشتیاق آغا حشر کے بھانجے ان کے دو اور عزیزان قریب
آغا منتظر اور آغا رشید۔ ان حضرات سے آغا حشر کے کارنامے واقعات زندگی سننے سے علم میں اضافہ ہوتا تھا۔
اندازہ ہوتا تھا کہ آغا صاحب کتنے بڑے فطین اور وطن دوست انسان تھے۔ ان کے ڈراموں سے زیادہ مجھ کو
ان کی غزلیں پسند تھیں۔ بیساختہ جواب دینا اشعار کہنا اور ڈراموں کے دو دو تین تین مناظر بیک وقت لکھوانا
انھی کا حصہ تھا۔ اردو کی ترویج اور ڈرامہ نگاری کے فن کو ترقی دینے میں ان کا بڑا یوگدان رہا ہے۔

مولوی حمایت احسن صاحب استاد فارسی کوئنس کالج بنارس اور عبدالغفار خان علیگڑھ

یونیورسٹی کے مشہور ہوکی اسپکیر کی صحبت میں بھی بڑی دلچسپیاں رہتی تھیں۔ غفار خاں اس وقت تو N.Ry. کے بنارس میں A.T.S. تھے۔ اس سے پہلے وہ ریلوے Crew انگرودیں تھے۔ ریلوے ریکریشن کلب کی نامی ہوکی ٹیم ایک زمانہ میں کیپٹن تھے اور میں فیض آباد میں اپنے کالج کی ٹیم میں تھا۔ کسی ٹورنامنٹ میں ہم دونوں کا مقابلہ ہوا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگے "واثق میں نے تم کو اس سے بہت پہلے بھی کہیں دیکھا ہے یاد نہیں کہاں"۔ میں نے کہا "ہاں ضرور دیکھا ہوگا۔ اور ہم نے فیض آباد میں آپ کی ٹیم کو ایک گول سے ہرایا بھی تھا"۔ تو خاں صاحب بولے "اچھا تو آپ وہی خوبصورت سے لونڈے ہیں جو گیند لے کر میرے قریب سے کبھی دائیں کبھی بائیں جھکائی دیکر نکل جاتا تھا"۔ اس کے بعد تو ہم لوگ بڑے یار ہوگئے تھے۔ ان کے ایک کلنگ پانڈے پانڈے تھے۔ اللہ سے ہم دونوں بہت لطف لیا کرتے تھے۔ مولوی حمایت احسن صاحب ہم لوگوں کے بہت بے تکلف بزرگ دوست تھے۔ بہت قابل، پر مذاق اور حاضر دماغ آدمی تھے۔ دوران جنگ ایران میں برطانوی فوجی افسروں کو فارسی پڑھانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ایک دن طہران میں ان کے گھر میں آٹا ختم ہوگیا۔ ہندوستانی باورچی نے جو ہمراہ گیا تھا اطلاع دی کہ طہران میں کسی دوکان پر آٹا نہیں مل رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا یہ بھلا کس طرح ممکن ہے کہ یہاں آٹا نہ ملے اور خود بازار روانہ ہوگئے جب پنساری کی دوکان پر پہنچے تو آٹے کی فارسی بھول گئے۔ آٹا مانگا تو جواب ملا "نمی دونم" مولانا کا حافظہ تو جواب دے چکا تھا مگر ذہانت برقرار تھی۔ دوکاندار سے پوچھا "گندم داری" اس نے کہا "بلے ہست" تو مولانا چکی کی طرح اپنا ہاتھ مٹھی باندھ کر گھماتے ہوئے کہا "گندم کا یوں یوں داری" تو دوکاندار نے ڈانٹا "نمی زنی کہ آرد می خواہی" "ہاں ہاں وہ کم آرد بدہ"۔ مولانا اپنے ساتھ یہاں سے ایک بکس بھر کے سوٹ اور ایک بکس چمڑے کے جوتے لے گئے تھے اور سب کا سب دس گنے داموں پر طہران میں بیچ آئے تھے۔



اواخر ۱۹۴۵ء میں بابا کا انتقال ہوگیا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ بوبو کے علاوہ دنیا میں اب میرا کوئی نہیں رہا۔ ایسا شفیق باپ جس نے باوجود میری نالائقیوں اور خودرائیوں کے کبھی مجھ کو کچھ نہ کہا۔ میں نے ان کی کوئی تمنا پوری نہ کی اور وہ زندگی بھر میری ہر تمنا اور ضروریات پوری کرتے رہے۔ ہمارے والدین چند معاملات میں دوسرے والدین سے بالکل مختلف تھے۔ وہ اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے تھے مگر کیا مجال کہ ان کے کسی قول و فعل سے ان کی یہ محبت ظاہر ہو جائے۔ ان کو اولاد کے ساتھ چونچلے بازی سے سخت نفرت تھی۔ بابا کے انتقال کے بعد گھر کا سب انتظام میرے سر پر آگیا۔ بوبو کی دیکھ بھال ان کے آرام و دلجوئی کا خیال، جائداد کی نگرانی وغیرہ غرض کہ ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں۔ اس سبب سے ہر ہفتہ میرا وطن آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ آسانی کے لیے میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ آسٹین ۸ کار خریدی جس نے میرا مدتوں ساتھ دیا۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں میں بنارس کا ڈپٹی ٹاؤن راشننگ افسر ہوگیا۔ انھی ایام میرے ایک ہم وطن سینیر ڈپٹی کلکٹر بنارس کے ٹاؤن راشننگ آفسر ہو کر آگئے۔ اوّل اوّل تو ان سے تعلقات نہایت خوشگوار رہے مگر کچھ مدت بعد ان کی بیوی کے لالچ اور بدتمیزیوں کی وجہ سے ذہنی تعلقات ناخوشگوار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ محترمہ نے مجھ کو فون کیا کہ داماد صاحب اکلائی ساڑیاں کہیں نہیں مل رہی ہیں اپنے انسپکٹر سے کہئے کہ کہیں سے تلاش کر کے چھ ساڑیاں دے جائے تو بیحد شکرگزار ہوں گی۔ میں نے تلاش کروا کے ساڑیاں بھجوا دیں۔ ساڑیوں کی قیمت ادا کرنے کو ہفتوں ٹالتی رہیں مگر جب انسپکٹر نے صبح شام تقاضہ شروع کیا تو مجبوراً دو ساڑیوں کی قیمت اور چار ساڑیاں واپس کر دیں۔ چونکہ کپڑوں کی راشننگ نہ تھی ان کی بات باقی رہ گئی۔ اس کے چند دنوں بعد ان کا فون آیا کہ گھر میں گیہوں ختم ہو گیا ہے۔ ایک بورا کسی راشن کی دوکان سے بھجوا دیجئے۔ میں نے ان کو صاف جواب دیدیا کہ بھابھی صاحبہ ساڑی کی اور بات تھی۔ گیہوں تو راشن کارڈ کے علاوہ کسی طرح ملنا ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا ہوں کہ اور وہ بھی قاعدہ کے خلاف کہ آپ اپنے گاؤں سے گیہوں منگوا لیجئے ناکے پر کوئی انسپکٹر اس کو چیک نہ کرے گا۔ معلوم نہیں انھوں نے گیہوں اپنے وطن سے منگوایا یا نہیں البتہ

اپنے شوہر نامدار سے اُن دونوں باتوں کی شکایت کی اور وہ شوہر ایسے زن مرید کہ زبان سے کچھ کہہ تو سکتے نہ تھے البتہ میرے فیصلوں اور نوٹنگ پر اعتراضات کرنا شروع کردیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک فائل کئی کئی دن تک میرے اور ان کے دفتر کے درمیان سفر کرتی رہتی تھی۔ اس پر میں نے تحریری نوٹ بھیجا کہ اس طرح کام کا بھگتان نہ ہو سکے گا۔ اگر آپ کو میرے کسی فیصلہ سے اتفاق نہیں تو اس کو مسترد کرکے اپنا فیصلہ صادر کردیا کیجیے۔ فائل کو نچائیے نہیں۔ میرا یہ نوٹ انھوں نے ضلع مجسٹریٹ کو دکھلا کر میری زبانی شکایت کی۔ جب D.M. نے مجھ کو بلوا بھیجا تو میں نے وہاں جاکر سارے واقعات بیان کردیے جن کی تحقیقات کرکے T.R.O کا تبادلہ کرادیا۔ کم تنخواہ والوں کو تو رشوت ستانی پر معاف بھی کیا جاسکتا ہے مگر جب میں کسی افسر کو رشوت کا مرتکب پاتا ہوں تو میرے تن بدن میں آگ ہی لگ جاتی ہے۔

جب دنیا کا پہلا اور دوسرا جوہری بم ۱۹۴۵ء کے وسط میں ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکی ہوابازوں نے گرایا تو جاپانی افواج نے Surrender (شکست) قبول کرلی اور جنگ کے مشرقی محاذ پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا اور بم گرانے والا ہواباز پاگل ہوگیا۔ لاکھوں انسان جل کر کوئلہ ہوگئے۔ لاکھوں بے دست و پا ہوگئے جنھوں نے سسک سسک کر جان دی اور لاکھوں ابتک مر رہے ہیں۔ عالم انسانیت کا ضمیر خود کو مجرم محسوس کرنے لگا اور دنیا کے فنا ہو جانے کے تمام امکانات نظر آنے لگے۔ دوسری طرف روسی افواج نے لینن گراڈ میں نو سو دن کے محاصرے فاقہ کشی، خون خرابے کے بعد جان کی بازی لگا کر نازی افواج کو ڈھکیلتے اور شکست دیتے ہوئے برلن پر ۱۹۴۶ء میں اپنا جھنڈا لہرادیا۔ نتیجہ میں ہٹلر نے خودکشی کرلی اور جرمن افواج نے ہر محاذ پر ہتھیار ڈال دیے اور دوسری عالم گیر جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ دنیا ایک بار پھر مکمل تباہی اور غلامی سے بچ گئی۔ اُس جنگ میں جن کو شکست ہوئی وہ مرے ہوئے اور فتح پانے والے ہارے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ادھر ہندوستانی قوم مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح کی قیادت میں جنگ آزادی کے آخری مورچہ پر فتح کے جھنڈے کھول رہی تھی کہ انگریزوں نے ملک کو تقسیم کرکے ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو آزاد کردیا۔ اس نوعیت کی آزادی نے برصغیر کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کو تقریباً ایک سال کے لیے خونخوار جانوروں میں تبدیل کردیا۔ آپس میں خون کی وہ ہولی کھیلی گئی کہ آج تک زخموں کا پوری طرح اندمال نہیں ہوسکا ہے۔ ملک کیا تقسیم ہوا کہ ملک کا ہر گھر تقسیم ہوگیا، ہر خاندان تقسیم ہوگیا حتیٰ کہ ہر فرد تقسیم ہوگیا اور ابھی تک تقسیم کے اس سبق کو دونوں ملکوں میں کسی نہ کسی شکل سے دہرانے کی کوشش جاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں سے اپنا Lock, Stock & Barrel (ڈیرہ خیمہ) لے جاتے ہوئے انگریزوں نے جو چاہا تھا وہی ہم

دونوں ملک کروا رہے ہیں۔ افسوس۔

مگر یہ سب دل ہلا دینے والی داستانیں یہیں نہیں ختم ہوتیں۔ ملک میں ہزاروں مسلمانوں کی جان بچانے والے انسان مہاتما گاندھی کو یہیں کے ایک کٹر ہندو نے ۳۰ جنوری ۴۸ء کے دن پستول کی گولیوں سے چھلنی چھلنی کر کے عین عالم عبودیت میں ہلاک کر دیا۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک کے اُس خونی دور میں سینے میں دردمند دل رکھنے والا کوئی ایسا ادیب یا فنکار نہ تھا جس کا قلم اظہارِ غم و غصہ اور انسان دوستی کے مسائل پر نہ چلا ہو۔ چنانچہ میں جو اس وقت اپنی زندگی کے حالات قلمبند کر رہا ہوں، میں نے اس دور میں لہو کا بنگال کے علاوہ زویا تانیا، اپنی تصویر سے، الف لیلہ، روزن کی آڑ میں، نئی کروٹ، ماؤنٹ ایٹم، قدم کی جھنکار، رقصِ بسمل، تقسیم پنجاب، میر کارواں اور فرقہ وارانہ فسادات پر مختصر نظموں کا مجموعہ "چیخیں" ۱۹۴۸ء میں اور جملہ تحقیقات کا انتخاب "جرس" ۱۹۵۰ء میں نذرِ قارئین کیا۔ قرائن بتلاتے ہیں کہ میری وہی نظمیں عوام تک پہنچیں جن کو میں بالعموم مشاعروں میں پڑھا کرتا تھا۔ باقی نظموں کی طرف نقادوں نے کوئی توجہ نہ دی اور ناشروں کی نا اہلی کی وجہ سے میرا مجموعہ کلام "جرس" کم ہاتھوں تک پہنچا۔

Seniority (تقدم) کے اعتبار سے میں اپریل ۴۸ء کو بنارس کا ٹاؤن راشننگ آفسر ہو گیا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اور قومی حکومت نے آئے دن انتظامی معاملات میں تجربے کرنا شروع کر دیے تھے۔ ملک کے آزاد ہوتے ہی کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسندوں نے کانگریس پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا اور کانگریس کا بائیں بازو ایک انقلابی متحدہ محاذ بنا کر حزبِ مخالف کی حیثیت سے کام کرنے لگا تھا، اور غیر قانونی بھی قرار پا چکا تھا۔ اُسی اتھل پتھل میں ۳۰ جون ۴۸ء کو میرے ترقی پسند خیالات اور اشتراکی نظریہ کی پاداش میں میری نوکری ختم کر دی گئی۔ اور میں چارج دے کر خاموشی سے بغیر اپنے مربیوں اور دوست احباب سے رخصت ہوئے اپنے وطن چلا گیا۔

۱۹۴۸ء میں حفاظت حسین صاحب I.C.S. کمشنر بنارس ڈویژن ہو کر آ گئے تھے۔ حفاظت صاحب ضلع آرا (بہار) کے رہنے والے تھے اور ان کی بیگم رضیہ صاحبہ بارہ بنکی کی تھیں۔ دونوں انتہائی شریف خلیق اور صاحبِ ذوق میاں بیوی تھے۔ ہوا یہ کہ گاندھی جی کی شہادت پر بنارس میں ایک ماتمی جلسہ ہوا جس کی صدارت حفاظت حسین صاحب کر رہے تھے۔ میں نے گاندھی جی پر اپنی مشہور نظم "میر کارواں"

سنائی جس کو موصوف نے بہت پسند کیا اور جلسہ ختم ہونے پر یہ میاں بیوی مجھ کو ساتھ لیکر اپنے بنگلے آئے اور معلوم کر کے کہ میں بنارس کا T.R.O. بھی ہوں بہت خوش ہوئے۔ ان کے برتاو میں کبھی اس احساس کا شائبہ نہیں ملا کہ وہ میرے سینیر آفیسر ہیں۔ انھوں نے اور ان کی بیگم نے ہمیشہ مجھ کو ایک ادیب اور بے تکلف دوست کی طرح سمجھا۔ مجھ کو بیحد عزیز رکھتے تھے اور تقریباً ہر اتوار یا تعطیل میں اپنے ساتھ دن گذار نے پر اصرار کرتے تھے۔ مجھ کو ان جیسے بالاقد، حسین اور پر وقار میاں بیوی زندگی میں کم ہی ملے۔ رضیہ بیگم بہت اچھی باورچن بھی تھیں۔ دستر خوان پر اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی کوئی چیز ضرور رکھتی تھیں اور حفاظت صاحب اپنے زمانہ تعلیم کے آکسفرڈ میں خریدے ہوئے شیشے کے پرکولیٹر میں کافی Brew کشید کر کے پلاتے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے اور جس کے بدلے میں میرے پاس بجز اخلاص و محبت کے اور کچھ نہ تھا۔ انسانی پیکر میں ہر دو فرشتہ تھے۔

نوکری ختم ہو جانے پر بڑی خاموشی سے بنارس چھوڑ دینے میں سب سے بڑا راز یہی تھا کہ اگر یہ راز اس وقت افشا ہو گیا تو یہ دونوں لکھنؤ کی زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں گے۔

ڈیڑھ تین ہفتوں کی غیر حاضری نے جب میری برطرفی کا راز فاش کیا تو حفاظت حسین صاحب نے بحیثیت کمشنر کے جونپور کا دورہ بول دیا۔ غالباً یہ اواخر جولائی یا اگست ۱۹۴۸ء کا مہینہ تھا۔ اور دورہ کی Itinerary (تفصیلات) میں میرے نام سے کجگاؤں کا دورہ بھی درج تھا جس کی سرکاری نقل میرے پاس بھی آئی تھی۔ اس پر میں نے کلکٹر ضلع کو مطلع کیا کہ کمشنر اور ان کی بیگم اس روز شب کا کھانا میرے غربت کدہ پر تناول کریں گے۔ اس دعوت میں کلکٹر ضلع جن افسران اور عمائدین شہر کو مناسب سمجھیں میری جانب سے مدعو کر دیں۔ چنانچہ چٹکی بجاتے وہ دن آگیا۔ مہمانوں کی آمد چراغ جلے ہی شروع ہو گئی تھی۔ سب سے آخر میں تقریباً ۷ بجے دو کاریں لال کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئیں۔ اگلی میں سے کلکٹر اور کپتان پولیس برآمد ہوئے اور دوسری میں سے حفاظت حسین صاحب اور رضیہ بیگم غیر معمولی سنجیدہ چہرہ بنائے ہوئے باہر آئے جہاں میں ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھا۔ حفاظت صاحب نے دیکھتے ہی بڑھ کے مجھ کو لپٹا لیا اور رضیہ بیگم نے پشت سے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ وامق صاحب آپ سے اس مغائرت اور بے مروتی کی توقع نہ تھی۔ کیا دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ اور حفاظت صاحب نے صرف مزاج پرسی کی اور متعلقین کی خیریت دریافت

کی۔ اور ہم سب لوگ بالکل ساکت آہستہ آہستہ ایک ماتمی جلوس کی شکل میں کوٹھی کے پائیں باغ میں داخل ہو گئے جہاں چبوترے پر نشست کے لیے ایک اوسط سائز کا پنڈال بنایا گیا تھا۔ مرکزی صوفہ سٹ پر ایک جانب پہلے رضیہ بیگم بیٹھیں ان کے بعد حفاظت صاحب اپنے بغل میں مجھ کو بٹھاتے ہوئے بیٹھ گئے۔ تب بقیہ مہمان بھی اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے رضیہ بیگم سے کہا کہ والدہ (لولو) آپ کی آمد کی منتظر ہیں۔ میں نے پہلی بار ان کو بجائے ساری کے غرارہ دار پائجامے کرتے اور دوپٹے میں دیکھا تھا (یہ بہت پروقار لباس ہے)۔ ان کو گھر میں لے جاکر میں نے تعارف کراتے ہوئے لولو کے سپرد کر دیا۔ نشست کا انتظام تخت پر فرش اور گاؤ تکیوں کا تھا۔ لولو نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور رضیہ بیگم تسلیم کر کے ان کے قریب بیٹھ گئیں جن کو میری تینوں بہنوں اور بیویوں نے گھیر لیا اور بارہ بنکی کی باتیں ہونے لگیں۔ دوسری طرف میراثنوں نے ڈھولک پر غزلیں گانا شروع کر دیں۔ جب میں باہر آیا تو ہال کمرہ میں میزوں پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ اس لیے میں نے باغ میں جاکر حفاظت صاحب اور دوسرے حضرات کو کھانے کے کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔ حفاظت صاحب میرے ہاتھ کا سہارا لیکر کھڑے ہو گئے۔ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کھانے کی میز پر حسب مراتب سب نے اپنی اپنی جگہ لے لی۔ میز کے سرے پر داہنی جانب حفاظت صاحب اور بائیں کرسی پر یہ کہتے ہوئے میں بیٹھ گیا کہ رضیہ بیگم اندر والدہ کے ساتھ کھانا نوش کریں گی۔ بہرحال چمچے بجنے لگے اور کھانا شروع ہو گیا۔ اب بات کرنے کی باری حفاظت صاحب کی تھی۔ ایک ہی لقمہ لینے کے بعد جھک کر مجھ سے دریافت کیا" وامق صاحب۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ" بجز ایک تکلیف کے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ وہ یہ کہ آپ یہاں نہیں ملتے۔ شرمندہ ہوں کہ بنارس سے بغیر رخصت حاصل کیے ہوئے چلا آیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ رخصت نہ ملے گی، اور میرا ضمیر گوارہ نہیں کرتا تھا کہ میرے لیے آپ کو کسی کا احسان لینا پڑے"۔" نہیں وامق صاحب کسی کا احسان کیسا۔ ارے وہ بھگوان سہائے چیف سکریٹری تو میرا کلیگ ہے اور ہم دونوں ایک ہی بیچ کے بے تکلف دوست ہیں۔ میں واقف تھا کہ اس معاملہ میں آپ کی انا بالغ ہو گی اس لیے بغیر آپ سے مشورہ کیے ہوئے میں نے اپنے یار بھگوان سہائے کو فون پر بہت کچھ کہہ ڈالا۔ ان کو میرے آپ کے تعلقات کا علم نہ تھا ورنہ یہ صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔ بہرحال اس وقت T.R.O. کی کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور میں نے بھگوان سہائے کو اپنی رضامندی دیدی

آپ کو فی الحال A.R.O. کی کسی جگہ پر بھیج دیں اور جو بھی T.R.O. کی پہلی خالی جگہ پیدا ہو گی آپ کو ملے گی۔ قاعدہ کی رُو سے آپ کو تنخواہ آپ کی آخری تنخواہ کے برابر ملے گی مگر خدا کے لیے کہیں آپ اپنی جھونک میں انکار نہ کر دیجیے گا۔ یہ تو آپ کو آپ کا حق واپس مل رہا ہے۔ آپ کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی زیادتی کی ہے۔ میں ان سب کی طرف سے معافی مانگتا ہوں"۔ " ارے حفاظت صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مجھ کو شرمندگی ہوتی ہے۔ واقعہ تو یہی ہے کہ آپ نے اس معاملہ کی تہ کو پکڑ لیا ہے۔ میں ویسا ہی کروں گا جیسا آپ فرمائیں گے"۔

کھانا ختم ہونے پر پہلے میں نے حفاظت صاحب اور دوسرے مہمانوں کو پنڈال میں پہنچایا اور اندر کا حال دیکھنے گھر میں چلا گیا۔ وہاں بھی کھانا ختم ہو چکا تھا اور چلمچی میں ہاتھ دھلائے جا رہے تھے۔ بڑی چہل پہل تھی اور چہروں پر رونق۔ رضیہ بیگم نے فرمایا " آج تو آپ سے وطن بارہ بنکی کا لطف آ گیا۔ آپ چچی جان کو کبھی بنارس نہیں لائے"۔ میں نے کہا " والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ نے گھر کے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ معلوم نہیں آپ کے ساتھ کچھ کھایا بھی کہ نہیں۔ اب کھانا بھی ایک ہی وقت کھاتی ہیں۔ بوبو اب رضیہ بیگم کو اجازت دیجیے۔ ابھی برسات ختم ہوئی ہے اور جونپور کا راستہ بہت خراب ہو چکا ہے"۔

رضیہ بیگم کو آتے ہوئے دیکھ کر حفاظت صاحب کھڑے ہو گئے ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ حفاظت صاحب جس قدر محزون اور سنجیدہ آئے تھے اس سے زیادہ خوش و خرم واپس جا رہے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اُن میاں بیوی کو خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ اس کے بعد کلکٹر ضلع اور کپتان وغیرہ کو رخصت کر کے دوسرے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مصافحہ کر کے گھر میں چلا گیا۔ بوبو سے رضیہ بیگم نے سب باتیں بتلا دی تھیں اور کہا تھا کہ آپ واثق صاحب کو پھر نوکری قبول کرنے پر مجبور کیجیے گا۔

جگہیں خالی ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ چنانچہ ۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو الہ آباد میں بحیثیت A.R.O. کے میرا تقرر ہو گیا۔

الہ آباد

ہر ملک میں غیر ملکی حکومت یا شہنشاہیت کے خلاف آزادی کو چلانے اور کامیاب بنانے میں سرکاری نوکر خفیہ طور پر نہایت موثر رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ آزادی سے پہلے برطانوی حکومت

کے خلاف اور آزادی کے بعد قومی حکومت کی جارحانہ پالیسیوں کے خلاف جد وجہد میں ترقی پسند سرکاری افسروں اور اہلکاروں کا کردار ملک گیر پیمانہ پر بہت اہم رہا ہے۔ ان افراد نے اپنے لیے خطرہ مول لینے کی نادر مثالیں قائم کر دیں۔ عام شہری کے لیے کسی تحریک میں کھل کر حصہ لینا اس درجہ خطرناک نہیں ہے جتنا کہ سرکاری ملازم کا در پردہ کام کرنا جو اگر گرفت میں آجائے تو ملازمت سے برطرفی کے علاوہ دوسری سزائیں بھی سخت تر ملتی ہیں۔ مگر سیاسی شعور اور نظریاتی وجدان اہل جرأت کے لیے نعمت اور موقع پرستوں کے لیے لعنت سے کم نہیں ہے۔ تحریک آزادی یا ترقی پسند تحریک میں حصہ لیتے ہوئے قانونی گرفت میں نہ آنا قابل تعریف سمجھا جاتا ہے کیونکہ محاذ جنگ پر ایک سپاہی یا رسدرسال کی بھی کمی لشکر کو کمزور بناتی ہے۔ نتیجہ میں پس پردہ کام کرنیوالوں کے کارنامے اپنی اہمیت کی خود مثال ہوئے ہیں۔ میں نے بھی قیام الہ آباد کے زمانہ میں چند اسی نوعیت کے کام کیے ہیں اور ایک ادیب اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ قیام بنارس میں جو کچھ میں تحریک کی خدمت کر سکتا تھا کھل کے کی مگر الہ آباد میں میری جد وجہد زیادہ سیاسی نوعیت کی ہو گئی تھی اور وہ بھی حکومت کے خلاف۔ اس لیے موخر الذکر پہ مجھ کو ناز ہے۔ C.P.I. پر حکومت کا تشدد حد سے بڑھا ہوا تھا اور ساتھیوں کو کہیں مل بیٹھنے کی جا پناہ اور کہیں راہ فرار بھی نہیں مل رہی تھی۔ کئی انقلابی ساتھیوں کے سر پر گرفتاری کا سرکاری انعام بھی تھا۔ جیسے بستی کے پرکاش بابو وغیرہ۔ اسی زمانے میں C.P.I. کے ایک بہت بڑے لیڈر داڑھی رکھے چھپتے چھپاتے الہ آباد پہنچے۔ جب یہاں بھی مخبروں نے خطرے کی گھنٹی بجائی تو ان کو راتوں رات رائے بریلی پہنچانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اور کلب عباس صاحب کی کار ان کی بیگم صاحبہ کی مدد سے حاصل کی گئی تھی۔ اس کو باری باری چلانے والوں میں ایک میں بھی تھا۔ کلب عباس صاحب اس وقت انکم ٹیکس ٹریبونل کے ممبر تھے اور ان کی بیگم صاحبہ ایک عراقی نژاد خاتون تھیں جن کا دیرینہ تعلق عراق کی کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔ محترمہ یہاں کے کمیونسٹ جلسے جلوس میں برقعہ پہن کر حصہ لیتی تھیں۔ اس زمانہ میں میرا قیام ڈاکٹر اعجاز حسین کی کوٹھی "نشیمن" کے ایک حصہ میں تھا۔ اعجاز صاحب ایک خالص ترقی پسند ادیب تھے۔ ان کو اشتراکیت سے جو لگاؤ تھا احاطہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ اس زمانہ ہی میں وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ لوکے تھپیڑوں میں پارٹی کے جلوسوں کی رہنمائی کرنے میں سب سے آگے رہا کرتے تھے۔ ان کے دولت کدہ نشیمن میں ترقی پسندوں اور ساتھیوں کا ہر وقت مجمع لگا رہتا تھا اور اعجاز صاحب ان سب کی دامے درمے قدمے سخنے مدد کرتے تھے۔ اعجاز صاحب کی تالیفات میں اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک کے افکار کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔ اعجاز صاحب کی ان خدمات کو آج کامریڈ ضیا الحق اور ڈاکٹر محمد عقیل وغیرہ جس طرح سراہ رہے ہیں اس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

یہ کہ میں اپنے کار کی خود سروسنگ کرتا تھا اس کا اعادہ کسی گذشتہ باب میں کرچکا ہوں اس سلسلہ میں اپنا ایک لطیفہ یاد آیا۔ اتوار کا دن تھا۔ میں نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے کار کے نیچے چیت لیٹا کسی پرزہ کو درست کر رہا تھا۔ ہاتھ پیر اور چہرہ گریس اور میل سے کالے ہو رہے تھے۔ پاؤں البتہ کار کی حدود سے باہر نکلے ہوئے تھے کہ ایک شخص میں بھی جس کے محض پاؤں ہی دیکھ سکتا تھا قریب آیا اور میرے پیروں کو ٹھوکر دیتا ہوا بولا کہ "اے ڈرائیور .A.R.O۔ اے۔ آر۔ او) صاحب کہاں ہیں۔ ان سے بھینٹ کرنا ہے۔ باہر نکلو اور ذرا ہم کو ان سے ملادو"۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا "بھائی ذرا دھیرج سے کام لو یہ کام پورا کرلیں تو نکل کے تم کو اے۔ آر۔ او صاحب سے ملادیں گے"۔ اس نے دوبارہ ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا "تو جلدی کام پورا کر کے نکلو کچھ اوپری آمدنی والا معاملہ ہے"۔ میں نیچے سے گھسٹتے ہوئے باہر نکلا اور تیزی سے برآمدہ میں ہوتا ہوا کمرہ میں چلا گیا۔ غسل خانہ میں ہاتھ منہ دھو کر تولیہ سے منہ پوچھتا ہوا کمرہ سے جب باہر آیا تو عمداً وہی نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے تھا کہ اس کو مجھے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ اور میں نے اس سے کہا کہ "کہو کیا کہنا ہے۔ میں ہی اے۔ آر۔ او ہوں"۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور وہ معافی مانگتے ہوئے ہاتھ جوڑے میرے پیروں کی طرف جھکنے لگا تو میں نے اس کو ہاتھوں سے روکا اور قریب پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔

وہ کسی اوپری آمدنی کی بات کرنے آیا تھا مگر مجھ کو پورا یقین ہے کہ وہ Expenditure from income (مجھ کو دیکھ کر اخراج ذیل) میں مبتلا ہو گیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ "ہم ایک راشن کی دوکان کے لائسنس دار ہیں۔ حساب کتاب کی غلطی پکڑ کر انسپکٹر صاحب نے ہمارا لائسنس جپت (ضبط) کرلیا ہے اور دوکان بند کر کے تالے پر مہر لگا دی ہے اور ایک ہجار روپیہ پر راجی نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ہجار ہجور لیں اور ہم کو چھوڑ دیں"۔ میں نے کہا "تم فوراً ہمارے سامنے سے چلے جاؤ۔ تم نے ایک نہیں دو غلط کام کیے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ دوکان کا حساب کتاب ٹھیک نہیں رکھا جس پر تم جرمانہ وغیرہ ادا کر کے معاف کئے جاسکتے تھے مگر دوسرا اس سے بڑا جرم یہ کیا کہ تم نے میرے ڈرائیور کو ٹھوکر سے مارا۔ اور اس جرم کی سزا میں تمہارا لائسنس ضرور خارج کیا جائے گا اس لئے کہ تم انسان نہیں جانور ہو۔ میں کل دفتر کھلتے ہی یہ حکم نکالونگا"۔ میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرا اردلی آگیا اور اس نے اس کو ڈھکیل کے کوٹھی سے باہر نکال دیا۔

جب میں "نشیمن" سے اٹھ کر لوکر گنج والے بنگلے میں منتقل ہو گیا جس کے دو کمروں میں لوکر گنج سب ایریا کا دفتر بھی تھا تو کچھ آزادی اور تخلیہ کا احساس ہوا۔ اطہر پرویز ان دنوں الہ آباد ہی میں سکونت پذیر

تھے۔ پارٹی کا کام بھی کرتے اور الہ آباد انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بھی تھے۔ ایک دن مجھ سے ملنے آئے اور تاریخ شب میں میرے بنگلے پر ایک خفیہ میٹنگ کا منصوبہ بنا کر چلے گئے ابھی میرے عیال وطن سے نہیں آئے تھے۔ البتہ میری خالہ احمدی بی بی اور علی حسین جعفری گرمیوں کی تعطیل گذارنے میرے یہاں آ گئے تھے۔ دوسرے دن شب میں تقریباً دس بجے اطہر پرویز مع بستہ کے پرکاش بابو اور دوسرے روپوش ساتھیوں کے پہنچ گئے۔ میرا سونے کا کمرہ بالکل تاریک اس خفیہ میٹنگ کے لیے لیس کر دیا گیا تھا۔ روشن دانوں پر سیاہ کاغذ چڑھا دئے گئے تھے۔ مدّن خالہ نے بروقت ضرورت استعمال کے لیے میری بند دق مع پچاس کارتوسوں کی پیٹی کے، ساڑیاں اور برقعے، چار بنانے کا پورا سامان اور ایک سرنگوں پڈلیمپ قاعدے سے گھر میں رکھ دیا تھا۔ کمرے کو ان ساتھیوں کے سپرد کر کے ہم تینوں افراد بنگلے کی چھت پر چلے گئے اور شب بھر پہرا دیتے رہے۔ یہ خفیہ میٹنگ تقریباً تین دن تک راتوں میں چلی تھی۔ اور طلوع سحر سے پہلے یہ لوگ خاموشی سے کسی طرف نکل جاتے تھے۔ آخری دن شب میں جب یہ لوگ آئے تو ایک کے پاس کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک بنڈل ڈپلیکیٹنگ کا غذ اور ایک اسٹنسل پیپر تھا۔ اطہر پرویز کو میں نے پہلی ہی ملاقات میں بتلا دیا تھا کہ میرے کمرے کے بغل ہی میں سائکلو اسٹائلنگ مشین کا کمرہ ہے۔ غرض کہ نصف شب تک ان سر بکف ساتھیوں نے آخری فیصلہ لیکر اسٹنسل کاٹا اور چار بجے تک اس کو سائکلو اسٹائل کر کے رخصتی کی دستک دی اور ہم لوگوں نے ان کو خدا حافظ کہہ کے رخصت کیا۔

اطہر پرویز سے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب صوبائی کمیٹی کے ممبران تھے جن کے فیصلہ کا پارٹی ہیڈ کوارٹر کو انتظار تھا۔ اس فیصلہ میں کسی بہت بڑی ہڑتال اور مظاہرے کی تمام ملک کو دعوت دینے کی تجویز تھی۔ ان لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد اطہر پرویز ایک رات آئے اور ہندی اردو میں ایک اسٹنسل کاٹا اور گسٹنر سے اس کی سو کاپیاں نکالیں اور آدھی رات بعد کہا کہ "کارنکالیے۔ اور اسٹوڈ ov e ٹ stok پر لیٹی بنوا لیجیے۔ اس شب ان پوسٹروں کو مختلف گلی کوچوں میں چسپاں کر کے اور اطہر پرویز کو ان کے گھر چھوڑ کے تقریباً چار بجے صبح اکر گنج واپس آیا تھا۔

اسی زمانہ میں "سردارجی" افسانہ لکھنے پر خواجہ احمد عباس پر الہ آباد میں مقدمہ چلا تھا۔ وہاں کی P.W.A. نے ایک ڈفنس کمیٹی بنائی تھی جس کا میں بھی ممبر تھا۔ اور خواجہ صاحب کی نقل و حرکت کا انچارج اس لیے بنایا گیا تھا کہ میرے پاس گاڑی تھی۔ دو تین پیشی میں یہ مقدمہ خارج ہو گیا۔ مگر اسی P.W.A. میں

رامانند ساگر کے ناول "اور انسان مرگیا" پر خواجہ صاحب کو اپنے پیش لفظ کی صفائی دیتے ہوئے دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ بحث میں بڑی گرما گرمی رہی نہ معترضین نے ہار مانی نہ خواجہ صاحب نے اپنی شکست تسلیم کی اور کشتی برابر کی چھوٹی۔ میرے خیال میں خواجہ صاحب کا موقف صحیح تھا۔

انجمن کے اسی اجلاس میں میری نظم "رقص بسمل" پر بھی اعتراض تھا کہ جبکہ حالات انقلاب کے لیے سازگار ہیں نظم انتظار کرنے کی تلقین کر رہی ہے۔ اس سے شعور کی کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ بس کان پکڑ کے اٹھوایا بیٹھوایا نہیں گیا ورنہ کوئی اور درگت باقی نہیں رہی تھی اور اس Impeachment کا مواخذہ میں اطہر پرویز سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ بہرکیف یہ کشتی بھی برابر چھوٹی۔ ادیبوں کے لیے نظریاتی اعتبار سے یہ دور بہت سخت تھا۔ اور جس میں بہتوں کے پائے استقامت میں لغزش آگئی تھی اور بہت سے ادیب اکھاڑہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد الہ آباد میں IPTA کی ایک بڑی کانفرنس ہوئی تھی جو بہت کامیاب رہی اور اس کے دوران بلراج ساہنی اور عمر شیخ نے مجھ سے بڑی مختصر نوٹس پر کئی گیت لکھوائے تھے۔ اس کانفرنس کا آخری اجلاس مشاعرہ پر ختم ہوا۔ مشاعرہ میں سب مقامی شعرا اور IPTA کے فنکاروں نے حصہ لیا تھا۔ جب فراق گورکھپوری کو اس میں شرکت اور صدارت کرنے کی دعوت دی گئی تھی تو انھوں نے شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ مگر جب مشاعرہ عین شباب پر تھا تو تقریباً بارہ بجے شب کے وقت فراق صاحب افتاں و خیزاں مشاعرہ ہال کے در پر دربان سے اندر داخل ہونے کے لیے اصرار کر رہے تھے مگر IPTA والوں نے ان کو اندر نہ جانے دیا اور ایک رکشا پر بٹھا کر ان کو بینک روڈ کے پتہ پر واپس کر دیا۔

پروفیسر مسیح الزماں اور میں نے مل کر ایک ادبی ڈائجسٹ "انتخاب" کا اجرا کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بھی مسیح الزماں تھے۔ وہ رسالہ تقریباً دو سال تک خوب چلا مگر کچھ میرے تبادلہ اور کچھ فنڈ کی کمی کی وجہ سے اس کو بند کر دینا پڑا۔ البتہ انتخاب پبلی کیشنز بہت دنوں تک چلتا رہا۔ میرا پہلا مجموعہ "جنجھیں" اسی نے شایع کیا تھا جس کی ایک ایک کاپی بک گئی۔

عباس حسینی اور شکیل جمالی ایک ادبی ماہنامہ نکہت نکالتے تھے۔ اس میں میری نظم "مینا بازار" پر مجاور حسین کا ایک طویل مضمون شایع ہوا تھا جس میں لائق مضمون نگار نے نظم پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا اور نظم کے بہت سے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی جن کی طرف خود میرا گمان نہ جاتا تھا۔

الہ آباد میں ہندی ادب کی ایک بڑی انجمن "پریمل" تھی میں کبھی کبھی اس کی نشستوں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ اور وہیں میری ملاقات ہندی کے نامور کویوں اور لیکھکوں سے ہوتی رہتی تھی۔ مثلاً "شمشیر بہادر، اگّے"، مہادیوی ورما، سمترانندن پنت، نرالا، ڈاکٹر بھگوت سرن اپادھیائے، تریدلیشور اپادھیائے وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہندی ادیبوں کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ جیسے کہ کارتکی پورن ماشی کی شب میں "اگّے" کے یہاں ایک گوی سمیلن ہوتا تھا جس میں ہر زبان کے ادیبوں کو دعوت دی جاتی تھی مگر پابندی یہ تھی کہ وہاں جو بھی صنف ادب پیش کی جائے اس کا موضوع چاندنی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے نظم "جاڑے کی چاندنی" اسی موقع پر لکھی تھی۔

یوں تو اُپیندرناتھ اشک سے میری ملاقات دہلی سے تھی جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں تھے مگر جب وہ ٹی بی سینی ٹوریم سے نکل کے الہ آباد آئے تو ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلے اردو میں افسانے لکھتے تھے بعد میں ہندی میں لکھنے لگے اور ان کا شمار ملک کے نامور ہندی ادیبوں میں ہونے لگا۔ انھوں نے ہندی شاعری میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔

بارہ بنکی

جولائی ۱۹۴۹ء میں مجھ کو میرا پرانا منصب ٹاؤن راشننگ افسری کا ملا اور تعیناتی جونپور ہوئی۔ مگر چونکہ جونپور میرا وطن تھا اس لیے میں نے کوشش کر کے چند مہینوں میں بارہ بنکی تبادلہ کروا لیا۔ البتہ جونپور چھوڑنے سے پہلے میں نے کجگاؤں کی یہ خدمت کی کہ اس کو شہر جونپور سے ملانے والی سڑک زین العباد کجگاؤں روڈ جو بہت خستہ ہو چکی تھی، کوشش کر کے تارکول کی بنوادی اور جو آج تک معمولی سالانہ مرمت سے کجگاؤں کو شہر سے بہت قریب کیے ہوئے ہے۔ یوں بھی آٹھ کلو میٹر کا راستہ خراب ہونے کے سبب سے سولہ کلو میٹر معلوم ہونے لگا تھا۔ پوسٹنگ کے لیے بارہ بنکی کو میں نے اس لیے بھی پسند کیا تھا کہ وہ علاوہ میرے وطن ثانی کے لکھنؤ سے بہت قریب تھا اور لکھنؤ انجمن ترقی پسند مصنفین کا بہت فعال مرکز ہو گیا تھا۔

بارہ بنکی میں بابا کے دوست مسیح الدین بیرسٹر صاحب مرحوم کی ریلوے اسٹیشن اور سول لائنز کے درمیان بہت بڑی کوٹھی تھی جو میری مشترک قیام گاہ اور دفتر تھی۔

فال زبان فال قرآن مثل مشہور ہے۔ چارج لیے ہوئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ شام

کے وقت اردلی نے اطلاع دی کہ امجاد میاں آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اُس وقت تک چونکہ عیال نہیں آئے تھے میں نے امجاد صاحب بلکہ دیرینہ بزرگ امجاد بھائی کو مکان کے اندر ہی بلا لیا۔ امجاد بھائی ویسے ہی سرخ سفید آج بھی تھے جیسے اب سے پچیس سال قبل تھے۔ جیوں ہی وہ گھر میں داخل ہوئے سلام کرتے ہوئے میں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ہم نے ایک دوسرے کو سینے سے لگایا۔ بیٹھنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ایک جیب سے ڈلی تمباکو کا بٹوا نکالا اور دوسرے سے پان کا ڈبہ اور دو پان بنائے، بغیر تمباکو والا مجھ کو دیا اور تمباکو والا خود نوش کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "بھیا! اب بڑھاپا آ دا۔ دیکھنے میں زیادہ فرق نہیں مگر اندر سے بالکل ٹوٹ چکے ہیں۔ زیادہ بیٹھ نہیں سکتا۔ ایک آدھ لقمے کھا کر بستر پر چلا جاتا ہوں۔ خون کا دباؤ بھی بڑھ گیا ہے۔ سنا کہ تم آ گئے ہو تو بس آنا ہی تھا آئے گئے ہیں کہ اینھگے آئے گئے ہو تو اچھا کیو مگر اب ہیاں سے جیھونا"۔ یہ کہہ کر دریر کھڑے ہو کر پان کی پیک تھوکی اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ "بھیّا اب جاوے دیو۔ جیو جگ جگ جیو" (اور ہوا بھی ایسا ہی کہ کچھ مدت بعد میں نے بارہ بنکی سے تبادلہ منسوخ نہ ہونے کی بنا پر دوبارہ استعفیٰ دیا تھا)۔

دفتر میں بیٹھا ڈاک دیکھ رہا تھا کہ کسی لفافے سے ایک منظوم درخواست نکلی۔ نہایت خوشخط تقریباً چالیس اشعار پر مشتمل حضرت وارث کرمانی دیوا شریف کے بہت ہی خوش فکر شاعر کی بہت ہی خوبصورت ایک نظم تھی جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ "گڑ کی چاء سے نہیں بلکہ بیوی کے طعنے سنتے سنتے عاجز آ گیا ہوں آپ تو ڈینگیں مارتے تھے کہ آپ کے شناسا کوئی شاعر صاحب بارہ بنکی کے .D.S.O سپلائی افسر ہو کر آ گئے ہیں اور اب اتنی شکر مل جایا کرے گی کہ کم از کم چاء جس کے وہ خود عادی ہیں گڑ کی نہ پینا پڑے گی۔ تو وہ شکر کہاں ہے۔ مجھ کو بیوی کی ان کڑوی کسیلی باتوں کا کوئی معقول جواب جب سمجھ میں نہ آیا تو سوچا کہ جس کا معاملہ ہے اسی کو اپنی مجبوری سے کیوں نہ مطلع کر دوں"۔ میں نے اُسی منظوم درخواست پر شکر کے بابو کو حکم دیا کہ پانچ سیر شکر کا پرمٹ بنا کر مجھ کو دیدو اور کرمانی کو لکھ دو کہ میں نے کرمانی سے منظوم درخواست کی تعریف کی۔ ان کے نام کا پانچ سیر شکر کا پرمٹ سامنے رکھ کر ان کو دو تین پیالی بہت میٹھی چاء پلائی اور اُن سے جی بھر کے غزلیں سنیں۔ اخلاقاً اپنے بھی چند اشعار سنائے اور تب ان کو پرمٹ دے کر یہ کہتے ہوئے رخصت کیا کہ آپ کو ہر مہینے پانچ سیر کا پرمٹ جایا کرے گا اور وہاں اپنی بیگم سے کہیئے گا کہ وہ مجھ کو بالکل سگھڑ نہیں معلوم ہوتیں ان کو گڑ کی چاء تک بنانی نہیں آتی۔ میں تو الہ آباد میں ڈاکٹر اعجاز کی بیگم صاحبہ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گڑ کی چاء ایسی پی ہے کہ بس مزا آ جاتا تھا۔ مجبوریوں کو خوشگوار بنانے کے بھی طریقے ہوتے ہیں"۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اعجاز کے یہاں کی خوشبودار سوندھی گڑ کی چائے نے شکر کی قلت

کے دور میں بڑی شہرت پائی تھی۔

ردولی کا عرس مشہور ہے جس کا ذکر گذشتہ باب میں کر چکا ہوں۔ ان کا بہت بڑا لنگر خانہ ہوتا ہے۔ اور پچاسوں من لڈو تقسیم ہوتے تھے مگر اس قحط شکر کے دور میں درگاہ کے سجادہ نشین شاہ حیات صاحب جن کی فراخ دلی کی دھوم تھی آج مجبور نظر آرہے تھے۔ ان کا مختار عام ایک خط لیکر آیا کہ "جانِ عم! تم سے ردولی کا عرس اور اس میں شکر کا خرچ پوشیدہ نہیں ہے۔ ایام عرس سر پر آگئے ہیں اور شکر کا ایک دانہ میسر نہیں۔ تم اس قحط شکر کے زمانہ میں جتنی بھی شکر دیدو گے اس کے پروانہ پر تمہاری ترقی عمر و درجات کی دعا کروں گا"۔ میری نظر میں ان کا عظیم ماضی پھر گیا اور اب ان کی اس کس مپرسی پر میرا دل اندر سے رونے لگا۔ دفتر سے پرمٹ بک منگوائی اور اپنے قلم سے اس کے ایک صفحہ پر شاہ صاحب کا نام اور پانچ من شکر کی مقدار لکھ کر کتاب لیے ہوئے دفتر سے اٹھا اور اپنی ہمدم دیرینہ کار پر سید صاد ڈپٹی کمشنر ضلع ایم۔ ایل۔ کول I.C.S. کے گھر پر پہنچ گیا۔ (اس جگہ یہ بتلادوں کہ خود سپلائی آفسر جملہ اختیارات Delegated تفویض ہوتے ہیں۔ اصل مختار افسر ضلع ہوتا ہے) وہ خوش رو خوش اخلاق جوان اور آلائشوں سے پاک شخص حسن اتفاق سے ابھی کچہری نہیں گیا تھا اور بنگلہ پر موجود تھا۔ میں چق اٹھا کر اس کے دفتر کے اندر چلا گیا اور بغیر کسی تمہید کے پرمٹ بک کھول کے ان کے سامنے رکھ دی کہ اس پر دستخط کر دیجئے۔ پرمٹ دیکھ کر وہ بولے کہ آپ خود ہی دستخط کیوں نہیں کرتے تب میں نے ان کو اپنے اور شاہ صاحب کے پرانے خاندانی تعلقات بتلائے" اور چونکہ پانچ من سے کم شکر ان کو دینا بے معنی ہے اس لیے آپ کے دستخط سے یہ پرمٹ بنوانا چاہتا ہوں تاکہ کل مجھ پر کوئی جانب داری کا الزام نہ عائد کر سکے۔ اور کول نے پرمٹ پر اپنا دستخط کھینچ دیا۔ اور ردولی کے عرس کی اشک شوئی ہو گئی۔

میرے مکان کے سامنے ہی کھیل کا میدان تھا جس میں سہ پہر کو روزانہ ہاکی کھیلی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بابو دھیان چند کے بعد دنیا کا سب سے بڑے ہاکی کے کھلاڑی کی حیثیت سے اپنا سکہ منوا چکا تھا بارہ بنکی کے نوجوانوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور ان کو کھیل کے نکات کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ ہم اس کی جادوگری دیکھنے وہاں چلے جایا کرتے تھے۔

یہی وہ سرزمین تھی جہاں میں پڑھ کر جوان ہوا تھا۔ تڑکے صبح کا وقت سب سے زیادہ سکون اور دماغی تخلیے کا وقت ہوتا ہے۔ اس کے دھندلکے میں اکثر چہل قدمی کرنے اور جن جن راہوں، میدانوں، نالیوں اور پلیوں سے میری ابتدائی زندگی گذر چکی تھی ان کی معصوم الھڑ یادیں تازہ کرنے نکل جایا کرتا تھا۔ اس وقت میرے پاس ایک السیشین بھی تھا۔ جو میرے ساتھ آگے آگے چلتا تھا اور زمین کو سونگھ سونگھ کر راستہ اور معتبر بناتا رہتا تھا۔

بارہ بنکی کا مذاق شعری ہمیشہ سے عام راستہ سے ہٹ کر رہا ہے۔ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ تغزل ہیئت شعر کے حسن ظاہری اور شوخی کلام سے زیادہ حظ حاصل کیا کرتا تھا اور باوجود اپنے نہایت ستھرے ذوق کے اُس وقت تک Break Through (ذہنی فصیلوں کو توڑ کر نئی راہ نہ نکال سکتا تھا۔ میرے دوران قیام میں بنکٹ انٹر کالج میں ایک مشاعرہ ہوا جس کی صدارت بابو بھیی ترائن ایڈوکیٹ کر رہے تھے۔ موصوف زمانہ تعلیم میں مجھ سے پانچ درجہ آگے تھے اور آج بھی عمر میں مجھ سے اُسی بزرگی اور شفقت کا شرف رکھتے تھے۔ جب روایتی غزلیں سنتے سنتے میرے کان پک گئے تو میں نے موصوف سے پڑھنے کی اجازت مانگی جو فوراً مل گئی۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ سامعین کو صدر کے توسط سے اس امر کی جانب متوجہ کروں جو میرے اور انکے درمیانی رابطہ قائم ہونے میں ممد ثابت ہو۔ عرض کیا کہ "ممکن ہے کہ میری شاعری آپ حضرات کو بدعتی معلوم ہو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ادب زندگی کے ساتھ ساتھ متحرک نہیں تو اس کو زندہ اور نمائندہ ادب نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے ترقی پسند شاعری سے عدم دلچسپی کے ازالہ کے طور پر ایک نیم معریٰ نظم پیش کر رہا ہوں جسکا عنوان ہے "جاڑے کی چاندنی" معریٰ نظموں پر نثریت کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ اس پر بھی توجہ چاہوں گا" اور میں تحت میں نظم سنانے لگا۔ اب تک سب نے ترنم میں پڑھا تھا:

یہ ماہتاب یہ سمٹا ہوا شباب فلک
کہ جیسے نور کا تالاب منجمد ہو جائے
یہ آسمان ہے یا ایک کاسۂ برف آب
مہک رہی ہے کہیں دور رات کی رانی

دُھر سروں میں گرے جیسے جھرنوں کا پانی
ٹپک رہی ہے کہیں نوک برگ سے شبنم
ستم ظریفی عالم یہ گریۂ پیہم
بدن کو اپنے سمیٹے ہوئے کھڑے دوست
نہ جانے کون سے آنگن میں ہے تو محو خرام
رُکا رُکا سا نظر آ رہا ہے ماہ تمام
تری جوانی تری مفلسی تری الفت
اُجاڑ گاؤں میں جاڑے کی چاندنی جیسے
ابھی تو ٹھوکریں کھا کر تجھے سنبھلنا ہے
ان اونگھتی ہوئی پگڈنڈیوں پہ چلنا ہے (اقتباس)

مشاعرے میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے سامعین کے سروں پر بیٹھ گئے ہوں۔ نظم ختم ہوتے ہی سکوت دکیف سماعت کا باندھ تھا جو فلک شگاف نعرہ ہائے پسندیدگی سے ٹوٹ گیا۔ یادو جھی نرائن نے اٹھ کر مجھ کو لپٹا لیا اور فرمایا کہ "مجتبیٰ میاں! ہم کو آج ایسی شاعری کی ضرورت ہے۔ تم کو ہم اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر دل سے دعائیں دیتے ہیں۔" سامعین کی جانب سے مزید سنانے کی فرمائش ہونے لگیں جن کو ہم نے "تقسیم پنجاب" اور "مینا بازار" سنا کر پورا کیا۔ اسی سے ملتا جلتا واقعہ شبلی کالج اعظم گڑھ کے ایک مشاعرہ میں ہوا تھا۔ گاندھی جی کے قتل پر میری نظم "میر کارواں" سن کر علامہ اقبال سہیل نے بالا علان فرمایا تھا کہ "اگر یہی آزاد نظم ہے تو اس پر میں ہزار نظمیں نثار کرنے کو تیار ہوں"۔

تقی حیدر سے میری ملاقات پہلے ہی سے تھی جوالہ آباد کے رہنے والے لکھنؤ میں عربی کے طالب علم تھے اور میرے ایک عزیز محمود حسین کے دوست اور ہم جماعت رہ چکے تھے۔ جب بھی تقی حیدر میرے وطن میں محمود کے یہاں آتے تھے تو زیادہ تر وقت میرے ساتھ گذارتے تھے اور بیشتر مارکسزم اور اشتراکیت پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ جب بنّے بھائی سجاد ظہیر پاکستان میں راولپنڈی کا مقدمۂ سازش میں ماخوذ تھے تو لکھنؤ میں رضیہ بھابھی اپنی بچیوں کو سینے سے لگائے امید وبیم کی

زندگی وزیر منزل بھینسا کنڈ کی تنہائی میں گذار رہی تھیں۔ کرامت حسین گرلز کالج میں اردو کی لکچراری کر رہی تھیں۔ انواع و اقسام کی پریشانیوں اور الجھنوں سے دوچار رہتی تھیں۔ کالج جائیں تو بچیوں کی نگرانی کون کرے۔ سسرالی اعزہ لکھنؤ کے دور دراز مقامات پر رہتے تھے۔ گھر کی نگرانی اور اشیاء ضروری خورد و نوش کی خرید و فروخت ایک معمر باورچی تنہا کہاں تک کر سکتا تھا۔ میں لکھنؤ جب جاتا تو ان کی خیریت دریافت کرنے وزیر منزل ضرور جاتا تھا اور ان کی بے ہمدم و بے مددگار زندگی دیکھ کر اندر سے دل رو رہا تھا۔ اتفاقاً تقی حیدر سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی۔ وہ عربی کی تعلیم ختم کر چکے تھے اور ان پر ترقی پسندی اور اشتراکیت کا نشہ طاری ہو رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عربی کالج کی قیام گاہ میں کبھی ان کے کبھی اُن کے مہمان بن کر رہ رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کے مستقل قیام اور آرام کا انتظام میں کر دوں گا۔ ان کو لے جا کر رضیہ بھابھی سے ملایا اور ان کے وہیں رہنے کی اجازت مانگی۔ رضیہ بھابھی نے بغیر تامل تقی حیدر کی گھریلو خدمات بخوشی قبول کر لیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تقی حیدر بڑی صلاحیتوں کے کارندے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں انتہائی ذہین اور گھریلو کاموں میں فرد۔ چند ہی دنوں میں رضیہ بھابھی ان کی خوش اسلوبی، اخلاق اور کارکردگی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ اپنا منھ بولا بیٹا بنا لیا۔ وہیں رہ کر تقی حیدر نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ وہاں رہ کر ان کی نظریاتی علمیت پراور جلا ہوگی۔ ننّے بھائی جب رہا ہو کر وطن واپس آئے تو انھوں نے بھی تقی حیدر کو بہت پسند کیا اور ان کو "نویت دیس" ماہنامہ دہلی کا جوائنٹ ایڈیٹر رکھوا دیا۔ لکھنؤ کے قیام میں تقی حیدر انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بھی ہو گئے تھے۔

جب سے میری پوسٹنگ بارہ بنکی ہوئی تھی میں تقریباً ہر اتوار کو لکھنؤ چلا جاتا۔ دوپہر کا لنچ انڈیا کافی ہاؤس حضرت گنج میں کرتا تھا۔ کیا زمانہ تھا لکھنؤ بھر کے منتخب Intellutuel (دانشور) فنکار، صحافی اور ان سب کے مبصرین بیک وقت وہاں جمع ملتے تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر علیم، پنڈت آنند نرائن ملا، آل احمد سرور، مجاز، سلام مچھلی شہری، آغا زیدی اور منظر عرف "بور" سے وہاں ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس کی باقی آبادی متحرک اور آتی جاتی رہتی تھی۔

ہر اتوار کی شام کو سرور صاحب کے مکان پر انجمن کا اجتماع ہوتا تھا۔ ان جلسوں میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک Galaxy (کہکشاں) میں گھل ملنے کا موقع ملتا تھا ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور،

احتشام حسین، مسیح الحسن رضوی، منظر سلیم، باقر مہدی، مجاز اور ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ ہر نشست میں ایک تازہ مضمون، ایک تازہ افسانہ اور ایک دو تازہ نظمیں اور غزلیں ضرور پڑھی جاتی تھیں۔ ان تخلیقات پر بحث کا آغاز عام طور پر کھٹے ٹیک کر باقر مہدی کیا کرتے تھے۔ ان بحثوں میں تنقید و تبصرے کا معیار کافی بلند ہوتا تھا۔ ہر نیا پرانا چھوٹا بڑا ادیب بحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ آخر میں صدر جلسہ کی تقریر جلسہ کا اختتام ہوتا اور ممبرانِ انجمن زیادہ صاف ذہن اور زیادہ بالغ شعور لیکر وہاں سے نکلتے تھے۔

میٹنگ کے بعد میں بارہ بنکی شب ہی میں واپس آجاتا تھا۔ عیال بارہ بنکی آچکے تھے۔ اب میری جملہ ادبی اور سیاسی سرگرمیاں طشت از بام ہو چکی تھیں۔ سرد بستہ میں خفیہ پولیس کی رپورٹوں کا ایک باب تیار ہو چکا تھا صوبائی حکومت سے میری چھیڑ چھاڑ شروع ہو چکی تھی کچھ اپنے طور پر بھی میری ادبی سرگرمیوں کے جسم پر سرکاری نوکری کا جامہ مسکنے لگا تھا کہ کسی تعطیل میں جب میں بوبو کی قدم بوسی کے لیے مجگاؤں گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "بھتیّ اب میرے مرنے کے دن قریب آگئے ہیں۔ میری آخری تمنا ہے کہ تم مجھ کو کربلائے معلیٰ پہنچا دو کہ مولا کے قدموں میں میرا دم نکلے"۔ میں یوں بھی ان دنوں بہت مغموم رہا کرتا تھا۔ میں نے عرض کی کہ "بوبو آپ بھی چلی جائیںگا تو میں کس کے سہارے زندہ رہوں گا"۔ اور میں ان کے پیروں پر آنکھیں ملنے لگا۔ انھوں نے فرمایا "بیٹا! اللہ سب کا پالنے والا اور صبر دینے والا ہے۔ بس میری یہ تمنا تم پوری کر دو"۔ حکم کا بیشی منظر میرے لیے بہت سخت تھا مگر اس کو ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ بارہ بنکی جا کر میں نے چھ ہفتے کی درخواست دیدی اور رخصت کی منظوری کی توقع امید پر ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے تین ہی دن بعد میں عیال کے وطن واپس آگیا۔

••

چھٹا باب

سفر عراق اور ایران

کربلائے معلیٰ میں ہمارا ایک جدّی مکان تھا۔ شاید اب بھی موجود ہو۔ وہاں کے خدام سید عبود کے تصرف و نگرانی میں رہتا تھا۔ جب خاندان کا کوئی فرد زیارت کے لیے کربلا جاتا تو ملنے پر سید عبود اس کو خالی کر دیتے اور بصرہ آکر اپنے مہمان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ چنانچہ جب ہم لوگ بحری جہاز سے شط العرب کے بندرگاہ بصرہ پہنچے تو سید عبود کے بڑے صاحبزادے سید محمود وہاں موجود تھے۔ یہ خدام لوگ اپنے حجاجوں کو پہچانتے خوب ہیں۔ گودی میں جہاز کے لگتے ہی وہ دوسرے مسافروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے ہم لوگوں سے آملے۔ اور پاسپورٹ، ویزا اور اسباب وغیرہ کا چارج لے لیا۔ اور مع سامان سفر کے ہم لوگوں کو ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر ہمارے کاغذات اور آمد کی رپورٹ پولیس میں درج کروانے اور شب کی بصرہ بغداد ٹرین میں رزرویشن کروانے چلے گئے۔

بمبئی میں الفانسو آم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک جنگلی یعنی تخمی اور دوسرا قلمی جو سوکھ جاتا ہے مگر سڑتا نہیں۔ تخمی پکنے کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ بمبئی سے روانہ ہوتے ہوئے میں نے ایک ٹوکری الفانسو کی ساتھ لے لی تھی جو بصرہ پہنچتے تک خراب ہو گئے۔ عراقی عرب کو دو چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ایک "انبہ" دوسرا "طوطی ہندی" یعنی طوطا مینا۔ جب ہم نے بصرہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو ان سڑے ہوئے آموں کی ٹوکری کو پھینکنے کے لیے میں مناسب گوشہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی وہ ٹوکری میرے ہاتھوں میں تھا کہ چند عراقیوں نے شکریہ کے ساتھ ان سڑے ہوئے آموں کی ٹوکری کو میرے ہاتھوں سے لے لیا اور "انبہ انبہ" کہکر کل سڑے آم کھا گئے جس طرح ہمارے یہاں سڑے ہوئے سیب انگور اور کھجور کھا لیتے ہیں۔ دوسری جانب کچھ لوگ ہندوستانی مسافروں سے دریافت کر رہے تھے کہ "طوطی ہندی داری" "یک صد ریال یک طوطی" تو وہ میرے پاس کہاں تھی۔ سڑے ہوئے آم تھے سو دیدئے تھے۔

ہمارے اس قافلہ میں بوبو، ان کی پھوپھی ام الحسنین بی بی اور ایک خادمہ تھی۔ ان خواتین کو آرام کے خیال سے بستروں پر ہوٹل میں لٹا کر میں دجلہ اور فرات کے سنگم کو دیکھنے چلا گیا۔ شمال سے جنوب میلوں تک

دو دریا دو رنگ کے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے دیکھے۔ شط العرب کا پاٹ تقریباً دو میل کا ہے جس کا مغربی ساحل بصرہ تھا اور مشرقی ساحل پر ایران کی سرحد اور کھجور کے باغات دیکھے جا سکتے تھے۔ بصرہ کے مغربی ساحل پر تیراکی اور غوطہ خوری کی تفریح اور کسرت کے خیال سے Dwing بورڈ کے لچکدار تختے بڑی تعداد میں نصب تھے جن پر سیڑھیوں سے چڑھ کے عربی، عراقی حبشی اور دوسری مخلوط نسل کے لوگ پاؤں کے گٹے تک لمبے لمبے کرتے پہنے دریا میں جھما جھم کودنے اور قلابازیوں کے کرتب دکھلا رہے تھے۔ جب یہ لوگ تختے سے دریا میں جست لگاتے تھے تو ان کے کرتوں میں ہوا بھر جاتی تھی اور بہتوں کے کرتے غباروں کی طرح اُلٹ کر سینے اور سر تک آ جاتے تھے اور کودنے والے جُم ننگے ہو جاتے تھے اور تماشہ دیکھنے والے منھ پھیر کے ہنستے تھے۔

میں شام تک بصرہ کے مختلف بازاروں کی سیر کرتا رہا۔ بصرہ کی رطب سیاہ دنیا کی سب سے اچھی کھجور مانی جاتی ہے۔ ایک کلو خرید کے ساتھ رکھ لی۔

کھانا وانا کھا کر شام ڈھلے ہم لوگ بصرہ ریلوے اسٹیشن پر سیکنڈ کلاس کے مخصوص ڈبہ میں پہنچ کر اپنی اپنی برتھ پر سو گئے۔ صبح طلوع آفتاب کے بعد جب ٹرین حلّہ پہنچی تو خدام سید محمد نے آ کر ہم لوگوں جگایا۔ (حلّہ سے کربلا، نجف اور کوفہ بہت قریب ہیں ورنہ بغداد جا کر پورا ایک دن اور لگ جاتا ہے)۔ حمالوں سے جملہ اسباب بے پلیٹ فارم کے حلّہ اسٹیشن پر اتروا کر ایک بہت بڑی ٹیکسی میں رکھوایا اور ہم لوگ پکی پکی سڑک سے کربلا کے لیے روانہ ہو گئے اور ڈیڑھ گھنٹے میں اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ مکان روضۂ امام عالی مقام سے قریب ہی تھا۔ مکان میں سامان وغیرہ رکھوا کر ہم لوگ اگلا پروگرام بنانے لگے۔ سیّد محمد کی رائے پر عمل کرتے ہوئے پہلے ہم لوگوں نے حمام کیا۔ دو ایک گھنٹہ کمر سیدھی کرنے کے بعد مولا کی قبر مطہر پر زیارت پڑھنے گئے۔ وہاں سے نکل کر بیوی، ننّا اور گل بہار تو گھر واپس چلی گئیں اور سیّد محمد اور میں روضۂ مبارک کے سامنے ایک مسقف بازار دیکھتے خرید و فروخت کرتے روضۂ حضرت عباس علمبردار کی زیارت کرنے چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر بلا سوچے سمجھے میں نے بہت سارے مصری تمباکو کے سگریٹ خرید لیے جن کو عراق میں "جگارا" کہتے ہیں۔ پھلوں میں آلو بخارا اور تربوز کے علاوہ کوئی اور پھل ابھی بازار میں نہیں آیا تھا۔ یہ دونوں پھل از حد میٹھے تھے۔

وہاں کے دوکاندار اور خوانچہ والے اچھی خاصی اردو بول لیتے ہیں۔ گھروں پر وہاں روٹیاں نہیں پکتیں۔ کھانے

پر نان بائی کی دوکان سے روٹیاں آتی ہیں یا پھیری والوں سے خریدی جاتی ہیں۔ وہاں کی روٹیاں دو دو تین تین فٹ لمبی دس بارہ انچ چوڑی اور ڈیڑھ دو انچ دبیز ہوتی ہیں۔ ذائقہ میں اس قدر لذیذ، نرم اور سوندھی کہ ان کو خالی کھا کر پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ پھیری والے صبح شام کپڑوں کے تھان کی طرح کندھوں پر ڈالے گھر گھر ہانک لگاتے پھرتے ہیں "نون می خواہی۔ نون می خواہی"۔ وہاں کے دوکاندار زیادہ تر فارسی یا اردو میں باتیں کرتے تھے۔ مزاحاً میں نے روٹی کے ایک پھیری والے سے پوچھا کہ روٹیاں کتنے گز بیچتے ہو تو وہ ہنسنے لگا۔

دو تین دن بعد میں نجف اشرف اور کوفہ گیا۔ کوفہ میں مولائے کائنات کے مکان اور مسجد کی زیارت کی

———— کوفہ کا بازار دیکھا اور نجف میں روضہ کی زیارت کر کے اسی دن کربلا واپس آ گیا۔ کربلا اور نجف کو ملانے والی شاہراہ کچی سے بھی بدتر حالت میں تھی اسی لیے وہاں کی ٹیکسیاں کربلا اور نجف کے درمیان ایک بہت، وسیع دعریض (Gravel) موٹی ریت کے صحرا میں دوڑتی پھرتی تھیں۔ اس صحرا میں سوسمار بہت ہیں جو بہت دور تک ٹیکسیوں کے ساتھ دوڑ کر ایک دم غائب ہو جاتے تھے۔ (شاہنامۂ فردوسی میں سوسمار کا ذکر پڑھا تھا مگر اس سے قبل میں نے سوسمار دیکھا نہیں تھا۔ ایک ایک گز لمبے جو ہندوستان میں "گوہ" کے نام سے مشہور ہیں مگر یہاں ان کا قد ایک فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا)۔

عراق میں ٹیکسیاں کثرت سے دستیاب تھیں اور عام طور پر بہت بڑی بڑی۔ رولس رائس، لینسیا، ہپ موبل پیکارڈ اور ڈوج وغیرہ اور اکثر ایر کنڈیشنڈ۔ چھوٹی گاڑیاں کم ہی دکھائی دیتی تھیں۔ اس زمانہ میں وہاں پیٹرول پچاس فلس یعنی ہمارے یہاں کے آٹھ آنے میں ایک گیلن ملتا تھا۔ ڈیزل کو کوئی لالٹین میں جلانے کے لیے بھی نہیں پوچھتا تھا۔ کربلا میں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد میں بغداد اور کاظمین ہوتا ہوا سامرہ اور موصل کی طرف چلا گیا۔

جس کی جو زبان ہو اسی کی زبان سے سننے میں لطف آتا ہے۔ عرب ممالک میں صحرانشینوں اور دیہات کے باشندوں کو "بدّو" کہا جاتا ہے اور انھیں بدّوؤں کی زبان ادب میں سند مانی جاتی ہے۔ کاظمین سے سامرہ جانے والی بس بدّو عرب عورتوں، بچوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جب بس چلی تو "للی للی" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عربی گیت تالیوں کی تھاپ پر کورس کے انداز میں بس کے اندر گونجنے لگے۔ دس بارہ فرسنگ جانے کے بعد کچھ خاموشی ہوئی تو دو بدّو عورتوں کو اپنے سامنے والی سیٹ پر آپس میں گفتگو کرتے سنا۔ ان میں ایک ضعیفہ اور ایک جوان تھی۔ جوان عورت رقت آمیز لہجہ میں اس ضعیفہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ لہجہ میں وہ گداز

اور گھلاوٹ تھی کہ باوجود کچھ سمجھ میں نہ آنے کے سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ خوشدامن اور نندوں کے مظالم کا ذکر کر رہی تھی اور روتی جاتی تھی۔ لہجہ کا تاثر دل پر اثر کر رہا تھا۔ ضعیفہ اس کو صبر کی تلقین کر رہی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو سن کر مجھ کو پہلی بار محسوس ہوا کہ عربی کتنی شیریں زبان ہے بشرطیکہ بولنے والا عربی بدو اور صحرانشین ہو۔

سامرہ سے واپس آکر میں نے کاظمین اور بغداد کے درمیانی بازار کے فندق احمدی میں چند دن قیام کیا۔ کاظمین کی دوبارہ زیارت اور بغداد کی خوب سیر کی۔ بغداد مشرقِ وسطیٰ کا لندن کہلاتا ہے۔ دورِ عباسی کی شان و شوکت اور برطانیہ کی وکٹورین تعمیر Lay out (بلڈنگ) نے اس شہر کو عظیم سے عظیم تر بنا دیا ہے۔ اونچے اونچے در، موٹے موٹے کھمبے اور کئی کئی فٹ دبیز دیواریں لندن کی پارلیمانی عمارتوں کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ بڑی بڑی کاریں۔ بڑی بڑی دوکانیں۔ چوڑی چوڑی سڑکیں اور موجیں مارتا ہوا رودِ دجلہ دریائے ٹیمز پر جیسے لندن۔ (لندن دیکھا نہیں ہے مگر اس کے اذکار اتنی تفصیل سے پڑھتا رہا ہوں کہ وہاں پہنچ کر میرے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا)۔

ایک روز اپنے سفارت خانہ (Legation of India at Baghdad) گیا۔ وہاں رفیع احمد قدوائی کے عزیز جواں سال کیپٹن وراثت حسین قدوائی پریس اٹیچی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ کو پہچانتے تھے۔ دفتر چھوڑ چھاڑ کر مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ بیوی بچوں سے ملوایا اور سب نے بڑی خاطر کیں۔ ان کے بچوں کو جو عراقی جوان پڑھانے آتا تھا اس سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی بڑا کارکن تھا اور جنرل قاسم کی صدارت کے لیے بہت کوشاں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انتخابات میں جنرل قاسم کی کامیابی کے بعد عراق میں فوراً انقلاب آجائے گا۔ وہ کامیاب ہوئے مگر مغربی سیاست کے ہاتھوں بہت قلیل مدت میں پہلے برطرف اور پھر قتل کر دیے گئے۔ سفارت خانہ میں وراثت قدوائی صاحب کی مدد سے میں نے ایران کا ویزا وغیرہ بنوا لیا۔ اور "ایوان تور" بس میں طہران کے لیے رزرویشن بھی کروا لیا۔

شب میں اپنے ہوٹل فندق احمدی میں سوتا تھا۔ دن میں کبھی کاظمین کبھی بغداد کی سیر اور شام میں قدوائی صاحب کے گھر پر گذارتا تھا۔

کاظمین کا دودھ، دہی اور بالائی "سرشیر" بہت مشہور تھی۔ بھینسیں بھی بہت بڑی بڑی دیکھنے میں آئیں۔ ایک صبح بیدار ہو کر میں اپنے ہوٹل سے قریب ہی ایک دودھ دہی والے کی دوکان پر ناشتہ دان لیکر

گیا کہ بالائی خرید کر لاؤں اور دیکھوں کہ کیا حقیقت وہاں کی بالائی لکھنؤ سے بہتر ہوتی ہے۔ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد گیا تھا۔ دوکاندار سے دریافت کیا کہ "سرشیر داری"۔ بس یہ سننا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور چند مہذب گالیاں دیتے ہوئے بولا "سرشیر؟ سرشیر" اور کفگیر کو اس طرح ہلاتے ہوئے کہنے لگا جیسے مار ہی بیٹھے گا "دونی کہ حالا چہ ساعت است۔ سرشیر خوردن روئے باید۔ ساعتے قبل طلوع سحر جملہ پنجاہ کلو سرشیر خلاص می کنم۔ برو برو سرشیر نمی دورم" اور میں اپنا سا منھ لیکر ہوٹل واپس آگیا۔ شب میں خادم فندق کو ایک ریال دیا کہ "بھائی میرے لیے چوتھائی کلو سرشیر کل صبح لادینا" دوسرے دن اسی بالائی سے میں نے ناشتہ کیا۔ واقعی اس کو بالائی کہتے ہیں۔ ایسی نازک نرم خوش ذائقہ اور خوش رائحہ بالائی لکھنؤ کی نہیں ہوتی۔

اہل عراق چار پینے کے بہت عادی ہیں۔ قدم قدم پر محض چار کی دوکانیں ملتی ہیں۔ وہ لوگ دوسری مغربی قوموں کی طرح بے شکر اور بے دودھ کی چار شیشہ کے فنجانوں میں پیتے ہیں۔ اگر کوئی ہم جیسا بدمذاق چاہے تو طلب کرنے پر قند کا ایک ٹکڑا دیدیتے ہیں جس کو منھ میں رکھ کر چار سپ کی جاتی ہے۔ یہ خوش رنگ اور بہترین چار ہندوستان سے جاتی ہے۔ وہاں چار نہیں پیدا ہوتی۔

عراق میں کثرت سے استعمال ہونیوالی اشیا خوردنی میں مع بالائی کے مجھ کو گوشت برّہ (دنبہ) اور برنج عنبربو (چاول) بہت پسند آئے۔ گوشت ایسا جیسے بے ریشے کا مکھن۔ چاول ایسا کہ گھر، پالو اور محلہ مہکے۔

جب ایران کے لیے ویزا اور زر دستی وغیرہ مل گیا تو میں پھر کربلا واپس آیا۔ بوبو سے مراجعت کی رخصت اور اجازت مانگی۔ تو انھوں نے کلیجے سے لگا کر سدھارنے کی اجازت دیدی۔ جب میں نے ہاتھ جوڑ کر دریافت کیا اب کتنی مدت بعد وطن واپس لے چلنے کے لیے حاضر ہوں تو انھوں نے بہت خوش ہو کر کہا کہ "چھنن۔ اب تو کربلا ہی میرا وطن اور مدفن ہے مجھ کو واپس لے چلنے کے ارادہ سے کبھی نہ آنا۔ البتہ اگر کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو تم کو پیسوں کے لیے لکھوں گی"۔

میں ایک دکھا ہوا دل تو تھا ہی بوبو کی ان باتوں پر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ انھوں نے مجھ کو اس عالم میں دیکھ کر پھر اپنے سینے سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگیں۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ چند ثانیہ بعد میں بڑی بڑی مشکل سے بوبو سے جدا ہوا۔ ٹیکسی پر سامان

رکھ کر بغداد سے بس پکڑنے نے روضۂ امام عالی مقام کی طرف رُخ کر کے زیارت پڑھتا ہوا روانہ ہو گیا۔

بغداد سے بس چھوٹنے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ میں نے اپنا بستر تو اوپر رکھوایا اور مختصر سامان اپنی صندلی کے نیچے رکھا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ جب بس روانہ ہونے لگی تو میں اٹھ بیٹھا۔ باہر کے مناظر دیکھنے لگا کہ ایک دم جھٹکے سے بس رُک گئی۔ رائفلیں لیے ہوئے چار عراقی سپاہی بس میں داخل ہوئے اور جھک جھک کر سیٹوں کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ان یہودیوں کی تلاش میں ہیں جو چھپ چھپا کر عراق سے بھاگ رہے تھے۔ یہودیوں پر اُن دنوں عراقی حکومت نے بڑی پابندی لگا رکھی تھی۔ نہ کوئی یہودی باہر سے آسکتا تھا نہ عراق سے باہر جا سکتا تھا۔ مگر ہماری بس میں ان کو کوئی یہودی نہ ملا۔ یوں بھی ان کی شناخت اس لیے آسان نہ تھی کہ ان کی مادری زبان عربی اور لباس عراقی ہوتا تھا۔

اب ہم عراق اور ایران کی سرحد سے گذر رہے تھے۔ دونوں جانب بے شمار مسلح فوجی کچھ گھوڑوں پر اور کچھ پا پیادہ اِدھر اُدھر بھاگتے دکھائی دیتے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوئی اور جنگ چھڑ جائے گی۔ دونوں کے تعلقات میں کشیدگی کا احساس ہوتا تھا۔

ایران کی سرحد میں داخل ہوتے ہی بس کازوین چک پوسٹ پر رُک گئی اور تقریباً دو گھنٹے رکی رہی۔ ویزا پاسپورٹ اور بس کے کاغذات پر مہریں لگیں۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ ٹہلتا ہوا میں بھی بازار کی جانب نکل گیا۔ بازار میں جہاں اور چیزیں بھی ہماری طرف کی مونگ پھلی کی طرح ٹوکریوں میں بکتیں، پستہ اور بادام بھی بہت ارزاں فی کلو ایک تومان کی نرخ سے فروخت ہو رہے تھے۔ تومان یہاں کے اٹھارہ آنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ارزانی اور شغل کرنے کے خیال سے میں نے آدھ آدھ کلو دونوں خشک میوے خرید کر کوٹ کے دائیں بائیں جیبوں میں بھر لیے جو کھانے میں بہت لذیذ معلوم ہوئے۔ طہران کے لیے مسافروں سے بھری گئی اور بسیں ہم سے آگے جا چکی تھیں۔ چنانچہ جب ہم رات گئے اپنی پہلی منزل رکان شاہ پر پہنچے تو وہاں کے مہمان خانوں یعنی سراؤں میں تقریباً سب کمرے بھر چکے تھے سردی بھی تھی اور ہماری بس کے سب مسافر بس اسٹاف اور قلیوں کی مدد سے شب باشی کے لیے کمرے تلاش کر رہے تھے۔ میں ناتجربہ کار ہونے کے سبب سے سب کے پیچھے تھا۔ بڑی دقتوں کے بعد مجھ کو ایک کمرہ میں ایک خالی بستر ملا جس کے دوسرے پلنگ پر کوئی دوسرا مسافر بہت موٹا تازہ

لحاف میں سر پیر چھپائے ہوئے سو رہا تھا۔ اور میں بغیر کچھ کھائے پیئے اپنا کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ صبح تڑکے اندھیرے منہ کانوں میں دوسرے بستر سے چپڑ چپڑ کی آواز پہنچی تو میری آنکھ کھل گئی۔ سر سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو ایک بہت سن رسیدہ جوڑا (میاں بیوی) کچھ کھا رہے ہیں اور منہ سے منہ ملائے ہوئے آپس میں کچھ باتیں بھی کرتے جا رہے ہیں۔ تو یہ کل شب کا کوئی موٹا تازہ ایک مسافر نہ تھا بلکہ دو ضعیف میاں بیوی زندگی کی تھکی اور لپٹی ہوئی محبت کی نیند سو رہے تھے۔ میں نے اپنے بستر میں لیٹے ہی لیٹے کہا "صبحکم اللہ بالخیر۔ در نصف شب آں چہ چی خوردی"۔ جواب ملا "چاشت" یعنی ناشتہ کوٹ پہن کر باہر نکلا تو دیکھا کہ سب کمرے کھلے ہوئے ہیں اور تمام مسافر کمروں اور چائے خانوں میں کچھ نہ کچھ کھا پی رہے ہیں۔ زیادہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت پوری ایرانی قوم چاشت کھا رہی ہے۔ اپنی بس کے ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تو اس نے حکم دیا "ہر چند کہ اشتہا نشود قدرے چیزے بخور۔ یک لقمہ صباحی بہتر ز مرغ ماہی"۔ اور تب شیخ سعدی کے اس قول کی صداقت اور افادیت کا احساس ہوا۔ میں نے بھی جیب میں پڑے ہوئے پستہ بادام سے شغل شروع کر دیا۔ ہمارے ساتھ ایک انگریز B.B.C. کا نامہ نگار بھی سفر کر رہا تھا جو چاشت کھانے والوں کی فلیش بلب کی مدد سے تصویریں لے رہا تھا۔ ایران میں بھی بلا دودھ شکر کی چائے کا رواج تھا۔ میں نے دو تین فنجان قند کی مدد سے پیئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر سب نے سامان باندھے اور آفتاب طلوع ہوتے ہی ہماری بس کرمان شاہ سے ہمدان کے لیے روانہ ہو گئی۔ اب ہم شمالی ایران میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ کے ہر گاؤں ہر قریہ میں چائے خانوں کے باہر سڑک سے ملی ہوئی بنچیں اور اسی لمبائی کی میزیں ملتی تھیں جس پر لوگ چائے پیتے ہوئے دیکھے جا سکتے تھے۔ دوپہر میں کسی قصبہ میں بس رکی اور میں نے ایک ہوٹل میں آدھی ڈبل روٹی ایک ابلے ہوئے انڈے اور دو فنجان چائے سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ ان کے علاوہ کوئی اور کھانا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کھانے کے بعد چہل قدمی کرتا ہوا میں ایک باغیچہ کی طرف نکل گیا۔ ہلکے عنابی رنگ کے آلوچے درختوں میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اتنی کثرت سے تھے کہ دل نے کہا دو ایک پھل توڑ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں چنانچہ میں نے ایک درخت کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ قریب ہی کہیں سے ایک عورت کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ "حرامی! حرامی! سرقہ کند" میں نے گھبرا کے ہاتھ کھینچ لیا اور تیزی سے اپنی بس کی طرف واپس ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ حضرت واقعی جو گالی کبھی نہ سنی تھی آج

سن لی۔ ڈرائیور کو ایران میں شوفر بولتے ہیں اور کنڈکٹر کو شاگرد شوفر۔ چنانچہ اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں جب میں نے اپنے شاگردِ شوفر کو آلوچے والی داستان سنائی تو اس نے جواب دیا "غم مخور غم مخور۔ حرامی بودن خیلے عیب نیست۔ جو تم این جا حرامی بمعنی دُزدی زدند" تب مجھ کو اپنی خفت سے چھٹکارا ملا۔ اس کے علاوہ بھی ایرانی فارسی یعنی زبان پہلوی کی لغت اور تلفظ ہم ہندوستانیوں کی فارسی سے بالکل مختلف ہے۔ "کلاں" کو "بزرگ"۔ "خرد" کو کوچک۔ تہران کو طہران۔ آئینہ کو شیشہ جام کو گلاس۔ جان من کو جونم۔ سیردی کو سیری۔ پوست کو پسّت۔ گلستان کو گلستن۔ اسپ غول جو خالص فارسی ہے اسپرزہ کہتے ہیں۔ اسپرزہ کی بھی ایک داستان ہے جو طہران پہنچ کر بیان کروں گا۔

اس قصبہ سے روانہ ہو کر اوائل شب میں ہم ہمدان پہنچ گئے جو ایک بڑا شہر معلوم ہوتا تھا۔ سامان ایک ہوٹل کے کمرہ میں رکھا۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی محسوس ہوا کہ شہر میں ہر طرف سے افیون اور شراب کی مہک آرہی تھی۔ دو ایک کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جھانک کر دیکھا تو فرش پر لیٹے ہوئے چار پانچ ایرانی چانڈو پی رہے تھے یعنی افیون دود کشی کر رہے تھے۔ دوسرے کمرہ میں میز کے گرد بیٹھے ہوئے کچھ لوگ شراب پی رہے تھے۔ اور یہی منظر ہمدان میں عام تھا۔ بنارس میں شیخ علی حزیںؔ کا حاضر جواب ملازم ہمدان کا رہنے والا تھا اور شیخ سے شاعری میں باتیں کرتا تھا۔ شیخ نے ایک دن کہا "ہمدانی مگساں می آیند"۔ ہمدانی نے جواب دیا "بلے حضور۔ ناکساں پیشِ کساں می آیند"۔

کھانے کی تلاش تھی اس لیے میں ایک بازار میں نکل گیا اور ایک بڑے رستوران میں داخل ہو گیا۔ بیرا لپک کے میرے پاس آیا۔ میں نے اس سے اپنی فارسی میں کہا کہ تمہارے یہاں جو سب سے اچھا اور لذیذ پکوان ہو لے آؤ۔ بیرا واپس گیا اور چند منٹوں میں ایک بڑی سی چینی کی پلیٹ میں اپنے یہاں کا بہترین کھانا لیکر آیا۔ پلیٹ میں چوٹی دار مکھن یا گھی میں بگھارے ہوئے چاول۔ لال کی ہوئی پیاز کے لچھے۔ انڈوں کی دو نیم نیم برشت زردیاں۔ خیار (کھیرے) کی لمبی لمبی قاشیں اور سلاد کے پتے۔ میں نے پوچھا "ان خوان نعمارا در زبان پہلوی چہ می گویند" گفت "چلو پلو" گفتم "خوب خوب خیلے خوب" اور اس پھیکے پکوان کو جیسے تیسے زہر مار اور پانچ تومان اس کی قیمت ادا کر کے اپنے ہوٹل میں آ کر سونے کی تیاری کرنے لگا کہ شاگرد شوفر شراب کے نشہ میں چور خبر سنا گیا کہ "بلا تاخیر بعد چاشت ماشین برائے طہران دُخان خواہد شد۔ دوران سفر دود کشی ممنوع" میں نے دریافت کیا "کس خوشی میں" تو اس نے جواب دیا ماشین (بس) میں پٹرول کے پیپے ساتھ چل رہے

ہیں۔ ہملان سے طہران کا سفر اپنے مناظر کے اعتبار سے بہت ہی دلکش تھا۔ میلوں لالۂ صحرائی کی سرخ سفید چادریں اوڑھے البرز کی پہاڑیوں کے ڈھلوان۔ میلوں تک پھیلے ہوئے انگور کے باغات (یہ منطقہ تاکستان کہلاتا ہے)۔ کوہ شیریں بے ستون جو معنوی اعتبار سے بے ستون کا بالکل الٹا تھا یعنی دو تین میل لمبی چوڑی زمین میں نصب نوکیلی سیاہی مائل چٹانوں کے تنو تنو ڈیڑھ ڈیڑھ سو فٹ بلند ناتراشیدہ کھمبے ہی کھمبے نظر آتے۔ اس کے بعد سیب ناشپاتیوں کے باغات، سفیدے اور چناروں کے جنگلات ملنے لگے۔ ایران کی مٹی اس قدر زرخیز ہے کہ جہاں جہاں پانی پہنچ گیا ہے باغات جنگلات اور سبزہ زار بکثرت پائے جاتے ہیں۔

سفر کی آخری منزل طہران پہنچنے سے پہلے کسی قصبہ میں ایک رات مزید قیام کرنا پڑا۔ وہاں سے صبح کو جب ہم لوگ روانہ ہوئے تو پیلی چکنی مٹی اور چونے کی کوٹھریاں نظر آنے لگیں۔ چراگاہوں میں گدریے بھیڑیں اور دنبے چرا رہے تھے۔ کھیتوں میں کسان آب پاشی کر رہا تھا۔ کوٹھریوں میں مزدور کھدائی کر کے ٹرکوں میں مال لاد رہے تھے مگر سب کے سب ہر چند کہ انتہائی بوسیدہ کوٹ اور پتلون اور فلیٹ کیپ یا کلاہ پہلوی میں نظر آتے تھے۔ زبان، لباس، رنگ روپ، قد و قامت کا یہ فرق تو عراق اور ایران کی سرحد کے دونوں طرف ایک دو میل کے اندر ہی محسوس ہونے لگا تھا۔ عراقی کا قد لمبا اور ایرانی میانہ قد۔ عراقی کا لباس روایتی عبا قبا جبہ اور اکال۔ ایرانی ننگے پاؤں بھی سوٹ ہیٹ میں۔ عراقی عربی بولتا ہوا اور ایرانی زبان پہلوی (حافظ و خیام کی فارسی سے نابلد) عراقی کا رنگ سانولا یا سیاہ، ایرانی کا رنگ زیادہ تر گورا۔ عراقی عورتیں برقع میں ایرانی عورتوں کی ٹانگیں برہنہ، جسم پر اسکرٹ اور سر پر رومال۔ غرض کہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔

طہران کے لیے روانہ ہوتے ہوئے صبح جیبوں میں جو پیسے یا دام بچ رہے تھے میں نے چاشت کے طور پر کھا کر ختم کر دئے تھے اور تقریباً دس بجے دن کو طہران پہنچتے پہنچتے پیٹ میں پیچش کی مروڑ شروع ہو چکی تھی۔ خیابان فردوسی میں بس رکتے ہی میں ایک ٹیکسی کر کے خیابان پہلوی پہنچا اور جلد از جلد ہوٹل فارس میں ایک کمرہ لیکر بند ہو گیا۔ اتنا ہوش نہ تھا اور اتنی عجلت تھی کہ بجائے سنگل بیڈ کے قریب ترین کمرہ کو جو ڈبل بیڈ تھا پسند کرنے میں اپنے کو مجبور محسوس کر رہا تھا۔ جب کمرہ میں باتھ روم کا دروازہ تلاش کیا تو وہ غائب تھا۔ اتنے بڑے ہوٹل میں کوئی ملحق باتھ روم نہ تھا۔ پھر جلدی سے دروازہ کھولا اور کوریڈور کے پندرہ بیس قدم کے سرے پر ایک در ملا جس پر لاترین لکھا ہوا تھا اس میں پیٹ دبائے ہوئے میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد چھ سات گھنٹے تک ہر دس منٹ پر کمرہ سے باتھ روم تک کی آمد و رفت

جاری رہی - اب پیٹ میں کچھ باقی نہ تھا مگر مروڑ بدستور پریشان کئے ہوئے تھی - کپڑے بدل کر میں نے خیابان پہلوی کے بازار میں کسی دوا کی عطاری اور پنساری کی دوکان نہ چھوڑی جہاں اسب غول یا اس کی بھوسی نہ تلاش کی ہو اور ہر جگہ سے مجھ کو زبان سے تالو بجانے کے ساتھ اوپر نیچے سر ہلاتے کا جواب ملا (جس کا مطلب ہمارے وطن میں علاوہ حیدرآباد کے کہیں نفی میں نہیں لیا جاتا) اور جس کا مطلب ایران میں بھی نفی تھا - اس وقت تک میکسا فارم اور سلفا گوناڈین ایجاد نہیں ہوئی تھیں - مایوس ہو کر ہوٹل واپس جانے والا تھا کہ دہی کا خیال آیا کہ گلے ہوئے چاول کے ساتھ پیچش میں مفید ہے - دودھ دہی کی دوکان پر پہنچا تو دہی کی فارسی بھول گیا البتہ دوکان میں مٹھے کی ایرمیڈ بوتلیں بڑی تعداد میں رکھی ہوئی تھیں - بیک وقت دو تین بوتلیں پی گیا جس سے وقتی تسکین ہوئی - شب میں مونگ کی کھچڑی کھا کر سو رہا - صبح اجابت تو ہوئی مگر اس کے ساتھ میوکس آیا تھا اور پیٹ میں مروڑ بدستور تھی - بمبئی سے ہمارے ساتھ مسافروں میں ایک ایرانی نژاد سوداگر بھی تھا - اس سے اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی - وہ خلیج ایران میں بوشائر کے بندرگاہ پر اتر گیا تھا - دوسرے دن جیب میں بازار کی طرف پھر چلا کہ نارسیکل خرید لاؤں جس میں اسب غول ہوتا ہے تو ایک شخص نے راستہ میں لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا - "ارے سید تم یہاں کب آئے" - میں نے جواب دیا "کل" اور یہ کہتے کہتے پیٹ میں پھر زوردار اینٹھن شروع ہو گئی - یہ وہی ایرانی سوداگر تھا جس نے بمبئی سے بوشائر تک میرے ساتھ سفر کیا تھا - میں نے کہا آؤ میرے ہمراہ میرے ہوٹل چلو تم سے بہت ضروری کام ہے - جب ہم لوگ ہوٹل فارس کے کمرہ پر پہنچے تو میں نے اس سے کہا کہ مجھ کو سخت پیچش ہو گئی ہے - تعجب ہے کہ یہاں اسب غول یا اسکی بھوسی نہیں ملتی - اس نے جواب دیا بکثرت ملتی ہے اور بیرا کے لیے گھنٹی بجادی - بیرا آیا تو اس نے بیرا کو ایک کاغذ پر لکھ کے ایک تومان دیا کہ جاؤ "پانچ تولہ پشت اسپرزہ اگر پشت نہ باشد اسپرزہ خود" بے آؤ - اور دس پندرہ منٹ میں میرے مسیحا کے حکم پر ایک پڑیا اسب غول اور دوسری پڑیا میں اسب غول کی بھوسی آگئی - اور میں نے ایک گلاس پانی کی مدد سے دونوں کی نصف پڑیاں پیٹ میں اتارلیں اور دوسرے دن صبح تک بالکل اچھا چنگا ہو گیا - جب دوسرے دن وہ ایرانی سوداگر مجھ کو دیکھنے آیا تو میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور اس سے اسپرزہ نام کی تفصیل دریافت کی تو اس نے بتلایا کہ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے - اور شہر کی نصف آبادی فرنچ بولتی اور سمجھتی ہے - زبان پہلوی فرنچ سے بہت متاثر ہے - یہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ایرانی لندن نہیں پیرس جاتے ہیں اور انگلستان کے مقابلہ میں فرانس کو زیادہ

پسند کرتے ہیں۔ یوں بھی ہمیشہ سے ایرانی اور فرانسیسی ثقافتوں میں بڑی مماثلت اور ہم آہنگی رہی ہے۔

اب غسل کا سوال پیدا ہونے پر معلوم ہوا کہ ہوٹل میں کوئی غسل خانہ نہیں ہے۔ طہران میں بہت سے پبلک حمام ہیں وہیں غسل کرنا زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہوٹل سے نزدیک ہی ایک حمام تھا۔ ایک پورٹ فولیو میں ضروری کپڑے اور وطن کا بہترین صابن لائف بوائے سوپ رکھ کر حمام گیا۔ حمام کے پہلے حصہ میں ایک کمرہ تھا جس میں ایک میلا سا فرش تھا اور دیوار سے ملے ہوئے بہت سے لاکر ــــ دو تومان لیکر ٹھیکیدار (یا مالک) نے مجھ کو ایک کنجی دی۔ میں نے اس میں اپنے کپڑے گھڑی قلم اور پرس وغیرہ بند کیے اور ایک بڑا تولیہ اور ایک صابن لیکر حمام ہال میں داخل ہو گیا۔ دروازہ خود کار تھا وہ بند ہو گیا۔ باہر سردی تھی اور حمام واقعی گرم تھا۔ حمام میں میرے علاوہ میرے پتھر کے فرش پر سب ننگے لیٹے ہیں۔ اخلاقاً ایک چھوٹے سے تولیہ سے ستر عورتیں کئے ہوئے تھے۔ ہال میں مجھ کو کچھ عجیب قسم کی بدبو محسوس ہوئی جو غالباً پسینہ بدن کی میل اور حلتی ہوئی سیلن کی ملی جلی بھبک تھی۔ طبیعت الٹ پلٹ ہو گئی۔ جی چاہا کہ بلا غسل کئے واپس چلا جاؤں مگر چونکہ سفر کی گرد اور گندگی جو میرے جسم کو خود بوجھل اور ناقابل برداشت بنائے ہوئے تھی اس سے گلو خلاصی بغیر نہائے ہوئے ممکن نہ تھی۔ میں طوعاً کرہاً اسی گندے پتھریلے فرش پر بیٹھ گیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہال میں زندہ لاشوں پر نظر دوڑائی تو دیکھا نوعمر چھوکرے گاہکوں کے اجسام پر رگڑ گھِس لگائے ہوئے ہیں۔ کسی کے سر کی چمپی ہو رہی ہے اور کسی گوشہ کی طرف رخ کئے ہوئے کوئی انڈر شیو کر رہا ہے۔ میں نے سوچا چلو یہی غنیمت ہے ورنہ اگر وہ دوبدو استادہ ہو کر یہ کار ضروری انجام دینے لگتا تو کوئی کیا کر سکتا تھا کہ سامنے ایک دروازہ کھلتا اور بند ہوتا نظر آیا جس میں لوگ غسل شرعی کر کے یا تو نکل رہے تھے یا اندر جا رہے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی اپنا تولیہ اور صابن سنبھالا اور اندر چلا گیا۔ اس میں تقریباً بیس۲۰ گرم پانی کے کیوبیکل بنے ہوئے تھے اور بمبوں سے پانی گرنے اور نہانے والوں کے ہو ہو کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک کھلا دروازہ دیکھ کر میں اس میں داخل ہو گیا اور اندر سے بند کر لیا۔ اس میں ایک پانچ واٹ کا بلب ٹمٹما رہا تھا۔ ایک گرم پانی کا بمبہ اور ایک سرد کا۔ ایک ڈونگا اور دو تین لکڑی کی کھونٹیاں۔ میں نے صابن کا ڈبہ کونے کے پتھر پر رکھا تولیہ ایک کھونٹی سے لٹکایا اور پہنے ہوئے کپڑے اتار کر دوسری کھونٹی پر لٹکا دیے۔ درآنحالیکہ وہاں پیشاب کی کھرہند آ رہی تھی میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ دیے بغیر دونوں بمبے کھول دیے اور بہتے ہوئے گرم ٹھنڈے پانی سے پیروں کی مدد سے فرش دھو ڈالا اور پندرہ منٹ

تک صابون سے رگڑ رگڑ کر سر سے پیر تک اپنے جسم کو خوب مانجا۔ دھندلکے میں اندازہ مشکل تھا کہ بدن سے کتنا میل نکلا۔ آخری چار یا پانچ ڈونگے آبِ خالص سے اپنے کو مزید صفائی کا احساس دلایا۔ تولیہ سے بدن خشک کیا اور اسی تولیہ کی لنگی باندھ کر باہر نکل آیا۔ چند ثانیہ ہال میں رک کر باہر والے کمرہ میں آیا۔ لاکر کھول کر بال سکھائے۔ کپڑے بدلے اور جلد از جلد واپس جاکر ہوٹل کے اپنے کمرہ میں دم لیا۔ بیرا سے چار منگوائی اور سوٹ بوٹ زیب تن کرکے بالکل "میں تو صاحب بن گیا"۔

طہران میں خصوصیت سے دو باتیں دیکھیں ایک تو یہ کہ ہر وقت ہر سڑک پر ٹیکسیاں چلتی ہوئی ملتی تھیں۔ اشارہ کرنے پر مسافر کو لینے کے لیے یا اسکو اتارنے کے لیے رکتی تھیں ورنہ مسلسل چلتی رہتی تھیں۔ مسافر کو لینے سے کوئی ٹیکسی انکار نہیں کرسکتی تھی کہ فوراً چالان ہوجائے گا۔ اپنے وطن کی مناسبت سے یہاں اور عراق دونوں جگہ کرایہ نصف سے بھی کم تھا۔ سب ٹیکسیاں یک رنگ اور اوسط قد و قامت کی تھیں۔ اور نوے فیصد ان کے ڈرائیور ہندوستانی سکھ ہوتے تھے جو ایران میں ایرانی عورتوں سے شادیاں کرکے وہیں کے ہو رہے تھے۔

ہوٹل سے نکل کر میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور سب سے پہلے طہران کی شہربانی یعنی پولیس کوتوالی گیا اور اپنی آمد درج کرائی، پاسپورٹ پر ٹھپا لگوایا اور وہاں سے اپنے سفیرِ ہند سید علی ظہیر صاحب سے ملنے ہندوستانی سفارت خانہ گیا۔ علی ظہیر صاحب نے معانقہ کیا اور مجھ کو دیکھ کر واقعی بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آج شب میں ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ میں نے معذرت چاہی کہ آج معاف فرمائیے بہت سے کام ہیں۔ ابھی دانش گاہ طہران جانا ہے۔ وزیر الحسن عابدی سے ملنا ہے جو وہاں زبان پہلوی پر تحقیقی کام کررہے ہیں۔ یہاں سے پاکستانی سفارت خانہ میں طیب حسین سے ملنا ہے۔ قم جانا ہے اس لیے دو تین دن بعد اگلے اتوار تک دولتکدہ پر خود حاضری دوں گا۔ بھابھی سے بھی تو ملنا ہے۔ اور وہ راضی ہوگئے۔ موصوف کے گھر کا پتہ نوٹ کرکے رخصت ہوکر سیدھا دانش گاہ طہران گیا اور عابدی کو غیر شادی شدہ اساتذہ کی اقامت گاہ یونیورسٹی کلب کے ایک کمرہ میں موجود پایا۔ وہاں ان کے استاد اور زبان پہلوی کے پروفیسر دکتر کیا (Kiya) سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں بیٹھے چار پی رہے تھے اور فارسی ادب کے کسی مسئلہ پر گفتگو کررہے۔ دکتر کیا فارسی، فرانسیسی، انگریزی اور روسی ادب کے ماہر تھے اور قدرے ہندوستانی بھی بول لیتے تھے۔ وہاں سے نکل کر کے گیا اور عابدی نے مجھ کو پوری دانش گاہ کی سیر اپنی کار میں گھما کر کرادی۔ بہت بڑا کیمپس تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں

اور طلباء کے لیے قیام گاہیں اور بڑے پیمانہ پر چمن بندی تھی مگر طلبا کی کمی محسوس ہوئی۔ دریافت کرنے پر ان حضرات نے بتلایا کہ یہاں تعلیم کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ متوسط اور غریب طبقات کے لوگ ان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ محض دولتمند خاندانوں کے طالب العلم یہاں آتے ہیں۔ ان سے کم حیثیت کے لوگ اتنے غریب ہیں کہ ان کے گھروں میں شب کے وقت روشنی بھی نہیں ہوتی اور غریب طلبا سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر نصب لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھے کتابیں پڑھتے اور لکھتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے متعجب ہو کر دریافت کیا کہ تیل کے ذخائر سے حاصل کی ہوئی دولت کہاں جاتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کا جواب حضرت شاہ ایران اور ان کی حکومت ہی دے سکتی ہے۔

جب میں وارد ایران ہوا تھا اسی کے ایک دن پہلے رزم آرا وزیر اعظم ایران کا قتل ہوا تھا اس کے بعد جب مصدق وزیر اعظم ہوئے تو انھوں نے وہاں کے تیل کے چشموں کو انگریزوں کے پنجوں سے نکال کر Nationalise کر دیا تھا۔

دانش گاہ کے چمن میں گلاب اور عنادل کی کثرت تھی۔ یہ اصلی بلبل تھے جو قد و قامت میں ہندوستانی بلبلوں کے ڈیوڑھے ہوتے ہیں اور جو مستانہ وار گلبانگ سے تھک تھک کر اکثر شاخ گل کے نیچے مردہ پائے جاتے ہیں۔ یہ افسانہ نہیں چشم دید حقیقت ہے۔ اور اس کی تصدیق وہاں کے غیر ایرانی مقیم لوگوں نے بھی کی۔

شب میں دکتر کیا، عابدی اور میں یکجا ہو کر دس بجے تک مختلف مسائل شعر و ادب پر گفتگو کرتے رہے۔ دکتر کیا نے میرے اشعار بھی بڑی دلچسپی سے سنے۔ جدید فارسی شاعری سے ان کا تقابل اور تبصرہ بھی کرتے رہے۔ کھانا ہم تینوں نے ایک ساتھ خیابان فردوسی کے کسی رستوران میں کھایا اور کھانے کی قیمت ڈاکٹر موصوف نے ادا کی اور اپنے گھر کا پتہ دیکر باتی ہم دونوں سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد عابدی مجھ کو ہوٹل میں چھوڑ کر دانش گاہ چلے گئے۔ دوسرے دن میں ایک ٹیکسی سے قم گیا جو طہران کے جنوب مشرق میں تقریباً چالیس بیالیس میل پر واقع ہے۔ وہاں معصومۂ قم کے روضہ پر زیارت پڑھی۔ وہیں ایک مذہبی عالم مل گئے جو ہندوستان آتے جاتے رہتے تھے۔ اپنے ساتھ اس مدرسہ پر لے گئے جہاں وہ معلم تھے۔ چا اور کھانے سے تواضع کی۔ میں نے ایسے کسی مذہبی مسئلہ پر گفتگو مناسب نہ سمجھی کہ مولوی مذہب کے بنیادی مسائل سے کسی قسم کے انحراف یا بحث پر اپنا توازن ذہنی کھو بیٹھتا ہے۔ علاوہ اس کے ہم اخباری گروں کے پلے تھے اور علما کا مسلک خالص تقلیدی ہوتا ہے۔ اس لیے گفتگو کا موضوع زیادہ تر وہاں کے عوام کی غربت اور اقتصادی مسائل تھے۔ اس زمانہ میں تودہ پارٹی (ایران کی کمیونسٹ پارٹی جو غیر قانونی قرار پا چکی تھی) سے ان علما کو بڑا سہارا ملتا تھا۔ اور ان کی مدد سے شہنشاہیت کے خلاف

بغاوت کا جذبہ علما اور عوام کے دلوں میں سر اٹھاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ تیل کے مسئلہ پر علما اس کے تو میائے جانے کی پالیسی سے متفق تھے مگر شہنشاہ کی استبدادی پالیسی کے دبے طور پر خلاف۔ حکومت کی جاسوسی سے سب خوف زدہ رہتے تھے اور بے بس نظر آتے تھے۔ کسی بھی مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ہر گھر میں اور ہر شعبۂ زندگی میں جاسوسی کا جال پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سہ پہر کو ان سے رخصت ہو کر میں چراغ جلے طہران واپس گیا۔

طہران میں آئس کریم بہت کھائی جاتی تھی۔ برف کا کوئی کارخانہ نہ تھا۔ البرز کی پہاڑیوں سے برف کی سلیں کاٹ کر ٹھیلوں پر آتی تھیں اور اسی سے قلفی جمانے کا کام لیا جاتا تھا۔ وہاں کی قلفی ضرورت سے زیادہ میٹھی ہوتی تھی۔ اور دہی چلو پلاؤ ہر جگہ کھانے کو ملتا تھا۔ شاید امیروں کے گھروں میں دوسرے مشہور اور لذیذ کھانے پکتے رہے ہوں تو مجھ کو خبر نہیں۔

قم سے واپس آنے کے دوسرے دن میں پاکستانی سفارت خانہ گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ راجہ غضنفر علی خاں سفیر پاکستان باہر گئے ہیں اور لکھنؤ کے میرے دوست طیب حسینی چارج ڈی افیرس ہیں۔ طیب دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئے اور سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ میں نے کہا ہوٹل فارس میں۔ یہ سنتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ کو ساتھ لیکر اپنی کار میں ہوٹل پہنچے۔ اور وہاں سے میرا سامان بندھوایا اور اس کو کار کے بوٹ میں رکھ کر سیدھے اپنے گھر پہنچے اور اپنی بیگم سے ملایا جو طیب کے استاد معظم ڈاکٹر مرحوم مرزا محمد رشید عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی بھانجی اور قبل تقسیم برصغیر دہلی کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن رہ چکی تھیں اور فسادات کے زمانہ میں اپنی کار دہلی پارٹی کو دیکر کراچی ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ بھی بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملیں اور ہم دونوں کو ایک ایک کافی کی پیالی تھما کر لنچ کی تیاری میں لگ گئیں۔ طیب اور میں بستروں پر لمبے لمبے لیٹ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کون کہاں ہے کیا کر رہا ہے آپ کیسے اِدھر آنکلے اور پہلے سے کیوں نہ اطلاع دی اور کئی دن گذارنے کے بعد اتنی تاخیر سے کیوں ملے وغیرہ وغیرہ۔ اور میں ان کے ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتا رہا۔ پچش کی مصیبت سن کے وہ بہت ہنسے اور لطیفہ سنایا کہ ایک طالب علم ایران سے فارسی کی سند لیکر اپنے وطن ہندوستان کے کسی دیہات میں پہنچ کر بیمار ہوا اور پیاس کے عالم میں "آب آب" کہتا ہوا مر گیا اور کوئی نہ سمجھا کہ پانی مانگ رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ ایران میں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کیسے ہیں۔ طیب نے جواب دیا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان تعلقات بہت اچھے ہیں تو وہ ایران ہی میں ہیں۔ ہم لوگ اس طرح مل جل کر رہتے ہیں جس طرح تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان میں رہتے تھے۔ میں نے کہا دو دن پہلے میں علی ظہیر صاحب سے ملنے گیا تھا۔ انھوں نے کسی دن ساتھ

کھانا کھانے کو کہا ہے۔ طیب نے کہا میں ابھی فون پر اُن سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ فون ڈائل کیا اور دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔ طے یہ پایا آج ہی شب میں ہم تینوں ان کے یہاں کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد بیگم طیب نے "لنچ تیار ہے" کی گھنٹی بجادی۔ ہاتھ دھو دھو کر ہم دونوں کھانے کی میز سے جا لگے۔ بیگم طیب نے کہا آج کی صاحب غیر متوقع ملاقات ہو کر بس لطف آگیا۔ اب کچھ دن یہیں رہ کر آرام کیجئے۔ دیکھئے آج آپ کے لیے کتنی قسموں کی ایرانی ڈشسز تیار کی ہیں۔ ایرانی کھانوں کی بات چل پڑی تو میں نے اپنے تجربے کی جلی کٹی ان کو سنائی۔ جہاں جاؤ چلو پلاؤ۔ چلو پلاؤ۔ یہ چلو پلاؤ کیا بلا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چلو پلاؤ ہے تو اچھی ڈش مگر ہوٹلوں میں وہ اچھا ملتا نہیں اس کے علاوہ بھی یہاں کھانوں کی بہت اچھی قسمیں ہیں۔ کوئی نام لیکر پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا اس کو کھائیے۔ واقعی وہ سالن بہت لذیذ تھا اور دوسری ڈشسز بھی کافی مزیدار تھیں اور ایرانی پکوان کی طرف سے مجھکو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

آج رات کی دعوت علی ظہیر صاحب اور بیگم علی ظہیر کے یہاں کھائی۔ کھانے کے بعد بارہ بجے شب تک مختلف موضوعات پر گفتگو اور شعر شاعری رہی۔ اور ان کا طیب سے اس بات پر جھگڑا ہوتا رہا کہ انھوں نے ایک ہندوستانی کو بغیر استحقاق اپنا مہمان بنالیا۔ اور طیب فوراً اس ہندوستانی امانت کو ہندوستانی سفیر کے سپرد کردیں۔ طیب اور بیگم اس تبادلہ پر بالکل راضی نہ ہوئیں بلکہ تھوڑی سی گرما گرمی بھی ہوگئی تھی مگر جلد ہی بیگم طیب نے سفیر ہند اور ان کی بیگم کو میرے اعزاز میں کل کی شب کے کھانے کی درخواست کی گئی۔ اور ہم لوگ جلد ہی بیگم طیب کے گھر آگئے اور میں نے اپنے میزبانوں کے بڈ روم میں تیسرا بستر اپنا لگا ہوا دیکھا۔ اور سب لوگ سو گئے۔

صبح سویرے ہی سے رات کی دعوت کے انتظامات ہونے لگے اور طیب ہم کو لیکر طہران کی سیر کرانے نکل کھڑے ہوئے۔ لنچ کے وقت واپس آگئے اور پھر قیلولہ کے نام پر شام تک سوتے رہے۔ اسی درمیان میں طیب اپنے سفارت خانے بھی ہو آئے۔ رات کی دعوت میں بھی کافی لطف رہا۔ ان لوگوں کا آپس میں یہ اختلاط دیکھ کر میں ان صاحبان سے پوچھا کہ کیا ایسے ہی تعلقات اپنے برصغیر کے دو ملکوں میں ممکن نہیں۔ جواب ملا بالکل ممکن ہے بشرطیکہ سیاسی پارٹیاں اور دوسرے بڑے ممالک اس میں رخنہ اندازی نہ کریں۔

صبح ہوئی تو شمران کی سیر اور پکنک کی ٹھہری۔ شمران سلسلہ البرز کے مشرقی اختتام کا نام تھا جس کی چوٹی پر اب تک برف کی چٹانیں موجود تھیں۔ طہران سے تقریباً پچیس کلو میٹر کی دوری پر رہا ہوگا۔ سڑک بالکل مانگ کی طرح سیدھی اور (Gradient) چڑھائی کا ناویہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ڈگری کا رہا ہوگا۔ کول تار کی نہایت مسطح شاہراہ جس کی دونوں جانب پگھلی ہوئی برف کے برف آب کے چشمے پتلی پتلی نہروں کی شکل میں بہہ رہے تھے۔ دور دیہ آلوچے اور ناشپاتیوں کے

سرسبز باغات تھے جن کے درمیان کھلے ہوئے چار خانے تھے۔ ایک نخلستان میں ایک بھنا ہوا بچہ مرغ اور ایک گلاس بیر مفت ملتی تھی۔ میں نے بیرے سے دریافت کیا "آن چہ چیز است۔ شراب؟" جواب ملا "نخوہ۔ ان شروب نیست۔ آب جو ست"۔ میں نے کہا "کیا خوب" اور طیب سے پوچھا کیا یہاں کے لوگ پانی نہیں پیتے بیر پیتے ہیں؟ انھوں نے کہا زیادہ تر ایرانی اہل دولت دن میں بیر اور شب میں شراب پیتے ہیں"۔ مرغ کھا کر ہم لوگوں نے قہوہ پیا جس میں قند تو تھا مگر دودھ نہ تھا جس کی تلخی خوشگوار تھی۔ بھاری کار تھی اس لیے شمران کی چڑھائی کا احساس ہوئے بغیر ہم لوگ پہاڑی کی نصف اونچائی تک پہنچ گئے۔ آخروٹ، بادام اور سیب کے باغات تھے۔ پرکیف ٹھنڈک تھی۔ شمران کی سڑکیں پتلی اور مرمت طلب تھیں۔ پیدل بھی خوب گھومے اور اس بلندی سے مشرق کے پیرس طہران کی طائرانہ سیر کی۔ دوپہر میں بیکڈ پنچ کھایا گیا۔ اس کے بعد کچھ دیر ہم لوگوں نے (Pine forest) چیڑ کے جنگل کے نیم مخمل کشن پر آرام کیا۔ چیڑ کی سوکھی ہوئی بادام پتی ہزار ہا سال سے ایک دوسرے پر تہ بہ تہ جم کر جو گدے بناتی ہے اس کی نرمی اور سختی کے امتزاج کا کوئی جواب نہیں۔

اب میری رخصت نصف سے زیادہ ختم ہو چکی تھی۔ اور مجھ کو مشہد، زاہدان اور نشکی ہوتے ہوئے کراچی اور کراچی سے بمبئی اور بمبئی سے بارہ بنکی جانا تھا۔ یہیں اپنے سفارت خانہ کے توسط سے میں نے رخصت میں دو ہفتے کی توسیع کی درخواست لکھنؤ بھجوا دی تھی۔ مجبوری تھی اس لیے طیب اور بیگم طیب نے مشہد کی بس پر بٹھا کر مجھ کو خدا حافظ کہا۔

طہران سے مشہد کا راستہ زیادہ تر پہاڑی اور ریگستانی ہے۔ مشہد دوسرے دن دوپہر بعد پہنچا۔ ٹیکسی والے سے کہا کہ کسی ایسے ہوٹل میں لے چلو جس میں کمروں سے ملا ہوا باتھ روم ہو۔ تاکہ میں حمام جانے سے بچ جاؤں۔ اس نے جواب دیا کہ ملا ہوا باتھ تو کہیں نہ ملے گا۔ البتہ ایک ہوٹل ہے نام یاد نہیں، جس میں بیت الخلا اور حمام فرانسیسی طرز کا بہت صاف ستھرا اور سنگ مرمر کا ہے۔ وہاں پہنچ کر ایک کمرہ لیا اور صاف کپڑے وغیرہ لیکر ہوٹل کے حمام میں داخل ہو گیا۔ واقعی بیت الخلا اور حمام سنگ مرمر کے تھے اور ہر طرح کے جدید آلات غسل سے مزین۔ کمرہ پر لوٹ کر چار رنگا کی اور کچھ کھانے کو۔ اس کے بعد کچھ دیر ہوٹل کے بستر میں جو صاف تکیوں تو شک چادر اور دو بہت نرم وگرم کمبلوں سے آراستہ تھا، میں نے کچھ دیر آرام کیا اور کمر سیدھی کی۔ چراغ جلنے کے بعد پیدل ہی روضۂ امام رضاؑ پر گیا جو ہوٹل سے تقریباً دو فرلانگ پر تھا۔ روضہ روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ضریح مقدس پر پہنچ کر میں نے زیارت پڑھی اور وہاں سے نکل کر اس کے در و بام کی

دیکھا تو صفوی دور کا بہترین طرز تعمیر کا نمونہ نظر آیا۔ سونے کے اینٹوں کے دو بلند مینار اور گنبد اور روضہ کا باقی حصہ میناکاری اور سچے جواہرات سے پٹا ہوا تھا۔ ایک بلند دروازہ کی محراب میں بیضہ شتر مرغ کے برابر ضخیم فیروزہ آویزاں تھا۔

دوسرے دن بازار اور اطراف کی سیر کی تو مشہد میں ایک ایسی چیز نظر آئی جو ایران میں دوسری جگہ تو کیا طہران تک میں عوام کو میسر نہ تھی یعنی پبلک پارک جس میں شہریوں کو سیر تفریح کرنے اور بچوں کو کھیلنے کی اجازت ہو۔ وہ صرف مجھ کو مشہد میں ملا۔ بڑا شاندار حسین و سرسبز پھولوں سے لدا ہوا باغ اور لان جس سے ہر شخص مستفید ہو سکتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے شاہی جبر و استبداد کی لہریں پہنچتے تک بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ بوڑھے جوان اور بچے اس پارک میں تفریح کر رہے تھے۔ مشہد سے تیسرے دن میں زاہدان کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور یہ راستہ دشت لوت ہو کر گذرتا تھا۔ جس میں سیکڑوں میل تک علاوہ ریتیلے دشت کے آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا اس لیے سب نے اپنی اپنی چھاگلیں پانی سے بھر لی تھیں اور ڈیڑھ دن کے کھانے کی اشیاء اپنے جھولوں میں رکھ لی تھیں۔ دوسرے دن دوپہر بعد ہم لوگ زاہدان پہنچے۔ اس کے فوراً بعد بلوچستان (پاکستان) کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

پاکستانی ریل زاہدان تک آتی ہے۔ ٹرین جس پر میں کراچی کے لیے روانہ ہوا تھا بلوچستان کے شمالی حصہ سے گذر کر بعد غروب آفتاب نشکی درہ بولن کے قریب تک دو انجنوں کی مدد سے پہنچتی ہے۔ دن کے سفر میں بلوچستان میں دنیا کے خوبصورت ترین ریگستان سے ہو کر یہ ریل گذرتی ہے۔ میں نے کئی ریگستانوں میں سفر کیا ہے مگر اتنے سڈول اور لہریے دار Sand Dunes (ریت کے تودے) کہیں نہیں دیکھے جو ہر پچیس تیس میل پر رنگ بدلتے رہتے ہوں۔ نیلا، پیلا، سرخ، سفید، سیاہ، سبز، بینجنی اور نہ معلوم کتنے رنگ کی ریت نظر کو مسحور کرتی تھی۔ اگر ان کی رنگین فلم تیار کی جائے تو ایک بہت نادر Documetary Film (دستاویزاتی فلم) بنایا جا سکتا ہے۔ دنیا کا سب سے قیمتی اور مضامین اور تصاویر کے اعتبار سے نہایت مقتدر اور معتبر ماہنامہ نیشنل جاگرفک (National Geographic) ہے۔ وہ اگر اس کی طرف توجہ کرے تو تحریر و تصویر دونوں میں شمالی بلوچستان کا صحیح امیج پیش کر سکتا ہے۔

نشکی پہنچنے کے بعد ہم کو کوئٹہ کراچی میل ملا جو درہ بولن سے گذر کر سندھ کے ریگستانوں سے ہوتا ہوا علی الصباح حیدرآباد سندھ پہنچا دیتا ہے اور وہاں سے ڈھائی تین گھنٹے میں کراچی۔

نیا نیا پاکستان بنا تھا اور میرے عم محترم سید محمد مرتضیٰ صاحب انکم ٹیکس آفسر ہجرت کر کے وہاں گئے تھے۔ ان کے پتہ پر تانگہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ لکڑی کے ایک عارضی فوجی بیرک میں مع اپنے اہل و عیال کے قیام پذیر ہیں۔ سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مگر جو آرام دہ طرز زندگی وہ لوگ ہندوستان میں چھوڑ کر اس تکلیف کو گوارہ کرنے آئے تھے دیکھ کر عبرت ہوئی۔ پورے کراچی کا یہی حال تھا۔ ہر مہاجر خاندان کی حالت بد سے بد تر تھی۔ کراچی ایک اجڑا ہوا شہر معلوم ہوتا تھا۔ چند نئی عمارتیں بننا شروع ہو گئی تھیں۔ سواری کے لیے گھوڑوں کے تانگہ کی جگہ گدھوں کا یکہ جس سے ایک گدھا یعنی اور کبھی رہتا اور بار برداری کے لیے بہت لمبی لمبی اونٹ گاڑیاں ہوتی تھیں اور جو اب تک ہیں۔ سڑکوں پر ایک آدھ کاریں اور جیپیں بھی دیکھنے میں آجاتی تھیں۔ اونٹ گاڑیوں کا وہاں وہ وقار تھا جب کسی چوراہے پر اپنی شاہانہ رفتار سے گذرتی تھی تو سڑکوں کا ٹریفک رک جاتا تھا۔ اسٹیٹ بینک کے چاروں طرف پرائیویٹ زرمبادلہ کے سوداگر اپنی چوکیاں لگائے کروڑوں روپے کا کاروبار کرتے رہتے اور اسٹیٹ بینک کے اہلکاران اپنے کاؤنٹر پر بیٹھے سگریٹ اور چائے پیا کرتے تھے۔ پھلوں، سبزیوں اور گوشت کا بازار اپنے پورے شباب پر چل رہا تھا مگر کپڑے کا بازار سرد دکھائی دیتا تھا۔ دو تین دن وہاں احباب اور عزہ سے مل کر میں بذریعہ سمندری جہاز بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اور بمبئی پہنچ کر جب کسٹم والے کو میرے سوٹ کیس میں علاوہ کتابوں اور استعمالی کپڑوں کے کچھ نہ ملا تو اس نے میرا نیا مجموعہ "جرس" شکریہ کے ساتھ اور میرے آٹوگراف کے ساتھ لے لیا اور ایک پیالی چائے پلا کر رخصت کیا آدمی شوقین اور پڑھا لکھا پنجابی معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے دن میں بمبئی میل سے لکھنؤ اور اسی دن بارہ بنکی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرا تبادلہ مین پوری کا ہو گیا ہے جہاں جانا میں پسند نہ کرتا تھا۔ تبادلے کو منسوخ کروانے کی کوشش میں ناکامیاب ہونے کے بعد میں نے طویل رخصت کی درخواست دی اس شرط پر دی کہ اگر رخصت منظور نہ ہو تو میرا استعفیٰ قبول کیا جائے اور میں نے اس درخواست کا نتیجہ سنے بغیر کلکٹر ضلع M.L. Kaul I.C.S. کو چارج دیدیا۔ رخصت پر جاتے وقت میں نے اپنی آسٹن کار رنگ اور مرمت کے لیے بارہ بنکی میں چھوڑ دی تھی وہ بھی شپ شیپ حالت میں ملی اور میں اپنا ضروری سامان اس میں رکھ کر وطن کو روانہ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں جولائی ۱۹۵۰ء میں میرا استعفیٰ منظور ہو گیا اور میں اپنے وطن کجگاؤں میں بالکل آزاد اور سرکاری آلائش سے پاک صاف ستھری فضا میں سانس لینے لگا۔ ••

ساتواں باب

جالندھر

مستعفی ہونے کے بعد دوران قیام وطن میں کبھی بمبئی، کبھی جالندھر، کبھی حیدرآباد، کبھی پنجاب، کبھی دہلی، کبھی رامپور، کبھی بہار، کبھی کلکتہ کی سیر و سیاحت اور کثرت سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا۔ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں چاٹگام، کھلنا، ڈھاکہ، جیسور اور سید پور وغیرہ کے مشاعرے میری ترقی پسند تخلیقات کے لیے خاص دلچسپی کے مراکز تھے۔ بنگال ادیبوں سے بھی ملنے کے مواقع ملتے رہے جن میں جسیم الدین جیسے شاعر سے مل کر بڑی مسرت ہوئی تھی کہ مشرقی بنگالی ابھی اپنی انقلابی شاعری کی روایت برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ان مشاعروں میں پرویز شاہدی، جگن ناتھ آزاد، روش صدیقی، نشور واحدی اور جگر صاحب کا ساتھ تو رہتا ہی تھا ان کے علاوہ وہاں کے بھی اردو ادیبوں سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔

۱۹۵۱ء میں جالندھر ریڈیو نے اپنے ایک سالانہ مشاعرہ میں مجھ کو شرکت کی دعوت دی اور میں بلا تردد جالندھر پہنچ گیا۔ تقسیم ملک کے بعد میرے لیے جالندھر کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ فسادات تو کب کے ختم ہو چکے تھے مگر ابھی دلوں کے زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے اس لیے وہاں کے مشاعروں میں مُسلمان شعرا کو بلانے میں ارباب مشاعرہ پس و پیش محسوس کرتے تھے مگر نہ معلوم کس بھروسے پر اور کن لوگوں کی تحریک پر جالندھر ریڈیو نے مجھ کو بلا لیا تھا۔ اور میں نے ریڈیو والوں کو اپنی آمد کی ٹرین اور وقت سے مطلع کر دیا تھا چنانچہ ریڈیو کے نمائندے جالندھر ریلوے اسٹیشن پر میری رہنمائی اور تحفظ کے لیے مع سواری کے موجود تھے۔ وہاں سے وہ حضرات مجھ کو ریڈیو اسٹیشن سے قریب ایک ہوٹل میں پہنچا کر اور ہوٹل کے منیجر کے سپرد کر کے واپس چلے گئے۔ اب صبح کا جھٹ پٹا ہو رہا تھا۔ میں نے گھنٹی بجا کر بیرا سے چائے لانے کو کہا اور ہلکی خنک ہوا سے لطف اٹھانے کے لیے کمرہ سے باہر چلا گیا۔ دیکھا کہ کمرہ سے کچھ دور ایک بنچ پر دو نوجوان معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیڑی پی رہے تھے۔ اونہہ۔ ہوگا۔ ہم سے کیا مطلب۔ کسی کے ملازم ہوں گے۔ مگر سناٹے سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ہوٹل میں بہت کم مسافر مقیم ہیں اور میں کمرہ میں واپس چلا گیا۔ چائے آئی۔ چائے پی کر میں مسہری پر لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو اشتہا محسوس

ہو رہی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو کافی دن چڑھ چکا تھا اور نو بج رہے تھے مگر وہ دونوں نوجوان اپنی جگہ پر بیڑی پیتے ہوئے ملے۔ میں نے کمرہ میں واپس جاکر بیرا کو بلایا اور ناشتہ لانے کو کہا۔ ناشتہ کرکے ابھی گولڈ فلیک کی نئی ڈبیا سے سگریٹ نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے باہر سے دق الباب کیا اور دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ اور ایک ۲۵-۲۶ برس کا ایک دبلا پتلا جوان آدمی کمرہ میں داخل ہوا جو جوان کم اور بڈھا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ بولا "تم واثق جونپوری ہو نا" میں نے کہا "ہاں میں واثق اور آپ؟" میں۔ میں تمہارا نادیدہ عاشق فکر ہوں" اتنا کہ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "یہ ریڈیو والے بہت خوفزدہ تھے مگر میں نے اصرار کرکے تم کو مشاعرہ کا کنٹریکٹ بھیجوا دیا تھا اور تمہارے تحفظ کا ذمہ لیا تھا۔ تم کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ ریڈیو والے ریلوے اسٹیشن پر تم کو لینے گئے تھے؟ یہ سب کچھ نہیں صرف اس گورے چمڑے کی حرمزدگی تھی۔ ہم آزاد ہو کر بھی غلام ہی رہے۔ اور ہم کو اب اس دیسی غلامی سے بھی لڑنا اور آزاد ہونا ہے"۔ اس کے بعد چائے منگائی گئی۔ پھر بے تکلف میری ڈبیا سے نکال کر ایک سگریٹ پی اور ایک جیب میں رکھ کر فکر آٹھ بجے رات تک کی رخصت لیکر یہ جا اور وہ جا۔ فکر تونسوی کے جانے کے بعد میں کوئی کتاب پڑھتا رہا۔ اور دوپہر کا کھانا کھا کر سو گیا۔ سہ پہر کو سو کر اٹھا تو شہر کی سیر کرنے اور لسّی پینے کا شوق چرایا۔ کپڑے بدل کے باہر نکلا تو اسی طرح دو بیٹھے وہ دونوں نوجوان بیڑی پی رہے تھے۔ ہوٹل سے کچھ ہی دور پر بازار شروع ہو گیا تھا۔ کچھ دور بازار میں چل کر ایک دوکان میں داخل ہو گیا اور مالک دوکان سے جب کسی لسّی کی دوکان کا پتہ دریافت کیا تو وہ ایک حکیم صاحب کا مطب نکلا اور انھوں نے اپنے مطب میں مجھ کو بٹھا لیا اور میرے لیے وہیں ایک طویل القامت گلاس میں لسّی منگوائی اور مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ کس کام کے لیے آئے ہیں کب تک رہیں گے۔ کیا نام ہے۔ جب میں ہر سوال کا جواب دے چکا تو بڑی شفقت سے بولے "ہاں جی خوب آرام سے سیر کرو۔ مشاعرہ میں شرکت کرو۔ مجھ کو بھی شعر و شاعری بڑی دلچسپی ہے۔ اطمینان سے گھومو۔ کوئی بولا تو گدّی سے زبان کھنچوا لوں گا اور کسی نے ترچھی نظر سے دیکھا تو آنکھیں نکلوا لوں گا۔ آج اپنی زبان کے دو بول بیٹھے تو آپ کی زبان سے سنے"۔ اتفاقاً میری نظر جب مطب کے باہر گئی تو وہ دونوں نوجوان سڑک کے اسی پار کھڑے بیڑی پی رہے تھے۔ جب ہوٹل میں فکر مجھ کو مشاعرہ میں ساتھ لیجانے کے لیے آئے تو میں نے کہا کہ "باہر بنچ پر بیٹھے بیڑی پیتے ہوئے دو نوجوان تم نے دیکھے۔ مجھ کو تو یہ جاسوس معلوم ہوتے ہیں جو صبح سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں"۔ فکر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا "ارے یار یہ جاسوس

واسوس نہیں ہیں۔ پارٹی کامریڈ ہیں جن کو پارٹی نے تمھارے تحفظ کے لیے ڈیوٹی پر لگایا ہے"۔ تب مجھ کو اطمینان ہوا۔ اس کے بعد فکر سے خوب دل کھول کر باتیں ہوتی رہیں۔ مشاعرہ میں بھی فکر کی طنزیہ گفتگو جاری رہی۔ دوسرے دن وہ برابر میرے ساتھ رہے۔ شام کو پارٹی آفس میں چائے اور شعر و شاعری رہی۔ ان دونوں نوجوانوں نے بھی اپنے منظوم عوامی نعرے سنائے۔ رات کی ٹرین سے فکر اور کئی ساتھیوں نے مجھ کو بادل نخواستہ رخصت کیا مگر وہ دو نوجوان میرے دائیں بائیں انبالہ تک ساتھ گئے۔ وہاں سے وہ مجھ سے رخصت ہوئے اور میرا سفر اپنے وطن کی طرف جاری رہا۔

اسلم خاں رامپوری

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک میرا قیام مستقل اپنے وطن گجگاؤں جونپور میں رہا۔ ضلع پارٹی کے ایما اور اجازت سے میں نے اپنے گاؤں میں پارٹی سیل قائم کیا۔ یہاں نوجوانوں کو پارٹی ممبر بنایا۔ مزید برآں گاؤں اور قرب و جوار کے دیہاتوں کو شامل کر کے کسان سبھا بنائی۔ اس کے جلسے کرواتا تھا اور لال کوٹھی میں ساتھیوں اور کسانوں کا کلاس لیتا تھا۔ جب گاہے گاہے مجھ سے تنہا گاڑی نہ چلتی تھی تو ضلع پارٹی کے سکریٹری کو بلا لیتا تھا۔ میں پارٹی ضلع ایگزیکیٹو اور پارٹی پریسیڈیم اور Cell (گیوٹ اکائی) کا بھی رکن تھا۔ اس زمانہ میں R.S.S. اور جن سنگھ سے ہم لوگوں کی ٹھنا ٹھنی رہتی تھی۔ ہم نے خاص طور پر "یادو" برادری کے لوگوں کو پارٹی ممبر یا ہمدرد بنا رکھا تھا۔ جونپور اور قرب و جوار کے نامی پہلوانوں کے دنگل کروائے جاتے تھے اور اس طرح وطن دشمن عناصر کی شرارتوں کی کاٹ کی جاتی تھی۔ گاؤں گاؤں میں کسانوں کے گھروں پر جا کے ان میں سیاسی شعور پیدا کیا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں U.S.I. اور C.I.A. کے جاسوسوں نے کراکت تحصیل کو اپنا مرکز بنا کر ضلع بھر میں Rural uplift (دیہی ترقی) کے نام پر FrankBushman (فرینک بشمین) کے Moral Rearmanent- اخلاقی باز بکتر بندی کے منصوبوں کی ترویج کا ڈھونگ رچا رکھا تھا اور اس کے پردہ میں بڑے بے ضرر انداز میں امریکی مفاد کے اعداد و شمار جمع کرنے کے خفیہ طریقے اختیار کر رکھے تھے اور غریب عوام کو انواع و اقسام کی رشوتیں اور لالچ دلا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا شیوہ بنا رکھا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنی گاڑی میں پٹرول ڈلوانے مچھلی شہر پٹرول پمپ پر گیا۔ شام ہو رہی تھی اور

ایک واکس ویگن وہاں مجھ سے پہلے سے کھڑی تھی۔ اس کے باہر دو امریکن کھڑے غالباً پمپ آپریٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک نے جیب سے چار مینار سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ایک ایک سگریٹ خود لی اور بڑے تپاک سے ڈبیا میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "Wadi like to" میں نے اپنا پائپ جیب سے نکالتے ہوئے جواب دیا "No thank you" اور پٹرول پمپ کی جانب اشارہ کیا۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوا اور انگریزی میں بولا "ہم آپ کو جانتے ہیں۔ آپ ہمارے دشمن ہیں۔ ہم سے نفرت کرتے ہیں اسی لیے ہم نے آپ کو سگریٹ پیش کی تھی کہ آپ وہی پائپ پینے والے کامریڈ ہیں یا کوئی اور"۔ معلوم نہیں کہ اب وہ جاسوس کہاں ہیں۔ زندہ ہیں کہ ویتنام کی جنگ میں کام آگئے۔

۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ رامپور کے ایک مشاعرہ میں بلایا گیا۔ مشاعرہ میں علاوہ ملک کے دوسرے نامور شعرا کے مقامی مشاہیر سے ملاقات ہوئی جن میں استاد جلیلؔ، محشرؔ عنایتی، شادؔ عارفی اور شبیر علی خاں شکیبؔ رامپوری مدرسۂ شاعری کے نمائندہ اساتذہ شامل تھے۔ دوسرے دن صبح کو ہم سب شعرا نواب رضا علی خاں سابق والی رامپور کے چھوٹے بھائی نواب جعفر علی خاں اثرؔ عرف منجھلے صاحب صدر مشاعرہ کی جانب سے دیے ہوئے چاشت کے انتظار میں ایک چھوٹے سے پنڈال میں کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ پنڈال کے ایک در کا پردہ ۶ فٹ بلند ہوا ایک چھریرے اور بیدکی مانند لچیلے جسم کا پانچ فٹ گیارہ انچ لمبا جوان بہ آواز بلند یہ کہتا ہوا داخل ہوا کہ "لوگو مجھ کو یہ بتلاؤ کہ تم میں وامقؔ جونپوری کون صاحب ہیں۔ وامقؔ جونپوری، وامقؔ جونپوری سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں"۔ میں ان کو ایک نظر میں پہچان گیا کہ اسلم خاں رامپوری ہیں اور میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ "جی اسلم خاں صاحب وہ خادم یہ ہے"۔ وہ لپک کے میری جانب آئے اور چونکہ پنڈال میں روشنی زیادہ نہ تھی میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے دریچہ تک لائے اور سامنے استادہ ہو کر کہنے لگے "اماں تم۔ مجتبیٰ۔ ابے مجتبیٰ۔ وامقؔ۔ ارے یار مجتبیٰ یہ بتاؤ کہ کل سے آئے ہوئے ہو اور میں تم کو یاد نہ آیا۔ ابے بھائی ٹھہرے کہاں ہو" "وہ اسٹیشن کے متصل جو ہوٹل ہے اس میں ہوں" "تو پھر میرے ساتھ چلو نا ہوٹل سے سامان لیکر گھر چلیں"۔ میں نے کہا "اور یہ ناشتہ" "چھوڑو یار یہ ناشتہ واشتا۔ گھر کی تازی چپاتی اور باسی آلو گوبھی میں جو مزا ہے وہ ان شاہی کھانوں میں کہاں۔ اے محشرؔ اور شبیر علی خاں کہاں ہو" شکیبؔ نے کہا "ہم لوگ یہیں سے تماشہ دیکھ رہے ہیں"۔ "بھئی کمال ہے۔ میرا پرانا یار مجتبیٰ آیا ہوا ہے اس کو گھر لئے جا رہا ہوں۔ آؤ تم لوگ بھی آؤ۔ آج سے سات دن تک ہمارے یہاں جشن رہے گا۔ آؤ آؤ جلدی کرو ورنہ بیگم مار ڈالیں گی۔ جلد از جلد یہاں سے ہم چاروں نکل چلیں۔ اگر کہیں منجھلے صاحب آگئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یوں تو ہم خود اپنے ساتھ مجتبیٰ کو لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے"۔

غرض کہ وہ مضبوطی سے میری کلائی پکڑے ہوئے شکیب اور محشر عنایتی کو ساتھ لیے اپنی کار میں بٹھا کر سیدھے ہوٹل گئے۔ بیروں سے بستر وغیرہ کار میں بھجوا کر اپنے گھر لائے۔ سامان ایک کمرے میں رکھوا کر نوکر سے کہا کہ جاؤ بیگم صاحبہ سے ہم لوگوں کا سلام کہو اور یہ کہ ہم لوگ اندر ہی ناشتہ کریں گے۔ بہت بڑا ناشتہ چھوڑ کے آئے ہیں" "اماں یار مجتبیٰ ہم لوگ تقریباً بیس سال بعد مل رہے ہیں۔ اس مدت میں کیسے کیسے انقلابات آئے۔ دنیا بدل گئی۔ آج صبح سے تمہارے اذکار سن رہے ہیں۔ منشی جی آئے تو وہ قصیدہ پڑھتے ہوئے آئے۔ یہ ہمارے جونیئر (نام یاد نہیں) آئے تو واثق کہتے ہوئے آئے۔ یوں میں واثق جونپوری کو برسوں سے رسالوں میں پڑھتا رہا ہوں مگر شان و گمان بھی نہ تھا کہ وہ تم مجتبیٰ ہو۔ تصویر کسی رسالہ میں دیکھی تھی مگر اس میں تمہاری کوئی پہچان نہ تھی۔ اور تم اگر مجتبیٰ تھے تو تم نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کل سے آج تک ملے کیوں نہیں" "خاں صاحب کل سے آج تک ایک سیکنڈ آنکھ نہیں لگی ہے۔ دماغ صحیح نہیں۔ تب بھی آج دن بھر آرام کرکے آپ کی تلاش میں نکلتا ضرور۔ مجھ کو بھی علم نہ تھا کہ آپ یہاں کے کوئی بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ آپ کی شرافت اور انسانیت اپنی جگہ پر" "تب ٹھیک ہے تو بتاؤ یار تم نے ہمارے رامپور پر کون سا جادو پھینکا ہے"۔ بھئی محشر اور شبیر علی خاں تم بتاؤ" شبیر علی خاں بولے "خاں صاحب ابھی کیا بتائیں، گرہیں تو رفتہ رفتہ کھلیں گی۔ مختصراً یہ کہ رات مشاعرہ میں انھوں نے جتنے اشعار یا نظمیں سنائیں اب تک کانوں میں ان کی گونج ہے۔ ابھی تو میری رائے ہے کہ ان کو ناشتہ کروا کے سلا دیجئے۔ جاگنے پر شب میں تفصیلی باتیں ہوں گی اور ہفتہ بھر کا پروگرام بنے گا"۔ اس تجویز کو اسلم خاں مان گئے اور میری جان بچی۔

غروب آفتاب کے وقت میری آنکھ کھلی۔ گھر قدیم و جدید مخلوط اسٹائل کا تھا۔ پختہ بھی اور سفالہ پوش بھی۔ لان بھی چمن بھی اور روکری بھی۔ ایک رامپوری ہاؤنڈ بھی۔ ٹمٹم، ہوا سے باتیں کرنے والی گھوڑی اور بڈھا سائیس بھی۔ اور سب پہ مستزاد اسلم خاں کا پتھر سا جسم اور جام شراب جیسا چھلکتا ہوا دل۔ ہمارے سکون اور دلچسپی کی ہر چیز اور کیفیت وہاں موجود تھی۔

اسلم خاں گھر میں سے برآمد ہوئے۔ "ارے بھائی خاں صاحب" خادم سے "چار لاؤ اور اس کے ساتھ کچھ گزک کے طور پر" "مجتبیٰ یار قبل اس کے کہ نامحرم لوگوں کی آمد شروع ہو یا پنج سنٹ میں بتلا جاؤ کہ مسلم بورڈنگ ہاؤس چھوڑنے کے بعد سے آج تک تم نے کیا کیا اور شاعر کس طرح ہو گئے"۔ "لکھنؤ سے بی اے ایل ایل بی کیا فیض آباد میں دو سال وکالت کر کے چھوڑ دی کچھ دنوں بیکار رہنے اور سیر سپاٹا کرنے کے بعد سرکاری نوکری کر لی۔ اور اب نوکری سے مستعفی ہونے کے بعد آزاد ہوں۔ شاعری ۱۹۴۰ء میں شروع کی اور اسی نہج سے

رامپور آنا ہوا۔ تب سے اب تک جو دیکھا ہے اور جو دیکھنے کو دل بے چین رہتا ہے وہی میرا موضوع شاعری ہے۔ شاعرانہ بدعتوں سے پُر۔ تعجب تو اس امر پر ہے کہ باوجود اہلِ رامپور کے مذاق اور یہاں کی شاعری سے میری شاعری کا بہت مختلف ہونے کے اربابِ ادبِ رامپور نے میری بڑی پذیرائی کی۔ اس کو بھانوں کی مہمان نوازی کے علاوہ اور کیا کہا جائے۔" "نہیں پیارے تم غلط سمجھے۔ رامپور والوں میں بڑی صلاحیت ہے۔ وہ تمھاری طرح ترقی پسند شاعری بھی کر سکتے ہیں اور وہ ایک استاد عارفی کی طرح کرتے بھی ہیں اور روایت سے بغاوت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں مگر وضعداری قلم اور اندازِ فکر سے اتنی لپٹی ہوئی ہے کہ اس کو ترک کرکے نیا راستہ اختیار کرنا ان کے بس میں نہیں۔ تاہم ان میں نئے اندازِ فکر سے لگاؤ بھی ہے جو تم جلیسوں کے اثر میں آکر نیا راستہ ضرور اپنائیں گے۔ البتہ رام پوری زبان کا لہجہ رہے گا جو کہ ہے۔"

"شب میں جمگھٹا ہوگا تو دیکھنا۔ شاد عارفی تو غالباً نہ آئیں وہ تخلیے کے شائق ہیں اور تخلیے میں شعر سنانے کے عادی ہیں۔ یوں بھی آج کل وہ مجھ سے باہر ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ محشر عنایتی، شکیب اور ان کے ابھرتے ہوئے شاگردوں یعنی رئیس اور نازش وغیرہ کو سنو گے تو تم کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ بھئی ہم تو تم سے وہ سب سنیں گے جو تم نے ان دس برسوں میں کہا ہے۔ ان میں سے میں اپنی پسند کا کلام چن لوں گا اور رامپور بھر میں مداری کی طرح تم کو ساتھ لیکر گھوموں گا کہ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔" ہم دونوں چار پائی پی کر یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شعرائے رامپور کی آمد شروع ہو گئی۔ پہلا گروپ محشر عنایتی، شبیر علی خاں شکیب، رئیس رامپوری، نازش نیازی کا تھا۔ اسلم خاں نے کہا "لوگو اپنی اپنی کرسیاں اٹھا کے یہیں لان پر آجاؤ۔ واثق یہ سب ہمارے دل پسند شعرا ہیں۔ یہ رئیس اور نازش نیازی ہیں جن کا ذکر تم سے کر چکا ہوں" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد جمیل رامپوری بھی آگئے۔ اختر علی خاں ایڈووکیٹ بھی آگئے۔ اختر علیخاں اس وقت تیس برس کے رہے ہوں گے "METICULOUSLY DRESSED" (ٹنک سک) سے درست، تجارہ زیب، اور پوڈر کا کولون میں مہکتے ہوئے۔ صورت اور سیرت سے اچھے۔ "واثق صاحب آپ کو اتنے قریب سے دیکھ کر اور خوشی ہوئی کہ آپ میں عام شاعروں والے چونچلے اور دل دکھانے والی باتیں نہیں ہیں"۔ اب جو حضرات آرہے تھے وہ رامپوری سامعین تھے۔ کوئی تالوں چھروں اور سروتوں کے کارخانے سے اٹھ کر آیا تھا، ہاتھوں اور چہروں پر تیل اور سیاہی کے دھبے۔ کوئی اکھاڑے سے کسرت کرکے نکلا تھا سر سے پاؤں تک مٹی اور پسینہ کی تر بتر تہبند کسے ہوئے۔ کوئی اخبار کا نمائندہ یا اڈیٹر تھا تو کوئی کالج کا لکچرر۔ دو چار نوجوان وکلا اور ان کے گھیرے میں کامریڈ اعجاز علی خاں ایڈووکیٹ قدرے سرخوشی کے عالم میں تشریف لائے

باہر کی روشنی گل کردی گئی تھی۔ اب ہم تھے اور مقامی سخنوران اور سخن سنجان رامپوری Cream بالائی سطح کی نمائندگی کرنیوالے رات میں اس کھیت کرتی ہوئی چاندنی میں شعرا کے گرد یوں بیٹھے تھے جیسے چاند کے گرد ہالہ۔ اسلم خاں نے کہا "لوگو اب کاہے کا انتظار ہے۔ اہل فن کا یہ خوبصورت اجتماع میری کوشش کے بغیر ایک گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔ اظہر میاں کی غزل سے اس نشست کا آغاز ہوگا۔ بسم اللہ اظہر میاں" اظہر، نازش اور رئیس کے بعد شکیب، محشر اور استاد جمیل نے اپنی بہترین تخلیقات سے ہم سب کو سرفراز کیا۔ اس میں شک نہیں کہ رامپور کے شعرا اور سامعین دونوں ہی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ بیچ بیچ میں تعریفوں کے ساتھ ساتھ تبصرے بھی ہوتے رہے "میاں یہ رامپور کی زبان یا محاورہ تو نہیں ہے" "یہ ترکیب بالکل نئی ہے مگر موضوع اور زبان سے جوڑ نہیں کھاتی" "یہ خیال حضرت داغ قدس سرہٗ یا حضرت امیر مینائی تاب ثراہ پہلے ہی فرما چکے ہیں اس پر کچھ اضافہ ہونا چاہئے تھا" وغیرہ وغیرہ۔ کسی سے اور کوئی لغزش ہوئی تو ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھوایا کہ شاعر غلطی کو اب درست کرے اب درست کرے گا اور ایک آدھ نے ایسا کیا بھی یہ تھا معیار وہاں کے سامعین کا۔ استاد جمیل کے کلام کے بعد چار کا دور چلا۔ محشر یا شکیب نے اسلم خاں کو ایک پرچہ دیا۔ اسلم خاں نے اس پرچہ کو پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ دو تین غزلوں اور چند نظموں کی فرمائش درج تھی جو گذشتہ شب میں نے مشاعرہ میں سنائی تھیں۔ (غزلیں۔ ہماری رندی مجاہدانہ خیال تو یہ بھی ہو تو کیسے۔ سرود جوانی یہ میرا فسانہ۔ ابھی تو شفق ظلمتوں میں گھری ہے۔ نظمیں۔ بھوکا بنگال۔ چند رباعیاں سنگھار رس میں۔ تقسیم پنجاب اور اسی دور کے شاعروں میں فرمائشات کی ردیف مینا بازار)۔ چونکہ اسلم خاں کو خاص طور پر سنانا مقصود تھا اس لیے حرف بحرف میں نے اس طویل فرمائش کو اپنے پورے جذبہ دوستی کے ساتھ پیش کیا۔

اختتام نشست تک اسلم خاں بت بنے بیٹھے رہے اور جب جملہ سامعین رخصت ہو چکے اور محض ان کے خاص احباب اور شعرا رہ گئے تب اسلم خاں نے بیٹھے ہی بیٹھے ایک مختصر تقریر کی "جذبۂ محبت اور قربت کی فراوانی میں مجھ کو اس وقت مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں کہ میں تمہاری شاعری پر اپنے مجرد تاثرات کو تفصیلی طور پر پیش کر سکوں البتہ اجمالاً کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جس شاعر کا آغاز اس درجہ روشن ہو اور شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہو جیسا کہ تمہارا ہے اور اس کو پوری طرح برتنا نوک پلک کا خیال رکھنا شاعری کی دس برس کی عمر میں اس کو اس بلندی تک پہنچانا کہ عظمت کی سرحدیں نظر آنے لگیں ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں گر نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ہمارے رامپور کے ارباب ذوق تو بڑے بد دماغ ہیں اور کب بڑے بڑوں کو سنتے ہیں۔ واقعی یہ تمہارا کمال فن ہے کہ تم نے ان سب کو ایک شب میں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اور اگر تم

یہاں وقتاً فوقتاً آنے کا وقت نکالتے رہے تو میں پورے بھروسے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے نوجوان شعرا تمھاری تحریک سے ضرور متاثر ہوں گے۔ کیوں بھئی ناصر خاں تمہارا کیا خیال ہے"۔ "بالکل وہی جو آپ کا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے کسی کے آگے گھاس بھی نہیں ڈالی تھی۔ ترقی پسند خیالات نظم کردینا اور چیز ہے اور ترقی پسند شاعری اپنے تمام تر تخلیقی اور فنی محاسن کے ساتھ کرنا کچھ اور ہی بات ہوجاتی ہے اور جیسی پروا حق کو پورا پورا حاصل ہے"۔ اس کے بعد ناصر علی خاں اور مختصر وغیرہ بھی رخصت لینے لگے تو اسلم خاں نے کہا "کل کچہری کے بعد ان کو لیکر منجھلے صاحب کے پاس جاؤں گا اور چراغ جلنے کے بعد لائبریری میں محفل ان کے اشعار سنے جائیں گے۔ اس کا اعلان بہت ضروری ہے"۔

سب کے جانے کے بعد مکمل تخلیہ ہوا تو اسلم خاں نے کھانے کے لیے کہا۔ اور کھانے پر بڑے جذباتی انداز میں بولے کہ "میں تو ادب زندگی اور حالات حاضرہ سے بالکل مایوس ہوکر اپنے پیشۂ وکالت میں لگ گیا تھا۔ اور تم سن کر خوش ہوگے کہ بفضلہٖ میں اس وقت چوٹی کا فوجداری کا وکیل مانا جاتا ہوں۔ یہاں سے نینی تال تک میری مناپلی ہے۔ مگر سکون نہیں تھا۔ تمھاری شاعری نے مجھ کو زندہ رہنے کا نیا راستہ دکھلایا ہے اور زندہ رہنے کی خواہش پیدا کی ہے۔ تمھاری شاعری میں مجھ کو میرے خوابوں کی تعبیر کی بشارت ملتی ہے۔

منجھلے صاحب سے ملاقات ہوئی اور معذرت چاہی۔ لائبریری اور اس کے بعد اسلم خاں کے کئی احباب کے یہاں کھانے اور چائے کے بہانے جاکر شعر و شاعری کا سلسلہ رہا۔ پانچویں دن میں نے اسلم خاں سے اجازت چاہی۔ "ارے یار اتنی عجلت کاہے کی؟ ابھی تو میں نے اپنے حالات تم کو سنائے ہی نہیں"۔ "اس کے لیے جلد ہی آنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ کچھ فقیر کے ذہن کی جھولی میں بھی کم قابل ذکر باتیں نہیں ہیں۔ اطمینان سے ایک دوسرے کا دکھ درد سنیں گے۔ اس سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ میں بھی تمھاری طرح گوشت پوست کا بنا ہوا ہوں۔ اپنا ایک وقار رکھتا ہوں تو اس خارزار عالم سے بغیر زخمی ہوئے بے داغ نکل جانا محال ہے"۔ اور میں وطن جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ سیالدہ اکسپریس پر بٹھاکر اسلم خاں اپنے گھر واپس گئے اور میں اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس کے بعد جب بھی کہیں آتے جاتے ہوئے رامپور سے گزرنا ہوتا تھا تو میں رامپور میں اپنا سفر فسخ کرکے اسلم خاں کے یہاں قیام ضرور کرتا تھا۔ نمائش رامپور کے مشاعرہ میں بلایا جاتا تو اس کو اولیت دے کر ضرور شرکت کرتا تھا۔

اس اثنا میں میں نے چند غزلیں اور دو تین طویل اور نیم طویل نظمیں کہی تھیں ۔ بین الاقوامی افق پر جنگ کے بادل پھر نظر آنے لگے تھے ۔ جنگ کے خلاف امنِ عالم کی تحریک شروع ہو گئی تھی ۔ اس کے پرچم کا رنگ سرمئی تھا جس پر پیبلو پکاسو کی دی ہوئی امن کی علامت Dove (فاختہ) بنی ہوئی تھی ۔ اس پرچم کو کھولے ہوئے ہندوستان کے جملہ ترقی پسند شعرا اور IPTA اپٹا کلکتہ میں کل ہند امن کانفرنس کرنے کے لیے جمع ہوئے ۔ اس کانفرنس کا پنڈال پارک سرکس کے میدان میں نصب ہوا تھا ۔ مجاز کے تحت الشعور میں جس کی محبت ابھرتی اور ان کو مظلوم سمجھتے تھے ان کا کارٹون چلتے پھرتے بناتے تھے اور اس پر اس کے دستخط لیتے تھے مثلاً پی ۔ سی ۔ جوشی اور پرویز شاہدی وغیرہ ۔ امن عالم کو عوام سے روشناس کرانے کے لیے ڈرامے ہوئے ۔ کتھا کلی رقص ہوئے ۔ تقریریں ہوئیں ، جلوس نکالا گیا جس میں تقریباً ایک لاکھ امن عالم کے حامی عوام مزدور اور کسان شریک تھے ۔ اس کانفرنس میں پرویز شاہدی جیسے کلکتہ کے سب سے بڑے شاعر کو دودھ کی مکھی کی طرح نظرانداز کیا گیا تھا ۔ اسی میں مجاز بھی تھے جن کی دماغی حالت اس زمانے میں ناقابل اطمینان ہو چکی تھی اس کے بعد رانچی میں ان کا علاج ہوا تھا ، اور وہاں سے بالکل صحت یاب ہو کر نکلے تھے ۔ کلکتہ کے چورنگی میدان میں عام اجتماع ہوا تھا جس میں ہیرن مکرجی ، پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے کم از کم دس لاکھ عوام کو خطاب کیا تھا ۔ اور سب سے آخر میں مشاعرہ ہوا تھا جس کے پارک سرکس پنڈال میں ایک دن پہلے امریکی ایجنٹوں نے آگ لگانے کی کوشش کی تھی ۔ صرف عقبی پردہ جل سکا تھا کہ پتہ چل گیا اور آگ پر قابو پا لیا گیا تھا مگر عوام میں وہ جوش و خروش تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا تھا ۔ جب پردہ جل رہا تھا تو عمر شیخ نے مائک آگے سے ہٹا کر "ہندوستان ہندوستان" اپنا مشہور گیت سنایا جو راستے کے سناٹے میں ایک دو فرلانگ تک سنا جا سکتا تھا ۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ پال روبسن کے بعد اگر کسی عوامی موسیقار نے پاٹدار اور بڑی آواز پائی تھی وہ عمر شیخ تھا ۔

مشاعرہ میں تقریباً ہر شاعر نے جنگ کے خلاف اور امن عالم کی مخالفت میں تازہ نظمیں سنائی تھیں ۔ میں نے بھی اپنی تازہ نظم "یدھ جی کا جنجال ہے ساتھی یدھ جی کا جنجال" سنائی تھی جس کو سنتے ہی سامعین کے اذہان میں شاید "بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال" آ گیا تھا اسی لیے میری امن والی نظم نفسیاتی طور پر متوقع اثر نہ پیدا کر سکی ۔ برخلاف اس کے سردار جعفری کی نظم "یلغار" کو سامعین نے زیادہ پسند کیا جب مشاعرہ کے اختتام کا اعلان ہوا تو کئی ہزار سامعین کھڑے ہو کر شور مچانے لگے کہ "مشاعرہ صبح تک چلے گا ۔ ہم اس وقت

کہاں جائیں۔ نہ ٹریم شروع ہوئی ہے نہ فٹن اور نہ رکشا میسر ہے۔ اور ہمارے مکانات میلوں دور ہیں چنانچہ مشاعرہ صبح تک ہوتا رہا۔

وہاں سے وطن واپسی پر مجھ کو چین میں ہونیوالی پیسفک امن کانگرس کا دعوت نامہ ملا۔ میرے پاس اس وقت پاسپورٹ نہ تھا۔ نئے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی مگر اس کے ملنے میں اس قدر تاخیر ہوئی (عمداً یا معمولاً کچھ کہا نہیں جا سکتا) کہ میں اس میں شرکت نہ کر سکا۔ مگر تسکین کی بات یہ ہوئی کہ میں نے اس کانفرنس میں سنانے کے لیے امن عالم پر جو نظم بعنوان "نیلا پرچم" کہی تھی اسکو اپنے وطن میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو "بھوکا بنگال" کو ملی تھی۔

اس زمانہ میں میں نے ایک اور تجربہ کیا تھا۔ اردو میں اب تک کوئی ode (طویل غنائیہ نظم) جس میں کسی شے کا انتہائی حسین اور مزین انداز میں حقیقت پر مبنی ذکر کیا جائے نہیں لکھی گئی تھی چنانچہ ہمت کر کے میں نے "زمین" پر ایک اوڈ کہی جو سب سے پہلے سہیل عظیم آبادی کے رسالہ "تہذیب" پٹنہ میں شائع ہوئی۔ نظم کا وہ رف ڈرافٹ تھا۔ مگر اب صیقل شدہ شکل میں "زمین" بہت بہتر ہو گئی ہے۔ میری عادت ہے کہ جب تک میرا دل پوری طرح مطمئن نہ ہو جائے اپنی تخلیقات میں برابر کانٹ چھانٹ اور اضافے کرتا رہتا ہوں تا آنکہ وہ بالکل مکمل نہ معلوم ہونے لگے اور اس عمل میں وقت لگتا ہے اس لیے رسالوں کے مطالبات سے گلو خلاصی کے لیے اس کو کسی حالت میں بھی ارسال کر دیتا ہوں۔ اس خراب عادت نے بھی میری شاعرانہ حیثیت کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ شائع شدہ مجموعوں میں بھی یہ اصلاحی عمل جاری رہتا ہے۔ اپنی تخلیقات کو میں نے کسی بھی منزل پر حرف آخر تصور نہیں کیا۔

اسی دوران نواب رضا علی خاں صاحب رامپور کی ایک سالگرہ کے موقع پر ہونیوالے مشاعرہ میں شرکت کی نوید بذریعہ ڈاک مجھ کو نہیں ملی بلکہ نواب صاحب نے میرے ایک عزیز محمد محسن حسان جونپوری کو خاص طور پر میرے پاس بھیجا اور زور ڈلوایا کہ وہ ذاتی اثر ڈال کر مجھ کو اپنے ساتھ رام پور لائیں۔ یوں بھی میں محسن صاحب کو ان کے بہت اچھے مرثیہ گو ہونے پر بہت عزیز رکھتا ہوں اس لیے میں انکار نہ کر سکا اور ان کی معیت میں رام پور پہنچ گیا۔ خاص باغ محل کے مہمان خانہ میں قیام و طعام کا شاہانہ انتظام تھا جو مجھ کو اس لیے گراں گذر رہا تھا کہ اسلم خاں کی موجودگی میں خاص باغ میں قیام کر رہا ہوں۔ پہلے مشاعرہ تھا اس کے بعد دعوت طعام۔ مہمان خانہ مہمان شعرا سے بھرا ہوا تھا جس میں ساغر نظامی۔ جگن ناتھ آزاد۔ خمار

بارہ بنکوی اور دہلی اور لکھنؤ کے بہت سے شعرا۔ مشاعرے کے منتظم خاص نواب صاحب کے بڑے خویش پروفیسر نورالحسن تھے۔ مشاعرہ میں مقامی اساتذہ اور چند نوجوان شعرا بھی تھے۔ جب میری باری آئی تو مختصر تمہید کے بعد میں نے اپنی تازہ نظم "زمین" سنائی جو سب نے بہت پسند کی اور مشاعرہ کے بعد نورالحسن آکر مجھ سے لپٹ گئے کہ آپ نے آج وہ نظم سنائی جس کا اردو میں شان و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف سے جس طوفان کا خوف تھا وہ آہی گیا یعنی اسلم خاں نے آکر مجھ کو چھاپ لیا۔ "نظم تو اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اس کو پھر سنیں گے اور کئی بار سنیں گے، اس کو ایک بار سن کر کوئی نہ اس کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی عظمت تک پہنچ سکتا ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ٹھہرے کہاں ہو؟ تمہارا سامان کہاں ہے؟" میں نے کہا "یہیں مہمان خانہ میں" "اماں یہ بھی کوئی بات ہوئی اور میرے ہوتے ہوئے چلو کھانے پر نواب صاحب سے باتیں ہوں گی"۔ ڈائننگ ہال میں کھڑے ڈنر کا انتظام تھا۔ جب اسلم اور میں کھانے سے فارغ ہو چکے تو اسلم خاں نواب صاحب کے پاس مجھ کو لیے ہوئے پہنچ گئے "سرکار ہم سب کو سالگرہ مبارک ہو۔ البتہ سرکار نے وامق کو مجھ سے کیوں چھین لیا۔ سرکار مشاعرہ ہو چکا۔ کھانا کھا کر سب نے حق نمک ادا کیا۔ اب اجازت دیجیے میں وامق کو اپنے یہاں لئے جا رہا ہوں"۔ نواب صاحب نے بہ آواز بلند پکارا "نورل نورل جلدی آؤ" نورالحسن آگئے "یہ دیکھو اسلم خاں وامق کو لیے جا رہے ہیں" نورالحسن انتہائی ذکی اور موقع شناس انسان ہیں۔ انھوں نے موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے جواب دیا "سرکار اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلم صاحب کو اجازت دیدیں کہ وامق صاحب کو لیجائیں۔ کل دوپہر کے مخصوص اور مختصر کھانے پر اسلم صاحب اور وامق صاحب کو آنا ہی ہے"۔ اور نواب صاحب نے اجازت دیدی۔ وہاں سے ہم لوگ مہمان خانے آئے اور میرا سامان گاڑی میں رکھوا کر اسلم خاں نے اپنے گھر پہنچ کر سانس لیا۔ میں نے ایسے جری اور دل گردے کے لوگ کم دیکھے ہیں۔

دوسرے دن پروفیسر نورالحسن نے ہم لوگوں کو لانے کے لیے دس بجے کار بھیجی۔ اسلم خاں کا سیشن میں خون کا مقدمہ لگا ہوا تھا اس لیے وہ نہ جا سکے اور معذرت کا خط لکھ کر مجھ کو دیدیا۔ جب میں خاص باغ پہنچا تو وہ انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اسلم خاں کا معذرت نامہ دیدیا۔ جس کو وہ لیکر حرم سرا میں نواب صاحب کے پاس گئے اور چند لمحوں بعد واپس آئے اور مجھ کو نشست کے اس کمرہ میں لے گئے جو ڈرائنگ روم اور محل سرا کے درمیان میں واقع تھا۔ میں جب اس میں داخل ہوا تو نواب صاحب، بیگم صاحبہ،

نواب صاحب کی صاحبزادیاں اور بہوئیں Protocol میں حسب مراتب) بیٹھی ہوئی تھیں۔ آداب سلام ہوا اور ایک صوفے پر نورالحسن اور ہم بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے "زینب" سنانے کی پھر فرمائش ہوئی جو میں نے سنائی اور نورالحسن نظم کے معانی اور نکات پر تبصرہ کرتے جا رہے تھے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ نظم سننے کے بعد بیگم صاحبہ نے فرمائش کی "اگر آپ مذہبی شاعری بھی کرتے ہوں تو کچھ برنظر ثواب عطا فرمائیے" میں نے کہا "جی ہاں کیوں نہیں۔ میں تو سراس صنف شاعری میں دلچسپی لیتا ہوں جس کو سننے اور پسند کرنے والے عوام ہوں۔ سماج کا ایک طبقہ مذہبی شاعری پسند کرتا ہے۔ ان کے لیے میں مذہبی شاعری میں اپنے ترقی پسند خیالات پیش کرتا ہوں" "تو کچھ ارشاد کیجیے" جہاں تک حافظہ کام کر رہا تھا یہ شعر اور دو قطعات جو یاد آئے وہاں سنائے تھے:

شبیر نے بتلا دیا جینے کا قرینہ — جو مر نہیں سکتا اُسے آتا نہیں جینا

حسین صبر کو تزئین ذات جانتے تھے — خود آگہی کو امیر الصفات جانتے تھے
حیات و موت میں جب فیصلے کا وقت آیا — تو آب تیغ کو آب حیات جانتے تھے

عباس رن میں آئے جو شمشیر کھینچ کر — رکھدی علی کے حملوں کی تصویر کھینچ کر
سجاد پا پیادہ نے بے تیغ فتح کی — اک معرکہ جنگ پاؤں کی زنجیر کھینچ کر

ان اشعار کو کئی کئی بار سنانا پڑا اور محترمہ کی بیاض پر لکھنا پڑا۔ اس کے بعد لنچ ہوا اور میں نورالحسن سے یہ وعدہ کر کے رخصت ہوا کہ چند دنوں میں نمائش کے مشاعرہ میں شرکت کرنے علی گڑھ آ رہا ہوں، اور رضا حسین زیدی کے یہاں قیام کروں گا۔

رام پور چند روز قیام کر کے میں علی گڑھ پہنچا۔ نمائش شروع ہو گئی تھی مگر مشاعرے کو ابھی کئی دن باقی تھے۔ نورالحسن۔ ذاکر صاحب۔ محمود صاحب۔ بشیر صاحب۔ مونس رضا۔ جذبی۔ قیصر زیدی۔ صابرہ زیدی ساجدہ زیدی۔ ناہید زیدی اور بوبیا وغیرہ سے ملتے جاتا رہا کہ نمائش کے مشاعرہ کا دن آ گیا۔ مشاعرہ میں میں نے دو نظمیں سنائیں۔ نیلا پرچم اور زینب جن کے سنانے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ "مینا بازار۔ مینا بازار" کا شور ہو تا رہا مگر میں پنڈال سے نکل کر سیدھا کباب پراٹھے کی دوکان پر پہنچا۔ مونس بھی ساتھ تھے۔ کباب پراٹھے کھانے کے بعد ہم لوگوں نے ایک پیکٹ آلو بخارے کا چورن خریدا جس کو کھاتے ہوئے رکشا میں کھوس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ دوسرے ہی دن مونس رضا نے کہا کہ کل جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ میں آپ کے

"زمین" سنائی ہے۔ ہر شعبہ میں نوٹس گھوم چکا ہے اور سامعین اس پر اظہار خیال کریں گے۔ کل آیا اور مونس رضا مجھ کو لیکر جغرافیہ کے ایک لکچر تھیٹر پہنچ گئے۔ تھیٹر جانی پہچانی شکلوں سے بھرا ہوا تھا۔ مونس رضا نے مختصر تعارف کے بعد مجھ کو ڈائس پر بلا کر نظم سنانے کو کہا۔ نظم سننے کے بعد سب سے پہلے پروفیسر محمود حسین نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے زمین کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ انگریزی ادب کا استاد ہونے کی حیثیت سے پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی کی کوئی اوڈ زبان و بیان و اسلوب اور سجاوٹ کے اعتبار سے زمین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ اوڈ الفاظ کے صوتی حسن سے پوری طرح مزین ہے۔ معنوی اعتبار سے اپنے موضوع پر محیط ہے۔ استعارے اور تشبیہات بالعموم مبالغے اور مصنوعات پر اپنی اساس رکھتے ہیں مگر زمین میں جتنے صنائع اور بدائع ہیں وہ سب حقائق اور اصلیت سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے اس اوڈ کو ادب کے تاج کا کوہ نور کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا"۔ اس کے بعد جغرافیہ کے استاد محمد انس نے اظہار خیال کیا۔ "زمین کے اتنے بڑے موضوع کے ہر رُخ کو جس حسن و اجمال سے اس اوڈ میں پیش کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ جغرافیائی زاویہ۔ ارتقائی زاویہ۔ انتھراپولوجیکل زاویہ۔ ثقافتی ادبی اور بے شمار زاویے۔ غرض کہ اس کو جس زاویہ سے دیکھا جائے ایک مکمل تصویر ملتی ہے۔ رجعت پرستوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے"۔ اس سیمینار کے بعد ایک بے تکلف دوست نے کہا کہ اگر تم زندہ جاوید ہونا چاہتے ہو تو فوراً مر جاؤ۔ نتیجہ میں وامق اور "زمین" ہمیشہ زندہ رہیں گے"۔ ذاکر صاحب نے اس کی نقل لی کہ ان کو بہت پسند تھی۔ نور الحسن نے ایک نقل لی کہ وہ انگریزی میں اس کا ترجمہ کریں گے۔

اسی زمانہ میں میں نے ایک غزل "برق شناخسار دیکھیے کب تک رہے" کہی تھی اور لکھنؤ ریڈیو کے مشاعرہ میں Unprerecorded live broadcast (تازہ بہ تازہ نشر ہوئی تھی۔ مشاعرہ کے بعد پائپ جلانے کے خیال سے باہر نکلا تو بیگم صاحبہ رامپور کے پرائیوٹ سکریٹری کار چھوڑ کے باہر تیزی سے میری جانب بڑھے اور ایک خط دیا "وامق صاحب! میں آج کل لکھنؤ ہی میں زیر علاج صاحب فراش ہوں۔ ٹانگ کی کوئی ہڈی بڑھ گئی تھی اس کا آپریشن ہوا ہے۔ ریڈیو پر ابھی غزل سنی طبیعت بے چین ہو گئی۔ سرکار بھی موجود ہیں۔ ہم سب کی تمنا ہے کہ آپ سیدھے یہاں چلے آئیے اور کھانا ہمارے ساتھ نوش کیجیے"۔ جب ان کی جائے اقامت پر پہنچا تو یہ کوٹھی بھی خاص باغ کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ محترمہ واقعی مشینوں میں جکڑی ہوئی بے بس بستر پر پڑی تھیں۔ نواب صاحب ٹہل رہے تھے اور سب سے چھوٹے خویش ہاتھ باندھے ہوئے

مؤدب ایک جانب کھڑے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی بیگم صاحبہ کا چہرہ گلاب ہوگیا۔ فرمایا کہ اسی زمین میں والد مرحوم کی بھی ایک غزل ہے اور فوراً درباری موسیقار مع سنگھیتوں کے بلایا گیا جس نے وہ غزل گا کر سنائی جو قدیم طرز شاعری کا بہت اچھا نمونہ تھی۔ میری غزل بھی میری بیاض سے اسی گائک نے سنائی جس سے غزل کا لطف دوبالا ہوگیا۔ فرق یہ تھا کہ یہ ایک جدید طرز و موضوعات کی ترقی پسند غزل تھی اور وہ قدیم رنگ کی زبان و بیان سے آراستہ۔ اب لکھنؤ میں یہ غزل اہل ذوق کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

بھوپال

وطن واپس آنے کے چند دنوں بعد بھوپال کی کسی طالبۂ علم زہرہ جمال کا خط ملا کہ یہاں کا ادبی ماحول انقلابی اور ترقی پسند ادب کے لیے بیحد سازگار ہو رہا ہے۔ کیا آپ دو چار دن کے لیے تشریف لا سکتے ہیں۔ اور مقامی ترقی پسند شعرا مثلاً تاج بھوپالی۔ سعید اختر اور کیف بھوپالی وغیرہ کی تحریک کو عوام سے بڑے پیمانہ پر بخوبی روشناس کرانے میں مدد کر سکتے ہیں یہ آپ ہی کا کام ہے۔ امید ہے آپ مایوس نہ کریں گے۔ میں نے خط کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ خود بھوپال کے لیے روانہ ہوگیا۔ بھوپال کے لیے یہ میرا پہلا سفر تھا۔ یوں بھی ہفتہ وار نظام بھوپالی کی وساطت سے وہاں کے ادبی اور سیاسی حالات سے میرے ذہن پر اس کی ایک امیج پہلے سے موجود تھی۔ بارہ بنکی چھوڑنے کے بعد سے میرے سر کے بال یکسر شروع ہوگئے تھے اور بڑھاپے کا انحطاط شکل وصورت اور عناصر کو غیر معتدل بنانے لگا تھا۔

بھوپال صبح سویرے ٹرین پہنچی۔ وہاں سے تانگہ کر کے میں خط میں مندرج پتہ پر محمود الحسن صدیقی صاحب کے دولتکدہ پر پہنچ گیا۔ در پر آواز کے جواب میں ایک نوجوان لڑکی بیحد دبلی پتلی مگر چہرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی دروازہ پر آ کر چند لمحے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھ کو ناپتی رہی۔ "آپ ... آپ" ہکلاتے کے انداز میں "آپ ... کون صاحب ہیں؟" "اور آپ" "جی میں محمود صدیقی صاحب کی بیٹی زہرہ جمال ہوں" "اور میں آپ کا بلایا ہوا وامق جونپوری ہوں" "ارے وامق صاحب۔ آپ وامق صاحب ہیں؟" میں اس کے اس اعصابی جھٹکے کو محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے توقعات اور اس کے ذہن میں بنی ہوئی وامق کی امیج گر کر چھن سے چور ہو گئی تھی۔ اور اسی وقت مجھ کو اپنی ایک نظم "اپنی تصویر سے" بہت یاد آئی۔ اس لڑکی نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا کہ مبادا اس کی مایوسی مجھ پر واضح نہ ہو جائے۔ "آئیے اندر تشریف لائیے۔"

"میں نے تانگے سے اپنا سامان اتارا اور جیب میں تانگہ والے کو کرایہ دینے لگا تو اس نے تانگہ والے کو

اشارہ سے روک دیا۔ میں نے کہا اس وقت تو ان کو رخصت کرنے دیجئے آپ سے بعد میں لے لوں گا۔
سامان لیکر گھر میں آیا اور صدیقی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ سے زہرہ جمال نے تعارف کرایا۔ بیگم صاحبہ الٹے پاؤں باورچی خانہ میں پہنچ گئیں۔ صدیقی صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا این خانہ ہمہ آفتاب است۔ زہرہ جمال نے کہا "ابا۔ واثق صاحب کے قیام کا انتظام ہونا چاہیئے۔ یہ گھر تو بہت ہی چھوٹا ہے۔ ہم لوگ اس میں جس تکلیف سے گذر اوقات کر رہے ہیں تو ضروری نہیں کہ واثق صاحب بھی تکلیف اٹھائیں"۔ صدیقی صاحب چھڑی سنبھال کر بغیر ناشتہ کئے ہوئے بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور تاج جس ہوٹل کے منیجر تھے اس میں میرے لیے ایک کمرہ بک کروا کے واپس آگئے۔ ہم لوگ چائے پیتے رہے کہ ایک گھنٹے میں حضرت تاج بھوپالی آگئے۔ ان کے پیچھے متھرا بابو۔ ان کے پیچھے گھرو میاں۔ غرض کہ گھر میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ زہرہ کے دونوں بھائی بیدار ہو چکے تھے۔ ان سب کے نام تعارف ہونے پر معلوم ہوئے تھے۔ کوئی فرش پر بیٹھ گیا کوئی اسٹول پر کوئی پلنگ پر۔ اور آئندہ کا پروگرام بننے لگا۔ صدیقی صاحب کی بیگم بھی آگئیں اور نوابین و بیگمات بھوپال کی داستانیں سنانے لگیں۔ کیا آب کوثر سے دھلی ہوئی زبان بولتی تھیں کہ بس کان لگائے سنتے رہئے۔ صدیقی صاحب قدرے خاموش مزاج تھے۔ غرض کہ ان تینوں کامریڈوں کی معیت میں تاج کے ہوٹل پہنچا اور نہا دھو کے بستر پر دراز ہو گیا۔
شام ہوئی تو صدیقی صاحب۔ زہرہ جمال۔ تاج۔ متھرا بابو اور گھرو میاں نے کمرہ میں داخل ہو کر کہا۔ "اٹھو بس اب کر لذت خواب سفر گئی"۔ یہ تاج کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ تاج جتنے پستہ قد اور منحنی تھے اتنے ہی گھرو میاں تنا ور بھاری بھر کم اور غیر معمولی جسامت کے آدمی تھے۔ پارٹی کے جلوس کا پرچم لیے سب سے آگے وہی نعرہ لگاتے ہوئے چلتے تھے۔ اور سب سے بڑی دوکان لبرٹی ٹیلرز کے مالک تھے۔ اشعار فی البدیہہ کہتے تھے جو زیادہ تر پارٹی کے نعرے بن جاتے تھے۔

میں اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ منھ دھو کر چاء پی اور شب مالوا کی سیر کے لیے سب کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔
سب سے پہلے پارٹی آفس گئے جہاں شاکر علی خاں صاحب شیر بھوپال سے ملاقات ہوئی۔ ملک میں ان کا شمار بڑے ہوشمند جری اور پختہ سیاسی شعور رکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ موصوف بڑے تپاک اور خلوص سے ملے۔ کورے کوزوں میں چاء آئی اور ہم سب نے اس کو خضوع و خشوع سے پیا۔ کامریڈ بانکے رکشا پر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جلسۂ عام کا اعلان جس میں حضرت واثق جونپوری شعری بھوپالی کی صدارت

میں نظمیں سنائیں گے کرتے ہوئے سنے گئے۔ وہاں سے اٹھ کر ہم لوگ سعید اختر کے یہاں گئے اور دیر تک ترقی پسند شاعری پر گفتگو ہوتی رہی۔ سعید اختر پیشے کے وکیل تھے اور بھوپال کے بڑے سنجیدہ ترقی پسند غزل کے شاعر مانے جاتے تھے۔ اور تاج اپنی شوخ کلام کے لیے مشہور تھے۔ دوسرے دن شب میں پارٹی کا جلسہ ہوا۔ پہلے شاکر علی خاں صاحب کی تقریر ہوئی جس کا مرکزی خیال شہر کی گرتی ہوئی حالت اور محنت کش عوام کے حقوق پر مبنی تھا۔ اس کے بعد گھرو میاں اور کامریڈ بانگے نے اپنے منظوم خیالات پیش کئے۔ تاج نے دو تین غزلوں کے دو دو تین اشعار سنائے۔ سعید اختر نے ایک تازہ غزل سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ سب کے بعد جب میرا نمبر آیا تو میں نے امن عالم پر نظم "نیلا پرچم" سنائی اور جب میں مختلف بندوں کے آخر میں "ہم اس لیے امن چاہتے ہیں" کہتا تھا تو سامعین کا پورا مجمع "امن عالم زندہ باد" کے نعرے لگاتا تھا۔ نظم کے اختتام پر امن عالم زندہ باد کے نعروں اور تالیوں پر یہ جلسہ ختم ہوا جلسے کے اختتام پر تاج نے دوسرے دن شب میں شاہی بارہ دری میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہونے والے مشاعرہ کا اعلان کیا۔

دوسرے دن تاج اور متھرا بابو نے مجھ کو پورے بھوپال کی سیر کرائی۔ بھوپال تال۔ شملہ کوٹھی۔ جامع مسجد اور بٹوکس، پریس اور زنانی سلیپروں پر مشہور زردوزی کے بازار دکھلائے۔ رات آئی تو شاہی بارہ دری میں سعید اختر کے والد بزرگوار کی صدارت میں جن کا شمار بھوپال کے اساتذہ میں ہوتا تھا مشاعرہ شروع ہوا۔ یہاں بھوپال کے ہر مدرسۂ خیال کے شعرا اور ارباب ذوق اور کالج کے اساتذہ طلبا اور طالبات کا مجمع تھا۔ شعرا میں بھوپال کیف بھوپالی اور شہاب اشرف بھی تھے۔ ہر شاعر نے اپنا بہترین کلام سنایا جو بہت پسند کیا گیا۔ میں نے بھی اپنی تازہ غزل "دیکھیے کب تک رہے" "مینا بازار" اور "زمین" سنائی جس سے بھوپال کے ارباب سخن اور رنگ وارثان بساط ادب کافی متاثر ہوئے۔ کسی ستم ظریف نے "بھوکا بنگال" کی فرمائش بھی کی۔ حیدرآباد میں اپنا حشر دیکھے ہوئے تھا اس لیے میں نے تکان کا بہانہ شرعی کر کے گلو خلاصی حاصل کی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا یہ مشاعرہ بڑی کامیابی پر ختم ہوا۔ (دوسرے دن مقامی اخباروں میں اسکی رپورٹنگ بھی بہت اچھے انداز میں کی گئی تھی)۔ زہرہ جمال خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں اور صدیقی صاحب بھی بہت مطمئن نظر آرہے تھے۔ میں ابھی ان سے دوسرے دن صبح کی کسی ٹرین سے واپس جانے کی اجازت ہی مانگ رہا تھا کہ حمیدیہ کالج کے طلبا اور طالبات نے ہم لوگوں کو گھیر لیا اور دن کے ایک بجے شعبۂ اردو کی Ansp ices (سرپرستی) میں کالج یونین ہال میں وہی غزل اور دونوں نظمیں سنانے کی

خواہش ظاہر کی۔ طلبا کی کوئی فرمائش میں کبھی رد نہیں کرتا۔ اپنا فرض ادا کرکے دوسرے دن شب میں بھوپال سے وطن کے لیے تیاری کا منصوبہ بنانے لگا کہ ہوٹل کے کمرہ پر تاج، متھرا بابو اور گھمنڈی میاں آ گئے اور کہا کہ آج غروب آفتاب کے بعد بھوپال کی اُس بلند پہاڑی پر جو شاہی بنگلہ خالی پڑا ہوا ہے اس میں صرف ہم چار آدمیوں کا کھانا اور رت جگا ہے۔ میں نے پوچھا "یہ رت جگا کس خوشی میں ہے"؟ ان لوگوں نے کہا کہ بھائی وامق صاحب آج تک تیتی مشاعرے ہو چکے ہیں۔ قسم لے لیجئے جو آپ کا کلام بالکل خالی الذہن ہو کر سننے کا موقع ملا ہو نہ جی بھر کے اپنا کلام سنانے کا موقع ملا ہے۔ ہم لوگ خائف تھے جو شہر کے اندیشے سے دُبلے ہو رہے تھے مگر خبر ملی ہے کہ آپ نے اپنے کلام سے بھوپال کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ ہم لوگ اس خوش خبری کا ہر طرح سے جشن منائیں گے اور صبح ہوتے ہی آپ کو وطن کے لیے بھوپال سے رخصت کر دیں گے۔

سرِ شام یہ پروگرام نہ شروع ہو سکا۔ خور و نوش کا سامان اور ایک کار کے حصول میں رات کے گیارہ بج گئے اور میں اپنے کمرہ میں اخباروں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ گیارہ بجے یہ لوگ کار لیکر آئے اور ہم لوگ تقریباً آدھ گھنٹے میں ہوا محل پہنچ گئے۔ چوکیدار نے بنگلہ کھول دیا۔ روشنی کردی۔ ایک کمرہ میں گدّے دار فرش بچھا دیا گیا، اسٹوو پر کھانا گرم ہونے لگا۔ تاج نے ایک اور خبر سنائی کہ کل آپ کو ابھی اور ٹھہرنا ہے۔ "آپ آیاما کو جانتے ہیں؟" میں نے کہا "یہ جاننے والی بات بھی خوب رہی۔ میں جب لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو آیاما لکھنؤ آرٹس کالج میں جو یونیورسٹی سے بالکل ملا ہوا تھا فنِ مصوری کے درس لے رہے تھے۔ پرنسپل ہالدار کے بڑے منظورِ نظر شاگرد تھے۔ جگر صاحب کا غلطی مرقع آیاما نے اُسی زمانہ میں بنایا تھا" "تو پھر سنئے وہ آج کل بیمار ہو کر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ اخباروں سے جب ان کو آپ کی خبر ملی تو انھوں نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ میں کل آپ کو لیکر ان کے پاس جاؤں۔ وہ خود ملنے آتے مگر بہت معذور ہیں"۔ میں نے کہا کہ "افسوس ہے آیاما بیمار ہیں ورنہ کھانا کھا کر چلتے اور وہیں رت جگا کرتے۔ خیر صبح ہونے دو ایک نیند لیکر آیاما کو دیکھنے ضرور چلیں گے۔ رات بھر یہ لوگ شعر سناتے اور سنتے رہے۔ لطیفوں کا دور بھی آیا۔ اس کے بعد ٹھنڈی ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ ہم لوگوں پر یک وقت غنودگی طاری ہونے لگی۔ آنکھ کھلی تو نگارِ سحر دریچۂ خاور کے پٹ کھول رہی تھی اور اس کا آنچل لہرا لہرا کر بشکل نسیم سیرِ چمنِ فطرت کی دعوت دے رہا تھا۔

خمار طاری تھا اور اب وہاں ایک منٹ بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کہا "تم لوگ چلنے کی تیاری کرو۔ سامان جمع کرو۔ میں اس بلندی سے بھوپال کو دیکھ لوں۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے اور یہاں سے تو اور خوبصورت لگتا ہے"۔

ہوٹل پہنچ کر میں تو فوراً سو گیا۔ تقریباً بارہ بجے دوپہر کو آنکھ کھلی۔ شیو کیا۔ غسل کیا کپڑے بدلے اور نیچے اتر کر تاج سے کہا "چلو پیارے آپا ماں کے یہاں چلیں اگر تم ساتھ نہ چل سکو تو تانگہ منگوا دو اور تانگہ والے کو پتہ بتلا دو کہ وہ مجھ کو ٹھیک آپا ماں کے گھر پر اتار دے۔ میں وہاں پہنچا تو ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ دو طرفہ تعارف کے بعد ہم لوگ گلے ملے۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اور ایک ہی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ملک کا اتنا عظیم مصور اب زیادہ دن زندہ نہ رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ حد سے زیادہ مے نوشی نے برصغیر کے چند فنکاروں کو وقت سے پہلے مار ڈالا۔ آپا ماں مرتضیٰ لنگلا، سعادت حسن منٹو افسانہ نگار۔ مجاز، سلام مچھلی شہری، نریش کمار شاد، تاج بھوپالی اور ناظر خیامی۔ اگر یہ سب آج زندہ ہوتے تو فن کی دنیا میں بہت زیادہ نام پیدا کرتے۔

آپا ماں سے پرانے دنوں کی کچھ باتیں ہوئیں۔ ان کو دو چار اشعار سنائے اور رخصت ہو کر ہوٹل واپس آیا۔ آپا ماں کو دیکھ کر دل اتنا پژمردہ ہو گیا تھا کہ بھوپال میں مزید رکنے کی قوت باقی نہ رہی اور میں اسی روز پہلی ٹرین جو مل سکی اس سے روانہ ہو کر وطن پہنچا۔ اس کے بعد سال میں ایک دو مرتبہ بھوپال کا چکر ضرور لگتا تھا۔ اور وہی سب ہوتا تھا جو پہلی بار ہوا تھا۔

بھوپال اور رامپور دونوں ہی اردو کے مراکز تھے مگر قدرے فرق کے ساتھ۔ رامپور میں شعر و شاعری کا چرچا زیادہ تھا اور بھوپال میں کم۔ رامپور کے سامعین بھوپال کے مقابلہ میں زیادہ سخن فہم تھے جن میں عام اور خواص میں زیادہ فرق نہ تھا جبکہ بھوپال کے عوام کا شعری مذاق اتنا بلند نہ تھا البتہ یہاں کے سامعین ترقی پسند شاعری سے زیادہ شغف رکھتے تھے۔

امراوتی

بھوپال سے واپس آئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ ڈگری کالج امراوتی کے صدر شعبہ اردو کا خط ملا کہ فلاں تاریخ کو ہماری اردو سوسائٹی کا افتتاح ہونے جا رہا ہے دن میں افتتاح ہو گا اور شب میں مشاعرہ۔ ہم اس رسم تقریب میں صرف دو ادیبوں کو شرکت کی دعوت دے رہے ہیں

آپ کو اور نشور واحدی کو۔ آپ کو اردو سوسائٹی کی رسم افتتاح ادا کرنے کی تکلیف دی جائے گی اور مشاعرہ کی صدارت نشور واحدی کریں گے۔ استدعا ہے کہ آپ برائے کرم نشور صاحب سے رابطہ قائم کر کے ساتھ ساتھ امراوتی آنے کا پروگرام بنالیں۔ اس میں آپ ہر دو حضرات کو سہولت ہوگی۔ اسٹیشن پر ہم آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ امراوتی پرانے برار کا دارالحکومت تھا جہاں ہم دونوں پہلی بار جا رہے تھے۔ راستہ بھی کچھ ٹیڑھا بیڑھا تھا اور ہم اس سفر سے کافی بیکیف ہو رہے تھے کہ برار کی سرحد میں ٹرین کے داخل ہوتے ہی ہماری دنیا بدل گئی۔ اب ہم اس سرزمین سے گذر رہے تھے جس کا رنگ بالکل کالا تھا اور سیاہی کے سینہ پر کھلے ہوئے سفید گلابوں کا ایک بحر ناپید اکنار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ہندوستان کا یہ وہی خطہ ہے جہاں سفید سونا یعنی کپاس یعنی روئی پیدا ہوتی ہے اور انگریزوں نے ڈھاکہ کے ململ بننے والوں کے انگوٹھے کاٹنے کے بعد لنکا شائر کی سوتی ملوں کا پیٹ بھرنے کے لیے نظام دکن سے زبردستی صوبۂ برار کو غصب کر لیا تھا۔ آنکھوں میں دور تک پھیلے ہوئے گِل اور گُل کے یہ دو متضاد رنگ و آہنگ کھپے جا رہے تھے اور ہم سفر کی ساری کلفتوں کو بھول چکے تھے کہ ٹرین امراوتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جا لگی۔ اور ہم لوگ صدر شعبۂ اردو کے دولتکدہ پر لے جائے گئے۔ امراوتی کے طلبا اور اساتذہ سے مل کر اندازہ ہوا کہ پورے برار بالخصوص امراوتی میں وہاں کی آبادی بلا تفریق مذہب و ملت اردو سے بے پناہ دلچسپی رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کالج میں اردو پڑھنے والے ہندو طالب علموں کی تعداد مسلمانوں سے کم نہ تھی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں اسی حقیقت کو میں نے موضوع بنایا اور اہل امراوتی کو تحسین و مبارکباد کا مستحق قرار دیا تھا۔ رات کے مشاعرہ میں بھی اہل امراوتی نے اردو سے اپنی جذباتی یکجہتی کا ثبوت دیا تھا۔ دوسرے دن امراوتی شہر کی سیر کرنے کے بعد شب میں اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر تیسرے دن ہم اپنے اپنے وطن واپس آ گئے۔

دہلی

۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس دہلی میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں سردار جعفری نے مجھ کو خط لکھا کہ میں گونڈہ جاؤں اور جگر صاحب کو کانفرنس کے مشاعرہ کی صدارت کے لیے تیار کر کے اپنے ہمراہ دہلی لاؤں۔ چنانچہ میں فوراً گونڈہ گیا اور جگر صاحب کو مشاعرہ کی صدارت کے لیے

راضی کرلیا۔ جگر صاحب نہایت سادہ مزاج نیک نفس اور جذباتی انسان تھے۔ پل میں آگ بگولہ اور پل میں برف سے زیادہ بارد۔ کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں سے ان کو سخت نظریاتی اختلاف تھا مگر انکے قول و عمل کی ہم آہنگی اور جوش و خروش کے وہ بھی مداح تھے۔ ہم سے ان کو زیادہ خلوص اس بنا پر تھا کہ ہم ان کی رمی کے ساتھیوں میں تھے۔ دہلی چلنے پر راضی ہو کر اپنے کرایہ سے میرے ساتھ رمی کھیلتے ہوئے دہلی گئے۔ مشاعرہ کی صدارت کی اور تازہ غزل سنائی جس کا ایک شعر تھا:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں ۔۔۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

مشاعرہ کے بعد ان کا تازہ ترین مجموعہ "آتش گل" جو ان کو ناشر نے بھیجا تھا وہیں سامعین میں نیلام کیا گیا۔ شرط یہ تھی ہر بولی بولنے والا اپنی بولی کی رقم جمع کردے۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار روپئے جمع ہوئے سب سے زیادہ رقم والے کو مجموعہ مل گیا اور رقم جگر صاحب نے انجمن کو بخش دی۔

اس کانفرنس میں کرشن چندر اور سردار جعفری انجمن کی مرکزی کمیٹی کے صدر اور سکریٹری منتخب ہوئے تھے اور صدر دفتر بمبئی قرار پایا تھا۔ اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ اسی کے فوراً بعد انجمن کی تمام سرگرمیاں کھٹائی میں پڑ کر رہ گئی تھیں۔

اس کانفرنس کے بعد میں ماہنامہ شاہراہ دہلی کا جو انجمن کا منھ بولا جریدہ تھا مدیر مقرر ہوا۔ اور پرکاش پنڈت کے ساتھ رہنے لگا۔ پرکاش پنڈت ترقی پسند تحریک کے ایک انتہائی فعال ممبر تھے جو اپنے قلم کے ذریعہ تحریک کی ٹھوس اور قابل قدر خدمت زندگی بھر کرتے رہے۔ ان کا نظریہ ترقی پسند ادب بہت واضح اور اٹل تھا جو پوری طرح ان کی کہانیوں اور تحریروں سے جھلکتا ہے۔ فی زمانہ ایسے ادیبوں بالخصوص شاعروں میں ایسے نام نہاد ترقی پسند عہدہ داروں کی کمی نہیں جو کہتے تو اپنے کو ترقی پسند ہیں مگر برائے نام بھی ان کے کلام میں ترقی پسندی کا کوئی عنصر نہیں ملتا اور وہ اپنی اس بے مقصد اور زیادہ مہمل شاعری کی مدد سے مختلف الخیال اداروں میں بے ضرر اور قابل اعتماد مانے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں "کاڈرس" نام کی کوئی چیز بھی نہیں ملتی۔

اس دوران قیام دہلی میں میں ہر دوسرے تیسرے اتوار کو رفیع احمد قدوائی صاحب کی سرکاری قیام گاہ نمبر ۴ ایڈورڈ روڈ پر انیس باجی سے ملنے ضرور جایا کرتا تھا۔ انیس باجی قدوائی صاحب کی

بھاوج تھیں جن کے شوہر کو ۴۷-۱۹۴۸ء کے فسادات میں مسوری میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ موصوفہ ترقی پسند ادیبوں کی بڑی سرپرست تھیں۔ اور ان کے یہاں اکثر ترقی پسند شعرا کی نشست مرکزی کمرہ کے قالین پوش فرش پر ہوا کرتی جس کی صدارت زیادہ تر ڈاکٹر تاثیر کیا کرتے تھے۔ جگر صاحب آ گئے اور نشست ہو گئی۔ جوش صاحب یا سردار یا مجروح آ گئے نشست ہو گئی۔ کبھی میں تنہا رہا تب بھی بغیر اشعار سنائے واپسی نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں تنہا تھا اور رات زیادہ جا چکی تھی اور نوکروں کو کوئی سواری نہ مل سکی تو کھانے کے بعد مجھ کو باہر برآمدہ کے کنارے پر مہمان خصوصی کے ایک کمرہ میں رات بھر رہنا پڑا۔ "رہنا پڑا" اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس سے قبل میں کبھی ڈنلپ کشن۔ ڈنلپ پلو اور سپرنگ کمبل کے بستر پر نہیں سویا تھا۔ اواخر نومبر تھا اور بستر اس درجہ لچک دار اور گدگدیلا تھا کہ مجھ کو رات بھر نیند نہ آئی۔ بالخصوص تکیہ سر کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دے رہا تھا بلکہ جھینکے دے رہا تھا۔ تکیہ کے معاملے میں میری ایک کمزوری یہ ہے کہ میں علاوہ پروں کے تکئے کے کوئی دوسرا تکیہ نہیں استعمال کر سکتا۔ روئی کا تکیہ چند ہی دنوں میں سخت ہو جاتا ہے۔ سپنجل سے میرے سر اور کانوں میں درد پیدا ہو جاتا ہے اور ڈنلپ پلو سے رات بھر جنگ کرنا پڑتی ہے۔

انھیں دنوں غلام ربانی تاباں نے "شکست زنداں" کے نام سے اُن ترقی پسند نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا جو آزادی وطن کے موضوع پر لکھی گئی تھیں۔ اس میں جوش صاحب کی عطا کردہ ایک ایسی نظم بھی شامل تھی جو ہنوز نظر ثانی کی محتاج تھی۔ جوش صاحب اس زمانہ میں سرکاری جریدہ ماہنامہ "آج کل" کے مدیر اعلیٰ تھے۔ جوش صاحب اس مجموعہ کو پڑھ کر بہت بیزار ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ نظموں کا یہ انتخاب ناقص تھا اور موصوف نے ترقی پسند شعرا کی نااہلی پر ایک ہجو لکھ کر نقوش لاہور میں چھپوا دی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ من حیث ہجو وہ نظم مکمل تھی مگر جس Sweeping (بلا استثنائی) انداز میں فن کی طرف سے بے توجہی کا الزام لگا کر تمام ترقی پسندوں کو مطعون کیا گیا تھا غلط تھا چنانچہ میں نے جوش صاحب پر تقریباً پچاس اشعار کی ایک ہجو لکھ کر ان کو بذریعہ ڈاک بھیج دی اور یہ ان کا بڑپن تھا کہ انھوں نے اس کا کوئی جواب الجواب نہیں دیا۔ اس ہجو ملیح کو اس وقت میں نے اخباروں میں اس احتیاط کی بنا پر شائع نہیں کروایا کہ کبھی ختم نہ ہونے والی بحث چھڑ جائے گی

اور اگر اس میں جوش صاحب نے رجعت پرستوں کا ساتھ دیدیا تو ہم لوگوں کی بڑی ہیٹی ہوگی اور بحث طول پکڑتی یقیناً۔ میں نے شاہراہ کے اداریہ میں ان کی ہجو پر محض اظہار افسوس کیا تھا کہ دوسرے ہی مہینے نقوش لاہور میں میرے اظہار افسوس پر اظہار بیزاری کیا گیا۔ بہر حال اس ہجو ملیح کو میں اپنے اس مجموعہ کلام میں شامل کر رہا ہوں جو زیر ترتیب ہے۔ میں نے اور بھی ہجویات ملیح کہی ہیں ان کا ایک مجموعہ علیحدہ شائع کروانے کا خیال ہے۔

پبلو نرودا ہسپانوی زبان کا مشہور شاعر دہلی آیا تو اس کو انجمن ترقی پسند مصنفین نے گے لارڈ ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ مہمان سے ہم لوگوں کا تعارف کرایا گیا اور اس نے Spanish Civil War کی انسانیت سوز تباہ کاریوں پر ایک طویل نظم سنائی اور ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا جو پسند بہت کی گئی۔ فوجی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف اس جنگ میں حریت پرست اور جمہوریت پسند عالمی فنکاروں کا جو تخلیقی کردار رہا ہے اس کو عالمی فنون تخلیق کے عظیم اور زندۂ جاوید نمونے کہا جا سکتا ہے۔ پکاسو نے Goer-nica (گوئرنکا) جیسا مصوری کا شاہکار دیا جس کی اہمیت آج جوہری جنگ کے خطرات سے دوچار دنیا کے لیے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ارنسٹ ہمنگوے نے For whom the bell tools جیسا عظیم ناول دیا جو رہتی دنیا تک ایک (Scriptures) متبرک کتاب کی طرح پڑھا جائے گا۔ کرسٹوفر کوڈول نے ترقی پسند تنقیدی معیار کو اپنی کتاب Study in dying culture اور دوسری تصنیفات کا معیاری ادب دیکر اس جنگ میں انسانیت کی قربان گاہ پر جان دی اور عظیم حبشی موسیقار پال روبسن کے سحر آفریں نغمے امن عالم کا پیغام لیے اب تک فضا میں گونج رہے ہیں۔ ہم ان فنکاروں کی قد آور شخصیت اور ان کی تخلیقات کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

جالندھر میں امن عالم کے پرچم تلے پنجاب کے لاکھوں کسانوں اور محنت کشوں کا میلا ہوا۔ جوش سے بھرے ہوئے عوام کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ رنگین تہبندوں اور پگڑیوں میں بھانگڑا۔ "ہم تیسری جنگ نہ ہونے دیں گے" کے موضوع پر IPTA کے ڈرامے۔ پنجاب کی مختلف دیہاتی بولیوں میں جنگ سے اظہار نفرت اور امن سے محبت کے گانے گو میری سمجھ میں نہ آتے تھے مگر سننے میں دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کراہ معلوم ہوتے تھے۔ پنجابی ہندی اور اردو کا ملا جلا اجلاس ہوا جس میں تقریروں کے

درمیان نظموں سے عوام کی دلچسپی قائم رکھی گئی تھی - اور اسی اجلاس میں میں نے اپنی طویل نظم "نیلا پرچم" کو پوری قوت سے پیش کیا تھا جو سننے والوں کے اتنے بڑے اجتماع کے لیے ضروری تھا - دوسرے دن پنجابی اخباروں میں اس کو بہت سراہا گیا اور پنجابی زبان کی مختلف شیلیوں میں اس کے منظوم ترجمے شائع ہوئے

مشاعروں میں بسا اوقات سنانے کے لیے کلام کا غلط انتخاب ناکامی اور شرمندگی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے - جالندھر سے واپسی پر "نیلا پرچم" کی کامیابی کا نشہ ابھی باقی تھا کہ پٹیالہ کے مشاعرہ میں سنانے کیلیے میں نے اسی نظم کا انتخاب کیا اور یہ ایک مشن بھی تھا - مگر ابھی چند ہی بند سنائے تھے کہ پٹیالوی جوانوں نے غزل غزل کا نعرہ بلند کر دیا - اور نظم بند کر کے مجھ کو غزل سنانا پڑی - بعد کو تجزیہ کرنے پر وجہ سمجھ میں آئی کہ پٹیالہ میں زیادہ تر فوجی بستے ہیں - اور بڑی بڑی جنگوں سے ان کی روزی روٹی کا تعلق ہے - اسی نہج سے ان کو میدان جنگ کے باہر تفریح چاہیے - جنگ کی تباہ کاریوں کا انتباہ نہیں - بالکل ایسا ہی واقعہ St. Stephens College, Delhi میں ہوا - سردار نے پیپلز ودا سے متاثر ہو کر کوئی نظم کہی تھی - سامعین کے مزاج کو نہ سمجھتے ہوئے انھوں نے وہ نظم سنانا شروع کی اور ابھی دس بارہ مصرعے پڑھے تھے کہ طلبا سیٹی بجانے لگے اور میری بدبختی سے میرا نام پکارنا شروع کر دیا - اور اس واقعہ نے مجھ کو بڑی Embarrassing position (الجھن) میں ڈال دیا - میں نے سردار سے کہا میں نہیں پڑھوں گا اور تم نئی دنیا کو سلام کا حرف آخر سناؤ - اور میں نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں اس وقت تک نہیں سناؤں گا جب تک آپ اپنے مہمانوں کے کلام کو توجہ سے نہیں سنیں گے - میں سردار جعفری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی حرف آخر نظم سنائیں - چنانچہ سردار نے وہ نظم بطیب خاطر سنائی جو بہت زیادہ پسند کی گئی -

اسی زمانہ میں پنڈت سندر لال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ہریندر چٹو پادھیا زیادہ تر دہلی میں رہ کر امن تحریک کے خلاف حکومت ہند کی معاندانہ پالیسی پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے - کبھی جامع مسجد کے سامنے میدان میں اور کبھی ارونا آصف علی کی صدارت میں قرول باغ میں - ان جلسوں میں ہریندر چٹو پادھیا کبھی ہارمونیم اور کبھی اکارڈین پر عوامی گیت سنایا کرتے تھے - ان دنوں بابو راجندر پرشاد صدر جمہوریہ تھے - پنڈت سندر لال نہایت اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بات چیت کرنے کے انداز میں تقریریں کرتے تھے - پنڈت سندر لال بڑے پرانے کانگریسی اور گاندھی جی کے خاص چیلوں میں سے تھے - اور حکومت سے کئی امور پر خفا رہتے تھے - پہلی

تو یہ کہ حکومت امن تحریک کے خلاف اس بنا پر ہے کہ یہ روسیوں کی تحریک تھی اور امریکا اس کو پسند نہ کرتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ حکومت باہر سے لیپا پوتا کرتی ہے اور عوام کی گرتی ہوئی حالت پر کوئی توجہ نہیں دیتی تیسرے یہ کہ حکومت نے گاندھی جی کے تصورِ آزادی کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اسی ضمن میں پنڈت جی نے ایک لطیفہ سنایا کہ دیکھو کہ آج حکومت کی گدے دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنی پرانی حیثیت کو بالکل بھول گئے ہیں اور فرمایا کہ "یہ شخص جس کو تم لوگوں نے ابھی چند دن قبل چاندنی چوک میں جو کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے وہ گاندھی جی سے ملنے ایک ٹھکر ٹھکریا کے پر سیوا گرام جایا کرتا تھا اور جب مہاتما جی کچھ ناشتہ کرنے کو کہتے تھے تو وہ اپنی میلی کچیلی دھوتی کے ایک کونے سے بندھی ہوئی چنے کی پوٹلی دکھلاتا اور کہتا تھا کہ باپو اب تو ہم نے پورا جیون چنا چبا کر کاٹ دینے کی پرتگیا کی ہے"۔ اس پر مجمع نے قہقہہ لگا کر اور تالیاں اور شیم شیم کے نعرے لگائے۔ کچلو صاحب بہت کم گو تھے اور ان کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ تعجب ہے کہ ان مجاہدینِ آزادی اور انگریزوں کی گولیوں کی بارش کے درمیان سے گذرے ہوئے غازیوں کو ہمیشہ ان کے اعلیٰ مرتبوں سے محروم رکھا گیا۔ یہ لوگ ملک کی ایک مشترک قوم کے اصل نمائندہ تھے جن کی راہ میں کہا جاتا ہے کہ سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد ہمیشہ حائل رہے۔

ایک دن بیگم زیدی یعنی قدسیہ آپا کا فون آیا کہ ذاکر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ آج شب میں کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ اس قیام دہلی میں اکثر دن کا کھانا گول کر کے کبھی بھوکا بھی رہ جاتا تھا۔ رات کا کھانا پرکاش پنڈت کے یہاں کھاتا تھا۔ اس لئے کھانے کی کسی دعوت کو مسترد نہیں کرتا تھا۔ جب کرنل بشیر حسین زیدی کے یہاں پہنچا تو وہاں ذاکر صاحب زیدی صاحب اور قدسیہ آپا کو حقہ پیتے دیکھا۔ ذاکر صاحب مجھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس لیے کہ مجھ کو مکان تلاش کرنے میں تاخیر ہو گئی تھی اور وہ لوگ تقریباً میرے آنے کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔ کھانے کے بعد ذاکر صاحب نے حکم دیا کہ "زمین" سنائیے۔ عجب حسن اتفاق کہ کھانے کے بعد بیگم پٹودی بھی آگئی تھیں۔ قدسیہ آپا اور زیدی صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ کرنل صاحب، بیگم صاحبہ بھوپال اور قدسیہ بیگم نے غالباً نہیں سنی تھی۔ چنانچہ میں نے نظم سنائی۔ زیدی صاحب کی متعلق یہ بتلانا مشکل تھا کہ وہ کیا پسند کرتے ہیں اور کیا نہیں اور یوں بھی شعر و شاعری کے مسئلہ پر موصوف کم ہی رائے کا اظہار کرتے ہیں البتہ قدسیہ آپا اور بیگم پٹودی بھوپال نے میری نظم اور اس پر ذاکر صاحب کے عالمانہ تبصروں کو بہت پسند کیا [6] اور بیگم پٹودی بھوپال نے اپنے

یہاں شعری نشست بالطعام کی دعوت دی جس کو میں نے بخوشی منظور کر لیا ـــــ دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ذاکر صاحب نے مجھ کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور بہت ہمدردانہ انداز میں بولے کر کہ "وامق صاحب! آپ کی شاعری مجھ کو بہت پسند ہے اور ہر صاحب ذوق کو پسند آتی ہوگی مگر ہندوستانی ادیب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ شاعری یا اس کی تخلیقات محض اس کی دنیاوی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتیں تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ غالباً شاہراہ کی ادارت سے تو آپ کی ضروریات پوری نہ ہو سکتی ہوں گی"۔ میں نے کہا "آپ کا خیال بالکل درست ہے مگر میں روزی روٹی کے سوال پر اپنا دست طلب کسی کے سامنے دراز نہیں کر سکتا"۔ موصوف نے کہا "اس کا تو مجھے یقین ہے البتہ اگر میں خود آپ کو علیگڑھ بلاؤں اور یونیورسٹی میں کسی معقول جگہ پر آپ کو کام سے لگا دوں تو آپ قبول کریں گے؟" میں نے جواب دیا "آپ کے حکم کی تعمیل کو میں باعث عزت سمجھوں گا۔ البتہ یہ فوراً ممکن نہ ہو سکے گا اس لیے کہ سال بھر سے اوپر ہو رہا ہے میں اپنے عیال کو دیکھنے نہیں گیا ہوں۔ کم از کم ایک ماہ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مزدوری کرتے کرتے بالکل خستہ ہو گیا ہوں"۔ "اچھا تو آپ گھر جائیے۔ میں موقع پاتے ہی آپ کو علیگڑھ آنے کی تکلیف دوں گا"۔ اس گفتگو کے بعد میں نے بیگم پٹودی بھوپال سے پھر کبھی ان کے یہاں شعری نشست میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے سب سے رخصت لی اور دوسرے ہی دن "شاہراہ" سے مستعفی ہو کر وطن واپس آ گیا۔

پھر، بھوپال

ابھی وطن میں آئے ہوئے تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ بھوپال اور حیدرآباد سے کل ہند مشاعرہ کے دعوت نامے ملے۔ بھوپال کا مشاعرہ بیگم پٹودی بھوپال کی صدارت میں ہوا تھا اس کے دوسرے دن بیگم صاحبہ نے اپنے محل پر ایک شعری نشست اور دوپہر کے کھانے پر جاں نثار اختر، سعید اختر، تاج بھوپالی اور مجھ کو دعوت دی۔ بھوپال میں چند دن قیام کرنے کے بعد میں حیدرآباد چلا گیا۔ یہ ایک خالص ترقی پسند ادیبوں کا مشاعرہ تھا جس کے منتظم سلیمان اریب تھے۔ اس میں مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت، وحید اختر دوسرے مقامی شعرا اور ملک کے تقریباً سبھی ترقی پسند شعرا نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ کی صدارت پروفیسر قادری زور نے کی تھی۔ زور صاحب نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے مجموعہ کلام کی بازیافت کا سہرا انھی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ آج حیدرآباد

کا ادارۂ ادبیات اردو جو اردو کے مخطوطات اور نوادر کا ایک عجائب گھر ہے انھی کے مساعی کا نتیجہ ہے۔

اس کے چند ماہ بعد بھوپال کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی جس کی کنوینر زہرہ جمال تھیں۔ اس میں کیفیؔ، ساحرؔ، جاں نثار اخترؔ، مجروحؔ اور میں نے شرکت کی تھی۔ اب زہرہ جمال کے والد صدیقی صاحب نے بہت بڑا لان در دالان والا مکان لے رکھا تھا۔ اور ہم سب باہر سے آئے شعرا کا قیام انھیں کے مکان پر ہوا۔ اس دفع زہرہ جمال کی والدہ کی گفتگو سے مستفید ہونے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

"بہت لطف آتا تھا باتوں میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھیں"

بالخصوص جب موصوفہ نوابین و بیگمات بھوپال کے اذکار کرتی تھیں تو محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھوپال کے متعلق کوئی تاریخی انشائیہ پڑھ رہے ہیں۔

علیگڑھ

اب ۱۹۵۵ء بھی شروع ہو گیا تھا مگر علیگڑھ کی کوئی سن گن نہ ملی۔ اقتصادی پریشانی اپنا پورا گھیرا ڈال چکی تھی کہ مارچ میں پروفیسر محمود کا تار ملا جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے کہ میں فوراً علی گڑھ چلا آؤں۔ چنانچہ میں تنہا علی گڑھ پہنچ گیا۔ رضا حسین زیدی کے یہاں سامان رکھا اور سیدھا محمود صاحب سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ انھوں نے اس تاخیر کے جملہ اسباب سے مجھ کو آگاہ کیا۔ ایک اسسٹنٹ رجسٹرار کی جگہ تھی جو ذاکر صاحب کی عدم موجودگی ہی میں پر ہو چکی تھی۔ اب آفس سپرنٹنڈنٹ کی ایک جگہ خالی ہوئی تھی جو مشتہر بھی ہو چکی اور درخواستیں بھی آ گئیں مگر میری کوئی درخواست نہیں آئی تھی اس لیے تار دیکر مجھ کو بلایا گیا ہے۔ ایک درخواست کا فارم دیا کہ اسی دن خانہ پوری کر کے داخل کر دوں۔ اور میں نے ویسا ہی کیا۔ پندرہ دن بعد سلیکشن کمیٹی کی نشست ہوئی جس کی صدارت خود ذاکر صاحب نے فرمائی۔ وائس چانسلر بالعموم ایپر سب آرڈینیٹ گریڈ کی انتخابی کمیٹی میں شرکت نہیں کرتا مگر چونکہ موصوف کو میرے انتخاب کو حتمی بنانا تھا اس لیے وہ اس کمیٹی میں آئے تھے۔ اور اگر وہ نہ آتے تو میری تقرری غالباً ممکن نہ ہو سکتی۔ دس بارہ امیدوار تھے

جن میں ایک صاحب .P.V.C کے آدمی تھے۔ کمیٹی کے چار ممبر تھے اور ذاکر صاحب کو لیکر پانچ۔ انٹرویو کے بعد .P.V اور یونیورسٹی کے خزانچی صاحب ایک طرف ہو گئے اور محمود صاحب اور پرنسپل انجینئرنگ کالج میری طرف اور ذاکر صاحب نے casting vote (اپنی فیصلہ کن رائے) میری موافقت میں دیکر میرے انتخاب کی توثیق کردی اور دوسرے ہی دن میں نے آفس سپرنٹنڈنٹ انجینئرنگ کالج .M.U Aligarh کا چارج لے لیا اور .P.V.C کے امیدوار کو کامرس کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ کی جگہ دیدی گئی۔

••

آٹھواں باب

علیگڑھ

اپریل ۱۹۵۵ء میں آفس سپرنٹنڈنٹ انجینئرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی حیثیت سے میں کام کرنے لگا۔ چونکہ فوری طور پر مستقل قیام کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تھا اس لیے سید رضا حسین زیدی استاد جغرافیہ کے مکان بھوسی کے بنگلے میں جو یونیورسٹی کی حدود میں انوپ شہر روڈ پر واقع تھا بحیثیت مہمان کے رہنے لگا۔ مرحوم چند ماہ بعد جغرافیہ میں ڈاکٹریٹ کرنے لیڈز (ولایت) چلے گئے اور میں ان کے ضمنی کرایہ دار کی حیثیت سے بھوسی کے بنگلہ پر تنہا قابض ہو گیا اور عیال کو بھی علیگڑھ لے آیا۔ بیوی، چھوٹا لڑکا باقر مجتبیٰ اور اکلوتی بیٹی شیریں۔ کامریڈ ذکی (ردولوی) کو جو علیگڑھ میں مولانا کے نام سے مشہور تھے اور M.Sc. Botony کے طالب علم تھے، میں نے اپنا مستقل مہمان بنا لیا۔ مولانا بہت پڑھے لکھے اور سخت قسم کے اشتراکی اور ترقی پسند تھے۔ چوٹی کے نازک مزاج زود رنج اور لڑاکو بھی تھے۔ باقر کچھاؤں سے فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول کر چکا تھا۔ اس کا نام انٹرمیڈیٹ کلاس میں بہ آسانی لکھ گیا البتہ شیریں ابھی چھوٹی تھی اس کی تعلیم کا سوال سامنے تھا۔ چنانچہ میری درخواست پر مولانا نے اپنے خالی اوقات میں اس کو انگریزی، اردو، سائنس، ریاضی، جغرافیہ اور تواریخ وغیرہ پڑھانے کا ذمہ لیا اور ایک سال میں ہائی اسکول کے نویں درجے میں داخلہ کے قابل بنا دیا اور اس کا داخلہ ہو گیا۔ اس طرح بچوں کی تعلیم کی طرف بڑے تردد سے میں نے گلوخلاصی حاصل کی۔ مولانا البتہ قد اور قدرے کم شکل ناک نقشہ کے آدمی تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گھر سے بھاگ کے اپنے پدر بزرگوار کی مرضی کے خلاف علیگڑھ آئے تھے اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اس لیے ان کے احساس کمتری نے نہایت جارحانہ انا کی شکل اختیار کر لی تھی مگر میں نے ان کو کبھی کسی طرح شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور وہ ایک فرد خاندان کی حیثیت سے ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ باقر کی طبیعت میں

ذرا تیزی تھی اس لیے آئے دن مولانا اور باقر سے جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ بالخصوص اس دوڑ میں کہ صبح سویرے روزنامہ ہندوستان ٹائمز پہلے کس کے ہاتھ میں آتا ہے۔ جس کو اخبار پہلے مل جاتا وہ اس کو لیکر بیت الخلا میں بند ہو جاتا اور دوسرا باہر سے کنڈی چڑھا دیتا۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے اور کبھی کبھی ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی اور مجھ کو مصالحت کروانا پڑتی۔ غرض کہ مولانا کے وجود سے گھر میں اچھی خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ اب مولانا غالباً Ph.D. کر کے علیگڑھ میں ریڈر ہیں (یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بس اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی)۔ مولانا بہت یاد آتے ہیں۔ معلوم نہیں ہیں انکو یاد ہوں کہ نہیں۔

قبل اس کے کہ میں علیگڑھ میں اپنے چھ سالہ قیام کی تفصیل میں جاؤں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان چند ساتھیوں کے اسمائے گرامی گنا دوں اور ان میں سے دو ایک کی خصوصیات بیان کر دوں جن کے درمیان میں نے وہاں کی زندگی گذاری تھی۔ ذاکر صاحب، ان کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی۔ محمود صاحب، ڈاکٹر نورالحسن، مونس رضا، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر مجیب اور انکی اہلیہ جمیلہ آپا، صابرہ زیدی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ڈاکٹر خورشیدالسلام، ڈاکٹر انس، ڈاکٹر محمد شفیع، ٹونکی صاحب، اطہر پرویز، ڈاکٹر رئیس احمد، جذبی، اختر انصاری، احمد عباس، پروفیسر آل احمد سرور، خواجہ مسعود علی ذوقی۔ سعید ماموں (دنیا بھر کے ماموں)، جرار حیدر ایڈووکیٹ اور زہرا جرار، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، بشیر صاحب لائبریرین مولانا آزاد لائبریری، کامریڈ صدیق (برادر خرد محمود صاحب)، اور طالب علموں میں معصوم رضا راہی، حبیب احمد (کیپٹن رائڈنگ کلب)، وارث کرمانی، قمر رئیس، امیر عارفی ان کے علاوہ اور دوسرے حضرات جن کے نام اس وقت یاد نہیں (سلسلہ واقعات لکھنے میں جو آگے چل کر ممکن ہے یاد آجائیں)۔

ان میں علاوہ چند کے سب ہی یا تو پارٹی ممبر یا ہمدرد یا ترقی پسند تھے۔ جب میں علیگڑھ پہنچا اس وقت کامریڈ صدیق یونیورسٹی شاخ پارٹی کے سکریٹری تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر خورشیدالاسلام سکریٹری ہوئے تھے۔ ان مندرجہ بالا شخصیتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ کردار کامریڈ صدیق کا تھا۔ ان کے چند واقعات بیان کر کے دوسروں کا مختصراً ذکر کروں گا جن کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔

کامریڈ صدیق کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی مگر کامریڈ ڈاکٹر زیڈ احمد اس کوشش میں تھے

کہ کوئی ایسی ترقی پسند خیالات کی لڑکی مل جائے جو تعلیم یافتہ ہو۔ نوکری کر کے صدیق کو پال سکے اور سنبھال لے۔ صدیق اپنے برادر بزرگ محمود صاحب کے ساتھ دودھ پور میں رہتے تھے اور جن سے محمود صاحب بیحد محبت کرتے ان کے ہر طرح سے کفیل رہتے مگر بظاہر ان سے خفا رہتے تھے۔ ایک دن صدیق کی عدم موجودگی میں ٹہلتے ہوئے موصوف ان کے کمرہ میں چلے گئے اور کمرہ کو حد سے زیادہ گندہ اور ناقابل سکونت پایا تو اسکو نوکروں سے اپنی موجودگی میں صاف کروانے لگے۔ محمود صاحب انگریزی کے پروفیسر، رجسٹرار یونیورسٹی اور تحریک کے بڑے ہمدردوں میں تھے۔ کمرہ کی صفائی کے درمیان صدیق کی تکیہ کے نیچے سے ایک میلا سا کاغذ برآمد ہوا جس پر ان ہمدردوں اور ساتھیوں کے نام درج تھے جن کو صدیق نے غدار Renegade اور پست ہمت Degenerate تصور کر رکھا تھا اور اسی لیے عوامی انقلاب کے بعد اشتراکی حکومت کے حکم سے منظر عام پر ان سب کو گولی کا نشانہ بننا تھا۔ عوام دشمنوں (Peoples enemies) کی اس فہرست میں پہلا نام محمود صاحب کا تھا اور دوسرا مونس رضا کا وغیرہ وغیرہ۔ اسی روز شام کو جب میں محمود صاحب کے یہاں گیا تو موصوف نے وہ فہرست مجھ کو دکھلائی اور فرمایا کہ "واقعی اب اس پاگل پن کا کوئی علاج"۔ میں نے کہا "اس فہرست میں بہت جلد ہی میرے نام کا بھی اضافہ ہونے والا ہے۔ صدیق کی شادی طے ہو گئی ہے اور میں نے چندہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں چندہ کے بدلے میں بیگم صدیق کو کوئی تحفہ دوں گا" اور شادی کے بعد میں نے ایسا ہی کیا۔

صدیق کی قیادت میں چند کامریڈ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ لیکر جیل کے سامنے ایک جلوس نکلا جس میں بمشکل دس بارہ آدمی تھے اللہ میں صدیق نے جلوس کی روداد پیش کی تو مظاہرین کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار بتلائی۔ جب چند ممبروں نے اس کو واقعہ کے خلاف بتلایا تو صدیق لال ہو کر بولے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ہمارا ایک ایک ساتھی کیا سو سو سپاہیوں سے کم ہے۔ اور یہ رپورٹ بلا اختلاف پاس کر دہ لکھ دی گئی۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام بیحد ذہین صاحب طرز انشا پرداز تھے اور اپنے مضمون میں بہت قابل مانے جاتے تھے۔ وہ لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل کے ساتھ سودا اور ہجویات پر کام کر رہے تھے۔ پروفیسر رسل اس سلسلہ میں کئی بار علیگڑھ آئے تھے اور ان سے میری ملاقات ڈاکٹر خورشید الاسلام کی قیام گاہ پر ہوئی۔ وہ انگریزی لندن کے خالص "کاکنی" لہجہ میں بولتے

تھے اور صحیح اردو میں لکھا کرتے تھے ۔ وہ انگریزی تحریروں میں ہجو کو (Satire) سیٹائر لکھتے تھے ۔ جب کہ دونوں مختلف اصناف ادب ہیں ۔ ہجو کا مطلب تضحیک ہے اور سیٹائر کا طنز، تضحیک اور طنز میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ اس مغالطہ کی ایک یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انگریزی ادب میں ہجو نام کی کوئی صنف نہیں ہے ۔ اس لیے پروفیسر موصوف نے اس کو سیٹائر فرض کر لیا تھا ۔ درآنحالیکہ ہجو، تضحیک اور مذاق اڑانے کا مطلب ہے آبرو ریزی، عیب جوئی ۔ جن کے لیے انگریزی مترادف الفاظ موجود ہیں ۔ Defamation,

Accusation اور Charactor: Assassination, Malign, Abuse, Disparage

وغیرہ ۔ خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی ۔ پروفیسر رسل آج تک تحریک اور ترقی پسندی سے منسلک ہیں ۔ موصوف نے انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے جشن طلائی ۱۹۸۵ء میں شرکت کی ہے جبکہ ڈاکٹر خورشید الاسلام ۱۹۵۸ء میں تحریک سے مستعفی ہو کر مخالف گروپ کی Good books میں ضم ہو گئے تھے ۔

اطہر پرویز کی اشتراکی جدوجہد کا ذکر گذشتہ ابواب میں آچکا ہے ۔ مرحوم نے بھی علیگڑھ میں قدم جمانے کے بعد ترقی پسندی کو خیر باد کہ کر ڈاکٹر خورشید الاسلام سے بہت پہلے ہی شعبۂ اردو میں اپنا اچھا مقام بنا لیا تھا ۔ پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علیگڑھ جب لکھنؤ میں تھے تو ان کی قیام گاہ پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوا کرتے تھے ۔ موصوف نے علیگڑھ میں P.W.A. سے ترک تعلق کر کے "جدیدیت" کی بنیاد رکھی اور ایک کل ہند سیمینار کیا جس میں مشہور ہے کہ امریکی عناصر نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا تھا ۔

مندرجہ بالا واقعات کے پس منظر اور پیش منظر میں میں وارد علیگڑھ ہوا تھا ۔ چونکہ علیگڑھ میں میرے احباب اور چاہنے والوں کا حلقہ پہلے ہی سے وسیع تھا اس لیے وہاں پہنچنے پر مجھ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ۔ نئے دن جگہ جگہ شعر و شاعری کے جلسے اور ادبی نشستیں گرم ہونے لگیں ۔ وہ گہما گہمی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا ۔ ہندی کے مشہور کوی نیرج ۔ جو پہلے سے میرے شناسا تھے ان جلسوں میں پابندی سے شرکت کرنے لگے ۔ اور اردو شاعری اور زبان سے متاثر ہوتے رہے ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج نیرج کی کویتاؤں میں اردو کا نمایاں عکس ملتا ہے ۔ قمر رئیس بھی اسی زمانہ میں اردو میں ایم ۔ اے کرنے آئے تھے اور شروع سے آخر تک باوجود شعبۂ اردو میں ترقی پسند تحریک کے خلاف ماحول کے ہمارے ساتھ رہے ۔ اساتذہ میں جذبی، اختر انصاری، منیب الرحمٰن، خواجہ مسعود علی ذوقی گو ہماری نشستوں میں کم شریک ہوتے تھے تاہم جذباتی طور پر پوری طرح تحریک سے وابستہ رہے ہیں ۔ تحریک کو ڈاکٹر نورالحسن، بشیر صاحب، محمود صاحب، مونس رضا، پروفیسر

عجیب، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور یونیورسٹی اور شہر کے جملہ ادبی مذاق رکھنے والے حضرات کی دلچسپی اور اخلاقی سہارا حاصل تھا۔ اسی زمانہ میں بلاغت حسینی شہاب سرمدی سپرنٹنڈنٹ اکسائز تبدیل ہو کر علیگڑھ آگئے تھے۔ اور اپنے مخصوص انداز شاعری میں تحریک کے ساتھ تھے۔ علیگڑھ سماج میں ترقی پسند شعرا کی ہردلعزیزی اس امر سے لگایا جاسکتا تھا کہ ویمنز کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں (جس کی پرنسپل ممتاز آپا تھیں جن کے رکھ رکھاؤ، تنک مزاجی اور ذہنی اور اخلاقی نظم و نسق کے معاملہ میں سخت گیری ضرب المثل تھی) جب کوئی شعری نشست ہوتی تھی تو صرف ترقی پسند شعرا کو دعوت دی جاتی تھی۔ جب کبھی بنّے بھائی علیگڑھ آتے تھے تو ویمنز کالج میں مشاعرہ ضرور ہوتا۔ میری نظم "مینا بازار" کا Shadow play (عکسی تمثیل) سب سے پہلے ویمنز کالج کی طالبات نے پیش کی تھی (اس کے بعد یونیورسٹی کی کلچرل سوسائٹی نے اس کو دوسری شکل میں پیش کیا)۔ اسی زمانہ میں شعبۂ جغرافیہ کی میزبانی میں ایک بین الاقوامی جغرافیائی سیمینار ہوا۔ اس میں دنیا بھر کے ماہرین جغرافیہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی جن کی تعداد سو سے کم نہ رہی ہوگی۔ اور جس کے کنوینر یار روح رواں مونس رضا تھے۔ علاوہ دوسرے انتظامیہ مسائل کے سب سے بڑا مسئلہ مندوبین کے ٹھہرانے اور خورد و نوش کا تھا۔ اس کو مونس رضا نے یوں حل کیا تھا کہ ہر قابل اعتماد اسٹاف ممبر کے یہاں ایک ایک دو دو مندوب کو ٹھہرایا گیا۔ جس میں صرف صبح کا ناشتہ شامل تھا۔ دوپہر کا لنچ اور سہ پہر کی چائے کا اہتمام سیمینار کی طرف سے ہوتا تھا اور شب کا ڈنر V.C و P.V.C اور مختلف صدر ہائے شعبہ جات کے یہاں ہوتا تھا۔ سیمینار تو تین دن چلا مگر مندوبین کی تواضع تقریباً پانچ دن تک ہوئی۔ چیکوسلواکیہ کے مندوب الگزانڈر یانکوف کی میزبانی کا شرف مجھ کو دیا گیا۔ علاوہ جغرافیہ کے ماہر ہونے کے یانکوف عالمی طلبا فیڈریشن کے سکریٹری بھی تھے جو چند سال بعد برطانیہ میں چیکوسلواکیہ کے سفیر بھی مقرر ہوئے۔

سیمینار کے زمانہ میں ان کی عمر چوبیس پچیس برس کی رہی ہوگی۔ ہماری کوشش یہ تھی کہ ان کو صبح ناشتہ پر وہی چیزیں کھلائی جائیں جو چیکوسلواکیہ میں میسر نہ ہوں مثلاً باقر خانی، بریانی، شاہی ٹکڑے اور پھلوں میں کیلا اور امرود وغیرہ۔ میں ناشتہ پر انکا ساتھ دیتا تھا اور باقر، شیریں اور مولانا بیرے ہوتے تھے اور راہی معصوم رضا ٹہل ٹہل کے اپنی پسندیدہ چیزیں کھاتے اور یانکوف کے پیچھے جا کر اس کی نقلیں اتارتے تھے۔ غرض ناشتہ پر اچھا خاصہ لطف رہتا تھا۔ ہمارے بچوں سے ان کی بڑی دوستی

اور بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ناشتہ پر کیلا تھا۔ انھوں نے ایک کیلا لیکر پورا چھیل ڈالا اور جیوں ہی منھ کی طرف لیجانے لگے کیلا چکنے پن کی وجہ سے انگلیوں کی گرفت سے نکل کر زمین پر جا رہا اور پروفیسر کیلے کے ساتھ اس کی بازیابی کے لیے خود بھی کرسی اور میز کے درمیان جاتے ہوئے دیکھے گئے۔ بڑا قہقہہ لگا۔ جب وہ دونوں ہاتھوں میں اس خاک آلود کیلے کو بہت مضبوطی سے پکڑے ہوئے نمودار ہوئے تو میں نے ان سے وہ کیلا لیکر دوسرا کیلا دینا چاہا تو وہ کہنے لگے No, No, I can't let it go so easily, Banana is a rare and very expensive commodity in our country (نہیں نہیں میں اس کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا، کیلا ہمارے ملک میں بہت نایاب اور قیمتی شے مانی جاتی ہے) میں نے جواب دیا "مگر ہندوستان میں نہ یہ نایاب ہے اور نہ بہت گراں۔ میں تم کو یہ گندا کیلا نہیں کھانے دوں گا" اور وہ اس کیلے کو نہ کھانے پر بہت مشکل سے راضی ہوئے۔

رضا حسین زیدی کے ولایت سے واپس آنے سے پہلے ہی مجھ کو نذیر احمد روڈ کا ۲ مکان یونیورسٹی نے الاٹ کر دیا تھا اور میں اس میں منتقل ہو گیا۔

میرے مکان سے ملے ہوئے ٹونک صاحب۔ ڈاکٹر انس، ذوقی اور احمد عباس پرنسپل پالی ٹکنیک کے مکانات تھے یعنی سب ہمسائے بھی بہت اچھے تھے۔ ڈاکٹر اشرف سے میری ملاقاتیں ٹونکی صاحب کے مکان پر ہوتی تھیں۔ ٹونکی صاحب بڑے پرانے اشتراکی تھے اور ڈاکٹر اشرف جب علی گڑھ آتے تھے تو انہی کے یہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر موصوف نسلاً راجپوت تھے اسی نہج سے ان کے قول و عمل میں بڑی ہم آہنگی تھی، تواریخ کے عالم تھے۔ خصوصیت ان کی یہ تھی کہ بہت بڑی بڑی باتیں چند جملوں میں کہنے کا گر جانتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہندوستان کا مسلمان اس وقت تک ہندوستان میں چین کی زندگی بسر نہ کر سکے گا جب تک وہ پاکستان کی طرف دیکھنا نہ چھوڑے گا اور ہندوستان اور ہندوستانی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکے گی جب تک وہ مسلمانوں سے نفرت کرنا نہ ترک کرے گی۔ ہندوستان کی سالمیت اور ترقی کے لیے ہندو مسلمان کا جذباتی لگاؤ نہایت ضروری ہے۔ تحریر و تقریر میں ڈاکٹر اشرف اردو اور انگریزی میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تقریر ہوتی تھی کہ جادو۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی میں بہت بڑا خلا تھا۔ ان کی قبل از وقت موت نے اشتراکی تحریک کا ایک سپہ سالار

ہم سے چھین لیا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ملک گیر پیمانہ پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ علیگڑھ میں بھی ترقی پسند مصنفین تو رہ گئے مگر ان کی انجمن کا جنازہ نکل چکا تھا۔ دوسری طرف میں اپنی خوش فہمی میں انجمن کے احیاء کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ سردار جعفری اور کرشن چندر کو خطوط لکھے۔ اس کے بعد بنے بھائی کو رجوع کیا۔ مگر ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور میری آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔ (اس ضمن میں اس زمانے کے روزنامہ آبشار کلکتہ میں میرے مسلسل طویل مضامین ملاحظہ ہوں)۔

وہاں چند نام نہاد شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا بھی حلقہ تھا جس کو علیگڑھ میں میرا وجود پسند نہ تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو سستی شہرت اور نام و نمود کے لیے کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے بڑے سرگرم کارکن بھی رہ چکے تھے اور اب ذاتی مفاد اور موقع پرستی کے رَد میں کسی غیر ترقی پسند پلیٹ فارم کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ انجمن کے انتشار اور میری بے بسی کا سہارا لیکر ان لوگوں نے مجھ سے جی بھر کے بدلہ لیا۔ میری اسیج پر خوب خوب کیچڑ اچھالے۔ مگر چونکہ ان ادبی بونوں کو میں نے کبھی مخاطب صحیح نہ سمجھا تھا اسی لیے میں نے ان بے ادبوں کا کوئی جواب دینے کی تکلیف گوارہ نہ کی۔ البتہ شکایت ترقی پسند تحریک کے ان سربراہوں سے ہے جو اس زمانہ میں چھپ چھپ کر علیگڑھ آتے تھے اور انھی لوگوں سے ملتے تھے جو سرکاری منصوبہ کے تحت کئی جلدوں میں اُردو زبان کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ "بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی"۔

باوجود ان حادثوں کے میرا قلم نہ رک سکا اور علاوہ دوسری نظموں اور غزلوں کے میں نے ایک اچھی نظم "فن" کہی۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اس ہیبت ناک دور میں میرے احباب سے مجھ کو وہ اخلاقی سہارا ملا کہ میرے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے پائی اور نہ میں مشتعل ہو سکا۔ البتہ طبیعت میں قدرے تکدر ضرور پیدا ہو گیا تھا جس کو احباب کی صحبتوں میں بھول جایا کرتا تھا۔ راہی اور امیر عارفی تو فرد خاندان جیسے تھے۔ ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا مگر دوسرے احباب بھی اپنی محبتوں سے میرا غم غلط کرتے رہتے تھے۔ مثلاً قدسیہ آپا (بیگم کرنل بشیر زیدی)۔ جرار حیدر اور ان کی بیگم زہرا، جمیلہ آپا (بیگم پروفیسر مجیب) ڈاکٹر رئیس احمد اور ان کی بیگم شگفتی، مونس رضا اور شہلا، ڈاکٹر نور الحسن اور ان کی بیگم ڈان، پروفیسر سلطان اور ان کے بیٹے خالد سلطان اور صابرہ زیدی، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی

اور ہمارے مربی اور جگری بزرگ دوست محمود صاحب۔

تاج اکبر میں کبھی جب عصمت چغتائی (جمیلہ آپا کی رشتہ کی بہن) آجاتی تھیں تو لطف صحبت کے لیے غیبتوں کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ مندرجہ بالا خواتین میں سب سے زیادہ دلچسپ اور منہ پھٹ جمیلہ آپا تھیں جن کو میں نے کبھی مغموم نہیں پایا۔

اکثر شام کو میری نشست محمود صاحب کے یہاں ہوتی تھی۔ جب ان پر فالج گرا تو ان کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی تاہم ڈاکٹر سمیع حمید نے ان کو بچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جب وہ زندگی اور موت کے خطرناک درمیانی دور سے گذر رہے تھے تو ایک ایسے خادم کی ضرورت ہوئی جو ایک مہینہ تک شب بحران کی مسہری کے قریب جاگ کر کاٹ دے۔ میرے پاس علاوہ اخلاص کے کچھ نہ تھا جو میں اپنے محسن کو پیش کر سکتا اور میں نے شب بیداری کی خدمت کے لیے اپنے کو پیش کر دیا۔ چنانچہ پورے ایک مہینہ میں نے یہ خدمت انجام دی اور دن میں آفس بھی جاتا تھا۔ دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے دفتر کے بعد سوتا تھا۔ محمود صاحب اس بحرانی دور سے پار تو ہو گئے مگر کئی سال تک صاحب فراش رہے۔ کشمیر سے مرحوم کو خاص محبت تھی اور میرے دوران قیام کشمیر میں گو وہ ٹھیک سے چل نہ سکتے تھے کشمیر تشریف لے گئے تھے۔ یوں تو وہ (State Guest) حکومت کے مہمان تھے تاہم اس قیام میں ان کی جتنی خدمت مجھ سے ممکن تھی میں نے کی۔ کشمیر سے واپسی کے بعد علیگڑھ میں ان کا انتقال ہوا۔

قدسیہ آپا کو قدیم تاریخی شخصیتوں پر ڈرامے تیار کرنے کا بیحد شوق تھا۔ وہ قدیم ڈراموں کا ترجمہ بھی کرتی تھیں، طبعزاد ڈرامے بھی لکھتی تھیں اور ڈرامے اسٹیج بھی کرواتی تھیں۔ اسی شوق کی تکمیل کے لیے زیادہ تر وہ دہلی ہی میں رہتی تھیں۔ جب وہ علیگڑھ آتیں تو میں ان سے برابر ملنے جایا کرتا تھا۔ نہایت شکیل اور پر وقار شخصیت کی خاتون تھیں۔ انھیں کی تحریک پر میں نے فرانسیسی ڈراما نگار ایڈمنڈ روستان کے ڈرامے "سائرانو دی برجریک" کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ ایک ایکٹ کا ترجمہ ختم ہی کیا تھا کہ علیگڑھ کی سیاست میں پھنس گیا اور آج تک وہ ترجمہ مکمل نہ کر سکا۔ دہلی آکر ایک بار ارادہ کیا کہ ترجمہ مکمل کر ڈالوں مگر کتاب باوجود تلاش بسیار کے نہ ملی۔ دہلی اور لکھنؤ کی دوکانوں پر بھی نہ ملی۔ بس ایک ایکٹ مترجم موجود ہے۔ اپنے ڈرامہ "انارکلی" کے گانے انھوں نے مجھ سے لکھوائے تھے جو میرے پاس ابتک موجود ہیں۔ گانے جو زیادہ تر غزلوں کی ساخت کے تھے موصوف کو دکھلا دیے

تھے جس میں انھوں نے کچھ ترمیم چاہی تھی مگر جب وہ ہی نہ رہیں تو کس کے لیے محنت کرتا۔ موصوفہ بہت تندرست تھیں کبھی بھی ان کے خون کا دباؤ اوپر یا نیچے نہیں ہوا تھا مگر اچھوں کی موت تو بغیر اطلاع آتی ہے۔ علیگڑھ آئی ہوئی تھیں۔ ایک دن صبح دس بجے دل میں درد ہوا اور ڈاکٹر سمیع حمید کے انجکشن لگاتے لگاتے قدسیہ آپا نے ایک لمبا سانس لیا اور گردن ڈھلک گئی۔ مرحومہ یونیورسٹی کے قبرستان میں قیامت تک کے لیے سو رہی ہیں۔

مردوں کے مقابلہ میں کمزور ہونے کے سبب سے ہندوستانی خواتین زیادہ Inhi-bited (ذہنی گتھیوں میں الجھی) رہتی ہیں مگر علیگڑھ کے حلقہ احباب کی خواتین میں یہ کمزوری بہت کم تھی۔ ایک صاحبہ جو بہت بڑی مذاقیہ تھیں کہا کرتی تھیں "بھئی ہم کو تو بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی منھ سے رال ٹپکا ٹپکا کے میرے حسن کی تعریف کرتا ہے۔ مگر میرے میاں نے آج تک میرے حسن کی تعریف نہیں کی"۔ ایک صاحبہ جو علیگڑھ کے معزز خاندان کی فرد تھیں اب پاکستان میں ہیں اور ایک انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی تھیں اور جو ہندوستان میں ایک زمانہ میں فلموں میں کام کرتی تھیں اور رینو کا دیوی کے نام سے مشہور ہوئیں تاج اکبر میں اختر آپا، جمیلہ آپا اور ان کی والدہ اور بہن سے ملاقات کرنے آئیں۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جب جمیلہ آپا نے ان سے میرا تعارف کرایا تو موصوفہ نے بڑی حقارت سے کہا I know these poets very well (میں ان شاعروں کو خوب جانتی ہوں)۔ میں صنف نازک کا بیحد احترام کرتا ہوں مگر ان کے اس بازاری انداز گفتگو اور بدتمیزی کو برداشت نہ کرسکا اور ان کے منھ پر کہا کہ And I much more know those film actresses (اور میں ان فلمی اداکاراؤں کو اس سے زیادہ جانتا ہوں) اس جواب کی ان کو توقع نہ تھی اور وہ بیحد لجاجت سے بولیں کہ "آپ مجھ کو جانتے ہیں" میں نے کہا جی ہاں میں نے آپ کی فلم دیکھی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ ممتاز آپا کی چھوٹی بہن اور میری سگی بہن معصومہ عباس "تسنیم" کی بڑی دوست ہیں" اس پر وہ سٹپٹا گئیں اور بہت دیر تک معافی مانگتی رہیں۔ جمیلہ آپا نے لقمہ دیا کہ "تم مجھ سے بھی زیادہ بدتمیز نکلیں"۔ بہرکیف مجھ کو مسرت ہوئی کہ رینو کا دیوی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

جمیلہ آپا اور زہرا حرار سے میری ایسی بے تکلفانہ دوستی تھی جیسی ڈ مردوں میں ہوا کرتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں ہر موضوع پر بالکل کھل کے گفتگو کرتے تھے۔ معلوم نہیں دوسروں کا اس ضمن میں کیا خیال اور تجربہ ہے مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ فہیم عورتوں سے اپنا حال دل اور مسائل بیان کرنے میں جو تسکین مجھ کو ملتی ہے وہ ہم چشم مردوں سے نہیں۔ ان کی ہمدردی کے دو نرم بول جو زخم پر مرہم کا کام کرتے ہیں مردوں کے پاس نہیں۔ جمیلہ آپا کی اصطلاحات بھی خوب ہوتی تھیں۔ جب مجھ پر کیچڑ اچھالے جا رہے تھے اور میں مغموم رہتا تھا تو وہ کہتی تھیں "بھنگیوں کے ٹوکروں سے تو بدبو ہی آئے گی۔ عطر و گلاب ڈھونڈیگا تو کل کے مرتے ہوئے آج ہی مر جائیے گا"۔ ان کا ایک پرلطف واقعہ یاد آیا۔ ایک شام ان کے یہاں گیا تو مجیب صاحب (جمیلہ کے میاں) بہت پریشان نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جمیلہ مجیب نے بغیر کسی سے رائے لیے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ اور آج کے دن اگلے ہفتے ۸ بجے صبح جمیلہ کو تین مورتی پر حاضر ہونا ہے۔ "ارے بھائی یونس رضا، ارے رئیس تم ان کو پنڈت جی سے ملنے کے طور طریقے بتلاؤ۔ اگر انھوں نے ان سے بھی اپنے مخصوص انداز میں باتیں کیں اور باتوں کی رو میں بھول گئیں کہ کس سے باتیں کر رہی ہیں تو میں تو کہیں کا نہ رہوں گا"۔ اور واقعہ یہ تھا کہ وہ خود بھی نروس تھیں اور بار بار کھلی ہوا میں ٹہلنے لگتی تھیں۔ ہم لوگوں نے سنجیدگی سے اس معاملہ کی نزاکت پر غور کیا اور متفقہ فیصلہ یہ لیا گیا کہ ان کو کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں۔ جو پنڈت جی پوچھیں وہ بغیر تکلف جواب دیں۔ یہ چھ دن چٹکی بجاتے گذر گئے۔ واپسی پر جمیلہ آپا نے جو رپورٹنگ کی وہ ذیل میں درج ہے:-

مقام تین مورتی نئی دہلی۔ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی کہ جمیلہ ٹیکسی سے پھاٹک پر اتریں۔ پہرے والے سپاہی کو پاس دکھلایا۔ پھاٹک والے رجسٹر پر دستخط کئے۔ ایک سپاہی ان کو P.A. کے کمرہ میں لے گیا۔ دو منٹ بعد P.A. صاحب ان کو لیکر پنڈت جی کے پاس پہنچ گئے جو باہر لان پر بید کی دو کرسیوں کے قریب ٹہل رہے تھے۔ P.A. نے تعارف کرایا۔ "مسز جمیلہ وائف آف پروفیسر مجیب آف علیگڑھ یونیورسٹی"۔

پنڈت جی: "بیٹھو جمیلہ بیٹھو" اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "کہو کیسے آئیں"۔

جمیلہ: "جی دودھ والی پسنجر سے آئی ہوں"

پنڈت جی: دودھ والی پسنجر سے؟ کیا مطلب"

جمیلہ: "اس ٹرین کا یہی نام ہے۔ علیگڑھ، خورجہ اور ڈنکور والے سیکڑوں گوالے آپ کی بے بولی کرائی ٹرین کے فرسٹ کلاس میں دودھ کے پیپے مسافروں پر رکھ رکھ کر دہلی لاتے ہیں اور دہلی اسٹیشن کے باہر لگے ہوئے بمبوں کا پانی ملا کر چاندنی چوک کی طرف چلے جاتے ہیں"۔

پنڈت جی: "پانی اگر صاف ہو تو دودھ کے فائدہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ کس سواری سے تم آئی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ کس لیے تم مجھ سے ملنے آئی ہو۔ کیا چاہتی ہو؟"

جمیلہ: جی۔ بس آپ سے ملنے آئی ہوں۔ آپ کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی اور دعائیں دینی تھیں کہ آپ کی علیگڑھ یونیورسٹی میں فرقہ داریت بالخصوص مسلمان فرقہ داریت اپنے پورے شباب پر ہے۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ہے"۔

پنڈت جی: یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ اور ہاں مجھ کو خیال آرہا ہے کہ میں نے تم کو میں کہیں دیکھا ہے"

جمیلہ: "جی ہاں۔ آپ نے مجھ کو اپنے دوست خواجہ عبدالمجید کے یہاں دیکھا ہوگا۔ وہ میرے نانا ہیں۔ اور بڑے متعصب مسلمان ہیں۔ اور آپ جب علیگڑھ جاتے ہیں تو آرام کے خیال سے انہی کے یہاں قیام کرتے ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ کی تائید ان کو حاصل ہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں مسلمان فرقہ پرستوں نے مسلمان قوم پرستوں کو بالکل دبا رکھا ہے اور فرقہ پرستی کو ہوا دینے والے خواجہ صاحب ہیں۔ آپ ان کے یہاں کیوں ٹھہرتے ہیں؟"

پنڈت جی: "یہ بات تو تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم ان کے یہاں کیوں جاتی ہو اور میرے وہاں جانے پر اعتراض کرتی ہو۔ جب کہ وہ تمہارے نانا ہیں"

جمیلہ: "جی ہاں میں جاتی ہوں اسی لیے کہ وہ میرے نانا ہیں۔ آپ کے نانا تو نہیں ہیں"۔

پنڈت جی: "جمیلہ تم نے مجھ کو لاجواب کر دیا۔ میں تم سے مل کے بہت خوش ہوا ہوں۔ اگر ملک میں تمہاری جیسی سمجھدار اور طرار سو دو سو عورتیں ہو جائیں تو فرقہ واریت ختم ہو جائے۔ اچھا خدا حافظ۔ مگر مجھ سے برابر ملتی رہا کرو اور وہاں کے حالات سے آگاہ کرتی رہو"۔

انٹرویو ختم۔ ہے کوئی جواب ہماری جمیلہ آپا کا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خدمت میں بھی حاضری دیتا تھا۔ مگر جب ترقی پسند ادیبوں سے ان کا اظہار بیزاری حد سے بڑھ گیا تو میں نے بھی موصوف سے فاصلہ رکھنا مناسب ہی جانا۔

رشید صاحب برائے نام میرے ہم وطنی بھی تھے۔ مجگاؤں اور مڑیاہو قصبہ کے درمیان بس سئی ندی ہے۔ مگر ان کو علیگڑھ سے وہ عشق تھا کہ میری یاد میں انہوں نے اس خاکدان کی طرف کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔

اختر انصاری سے میری اس لیے بہت بنتی اور چھنتی تھی کہ ہم دونوں شعبۂ اردو سے بہت بیزار تھے۔ اس قدر مشترک میں صرف فرق یہ تھا کہ ان کی بیزاری قدیم تھی اور میری جدید۔ علیگڑھ کے ہر استاد اور طالب علم کے لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آگرہ کے اس قدر نزدیک ہونے کی آسانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے تاج محل ضرور دیکھا ہوگا مگر خود اختر انصاری سے سن کر مجھ کو از حد استعجاب ہوا کہ انھوں نے ان دنوں کے عہد وصال تک تاج اس احتیاط کی بنا پر نہیں دیکھا تھا کہ ان کے تاج کا تصور حسن کہیں مجروح نہ ہو جائے۔ معلوم نہیں میرے علیگڑھ چھوڑنے کے بعد ان کا تصور تاج محل مجروح ہوا یا نہیں۔ پہلے ڈاکٹر خورشید الاسلام سے ان کی بڑی دوستی تھی مگر بعد میں وہ ان سے اس لیے خفا ہو گئے کہ بقول ان کے پروفیسر رالف رسل ان کو اپنے ساتھ سودا پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ولایت لے جانے کو آئے تھے مگر خورشید الاسلام نے رسل کو بیچ سے اُچک لیا۔ اگر ان کا یہ الزام درست ہے تو ان کی خفگی حق بجانب ہے اور اگر اختر انصاری کا الزام ان کی Make belief (خوش فہمی) پر مبنی ہے تو ڈاکٹر خورشید الاسلام سے ان کی خفگی بیجا ہے۔

علی گڑھ میں مجھ کو متضاد قسم کی زندگی بسر کرنا پڑی تھی۔ نہایت پر کیف اور بے کیف دونوں۔ بیکیفی کی معراج اس وقت ہو گئی جب ڈاکٹر خورشید الاسلام سے میرے تعلقات سرد پڑ گئے تھے اور کیف و انبساط اپنی معراج پر پہنچ گئے جب میرے محسنِ اوّل (Mentor) ذہنی استاد میرے گرو میرے مرشد پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی علیگڑھ میں اقتصادیات کے سینئر پروفیسر ہو کر آ گئے تھے۔ وہی محبت وہی شفقت اور پہلے سے بھی زیادہ ان کی شخصیت گداختہ ہو کر نکھر آئی تھی۔ آواز میں اور بھی نرمی پیدا ہو گئی تھی مگر افسوس کہ چند ہی ماہ بعد امراض عالم کا شہنشاہ ملک الموت کا سربراہ یعنی گلے کا کینسر ان کو ہو گیا۔ جنیوا گئے۔ آپریشن ہوا مگر وطن واپس آ کر تھوڑی ہی مدت بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ حق مغفرت کرے

عجب آزاد مرد تھا"

کچھ مدت کے لیے ڈاکٹر عابد حسین شعبۂ Humanities کے پروفیسر اور صدر ہو کر آئے تھے۔ اور ان کی بیگم صالحہ بھی آئی تھیں۔ صالحہ بیگم غلام السیدین صاحب کی ہمشیرہ تھیں اور صابرہ زیدی ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، بوٹیا اور شاہدہ پانچوں بہنیں سیدین صاحب کی نواسیاں تھیں۔ اس خاندان میں تمام آفتاب تھا اور ہے۔ جب بہت زیادہ سنجیدہ ادبی مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کا رد آتی تھی تو اسی خانوادہ کے دروں پر دق الباب کرتا تھا۔ جس طرح عابد صاحب ٹھوس قابلیت کے آدمی تھے اسی طرح صالحہ بیگم ٹھوس قسم کی ناول نگار ہیں۔ اور یہ دونوں نابغۂ روزگار شخصیتیں شعر فہمی کی صلاحیت حد کمال تک رکھتی تھیں۔ صابرہ زیدی اور ان کی سب بہنیں عالمی ادب اور جملہ فنون لطیفہ میں بڑا درک رکھتی تھیں۔ نظریات کے معاملے میں سب کے سب کا نہایت نڈر بیباک اور Uncompromising رویہ تھا۔ صابرہ زیدی صحت کی خرابی کی وجہ سے بہت سنجیدہ اور قدرے ملول رہا کرتی تھیں۔ ان سے میں بہت پھونک پھونک کے گفتگو کرتا تھا کہ کہیں "ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔ اور باقی نہایت طرار اور مباحثہ جو تھیں۔ صابرہ کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اپنی محبوب ترین سرزمین میں بخاک رفت اور ساجدہ اور زاہدہ نے اردو شاعری میں بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہ دو بہنیں بڑی تخلیقی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور سیدین صاحب اور خواجہ احمد عباس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ خواجہ احمد عباس ایک کہنہ مشق افسانہ نگار، تاریخ ساز فلم ساز اور بڑے پائے کے صحافی تھے۔ ان کے اوصاف سے کون نہیں واقف اور سیدین صاحب ان سب کے پیر و مرشد تھے۔ ادبیات، اقبالیات، تواریخ، انگریزی ادب اور تعلیمات کے ماہر و عالم تھے۔ جو کام کرتے تھے اس کو کمال کی حد تک پہنچاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ذاکر صاحب کے بنیادی تعلیم پروگرام کی تشکیل میں سیدین صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی بڑی برگزیدہ شخصیت کی مالک تھیں۔ افسوس کہ دونوں قبل از وقت مر گئے۔ پہلے دماغی کینسر میں بیگم اور اس غم نے سیدین کو مار ڈالا۔ ان کے مرنے پر میں نے شعر کہا تھا ؂

قریب تھے تو قیامت کا لطف آتا تھا ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

ان کی تصنیف "آندھی میں چراغ" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے مافی الضمیر کو من و عن کاغذ پر منتقل کر دینا بہت بڑا فن ہے اور اس فن پر سیدین صاحب کو پوری دسترس تھی۔ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی اور

خواجہ غلام السیدین کی اموات اور ایک تیسری اہم موت کو ابھی تک بھلانے میں ناکامیاب رہا ہوں۔ دوسروں کی یادیں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں مگر یہ تینیں یادیں کسی وقت ذہن سے محو نہیں ہوتیں۔

ذاکر صاحب کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ، ضرورت سے زیادہ گفتگو نہ کرنے والے۔ ہر شخص کو ایک نظر سے دیکھنے والے بے فیض اور بالکل خشک مزاج آدمی تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پنج عیب شرعی میں سے کوئی عیب بھی ان میں نہ تھا۔ مغالطہ اس لیے ہوتا تھا کہ وہ ایک نہایت متوازن ذہنیت کے مالک تھے۔ اور بہت سرعت کے ساتھ ان کا ذہن ہر امر کی ماہیت تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لئے انھوں نے علیگڑھ والوں کی تربیت نفسی کے لیے نئی عمارتیں بنوانے سے پہلے باغبانی اور چمن بندی پر زور دیا تھا۔ وہ اہل علیگڑھ کو پہلے رحمدل اور خوش مذاق بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ "بوڑھے اگر اچھی عمارتوں میں بسادیئے جائیں تو وہ ان کو بھی ویرانہ بنادیں گے" - عام طور پر لوگوں نے ان کو پوری طرح پہچانا نہیں وہ اپنے سینے میں ایک ہمدرد دل رکھتے تھے۔ لوگوں سے گفتگو نہ کرتے تھے۔ وہ ہر شخص کی صلاحیت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فیض اسی کو پہنچاتے جس میں وہ جوہر قابل دیکھتے۔ اور بے تکلف اس سے ہوتے تھے جس پر ان کو بھروسہ اور یقین ہوتا تھا کہ ان سے وہ بیجا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ میں اسی لیے ان کی وکالت نہیں کر رہا ہوں کہ وہ میرے محسن تھے۔ ایک زندہ مثال تو میری ہی ہے۔ اگر وہ بے فیض ہوتے تو ان کے کاسٹنگ ووٹ سے مجھ کو نوکری کیسے ملتی۔ اگر وہ بے فیض ہوتے تو میرے لڑکے باقر کو رانچی میں سائیکو تھریپی کی ٹریننگ کیوں دلواتے۔ وہ زاہد خشک بھی نہ تھے۔ وہ بڑے پاک باز حسن پرست تھے اور اپنے خاص حلقہ احباب میں بیٹھ کر غیبت اور اسکینڈلس سے بیحد لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ پیش کرتا ہوں۔ موصوف جب گورنر بہار تھے تو رانچی میں یوم آزادی کے جشن کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی کیا۔ علاوہ رانچی اور بہار کے مقامی شعرا کے انھوں نے باہر سے صرف فراق گورکھپوری اور مجھ کو بلایا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں وہاں پہنچے اور گورنمنٹ ہاؤس کے کمروں میں ہم دونوں کا قیام ہوا۔ ۱۵ اگست کی سہ پہر کو ایٹ ہوم ہوا اور شب میں گورنمنٹ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں مشاعرہ۔ پہلے رانچی کے شعرا نے پڑھا۔ اس کے بعد بہار کے دوسرے مقامات سے آئے ہوئے شعرا نے کلام سنایا۔ اور ہم دو معزز مہمانوں کا سب کے بعد نمبر آیا۔

دوسرے دن جب فراق رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے اور ان کا رزرویشن وغیرہ ہو گیا تو میں نے بھی ان کے A.D.C. سے کہا کہ گورنر صاحب سے میرے لیے بھی اجازت حاصل کر کے علیگڑھ کے لیے رزرویشن کروا دیجئے اور میں اپنے کمرہ میں جا کر سامان پیک کرنے لگا کہ پانچ منٹ میں ذاکر صاحب کا پیغام آیا کہ آج آپ نہیں جا سکتے۔ A.D.C. اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ پیچھے ذاکر صاحب خود بہ نفس نفیس میرے کمرہ پر پہنچ گئے۔ ان کے آنے پر ADC باہر چلا گیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا۔ فراق الہ آباد سے آئے تھے اور واپس جا رہے ہیں اور آپ آ رہے ہیں علیگڑھ سے تو آپ آج ہی کس طرح جا سکتے ہیں۔ شب میں میرے ساتھ آپ کو کھانا کھانا ہے اور کھانے کے بعد آپ سے علیگڑھ کے حالات سنیں گے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ گورنری کو بھول جاؤں اور ایک خالص علیگیرین بن جاؤں۔ اور مجھ کو رک جانا پڑا۔ دن بھر سوتا رہا۔ شام ہوئی باغ میں چہل قدمی کے لیے چلا گیا۔ رات کو ٹھیک نو بجے اردلی آیا کہ گورنر صاحب کھانے پر آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ان کا ایک لمبا زیادہ اور چوڑا کم بیک وقت سونے کا کمرہ تھا لکھنے پڑھنے کا کمرہ تھا اور کھانے کا کمرہ تھا جس میں قدرے تنگی کا احساس ہوتا تھا اور جو گورنر کے بالکل شایان شان نہ تھا۔ کھانے کے بعد میز ہٹ گئی اور اسی کی جگہ پر دو آرام کرسیاں لا کر برابر رکھ دیں ایک پر بیٹھتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا۔ "ہاں تو واثق صاحب آپ تازہ بہ تازہ علی گڑھ سے آ رہے ہیں اس لیے وہاں کے کچھ تازہ واقعات سنائیے"۔ آئے دن تو علیگڑھ میں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان کو کیا سناؤں اور کہاں سے سناؤں۔ ماہر تعلیم ہیں اس لیے تعلیمی واقعات سناؤں۔ "آپ پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی کو تو جانتے ہوں گے۔ لکھنؤ سے ریٹائر ہو کر علیگڑھ میں سینیر پروفیسر اقتصادیات ہو کر آئے ہیں"۔ "ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ زیدی صاحب نے اچھے آدمی کو پکڑا ہے" "آرٹس فیکلٹی بننا شروع ہو گئی ہے مگر مجھ کو اس کا آرکیٹکچر پسند نہیں آیا۔ کینڈی سنٹر کی اسکیم ہے اس کا ماڈل دیکھا تھا وہ کچھ نیا پن لائے گا"۔ "بشیر صاحب لائبریرین امریکہ گئے ہوئے ہیں"۔ "دو ایک نئے ہوسٹل بھی بننے والے ہیں"۔ "واثق صاحب ابتک آپ نے علیگڑھ کی کوئی پر لطف بات نہیں سنائی جسکو سنکر اندازہ ہوتا کہ علیگڑھ ابھی اپنی جگہ زندہ ہے۔ زندہ دلان علیگڑھ کا کوئی واقعہ سنائیے میرا مطلب ہے کوئی اسکینڈل سنائیے۔ یہ کوئی دینیات کا کلاس یا council کی میٹنگ تو نہیں ہے"۔

"میں اور اسکینڈل آپ کو سناؤں" "واہ۔ نجی صحبتوں میں اسکینڈل اور غیبت سن کر صحت بنتی ہے سنائیے اور بے تکلف سنائیے"۔ اسی زمانے کے دو تین اسکینڈل ان کو سنائے جن کو سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے اور میں نے یہ سنایا کہ ٹیچرس ٹریننگ کالج کی فلاں صاحبہ نے ۵۰ برس کی عمر میں پانچویں شادی کی ہے تو انھوں نے زور دار قہقہہ لگایا۔ سوچنے کی بات ہے جس شخص کے چہرہ پر مسکراہٹ مشکل سے آتی ہو وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور یہ کہے کہ "آج میری پیشین گوئی پوری ہو گئی۔ میں نے ان کے متعلق پہلے ہی پیشین گوئی کی تھی کہ "One day she would be beating all previous records and become the most married women of the University" اور خوب ہنسے میں نے دو ایک واقعات اور سنائے جن کو سن کر وہ لطف اٹھاتے رہے۔ اب ہم لوگوں پر نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ میں نے رخصت لی اور دوسرے دن علیگڑھ واپس جانے کی اجازت بھی۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا پرانا دستور رہا ہے کہ جب دوسرے ممالک سے کوئی بڑی شخصیت ہندوستان آتی تو اسی کو یونیورسٹی ضرور دکھلائی جاتی ہے۔ چنانچہ میرے دوران قیام علیگڑھ میں وہاں تین بڑی شخصیتیں آئی تھیں صدر مصر جمال ناصر، شاہ ایران رضا پہلوی، ملکہ ثریا اور شاہ فیصل ابن سعود۔ ان شاہی مہمانوں کی آمد سے ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ یونیورسٹی کی Face lift (رو آرائی اور ستھرائی) ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مصنوعی قسم کی چہل پہل پیدا ہو جاتی تھی۔ دانش گاہ نمائش گاہ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ فطری ثقافتی زندگی کی پٹری سے اتر کر ثقافتی کارخانے بن جاتے تھے۔ اور ان کے رخصت ہو جانے کے کئی دن بعد یونیورسٹی اپنی پرانی رفتار پر چلنے لگتی تھی۔ ابن سعود کے دورۂ علیگڑھ کے زمانہ کے دو واقعات مجھ کو اب تک یاد ہیں۔ ایک یہ کہ علیگڑھ میں سونے کا بھاؤ گر گیا تھا اور دوسرا یہ کہ لکھنؤ سے سنائی آئی تھی کہ مجاز لال باغ کے ایک دو منزلہ عمارت کی کھلی چھت پر مرے ہوئے پائے گئے۔

مجاز کے انتقال کا مجھ کو بیحد صدمہ ہوا تھا۔ ان پر بہتیروں نے اچھی بری نظمیں لکھیں۔ میں نے کوئی نظم تو نہیں لکھی البتہ ایک گھنٹہ کا ریڈیائی بشمول اسٹیج ڈرامہ لکھا تھا جس کو نہ شائع کر سکا اور نہ کسی ریڈیو یا اسٹیج پر پیش کش کے لیے بھیج سکا۔ اگر کوئی ناشر چاہے تو اس کو کتابچہ کی شکل میں شائع کرنے کے لیے مجھ سے لے سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ڈرامہ مجاز کی شخصیت کو تمام تر رومانی، فنی اور ادبی لوازمات کے

تناظر میں پیش کرتا ہے۔

اشتیاق محمد خاں (قائم گنجی)۔ یونیورسٹی فوک سانگز انسمبل کے ڈائرکٹر تھے۔ یہ وہی اشتیاق محمد خاں ہیں جنہوں نے فلم امراؤ جان میں ہیرو کے باپ کا رول ادا کیا ہے۔ وہ موسیقی کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اس زمانہ میں وہ نظموں، غزلوں اور گیتوں کی اچھی اچھی دھنیں بنایا کرتے تھے۔ مجاز کا ترانۂ علیگڑھ "یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں" جو H.M.V. نے ریکارڈ کیا تھا اشتیاق محمد خاں کا ہی ڈائرکٹ کیا ہوا ہے۔ دہلی کے کل ہند یونیورسٹیز ثقافتی میلے میں علیگڑھ عوامی گیتوں کا انسمبل بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس میلے میں مقابلہ کے لیے ایک عوامی گیت کی مجھ سے فرمائش کی اور میں نے ان کو ایک مرزا پوری کجلی جس کا بہت پرانا بول ہے "کیسے کھیلن جیبو ساون ماں کجریا گوریا گھر آئی بدریا" نئے ترقی پسند خیالات کے ساتھ لکھ کر دیدی۔ مسرت ہوئی تھی کہ اس پر Folk song trophy (بہترین عوامی گیت) کا انعام مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو ملا تھا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے کنووکیشن میں مہمان خصوصی انگریزی میں ایڈریس پڑھتا ہے مگر ایک سال دانش گاہ علیگڑھ کے تقسیم اسناد کے موقع پر جب ڈاکٹر صاحب مہمان خصوصی ہو کر آئے تھے تو موصوف نے اردو میں اپنا خطابیہ پیش کیا تھا۔ موضوع تھا "میں اور دانش گاہ علیگڑھ"۔ اسی خطابیہ میں انھوں نے اپنی دلی تمنا کا یہ بھی اظہار کیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی بنائی جائے جس میں صرف تھرڈ کلاس گریجویٹ کا داخلہ ہو اور جب اس میں سے اوّل درجے کی سندیں لیکر اور Ph.D. کر کے عالم بن کر طلبا نکلیں تب وہ سمجھیں گے کہ کاروانِ تعلیم و تدریس و تحقیق صحیح راستہ پر گامزن ہوا ہے۔ زبان و ادب کے اعتبار سے اس خطابیہ کی انشاء آپ اپنی مثال تھی۔ ہلکے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا ایک بحر بے کنار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

۱۹۵۹ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی تیر پر علیگڑھ میں کائی گرد جم چکی تھی اور ملک گیر پیمانہ پر انجمن کا جنازہ نکل چکا تھا۔ جدیدیت جوان ہو رہی تھی۔ انجمن کے کرتا دھرتا اور ان کے چیلے چاپڑے اور دوسرے ایسے ہی موقع پرست اور مفاد جو ادیا تھے جو خطابات، اعزازات اور انعامات کے پیچھے دارالحکومت کے دفتروں کے چکر لگا رہے تھے۔ علیگڑھ میں بھی اسلامی شو و نیزم کی ریشہ دوانیاں اساتذہ اور طلبا میں اپنے اثرات دکھا رہی تھیں نتیجہ میں ڈاکٹر رئیس احمد اور ڈاکٹر شکتی رئیس احمد وغیرہ

اور دوسرے قوم پرست لوگوں کی Exodus / بھگدڑ شروع ہو گئی تھی۔ جو ترقی پسند بچ گئے تھے وہ بھی پر تول رہے تھے اور ۱۹۶۰ء ختم ہونے جا رہا تھا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی) کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا کہ میرپور خاص میں ایک ہند پاک مشاعرہ کا انعقاد ہونے والا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میرپور خاص کی تحریک پر آپ کو یہ دعوت نامہ جا رہا ہے۔ آمد و رفت ہوائی سفر کا ٹکٹ منسلک ہے اور آپ سے مشاعرہ میں شرکت کی استدعا ہے۔۔ دوسرے دن حبیب احمد کیپٹن رائڈنگ کلب میرے پاس آئے اور انہوں نے بھی مجھ سے کہا کہ ان کے بہنوئی میرپور خاص کے کلکٹر ہیں اور وہ اس مشاعرہ میں آپکی شرکت کے متمنی ہیں کہیں میں انکار نہ کر دوں اس لئے حبیب کو بھی خط آیا تھا کہ وہ مجھ کو اس سفر کے لیے آمادہ کروائیں۔ بہر حال میں ایک ہفتہ کی رخصت لیکر کراچی گیا اور مشاعرہ میں شرکت کی۔ بہت دنوں کے چھوٹے ہوئے احباب مشاعرہ میں ملے۔ سید محمد جعفری، ماہر القادری، صابر دہلوی، رئیس امروہوی اور پاکستانی جواں سال شاعر حمایت علی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ وہاں میں نے اپنی نظم "فن" سنائی تھی۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں کا زمانہ تھا اور عوام کے حوصلے اس قدر پست ہو چکے تھے کہ سامعین کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے جونپور کے شعیب خاں وزیر مالیات کے چھوٹے بھائی (نام یاد نہیں) سامنے اگلی صف میں صوفے پر بیٹھ کر مشاعرہ کی صدارت کر رہے تھے۔ نظم جس رفتار سے اپنے نقطۂ عروج پہ پہنچ رہی تھی ان کا چہرہ کبھی خوف سے زرد ہو جاتا تھا اور کبھی غصہ سے سرخ۔ عجب بوقلمونیت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور تمام پاکستانی ادیب اور سامعین ان کی حرکات و سکنات سے متاثر ہو رہے تھے۔ میرا انتخاب نظم وہاں کے لیے بالکل صحیح تھا۔ نظم کا آغاز طاؤس و رباب سے ہوتا ہے اور نقطۂ عروج پہ پہنچ کر شمشیر و سناں پر اختتام۔ فوجی بوٹوں سے کچلے ہوئے وہاں کے عوام دل میں خوش اور چہروں سے خوف زدہ نہ دکھائی دیتے تو اور کیا کرتے۔ دوسرے دن حبیب کی ہمشیر اور ان کے میاں کے یہاں پرانے علیگڑھ کی مہمان نوازی اور راحت سے لطف اندوز ہوا۔ ان کے یہاں مخصوص احباب کی موجودگی میں شعری نشست بھی ہوئی جس نے چاٹگام میں سید آل رضا کے چھوٹے بھائی مسعود رضا کے گھر پر ایک پر لطف شعری نشست کی یاد تازہ کر دی تھی۔ تیسرے دن صبح ہوتے ہی میں کراچی واپس پہنچ گیا۔ شام کو رائٹرس گلڈ کے عصرانہ میں شرکت کی جس میں قرۃ العین حیدر بھی بحیثیت خصوصی مہمان کے شریک تھیں۔ وہاں بھی کچھ لوگوں نے میری شاعری پر ناک بھوں سکوڑی۔ البتہ عینی اور چند بنگالی ادیبوں نے بہت سراہا اور خوف زدہ ادیبوں سے

ان کی بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ رائٹرز گلڈ کے جس ہال میں یہ جلسہ ہو رہا تھا اس کے باہر ٹہلت اور ہال کے دروازہ سے جھانکتا ہوا ایک چھ فٹ دو انچ کا لمبا تڑنگا آدمی شلوار اور کرتے میں دکھائی دیا۔ جب میری اس کی نظریں چار ہوئیں تو اشتباہ ہوا کہ یہ کوئی شناسا ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں جب باہر نکلا تو دیکھا کہ یہ تو ڈاکٹر چودھری عبدالرحمٰن رانجھا ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں Pila (گھونگھے) پر تحقیق کرکے D.Sc. لی تھی اور ہوسٹل میں ساتھ رہتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ "ارے چودھری صاحب آپ ہیں۔ پچیس (۲۵) سال بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ کی پیشانی پر بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ یا جھک جائیے یا بغلوں میں ہاتھ دیکر اپنے برابر اٹھا لیجئے" ہال میں کافی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ میں ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہال میں آیا اور سب سے ان کو ملایا۔ کافی پلوائی۔ کچھ لوگ ان کو پہچانتے تھے۔ ایک صاحب نے کہا "ارے صاحب ڈاکٹر صاحب کو کون نہیں جانتا۔ یہ تو ہمارے پاکستان کے ڈائرکٹر آف زوجیکل سروے ہیں"۔ تب مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ پی۔ سی۔ جوشی کے بھتیجے آنند جوشی کے ایجبل گارجین اور ڈاکٹر بھال صدر شعبۂ حیوانیات لکھنؤ یونیورسٹی کے شاگرد رشید یہاں حیوانوں کے افسر اعلیٰ ہیں۔

خیر وہ صحبت ختم ہوئی اور عینی کا پتہ نوٹ کرکے چودھری صاحب کے ساتھ وہاں سے نکل کر ان کی کار میں جا بیٹھا انھوں نے کہا کہ یہاں لکھنؤ یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے۔ اور آج آپ سے ملنے کے لیے اس کا خاص جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ آج صبح روزنامہ جنگ میں آپ کے آنے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اخبار میں دیئے ہوئے پتہ پر آپ کے چچازاد بھائی کے یہاں گیا تو معلوم ہوا کہ گلڈ میں ہیں تو میں یہاں آیا۔ چلئے وہاں سب انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑے کمرہ میں سفید فرش پر بیس پچیس پرانے دوست احباب گھیرا بنائے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے اور شور مچا کے مجھ سے لپٹ گئے۔ "آ گیا سالا مجتبیٰ لوفر۔ بڑا شاعر بنا گھومتا ہے۔ کیوں بے تو نے یہ سب کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ تمام مزے اڑاتا پھرتا ہے اور ہم پرانے عاشقوں کے آگے گھاس نہیں ڈالتا۔" دیکھا تو سید حسن کمبو میرٹھی ایم۔ کام (ملک) ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان۔ حبیب الرحمٰن P.A.S. محمود، مولانا گوالیاری اور اب یاد نہیں کون کیا کیا تھا۔ اور سب بچوں کی طرح ہلڑ مچا رہے تھے۔ کوئی منھ چوم رہا تھا۔ کوئی چٹکیاں لے رہا تھا۔ کوئی کپڑے نوچ رہا تھا۔ سب پاگل جیسے لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ غل ختم ہوا تو سب مجھ کو گھیر کر فرش پر بیٹھ گئے اور سنجیدگی سے باتیں ہونے لگیں۔ "ہاں تو حضرت واثق جونپوری یہ فرمائیے کہ آپ کا قیام یہاں

کب تک ہے۔" "میں تین دن اور یہاں ہوں۔ چوتھے دن مجھ کو علیگڑھ میں موجود ہونا ہے" "ہم لوگ ایک پاک ہند مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں"۔ "یار مشاعرہ ضرور کرو مگر ابھی نہیں۔ اس میں وقت لگے گا۔ اس وقت مجھ کو جانے دو۔ پھر جب بلاؤ گے آجاؤں گا۔" "تو پھر یہ پروگرام رہا کہ اس وقت سے دس بجے شب تک تم جتنا سنا سکو سناؤ۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم لوگوں کو تم پر کتنا فخر ہے اور ہم اپنے درمیان تم کو پا کر کس قدر خوش ہیں۔ اور تمہارے اشعار سننے کے کتنے مشتاق ہیں"۔ یہ سب باتیں سب کی جانب سے سید حسن کر رہے تھے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جتنا چاہو آج سن لو" اور "یہاں شعر و شاعری کے بعد کھانا بھی یہیں کھانا ہے"۔ میں نے کہا "منظور مگر محمد ارتضیٰ کو فون کر دو کہ میں تم لوگوں میں گھرا ہوا ہوں اور دیر میں گھر پہنچوں گا۔"

اس کے بعد سب صفیں بنا کر بیٹھ گئے اور میرے لیے ایک کرسی ڈال دی گئی۔ میں تقریباً ڈھائی گھنٹے تک اپنے نزدیک اپنا بہترین کلام ان کو سناتا رہا۔ دو چار غزلیں اور چند نظمیں سننے کے بعد ایک دوست بولا کہ "بھئی اپن کے پلے تو بہت کم پڑا ہم جو سائنس کے آدمی ٹھہرے مگر ایک بات بات ضرور سمجھ میں آئی ہے کہ چھوکرا بڑا قابل نکلا ہے۔ ابے تو نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔ میری یاد میں تو کبھی پڑھتا وڑھتا نہیں تھا۔ اور کوئی امتحان دو حملوں سے کم میں پاس نہیں کیا"۔ میں نے کہا "یار! شعر سنو! اگر کورس کی کتابیں پڑھنے سے لوگ شاعر ہو جایا کرتے تو آج ہر اوّل درجہ کا طالب علم شاعر ہوتا۔ مگر "شاعری جزو لیست از پیغمبری"۔ البتہ بڑی شاعری کرنے کے لیے بہت پڑھنا پڑتا ہے اور میں نے بہت پڑھا ہے انگریزی اور اردو ادب دونوں" —— وہاں احباب میں اس بحث کو آگے بڑھانے کی ضرورت نہ تھی البتہ بہت پڑھنے کے مسئلہ پر اس وقت مزید روشنی ڈالنا چاہوں گا۔

بہت پڑھنا ایک صورت ہے اور دوسری بہت پڑھا لکھا معلوم ہونا۔ بہت پڑھنے کا مطلب ہے کہ ادب عالیہ کے ساتھ رطب و یابس بھی پڑھا جائے۔ ڈکنز۔ مکالے۔ شکسپیر اور ٹالسٹائے کے ساتھ ہیڈلے چیز اور ویسٹرنز بھی پڑھا جائے۔ حالی۔ آزاد۔ شبلی اور اقبال کے ساتھ ابن صفی بھی پڑھا جائے۔ بالخصوص انگریزی میں جو ملے وہ پڑھا جائے۔ بہت پڑھا ہوا ظاہر کرنے کے لیے کچھ لوگ محض مشاہیر کی تخلیقات اور حوالہ دینے کے لیے (High lighted) غیر معمولی طور پر نمایاں ادب کے اقتباسات رٹ لیتے ہیں اور موقع موقع سے ان کو استعمال کرتے ہیں مگر یہ بہت پڑھنا نہیں ہوا۔ مجھ کو معلوم ہے

کہ زیادہ تر لوگ محض دیباچے پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بغیر مطبوعہ یا لبس پڑھے ہوئے زبان و بیان اور عوامی نفسیات پر دسترس ممکن نہیں۔ ModernClassices (جدید میکانیکی کلیسکل ادب) کا بھی جس پر ادب کے اجارہ داروں نے Taboo (امتناع) لگا رکھا ہے پڑھنا ضروری ہے۔ اس طرح اچھے اور برے ادب کا فرق بھی ذہن پر واضح ہوتا ہے۔

ہاں تو میں بیان کر رہا تھا کراچی میں اپنے دیرینہ احباب سے ملاقات کا حال۔ اشعار سناتے سناتے جب میں تھک گیا تو کھانا آیا اور ہم سب نے ایک خاندان کی طرح اس سے انصاف کیا۔ کھانے کے بعد ایک ایک سے گلے مل کر رخصت ہوا اور چودھری عبدالرحمٰن رانجھا نے اپنی گاڑی سے مجھ کو المرتضیٰ پہنچا دیا۔

دوسرے دن عینی کی قیامگاہ پر گیا۔ دیکھا کہ وہ اپنے مکان کے سامنے چمن میں پندرہ بیس نئی نئی کتابوں کو سامنے رکھ کر کوئی نوٹ تیار کر رہی ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کا معرکتہ الآرا ناول "آگ کا دریا" برصغیر میں اردو ناولوں کی سست رفتار دنیا کا ایک سنگ میل بن کر سامنے آیا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بتلایا کہ "تاکہ آگ کا دریا پر آدم جی ایوارڈ کے لیے میں بھی بار ہو جاؤں اس لیے مجھ کو ایوارڈ کی جیوری کا ممبر بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ سب دوسروں کے ناول ہیں۔ خیر مجھ کو رائے دینا ہے کہ ان میں کون سی تخلیق اس اعزاز کی مستحق ہے۔ میں نے یہ سب ناول پڑھ ڈالے ہیں اور یہ سب دوسرے اور تیسرے درجے کے ناول ہیں۔ تاہم کسی ایک کو تو بہر حال آدم جی ایوارڈ ملے گا"۔ بقول کیفی اعظمی کے ادب میں بھی سیاست کی گرم ہوا کا "طوفان وہاں بھی ہے یہاں بھی"۔ عینی کے یہاں چائے پی کر ہم دونوں ٹیکسی کر کے صہبا لکھنوی سے ملاقات کرنے ماہنامہ افکار کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ صہبا اور افکار اپنے ترقی پسند نظریات کی پاداش میں حکومت کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ عالم یہ تھا کہ کھلے عام صہبا سے ملنا اور بات چیت کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب ٹیکسی افکار کے دفتر کے سامنے رکی تو عینی اپنی نشست سے پیچھے کی طرف اور سرک گئیں۔ میں ٹیکسی سے اتر کر صہبا سے ملنے ان کے دفتر میں چلا گیا۔ ہم لوگ گلے ملے اور باہر نکل کر ٹیکسی سے مل کر کھڑے ہو گئے۔ خیریت و عافیت کے دو چار جملوں کے بعد صہبا نے کہا کہ "اب آپ لوگ جائیے۔ باقی سب ٹھیک ہے۔ ان شاء اللہ پھر کبھی ملیں گے۔ ہوا ابھی بہت گرم ہے"۔

زہاں سے واپس ہوتے ہوئے علینی نے بتلایا کہ وہ جلد ہی ہجرت کر کے ہندوستان آنے والی ہیں"۔ ان کو ان کے گھر چھوڑ کر میں جوش صاحب کی طرف روانہ ہوگیا۔

جوش صاحب پاکستان حکومت کی منصوباتی اردو لغت کی تالیف پر متعین تھے۔ ان کا دفتر اور گھر ایک ہی عمارت میں تھا۔ حسن اتفاق سے جوش صاحب سامنے ہی دفتر کے ایک بڑے سے کمرے میں ایک بڑی سی میز سے ملی ہوئی ایک گردشی کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھے ملے۔ مجھ کو دیکھ کر ان کا چہرہ گلاب ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان کے رخساروں کی زردی دور نہ ہو سکی البتہ مسرت کے عالم میں ان کے کھلے ہوئے خوبصورت دانتوں کو ان سے کوئی نہ چھین سکا تھا۔ "آؤ میری جان میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ مردے سے کون محبت کرتا ہے"۔ اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کیا یہ ہندوستان کا وہی شاعر انقلاب ہے۔ کیا یہ وہی باغ و بہار شخص ہے جس کے ٹھٹھے مار کر ہنسنے کی آواز ایک فرلانگ تک سنی جا سکتی تھی۔ کیا یہ وہی بہادر انسان ہے جس نے پنڈت جی کے منھ پر سردار ولبھ بھائی پٹیل سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور کانگریسی حکومت کا مذاق اڑایا تھا اور جو اب ایک زندہ لاش معلوم ہو رہا ہے۔ صاحب سلامت اور معانقہ کے بعد میں نے خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ "آپ اب کیا کر رہے ہیں" جواب ملا "جھک مار رہا ہوں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ جان من یہ بتلاؤ کہ چار بجیں گے یا رئیس امروہوی کے یہاں لیٹ لیٹ کے فرش پر پی جائے۔ ارے کوئی ہے۔ ڈرائیور سے کہو کار نکالے"۔ "چلو میں چل کے دل ہلکا کریں گے"۔ ڈرائیور گراج سے کار نکال کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ "ارے جوش صاحب کیا یہ وہی دہلی والی گاڑی ہے۔ صرف قد و قامت سے پہچانی جا سکتی ہے ورنہ پہلے والے اس کے رنگ روپ کے تو کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ ہیڈ سے ٹیل تک بدنما دھبے ہی دھبے ہیں"۔ "ہاں بیا لیے اگلے وقتوں کے معشوقوں میں اب یہی تھوڑا بہت ساتھ دے رہی ہے"۔

وہاں سے روانہ ہو کر ہم لوگ رئیس کی طرف چلے۔ راستہ میں جوش صاحب ایک ایک کی خیریت پوچھتے رہے۔ فراق کیسے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کیسے ہیں سردار کیسے ہیں ساغر کیسے ہیں۔ ہائے مجاز۔ میں کہتا تھا بیٹے شراب شام کو فضیلت کے وقت پینا شروع کرو۔ صرف دو تین پگ پیو اور آہستہ آہستہ پیو مگر وہ بلانوش کب میری سنتا تھا۔ آخر کار رائس ڈائن کے قدموں

پر اپنی جان عزیز نذر کردی ۔ افسوس" ۔ ان کی سب یادوں کے تذکرے میں وہ طویل راستہ چشم زدن میں کٹ گیا اور کار کراچی کی سب سے بڑی شاہراہ کی ایک گندی گلی کے ایک سہ منزلہ مگر انتہائی فرسودہ مکان کے سامنے رُک گئی ۔ اسی کے سامنے نہایت پتلی دبلی اور عمودی سیڑھی کو ناپ کر ہم لوگ رئیس کے فلیٹ میں پہنچے ۔ واقعی رئیس کی قیام گاہ بڑی فلیٹ تھی اور جو دس فٹ بائی دس فٹ کے دو کمروں پر مشتمل تھی ۔ ایک مردانہ کمرہ تھا اور دوسرا زنانہ ۔ مردانہ کمرہ میں دیوار سے دیوار تک ایک فرش بچھا تھا اور پانچ چھ بستر لپیٹے ہوئے دیوار سے لگے گاؤتکیوں کی کمی کو پورا کر رہے تھے ۔ رئیس اور جون ایلیا لیٹے ہوئے تھے ۔ جون ایلیا تو ہم لوگوں کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے مگر میر پور خاص کے سفر کی تکان سے چور رئیس لیٹے ہی رہے اور ان کو دیکھ کر ہم لوگ بھی لیٹ گئے ۔ اس زمانہ میں جون ایلیا ماہنامہ انشا ادارۂ ذہن جدید سے نکالتے تھے اور رئیس روزنامہ جنگ کیلئے رباعیاں اور قطعات لکھتے تھے جن کو جنگ کے قارئین بہت پسند کرتے تھے ۔ چار، دوپہر کا کھانا، پھر چار ۔ شعر و شاعری اور برصغیر کے جملہ مسائل پر باتیں شام تک ہوتی رہیں ۔ رئیس اخلاق و محبت کا مجسمہ اور جون ایلیا ایک جواں سال ابھرتے ہوئے ادیب، صحافی اور دانشور تھے ۔ جن کا اب پختہ کاروں میں شمار ہوتا ہے ۔ انتہائی ذہین ادیب ۔ مگر یہ مہاجرین اور آسمان ثقافت کے ستارے جس کسمپرسی کی زندگی گذار رہے تھے بیان نہیں کی جا سکتی ۔ یہ لوگ تو اپنی کشتیاں جلا کر وہاں آباد ہوئے تھے ۔ دیکھ کر عبرت ہوتی تھی ۔ (مگر اب خبروں اور خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ بحمدہ یہ سب لوگ مزے سے ہیں ۔ اچھے مکانوں میں رہ رہے ہیں ۔ اقتصادی آسودگی بھی حاصل ہے اور رئیس اکادمی چلا رہے ہیں ۔ ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ رئیس صاحب کی جب کوئی شعری تخلیق شایع ہوتی ہے تو وہ مجھ کو نہیں بھولتے ۔ اب تک چار یا پانچ مجموعے بھیج چکے ہیں ۔ ان سے ملنے کو پھر جی چاہتا ہے)۔

دوسرے دن علیگڑھ کے احباب کیلپ اور خدیجہ کیلپ سے ملنے گیا ۔ بہت اچھا کتائی اور کڑھائی کا اسکول چلا رہی تھیں ۔ رات کا کھانا انھی کے یہاں کھایا ۔ کھانے پر علیگڑھ کے اور دوسرے احباب سے ملاقات رہی ۔ دن میں ممتاز حسین سے ملنے گیا تھا ۔ اور خدیجہ کے یہاں کھانے پر ان کو بھی لایا تھا ۔ یہ سب کافی پر لطف اور غنیمت صحبتیں تھیں ۔ اب میرے اور علیگڑھ کے درمیان دو راتیں اور ڈھائی دن باقی رہ گئے تھے ۔ شب میں جب اپنے مستقر پر پہنچا تو چچازاد بھائی اور بہنی اور دوسرے قریبی اعزہ

مولانا اقبال احمد آفتاب احمد خاموش تھے البتہ چچی صاحبہ جن کو ہم چچانی پکارتے ہیں بولیں کہ "بھئی دوست احباب سے ملنے کو جی نہیں روکتی مگر کچھ اپنے خون کی بھی کشش ہوتی ہے۔ تھوڑا سا وقت نکال کر ہم لوگوں کو بھی دیدو"۔ میں نے ان کے سامنے سر جھکا کر کہا کہ "اب سے جو حکم ہو ویسا ہی کروں گا"۔ کلثوم بولیں کل دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں ہے اور ارتضیٰ بولے کل رات کا کھانا ہمارے یہاں ہے ہم نے آپ کے اور اپنے مشترک دوستوں کو دعوت دیدی ہے اور شعر و شاعری بھی ہوگی۔ پرسوں دوپہر کے کھانے پر محمدیہ بی بی اور کرار حیدر نے بلایا ہے" اور میں باقی دوستوں کے لیے روپوش ہوگیا۔ یا یوں کہئے کہ نظر بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن صبح خدیجہ اور کلیپ ملنے آئے باہر سے کہلوا دیا گیا "میں نہیں کہیں گئے ہوئے ہیں"۔ جون ایلیا آئے کہدیا گیا "اپنے دوست رئیس صاحب سے ملنے گئے ہیں"۔ ممتاز حسین آئے بتلا دیا گیا "علیگڑھ کی خدیجہ کے یہاں گئے ہیں"۔ ڈاکٹر راجھا آئے ان کو کسی لکھنؤ کے پرانے ہم جماعت کا راستہ بتلا دیا گیا۔ غرض کہ تقریباً ہر ایک ملنے والے کو میری تلاش میں اس کے گھر واپس جانے کی سہولت بہم پہنچا دی گئی۔ چچانی نے کہا "ٹھیک ہی تو ہے۔ اب یہی لوگ ہمارے ہم وطن ہیں ان کو اِدھر اُدھر دوڑانے سے کیا فائدہ۔ سب کو بعنوان شائستہ اپنے اپنے گھر واپس کر دیا گیا"۔ چچی سے میں نے فرمائش کی کہ ان تینوں کھانوں پر کوئٹہ کے کبر بائی اور عنابی بڑے انگور ضرور رہیں۔ کرار حیدر کو بھی میری فرمائش کی اطلاع دیدی گئی۔ میں علیگڑھ سے چچی کے لیے کوئی تحفہ نہیں لے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ اس زمانہ میں وہاں سوتی کپڑوں کا قحط ہے چنانچہ میں نے انتہائی معذرت اور خوش آمد کے ساتھ اپنے بستر کی نئی چادر اور تکیوں کے غلاف جن کے کنارے کڑھے ہوئے تھے موصوفہ کی خدمت میں پیش کر دیئے جسے انھوں نے بڑے اصرار کے بعد قبول فرمایا اور دعائیں دیں۔

کراچی قیام کے باقی دو دن بڑے گھریلو ماحول، جگھٹوں، ہنسی مذاق اور طعنوں تشنوں میں گذرے آخری دن شام کی فلائٹ سے مجھ کو علیگڑھ واپس جانا تھا۔ رخصت ہونے کے وقت چچانی آبدیدہ ہو کر بولیں "خدا حافظ۔ دیکھو اب تم سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ اور اللہ جانے کبھی ہوگی بھی کہ نہیں"۔ جب کراچی کے ایرپورٹ پر پہنچا تو خدیجہ اور کیلپ وداعیہ "کہنے آئے تھے۔ جمیلہ آپا علیگڑھ میں کیلپ کے سامنے اکثر کہا کرتی تھیں کہ "یہ عورت تو ذاتی پر پھیرا ئی پڑتا ہے"۔ مگر میری طرف سے خدیجہ کے موجودہ Attitude! اور رویئے کے اسباب کا ان دونوں کو کوئی علم نہ تھا ورنہ وہ ایسا نہ کہتیں۔ واقعہ یوں ہے کہ دہلی میں ہند پاک مشاعرہ کے دوسرے دن ہالی اور شیلا ہالی نے پاکستانی شاعرہ زہرہ نگاہ، محمد جعفری، علی سردار جعفری۔ مجروح

سلطانپوری اور مجھ کو اپنے کناٹ سرکس کے فلیٹ میں کھانے کی دعوت دی تھی۔ بے تکلفی تو تھی ہی میں نے باتیں کرتے کرتے خدیجہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا جس کو انھوں نے جھٹک کے ہٹا دیا تھا اور بعد میں مجھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس سے زیادہ خدیجہ کو اپنی غلطی کا۔ اس کے نتیجہ میں ان کی طرف سے کس قدرے Reserve، (کم آمیز) ہو گیا اور اپنی غلطی کے ازالہ میں وہ مجھ سے جذباتی طور پر قریب آتی گئیں کہ میں اس واقعہ کو بھول جاؤں۔ میں کسی خاتون کو شرمسار نہیں دیکھ سکتا اس لیے میں نے اس واقعہ کے اثر کو زائل کرنے کی عملی کوشش کی اور اس کوشش میں خدیجہ سے اور زیادہ بے تکلف ہو کر ملنے لگا مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ کے ملنے کی سطح سے اونچی نہ ہو سکیں اور جمیلہ کو جلنے کا موقع ملتا رہتا تھا جبکہ خدیجہ اور کیلیب دونوں سے میرے انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے۔ کیلیب میرے جگری دوست اور خدیجہ ان کی چہیتی بیوی۔ یہ رشتہ سماج کے لیے ایک امانت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی دوست کی بیوی پر عاشق ہو گئے طلاق دلوائی اور شادی کر لی، اس سے زیادہ گھٹیا کوئی حرکت نہیں ہو سکتی۔ میاں بیوی کے تعلقات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں کسی کو ڈاکہ ڈالنے کا حق نہیں۔ شراب پینا اور اس کے نشہ میں طوائف کے کوٹھے پر جانا اتنا Immoral (غیر اخلاقی) نہیں ہے، جتنا کسی دوست کی گھریلو زندگی پر چھاپا مارنا۔

علی گڑھ واپس پہنچ کر دفتر گیا تو ڈاکٹر رئیس احمد کا ایک رجسٹرڈ خط ریجنل انجینئرنگ کالج سری نگر (کشمیر) سے آیا ہوا ملا کہ ہمارے کالج میں ایک اسسٹنٹ رجسٹرار کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ذکی الدین کالج کے پرنسپل ہیں۔ خالی جگہ کا اشتہار ہو چکا ہے درخواست کا فارم منسلک ہے اس کی خانہ پوری کر کے واپس کر دیجیے۔ "کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں" جن میں میں بھی شامل تھا اور درخواست کو میں نے پروفیسر ضیاء الدین انصاری پرنسپل انجینئرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے فارورڈنگ نوٹ کے ساتھ کشمیر بھیج دیا اور اپنے کاموں میں لگ گیا۔

میرے قریب ترین ہمسایہ بھائی احمد عباس کی تحریک پر بھائی نواب محمد عباس صاحب طالب صفوی شاعر ادیب اور عالم قصبہ شمس آباد ضلع فرخ آباد کا ایک خط ملا کہ اگر نظم مسلم ہندی کا یہ شعر ع

یوں ڈرتے ڈرتے اٹھتی ہیں نظریں   دست طلب جیسے مفلس بڑھائے

آپ کا ہی ہے تو میں آپ کے بڑے فرزند حشمت مجتبیٰ زیدی سلمہ انجنیر لودنا کولیری دھنباد (بہار) کو اپنی فرزندی میں لینے کی درخواست کرتا ہوں - اور چاہتا ہوں کہ اپنی منجھلی لڑکی زہرا صنیار سلمہا کو آپ کی دختری میں دیدوں - سبھوں کی رضامندی حاصل کرکے میں نے یہ رشتہ منظور کرلیا - اور کشمیر جانے کے چند ہی مہینہ بعد رخصت لیکر یہ شادی علیگڑھ سے کردی - نواب پھتاری خواجہ عبدالمجید اور کرنل بشیر حسین زیدی جمیلہ آپا اور زہرہ جرار نے بہو کو بہت پسند کیا اور شادی کے بعد میں نے ان دونوں کو سید صاحب دھنباد بیک کردیا - شادی کے بعد بہو سے گھریلو خدمت لینے کا میں قائل نہیں -

شیریں انٹر فائنل میں تھی اور باقر M.A. Psychology فائنل میں تھے - یعنی میں بڑی سلامت روی اور نیک نامی کے ساتھ اپنے سماجی فرائض سے سبکدوش ہونا شروع ہو گیا تھا - مسز حنیب الرحمٰن سوئس خاتون تھیں اور شیریں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتی تھیں کہ :

You will not have to brother about the marriage of your daughter Sheerin and neither Baqar being a handsome youth will face any difficulty in choosing a beautiful wife for himself.

۱۹۶۰ء گذر جانے کے فوراً بعد سری نگر سے ڈاکٹر ذکی الدین احمد کا تار ملا کہ :

"Your appointment as Assistant Registrar of this college has been made in absentia by P.S.C. Jammu & Kashmir and approved by the Chairman Board of Govern. of the college pray join as early as possible.

اور میں نے علیگڑھ یونیورسٹی کے قاعدے کے اندر دو سال کی رخصت بلا تنخواہ کی درخواست دیدی اور قاعدہ یہ بھی تھا کہ اس نوعیت کی رخصت اسی کو مل سکتی ہے جس کی درخواست یونیورسٹی کے Proper authority (صاحب مجاز عہدہ دار) کی معرفت باہر بھیجی گئی ہو - عام طور پر ایسی درخواستیں رجسٹرار یونیورسٹی کی معرفت جایا کرتی تھیں اور کوئی وجہ لگا کر روک بھی دی جاتی تھی - چونکہ مجھ کو پہلے ہی سے شک تھا کہ میری درخواست روک دی جائیگی اس لیے اس کو میں نے اپنے پرنسپل کالج کی معرفت بھیجا تھا - چنانچہ یہی لم لگا کر رخصت کی درخواست یونیورسٹی کی اگزیکیٹو

کاؤنسل میں بھیج دی گئی کہ اس کیس میں بلا تنخواہ رخصت نہ دی جائے۔ پرنسپل ضیاءالدین ایجنڈا دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ کاؤنسل میں بے قاعدگی کا الزام ان پر بھی آئے گا۔ میں نے موصوف کو سمجھایا کہ آپ پر کوئی الزام نہیں آ سکتا اور نہ میری درخواست مسترد ہو سکتی ہے کیونکہ کیلنڈر میں Proper authority کہیں (Definite) واضح نہیں ہے۔ آپ ایک ادارہ کے سب سے بڑے افسر اور authority ہیں اس لیے آپ نوکری کی میری درخواست کو براہ راست کشمیر بھیجنے میں پوری طرح حق بجانب ہیں اگر وہ جگہ اسی یونیورسٹی میں ہوتی تو میری درخواست کو (Forward) آگے بڑھاتا۔

چنانچہ کونسل کو میری رخصت بلا تنخواہ منظور کرنا پڑی اور یونیورسٹی کیلنڈر میں Proper Authority کی تعریف واضح کرنے کا رزولیوشن پاس کیا گیا۔

خود نوشت کے ان چند ابواب سے یہ بات تو واضح ہو چکی ہو گی کہ مجھ کو بیک وقت کئی طرح کے کھانے پسند نہیں ان کی اقسام کم ہوں مگر جو سامنے آئیں وہ خوش ذائقہ ہوں۔ ایک چپاتی، ایک سالن، ایک دال اور تھوڑا سا چاول میرا کھانا ہے۔ البتہ کھانے کے بعد کوئی میٹھی ڈش ضروری ہے۔ اگر کچھ نہیں میسر تو گڑ کی آدھی بھیلی کافی ہے۔ خالی شکر میں نہیں کھا سکتا اور چائے میں بھی شکر بہت کم لیتا ہوں۔ دعوت میں بھی نظریں دوڑا کر کسی ایک چیز کو منتخب کر لیتا ہوں۔ میزبان کا اصرار کہ یہ بھی کھائیے وہ بھی مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔ مٹھاس چونکہ میری بڑی کمزوری ہے اس لیے دوسروں کو پکاتے ہوئے دیکھ کر میں نے بہت سی میٹھی چیزیں پکانا سیکھ لی ہیں۔ مثلاً کھرچن دار چاول کی کھیر۔ شاہی ٹکڑے، انڈے اور سوجی کے حلوے وغیرہ۔ ایک نمکین کھانا بھی غنیمت پکا لیتا ہوں، مٹر پلاؤ ـــــ چنانچہ علیگڑھ ہی کے قیام کا ایک واقعہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ مدتوں سے میری بیگم صاحبہ نے شاہی ٹکڑے نہیں کھلائے تھے۔ اصرار پر بھی ٹال گئیں تو میں نے معظمہ سے کہا کہ آپ کو بڑا ناز ہے کہ آپ بہت اچھے شاہی ٹکڑے پکاتی ہیں تو ہوا کرے۔ میں آج خود پکاؤں گا اور شیریں سے کہا کہ "آؤ بیٹا ہم تم مل کے پوری دو ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے پکائیں گے۔ میں شمشاد مارکٹ سے سب ضروری چیزیں لاتا ہوں اور تم انگیٹھی میں املی کے کوئلے بھر کے لال رکھو"۔ ہماری پیاری بیٹی کوئلوں کو دھونک رہی تھی کہ مارکٹ سے جلد سامان لے آیا۔ پہلے زعفرانی قوام تیار کیا اس کے بعد توسٹوں کو گھی میں فرائنگ پین پر لال فرائی کر کے ایک سینی میں قوام پر رکھتا جاتا تھا۔ جب چوبیس ٹکڑوں نے قوام جذب

کر لیا تو ان پر آدھ سیر دودھ ڈالا اور سینی کو انگیٹھی کی ہلکی آنچ پر رکھ کر ٹکڑوں کو الٹنے پلٹنے لگا اور بیگم کی یہ قطع کہ کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی کبھی دائیں سے گذر جائیں کبھی بائیں سے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ معاملہ بالکل تیار ہونے کے قریب ہے تو یہ کہتی ہوئی گذر گئیں کہ اس پر دو تین چلّو پانی کا چھینٹا دیدیجیے۔ میں نے شیریں سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے تو اس نے کہا اماں کہتی ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ اور میں نے اس پر دو تین چلّو پانی ڈال دیا۔ اب جو اس کے بعد ٹکڑوں کو الٹنا پلٹنا چاہا تو وہ سب سینہ فگار ہو گئے اور بلبلے دینے لگے۔ "بیٹا۔ تمھاری اماں نے تو بڑی چوٹ دے دی۔ پیسے برباد ہونے کا اتنا غم نہیں جتنا شاہی ٹکڑوں کی بربادی کا غم ہے۔ اچھا رکو" یہ کہکر میں سینی انگیٹھی سے نیچے اتار دی۔ اور شیریں سے کہکر پھر سائیکل اٹھائی اور شمشاد مارکیٹ کے لیے روانہ ہو گیا "اس پر پنکھا جھلتی رہو میں ابھی آیا" اور دس منٹ کے اندر اندر آدھ سیر کھویا لایا۔ شیریں سے ایک بڑا بھگونا منگوایا اور اس میں سینی کا سارا ملغوبہ اور کھویا ڈالکر چلایا تو پانی جل گیا اور عرق کیوڑہ کے چھینٹے کے بعد کفگیر کے دو ہاتھ چلائے تو سوندھی خوشبو سے مشام جاں مہک اٹھا اور دل و دماغ نے بیک وقت صدا دی کہ "وہ مارا" انگیٹھی سے اتار کر اس کو ٹھنڈا کیا گیا اور ایک پلیٹ میں دو تین چمچے نکال کر شیریں اور میں نے چکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔

یہ شاہی ٹکڑوں کا حلوہ نہیں بلکہ شاہی ٹکڑوں کا بادشاہ تھا۔ اور اسی وقت اس کو بادشاہی حلوہ کا لقب دیا گیا۔ بیگم نے چکھا تو انھوں نے بھی بہت پسند کیا۔ دوپہر کے کھانے پر باقر بھی موجود تھا۔ اس نے بھی بہت تعریف کی اور اپنی ماں سے کہا "آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا" تو انھوں نے باقر کی تعریف کو قبول کرتے ہوئے کہا "اس کو تمھارے ابا اور شیریں نے پکایا ہے مگر نسخہ ہمارا ہی تھا"۔

ہم لوگ کھانا کھاتے۔ قریب ہی کرنل بشیر زیدی V.C. کی کوٹھی تھی اور ان دنوں ان کی ہمشیر یعنی مشیر کی والدہ قدسیہ آپا کے انتقال کے بعد تنہائی کے خیال سے زیدی صاحب کے یہاں مقیم تھیں۔ ہم نے ایک بڑے تھال میں حلوہ بھر کے باقر کو دیا کہ ان کو لے جاکر اپنے دوست مشیر کی والدہ کو دے آؤ کہ یہ بادشاہی حلوہ ابا نے پکایا ہے"۔ دن گذرا رات گذری۔ دوسرے دن موصوفہ کا خط آیا۔ "واقعی صاحب، ہم نے اور زیدی صاحب نے ایسا حلوہ کبھی نہیں کھایا تھا۔ مہربانی فرماکر اسکا (اجزائے ترکیبی) اور پکانے کا طریقہ لکھ کر بھیج دیجیے"۔ میں نے جواب دیا "اس کا ریسیپی لکھنا مشکل ہے یہ ایک ایجاد بندہ ہے جو کبھی حاضر ہو کر بتلادوں گا"۔

نواں باب

کشمیر

(اکتوبر ۱۹۶۱ء سے اکتوبر ۱۹۶۹ء تک)

ریجنل انجینئرنگ کالج کی داغ بیل پڑے ہوئے ابھی سال ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت اس کا Campus site (مجوزہ احاطہ) حضرت بل درگاہ سے ملحق ڈل کے مغربی کنارہ پر ایک ہزار ایکڑ کا سرسبز میدان تھا جس میں کالج اور جائے اقامت کی تعمیر کا منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ اس لیے شروعات کے طور پر حضرت بل کی دوسری جانب ہزاروں چنار کے درختوں کے سائے نسیم باغ میں خالی فوجی بیرکوں کو کلاس روم، دفاتر اور چند اساتذہ کی قیام گاہوں میں مناسب ردوبدل کے ساتھ استعمال میں لایا گیا تھا۔ دس اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام کو سری نگر پہنچتے ہی میں نسیم باغ جا کر ڈاکٹر رئیس کا مہمان ہوگیا۔ اور دوسرے دن نوکری کا چارج لے لیا۔

یہ کوئی میرا پہلا کشمیر کا سفر نہ تھا۔ اس سے پہلے کئی بار مشاعروں اور سیاحت و تفریح کی غرض سے وہاں جا چکا تھا۔ خود سری نگر کسی خاص تفریح کی جگہ نہیں ہے۔ جب میں پہلی بار سری نگر مجاز کے ساتھ گیا تھا تو لال چوک میں بس سے اترتے ہی مجاز نے کہا "لگتا ہے علیگڑھ سے مارہرہ پہنچ گئے۔ مناظر تو اچھے ہیں مگر درمیان میں پہاڑ حائل ہیں"۔ اور واقعی کشمیر اور اس کا فطری حسن سری نگر سے باہر نکل کر ملتا ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت جگہیں ہیں اور جو کوئی دو ایک سی نہیں۔ بڑی بڑی تفریح گاہیں مثلاً گلمرگ، یوسمرگ، سونامرگ، اور پہلگام سیاحوں کی دلچسپی کے لیے کافی ہیں اور اچھابل وغیرہ ادیبوں اور مفکروں کے لیے مناسب ترین جگہیں ہیں۔ عام طور پر سیاح ان جگہوں پر نہیں جاتے۔ ان سب میں ڈاک بنگلے ہیں، چشمے ہیں، جنگلی جانور دیکھنے میں آتے ہیں۔ کثرت سے خودرو پھول ہیں۔ سکون ہے اور شور مچاتا ہوا سناٹا۔ پڑھو لکھو۔ ٹراؤٹ کا شکار کھیلو۔ پینے کے لیے چائے اور کانی ساتھ لے جاؤ اور کھانے کے لیے انڈا مرغی قریب ہی گوجروں یا کانوں سے خرید لو۔ ویسے الغرض میں وادیِ لولاب کے مرغ کا کوئی جواب نہیں۔ ہم جب ڈکسوم گئے تو جی بھر کے ٹراؤٹ کھائی۔ ٹراؤٹ صرف برفیلے پانی

میں ملتی ہے۔ کشمیری بھیڑ کے گوشت کا جواب بس عراق کے گوشتِ برّہ یعنی دنبہ میں ملتا ہے۔ وادی کشمیر میں بھینس نہیں ہوتی۔ کشتوار کی طرف دو ایک بھینس پالنے کا رواج ہے۔ کشمیری گائے اوّل تو دودھ کم دیتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کسی قیمت پر خالص دودھ نہیں مل سکتا۔ خود اپنی گائے پالنا بھی وہاں آسان کام نہیں۔

زعفران صرف پامپور نامی ایک دیہات میں اُگتی ہے۔ وہاں کی مٹی لاکر گملوں میں دوسری جگہ زعفران اگائی جا سکتی ہے۔ تھوڑی زعفران کشتوار میں بھی ہوتی ہے۔ وہاں کے پھلوں میں سیب کے کے بعد جس پھل کا نمبر آتا ہے وہ ناشپاتی کی ایک قسم "بگوگوشہ" ہے۔ منھ میں رکھتے ہی شربت بن کر کام و ذہن کو سیراب کرتا ہوا حلق کے نیچے اتر جاتا ہے۔ قد میں بڑی ناشپاتی کے برابر نہایت شیریں اور اس قدر نازک پھل ہے کہ علاوہ اُس کولڈ اسٹور یج کے کہیں اور ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

موسم سرما کے بعد پھلدار درختوں میں پیغام بہار لیکر پہلے پھول آتا ہے اور جب پھولوں میں پھل آجاتا ہے اور پنکھڑیاں گر جاتی ہیں تب شاخوں پر پتیاں نمودار ہوتی ہیں۔ سب سے زیادہ دل کش Blossom (زنگ دلی) کا طوفان بادام کے پھولوں کا ہوتا ہے جس کو کشمیر میں شگوفہ کہتے ہیں۔ بادام کے باغوں میں میلے لگتے ہیں۔ گانے ہوتے ہیں۔ سنتور بجتے ہیں۔ ڈھولکیں ٹھنکتی ہیں۔ یہ موسم بہار کا شباب ہوتا ہے اور اس سارے مزے کو کرکرہ کرنے کو ابر بہارا پنے تیور سے ضرور دکھاتا ہے۔ بارش کا وہ ریلا ہوتا ہے کہ پھول کی پنکھڑی شاخ پر نہیں رہ جاتی۔ اور وادی کشمیر میں علاوہ کیچڑ کے پیروں تلے کوئی چیز نہیں ہوتی۔ سب لت پت۔

فصل میں باہر سے آیا ہوا آم وہاں کے کشمیری سیب سے ارزاں ملتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ دوکانداروں سے وجہ دریافت کرنے پر علاوہ خندۂ ناگوار کے کوئی اور جواب نہیں ملتا۔

ابھی یہ بات رہتی ہے کہ وادی کشمیر کا سب سے پہلا پھول عنب شاہی کی شکل و شباہت کا اور مزیدار بید مشک کی لمبی لمبی شاخوں پر نمودار ہو جاتا ہے یعنی یخ کے نقاب کو روئے زیبا سے ہٹا کر جھانکنے لگتا ہے۔ اور جس کی روح پرور خوشبو کی وضاحت کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

کشمیر کا کھلا ہوا قومی مشروب وہاں کی نمکین چائے ہے جس کے بغیر کشمیری زندہ نہیں رہ سکتا۔ چائے کے ساتھ وہ روٹی کی مختلف قسمیں کھاتا ہے اور کھانے پر صرف چاول، ندرو، کرم کا ساگ یا راجماں کی دال۔ ہاں خاص مواقع پر مثلاً شادی یا دعوت وغیرہ میں یا پھر ہوٹلوں یا امیر گھرانوں میں کشمیری بھیڑ کے ہر عضو بدن

کے مختلف اور بہت خوش ذائقہ کھانے پکتے ہیں ۔ رستہ ، طبق ماس ، یخنی ، آب گوشت ، میتھی اور گوشت آبہ اور دوسرے لاتعداد پکوان ۔ میتھی جو سرخ رنگ کی ہوتی ہے اور بھیڑ کی Intestines (چھوٹی آنتوں) سے تیار کی جاتی ہے اور گوشت آبہ کشمیری cusine delicacy (دنیا کے نزاکت مآب) کھانوں میں شمار ہوتے ہیں ۔

جب کشمیر کو فطرت کی طرف سے ہر شے میں حسن ملا ہے تو وہاں کے انسانوں میں بھی اس کا کافی عنصر پایا جاتا ہے ۔ کشمیری پنڈتوں میں کشمیری مسلمانوں سے زیادہ حسن ہے ۔ اور بھیڑ بکریاں چرانے والے گوجروں اور بکروالوں میں پنڈتوں سے بھی زیادہ ۔ ان کی عورتیں بلا مبالغہ آہو چشم ہوتی ہیں ۔

کشمیر میں مغل بادشاہوں نے اپنی بیگمات کے پردے کے لیے فطرت کے حسن کو بھی فصیلوں میں گھیر دیا تھا ۔ جن کی مثالیں شالیمار ، نشاط باغ ، اور چشمہ شاہی وغیرہ میں ملتی ہیں ۔ چشمہ شاہی کا پانی بہت ٹھنڈا ، ہلکا ، شیریں اور ہاضم ہے ۔ میں ہمیشہ سے معدہ کے امراض کا شکار رہا ہوں چشمہ شاہی کا پانی مجھ کو بہت فائدہ کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ پیتے جوش میں آ کر اس کے پانچ چھ گلاس پی لیے اور بجائے افاقہ کے مجھ کو بدہضمی ہو گئی ۔

زمانہ قدیم میں کشمیر کے حکمراں شاہ زین العابدین نے جن کو وہاں بڈ شا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اپنے کشمیری عوام کو دو ایسی چیزیں دیں کہ آج تک کشمیری ان کے بل بوتے پر زندہ ہے ۔ ایک فرن یعنی پیرہن اور دوسری کانگڑی جو ہمیشہ ان کے فرن اور بستر کو گرم رکھتی ہے ۔ آسودہ حال لوگوں کے لیے یخ بستہ کشمیر سب سے خوبصورت اور صحت بخش ہوتا ہے ۔ وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات میرے دوران قیام کے اپنے پردور میں ایک نوع کی عدم آسودگی اور اتھل پتھل کے شکار رہے ہیں ۔ مثلاً ان کی تاریخ کے پس منظر میں ہر غیر کشمیری کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا ، زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی ہمدردی Exploit کرنا ، مسئلہ کشمیر کو ہر حال میں زندہ رکھنا ، اچھے باشعور لوگوں کو چھوڑ کر بھیڑ یا دھسان تو نہ چھوڑ کی زندگی بسر کرنا ۔ اپنی دستکاری اور مصنوعات کی خود قدر نہ کرنا ، اپنی ذہنی صلاحیتوں کو غلط کاموں میں استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ ۔

کشمیر کے میرے مشاہدات اور تجربات کا ذکر یوں تو پوری ایک کتاب کا طالب ہے مگر ان چند صفحات میں میں نے ان ہی باتوں پر سرسری طور سے روشنی ڈالی ہے جنھوں نے میرے ذہن کو متاثر کیا اور

چند باتوں سے over whelmed (جذباتی طور پر اتنا دبا) رہا اور چند سے اتنا بے کیف کہ علاوہ نوکری کے کوئی خاص ادبی کام نہ کر سکا۔

اپنی آمد کے دوسرے دن جب میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ذکی الدین احمد سے ملا تو وہ معقول اور دلچسپ آدمی معلوم ہوئے۔ میرا دفتر ان کے دفتر کے بغل میں لگنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب جرمنی کے برقیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی تھے اور رڑکی یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر یہاں آئے تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ اردو فارسی کا بھی ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ بہت تیز کام کرتے مگر ان کا اصلی اجلاس دفتر کے اوقات ختم ہونے کے بعد لگتا تھا۔ ڈاکٹر رئیس کو بلاؤ، شکتی رئیس احمد کو بلاؤ، فزکس کے ڈاکٹر احمد علی کو بلاؤ، واثق صاحب کو بلاؤ۔ ان کا اردلی کافی مزاج دان تھا۔ جب ہم سب لوگ ان کی بہت بڑی میز کے گرد بیٹھ جاتے تھے تو سب کے سامنے کبھی چائے کبھی کافی کی پیالیاں اور بسکٹ یا کاجو ہوتے تھے۔ ہم سب اس پر متفق تھے کہ ان کی میز پر کافی تو اچھی ملتی ہے مگر چائے بالکل اچھی نہیں ہوتی۔ بہر حال وہ ایک گھونٹ کے بعد وہ غیبتوں کا دفتر کھولتے تھے۔ ان کو ہزارہا واقعات اور لطیفے یاد تھے۔ اور کبھی Prewar Germany (قبل جنگ المانیہ) کے قصے سناتے تھے۔ کالج کے پالیسی معاملات میں رائے بھی لیتے۔ یہاں تک کہ چراغ جل جاتے اور تب وہ ہم لوگوں کی جان چھوڑتے اور ہم لوگ تھک کر اپنے مستقر پر چلے جاتے۔ یہ ایک دن کا نہیں روز کا قصہ تھا۔ سہ پہر اور شام کا وقت سیر سپاٹے یا شاپنگ کا ہوتا ہے، اگر ہم میں کا کوئی فرد کبھی سری نگر چلا جاتا تو وہ جملہ کستے تھے کہ "ان کو روز سری نگر جانے کا عجیب مرض ہے۔" وہ قصے اور لطیفے سنا کر بھول بھی جاتے تھے اور چھٹے چھ ماہے اس کو پھر دہرا دیتے تھے۔ غرض کہ بجمیع الوجوہ بہت نیک نفس پر لطف اور شریف آدمی تھے۔

عیال کو میں علیگڑھ ہی میں چھوڑ آیا تھا کہ ابھی یہاں کوئی مکان ملا نہیں تھا اس لیے نسیم باغ میں انھوں نے اٹیچڈ باتھ روم کے ساتھ ڈاکٹر رئیس کے مکان سے ملا ہوا ایک کمرہ مجھ کو الاٹ کر دیا تھا۔

اس زمانہ میں شیخ عبداللہ قید میں تھے اور بخشی غلام محمد کی حکومت کے ڈنکے بج رہے تھے وہ ہمارے کالج کے بورڈ آف گورنرز کے (بحیثیت وزیر اعظم کشمیر) صدر بھی تھے۔ گزیٹیڈ پوسٹ پر تقرری بغیر ان کی توثیق کے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مجھ کو بحیثیت شاعر کے پہلے سے جانتے تھے۔ P.S.C. Kashmir نے اسسٹنٹ رجسٹراری کے لیے میرا اور Humanities (ہیومینیٹز) کے سینیر پروفیسری جگہ کے لیے مرتضیٰ رضا کا انتخاب ایک ساتھ کیا تھا۔ میری تقرری کی تو بخشی صاحب نے

فوراً توثیق کردی اور دہلی کی C.I.D. کی میرے خلاف رپورٹ کا جواب ان الفاظ میں بھیج دیا تھا کہ "میں وامق کو جانتا ہوں کہ وہ کشمیر کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہ کریں گے"۔ اور مولوی رضا کی فائل کو الٹ کے رکھ دیا۔ میں نے سرکاری مکان کے لیے درخواست دیدی تھی مگر جب محکمہ تواضع کشمیر نے کئی ہفتہ تک اس پر کوئی فیصلہ نہیں لیا اور علیگڑھ یونیورسٹی کے مرکزی دفتر سے خطوط آنا شروع ہو گئے کہ یا تو آپ جلد از جلد ۶ نذیر احمد روڈ خالی کر دیجئے یا کشمیر سے واپس آکر یہاں کا کام سنبھال لیجئے تو میں نے طے کیا کہ بغیر بخشی صاحب سے ملے ہوئے مکان ملنے والا نہیں۔ چنانچہ میں نے ایک دن استعفے کی درخواست لکھ کر اپنے جیب میں رکھی اور بخشی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ بخشی صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر روز دس بجے دن کے وقت اپنے یہاں کے افسران اور عمائدین کو بنگلہ کے لاؤنج میں مغل اعظم کی طرح Andience (درشن) دیتے تھے۔ میں دس بجنے سے دس منٹ قبل جب لاؤنج میں داخل ہوا تو دیکھا کہ تقریباً بیس تیس وردی پوش افسران فوج و شہر بانی سامنے در کے پردہ پر نظر جمائے ہوئے دو رویہ کھڑے ہیں۔ میں بھی انھی میں لگ کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا کہ تھوڑی دیر میں پردہ اٹھا اور پشمینہ کی شیروانی قراقلی اور سفید پائجامہ میں بخشی صاحب دائیں بائیں دیکھتے ہوئے برآمد ہوئے۔ دو ہی چار سے ہاتھ ملا چکے تھے کہ ان کی نظر مجھ پر پڑی اور دور ہی سے بولے "کہئے وامق صاحب نسیم باغ سے اتنے سویرے کیسے نکل پڑے" میں نے آگے بڑھتے ہوئے جیب سے ایک سفید کاغذ نکال کر ان کو دیا۔ "یہ کیا ہے" میں نے کہا "میرا استعفے" "کیوں خیریت تو ہے" "جی خیریت ہوتی تو آپ کو تکلیف دینے کیوں آتا۔ ادھر علیگڑھ والے میرے عیال کو ستا رہے ہیں کہ مکان خالی کرو اور ادھر ایک مہینہ ہو گیا، کوئی مکان الاٹ نہیں ہوا ہے"۔ بخشی صاحب نے پکارنا شروع کیا "دار کو، دار کو" یہ دار کو ڈائرکٹر تواضع تھے۔ فوراً بغل کے ایک کمرہ سے نکلے "جی جناب" "وامق صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار کو آپ نے ابھی تک کوئی مکان کیوں الاٹ نہیں کیا" "جی جناب وہ ایسا ہوا۔ وہ ویسا ہوا" "ایسا ویسا کچھ نہیں۔ آج کے تیسرے دن ان کو مکان مل جانا چاہئے"۔ "بہت بہتر جناب"۔ بخشی صاحب نے میری درخواست پھاڑ کے وہیں پھینک دی۔ اور دار کو صاحب میرا ہاتھ پکڑے ہوئے بغل کے کمرہ میں لے گئے۔ "آپ بخشی صاحب کے پاس کیوں چلے گئے میرے پاس آئے ہوتے تو آپ کو فوراً مکان مل جاتا۔ دو مکان ہیں۔ جواہر نگر میں ایک بنگلہ ہے اور ریزیڈنسی روڈ پر چار کمروں کا ایک فلیٹ خالی ہے۔ آپ پسند کر کے بتا دیجئے"۔ "میں ابھی آپ کو الاٹ کر دوں" "میں جانتا ہوں وہ بنگلہ جہلم پار

ہے۔ آپ مجھ کو یہ فلیٹ دیدیجئے"۔ "کل آپ کو ۲۲ فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر مل جائے گا۔" "تو کیوں نہ میں لال چوک سے ایک تالا خرید کر ابھی فلیٹ میں ڈال دوں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ اجازت ہے؟" "ہاں صاحب آپ ابھی اس میں اپنا تالا ڈال دیجئے"۔ "شکریہ وارکو صاحب۔ کبھی کوئی کام ہو تو بتلائیے گا"۔ اور میں امیرکدل کی جانب روانہ ہوگیا۔

ایک بڑا سا گوڈریج کا تالا خریدا اور ۲۲ ریزیڈنسی روڈ فلیٹ پر ایک چھوٹے سے تالے پر اپنا تالا لگا کر نسیم باغ واپس چلا گیا۔ اور دفتر لبعد جب ڈاکٹر ذکی الدین احمد کا دربار لگا تو میں نے اپنا کارنامہ سنایا۔ سب لوگ متعجب بھی ہوئے اور میری کامیابی پر خوش بھی بالخصوص ڈاکٹر صاحب بہت مسرور ہوئے اور میری اس جرأت کو ذہن میں نوٹ کر لیا۔ خود بھی بخشی صاحب سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ دونوں کے مزاج میں Dictatorial (مطلق العنان) حکومت کا بے پناہ جذبہ قدر مشترک تھا۔ قاعدہ قانون کی Rut (نالی) کے پابند نہ تھے۔ میری بھی ہمیشہ سے یہی کمزوری رہی ہے کہ جس کام کو کرتے میں مجھ کو مسرت ہوتی ہے اس پر عملدرآمد کرنے میں کبھی قاعدے قانون کی پرواہ نہ کی۔ ایک بجے تک میں تمام دفتری کام ختم کر دیتا اور اس کے بعد دوسروں کے دفتر اور مختلف شعبہ ہائے تعلیم میں جا کر گپیں لڑاتا تھا۔ گھر پر کبھی کوئی فائل نہ لاتا تھا جب کہ دوسرے لوگ اپنے اپنے بستوں میں روزانہ بے شمار فائلیں ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ شاید ان سب کو Quick disposal (جلد مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے) کا Knack (ڈھب) نہ آتا تھا۔

نسیم باغ میں قیام کئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ نومبر آتے ہی سخت سردیاں شروع ہو گئیں۔ ڈاکٹر رئیس نے بتلایا کہ یہاں سردیوں میں چربی دار گوشت، گھی، ڈوسٹ مکھن اور انڈے وغیرہ خوب کھانا چاہیئے۔ اور میں اسی دن شام کو سری نگر جا کر درجنوں انڈے، ایک کلو اصلی گھی، کئی ڈبل روٹیاں، پالسن مکھن کا ڈبہ، زعفران، کیوڑے کی ایک چھوٹی بوتل، سوکھے میوے اور کھانے کے بعد کوئی کوئی میٹھی چیز کھانے کے لیے ایک کلو برفی لے آیا اور الماری میں سب چیزیں سجا کر رکھدیں۔ اب میرا کھانا کالج میس سے آنے لگا تھا اور میں نے اپنے کمرہ کو ہیٹر سے خوب گرم بنا رکھا تھا۔ ایک شام کو برفباری شروع ہوگئی۔ جمی ہوئی برف تو بہت دیکھی تھی مگر Snow fall دیکھنے کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ بیان نہیں کر سکتا کہ نظروں کے سامنے کیا منظر تھا۔ آسمان سے گرتے ہوئے بیلے کے پھولوں

کی جھڑی بندھی ہوئی تھی - پوری فضا میں ہلکے کاسنی رنگ کے پھیلے ہونے کا احساس ہو رہا تھا - ایک گھنٹہ میں مکانوں کی ڈھلوان چھتیں، زمین، درختوں کی شاخیں سفید ہو گئی تھیں - دل نہ مانا اور اس روح افزا منظر کو اپنے اندر سمو لینے کے لیے ایک گرم کوٹ پہن کر اور ٹوپی سر پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل آیا - اور تقریباً آدھ گھنٹے تک فطرت کے اس عجیب و غریب حسن کو زمین پر بچھے ہوئے سفید قالین پر ٹہل ٹہل کر نظروں سے پیتا رہا - سردی کا قطعی احساس نہ ہوا (بعد میں معلوم ہوا کہ برف باری کے دوران فضا کا درجۂ حرارت اونچا ہو جاتا ہے) - دوسرے دن صبح ہوئی تو ابر چھٹ گیا تھا اور آفتاب نکل آیا تھا - ہر چہار جانب دودھ کی طرح سفید برف کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا - اسی طرح دسمبر آنے تک کئی بار برف باری ہوئی اور میں ان سے لطف اندوز ہوتا رہا - ایک دن جب الماری کھولی تو ہر چیز اپنی جگہ بدستور تھی - البتہ ایک ڈبل روٹی اور آدھے سے زیادہ جو برفیاں اب تک نہ کھا سکا تھا پھپھوندی سے نیلی ہو رہی تھیں - ڈبل روٹی تو میں نے پھینک دی - اور اس پھپھوندی سے لوث برفی کو پھینکتے ہوئے کسالا لگا اور اس کی بازیافت کی ترکیبیں سوچنے لگا - تو ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ ان پر سے چھری کی مدد سے پھپھوندی جس قدر ممکن ہو اتار دی جائے - اور یہ کام میں نے ایک گھنٹے کی محنت میں کر ڈالا - بارہ انڈے لیے اور ٹفن کیریر کے ایک ڈبہ میں ان کو توڑ کر خوب پھینٹ ڈالا - اس میں گھی، زعفران، کیوڑہ، تھوڑی سی شکر اور وہ سب برفیاں ڈال کر انڈا پھینٹنے کی مشین سے ان کی دوبارہ خوب آمیزش کی - بجلی کے چولھے پر اس کو رکھ کر آہستہ آہستہ اسی مشین سے پھینٹتا رہا - جب اس میں گول گول دانے پڑنے لگے تو اس کو اسٹوو سے اتار کر چلاتا رہا - دوبارہ پھر اس کو ایک دو منٹ تک اسٹوو پر رکھ کر گرمی دی - جب گھی چھوٹنے لگا تو اسٹوو بند کر دیا اور اس حلوہ کو ایک چینی کی قاب میں نکال لیا - زرد، خوش رنگ، پکھراج کے چھوٹے چھوٹے موتیوں سے قاب بھر گئی تھی - نو بجے صبح کا وقت تھا اور دماغ زعفران اور کیوڑے کی مہک سے بس گیا تھا - ٹھنڈا ہونے پر میں نے ایک چائے کا چمچ بھر نکال کر اس کو جب چکھا تو آنکھیں کھل گئیں - نہ اس میں پھپھوندی کی کوئی جھلک تھی نہ سیلن کا اثر - عام انڈے کے حلووں سے کہیں زیادہ لذیذ و لطیف تھا -

میں نے کمرہ میں تالا لگایا اور داہنے بائیں سے ڈاکٹر رئیس، شکتی رئیسی اور ڈاکٹر سید علی اور ان کی بیگم کو اپنے کمرہ پر یہ کہہ کر بلایا کہ ایک پریشانی سے مجھ کو جلد چھٹکارا دلوائیے - ان لوگوں کے یہاں کئی بار کھانا اور ناشتہ کر چکا تھا - سب نے پوچھا - آخر کیا بات ہے کچھ بتائیے تو - میں نے کہا میرے کمرہ پر چلیے تو آپ لوگوں پر سب معاملہ کھل جائے گا - میں نے اپنے کمرہ کا تالا کھولا اور سب کو ساتھ اندر لے گیا -

چار کی میز پر قاب ایک سرپوش سے ڈھکی ہوئی تھی ۔ میں نے سب سے پوچھا اس کے اندر کیا ہو سکتا ہے ۔ کسی نے کہا خوشبو سے تو بریانی معلوم ہوتی ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ تو شکتی محلہ کی سب سے بڑی باورچن بولیں کہ شاہی ٹکڑا ہے ۔ میں نے کہا اس کے لگ بھگ ۔ بیگم علی نے کہا تو پھر یا تو یہ زعفرانی کھیر ہے ۔ میں نے کہا یہ سب کچھ نہیں اور سرپوش اٹھا دیا اور سب کے ہاتھ ایک چمچ ۔ کھائیے اور بتائیے کیا ہے ۔ سب نے ایک ایک چمچ لیکر منہ چلایا تو سب کی آنکھیں نکل پڑیں ۔ سب نے کہا انڈے کا حلوہ ہے مگر بہت خوش ذائقہ ہے ۔ اتنا اچھا انڈے کا حلوہ ہم نے آج تک نہیں کھایا تھا ۔ بتلایئے کس نے بنایا ہے ۔ میں نے کہا میں نے بنایا ہے ۔ بیگم علی بولیں ہائے اللہ بتلایئے اس میں آپ نے کیا کیا ڈالا ہے ۔ "کچھ نہیں سب وہی چیزیں ہیں جو آپ انڈے کے حلوے میں ڈالتی ہوں گی ۔ البتہ ایک چیز اور ہے جو آپ کو بازار میں کہیں نہیں مل سکتی جو اتفاقیہ طور پر اپنی الماری میں ہاتھ آگئی ۔ وہ کیا ہے بتلایئے بتلایئے ۔" وہ ہے پھپھوندی لگی برفی " "چلیئے ہٹیئے مذاق نہ کیجئے" ۔ میں نے کہا "مذاق کرنیوالے پر لعنت بھیجئے ۔ جو کہہ رہا ہوں سچ ہے" ۔ اور تب ان کو ساری داستان سنائی ۔ حلوہ اس قدر Rich تھا کہ آدھے سے زیادہ نہ ختم ہو سکا ۔ اس کو میں نے چار کی تین طشتریوں میں برابر تقسیم کر کے ایک شکتی کو دیا ایک بیگم علی کو اور ایک اپنے لیے رکھ دیا ۔ اور سب بہت خوش خوش رخصت ہوئے ۔

سردیوں کی تعطیل میں بچوں کے پاس علیگڑھ گیا ۔ شمّوں بڑے بیٹے کی شادی کی اور علیگڑھ میں کچھ دن قیام کر کے دوست احباب سے ملاقاتیں کیں ۔ ایک ماہ بعد کشمیر جانے کی تیاری شروع کر دی ۔ ضروری اشیاء کو ساتھ رکھا اور زیادہ سامان ہمسایہ اور اب رشتہ دار سید احمد عباس اور خواجہ مسعود علی ذوقی کی امانت میں دیکر اواخر فروری تک اہلیہ اور شیریں کو ساتھ لیکر سری نگر پہنچ گیا ۔ اور ٹورسٹ سنٹر سے سیدھے اپنے فلیٹ میں جا بسا ۔ شیریں .F.Sc کر چکی تھی ۔ اس کا داخلہ زنانہ ڈگری کالج کے .B.Sc کلاس میں ہو گیا ۔ چونکہ باقر ابھی علیگڑھ سے نفسیات میں .M.A کر رہا تھا اس لیے اس کو وہیں چھوڑ دیا تھا ۔ اور کشمیر میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر ہونے لگی ۔ روزانہ پبلک ٹرانسپورٹ سے دس بجے کالج جاتا اور شام کو ڈاکٹر ذکی الدین احمد کے ساتھ کار میں اپنے فلیٹ واپس آجاتا ۔ معمولی تعطیلوں میں ڈاکٹر رئیس شکتی اور ریاض ڈاکٹر ذکی الدین احمد کی معیّت میں کشمیر کا کونا کونا گھومتے تھے ۔ اس زمانہ میں خواجہ غلام السیدین صاحب کشمیر میں حکومت کے مشیر تعلیمات تھے ۔ ان سے اور ان کی بیگم صاحبہ سے

ملتے ان کے یہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ اس وقت موصوف اپنی کتاب "آندھی میں چراغ" لکھ رہے تھے۔ اور سرکاری کاموں کی طرف سے قطعی کا احساس ہوتا تھا۔ دو ایک مرتبہ رئیس شکتی اور میرے ساتھ مع اپنے چند تکیوں کے مغل باغات کی سیر اور سکون کے لیے بھی کہ گھر پر اہل حاجت ان کو اکثر گھیرے رہتے تھے۔ وہ نشاط باغ کو شالیمار سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ ہم لوگ فواروں کا تماشہ اور چہل قدمی کرتے یا اسٹوو جلا کر کافی تیار کرتے اور موصوف دو تکیے لگائے چت آنکھیں بند کئے کھلی گھاس پر پڑے رہتے۔ غور و فکر کرتے تھے یا نیم خوابی کے سہارے استراحت، اس کا اندازہ نہ ہوسکتا تھا۔ ایسے شریف، خلیق حساس زود فہم اور با وصف اپنے جملہ سوفسٹیکیشن کے بے تکلف انسان ملک نے کم ہی پیدا کئے ہوں گے ان کی زندگی میں ان کی زبان سے میں نے کبھی بیکار بات نہیں سنی۔ وہ مخزن العلوم تھے۔ وہ نشاط باغ کو شالیمار پر اس لیے ترجیح دیتے تھے کہ شالیمار محض خوبصورت ہی خوبصورت تھا اور نشاط بلغ اتنا خوبصورت نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی عظمت، سنجیدہ مزاجی اور نکتہ جو حسن پسندی کی مثال پیش کرتا تھا۔ شالیمار میں تماشائیوں کا کثیر مجمع ہوتا تھا جبکہ نشاط میں وہی لوگ سکون پاتے جو حس لطیف رکھتے تھے۔ موصوف کو چشمہ شاہی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ کشمیر میں کہیں کا پانی اگر فلٹر کرکے پیا جائے تو اس میں چشمہ شاہی کے پانی کے سبب خواص ملیں گے۔

چونکہ کالج سے واپسی کے بعد وقت کٹنا دوبھر ہوجاتا تھا اس لیے کمال صدیقی ریڈیو کشمیر کے پروگرام اگزکیٹو کے فلیٹ ۲۰ میں شب کا پہلا حصہ گذارنا شروع کردیا۔ لکھنؤ کے رہنے والے پڑھے لکھے اچھے شاعر تھے اور میں، شمیم احمد شمیم مدیر ہفت روزہ آئینہ، نعیم الثقلین انصاری I.A.P.C.S. جو اس زمانہ میں وہاں مستعار زرعی چکبندی افسر ہو کر آگئے تھے اور دوسرے احباب آجاتے تھے۔ لطف کی باتیں ہوتیں اور دفع الوقتی ہوجایا کرتی۔ شمیم محکمہ دیہی ترقیات میں افسر تھے۔ ان کو ایک جیپ کار ملی تھی جس کو وہ اپنے نجی کاموں میں سرکاری سے زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو سائیکل چلاتے ہوئے دیکھا۔ دریافت کیا "ارے بھئی تمہاری جیپ کیا ہوئی" "جیپ! جیپ ہی تو کثرت استعمال سے گھس کر سائیکل ہوگئی ہے"۔ بخشی صاحب نے کسی بات پر خفا ہو کر ان کو معطل کردیا اور میں نے ان کو دیکھا کہ پیدل جارہے ہیں۔ دریافت کرنے پر انھوں نے جواب دیا "شمیم احمد شمیم نہیں۔ اب میں شمیم احمد (Suspendia) سسپنڈیا ہوں۔ شمیم کے اس نئے تخلص پر ہم لوگ خوب ہنسے

شمیم بہت ذہین آدمی تھے۔ کبھی چار کبھی چھ اور کبھی آٹھ صفحات کا جریدہ "آئینہ" کا کم از کم تین چوتھائی وہ تنہا لکھتے تھے اور جو کشمیر میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ شیخ صاحب کے واپس آنے کے بعد ممبر پارلیامنٹ بھی ہو گئے مگر افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور عین شباب میں انتقال کیا۔ دوران گفتگو شمیم ہی کا یہ جملہ تھا جو ابتک یاد ہے کہ "کشمیر رہے یا نہ رہے ہم مسئلہ کشمیر کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے"۔ ایک دوسرے موقع پر شمیم نے کہا تھا "جب تک حکومت ہند Plebiscite (عام رائے شماری) سے انکار کرتی رہے گی ہم پلے بسائٹ کا مطالبہ کرتے رہیں گے اور جب کبھی وہ اس کے لیے تیار ہو جائے گی تو ہم پلے بسائٹ نہ ہونے دیں گے"۔ بہر صورت ہم ہندوستان میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ پاکستان ہمارا بار نہیں اٹھا سکتا"۔

نعیم التقلین انصاری تاش کے کھیل برج کے اچھے کھلاڑی تھے۔ جب ہم لوگ کمال احمد صدیقی کے فلیٹ پر شام کی نشستوں سے اکتانے لگے تو انصاری نے تجویز پیش کی کہ یہ شامیں آسانی سے نہیں کٹ سکتیں تو کیوں نہ ہم لوگ برج کھیلنا شروع کریں۔ مجھ کو برج سے تھوڑے شد بد پہلے سے تھی اس لیے میں نے ان کی تائید کی۔ تاش کی دو گڈیاں انصاری خود خرید لائے۔ اور دو تین دن کی ٹریننگ کے بعد ہم لوگ شروع شروع میں ایک پیسہ پوائنٹ۔ پھر پانچ پیسے پوائنٹ اور پھر دس پیسے پوائنٹ پر مستقل برج کھیلنے لگے۔ اور یہ نشست جو زیادہ سے زیادہ آٹھ نو بجے تک پہلے ختم ہو جایا کرتی تھی اب گیارہ اور بارہ بجے شب تک یہ چلنے لگی۔ کمال صدیقی کی بیگم رشو اپنے بچوں کو لیے بیٹھی کھانے کے لیے کھیل ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ رشو طبیعتاً بہت نیک مہمان نواز اور شوہر کی مطیع بیوی ہیں۔ وہ ہم لوگوں کی اس بے حسی کو برداشت کر لیتیں مگر اس برج کلب سے دور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کہاں لے جاتیں۔ دوسری طرف شمیم کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کے گھر میں علحدہ تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ شمیم نے نوکری کے ساتھ ساتھ برج سے بھی استعفیٰ دیدیا اور اپنی پوری توجہ آئینہ پر مرکوز کر دی۔ تب میں نے یہ تجویز پیش کی کہ کل سے برج پارٹی بجائے فلیٹ ۵ کے فلیٹ ۱۱ میں جما کرے گی۔ سب نے سرد مہری سے اس تجویز کو منظور کر لیا اور میرے فلیٹ میں ایک برج ٹیبل اور چار برج چیئرز کا اضافہ ہو گیا۔ انصاری کبھی شب میں دیر سے جہلم پار جواہر نگر جایا کرتے تھے اور چونکہ ان کی بیگم بڑی جلاد قسم کی تھیں اس لیے انھوں نے بطیب خاطر معذرت

کے ساتھ برج کلب سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اب باقی رہ گئے کمال، جواہر لعل اور میں دو تین دن تک کٹ تھروٹ ہوتا رہا۔ مگر کٹنگ۔ برج کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے کالج میں ایک جواں سال انگریزی کے لیکچرر آفاق احمد کو پکڑا اور دوسری طرف سے جواہر لعل اپنے دوست بل جی کو لائے۔ جب پانچ شوقین اکٹھا ہوگئے تو کٹ آؤٹ ہونے لگا۔ چند دنوں بعد کمال پر بھی محلہ میں رشتو کی سہیلیوں کا زور پڑا تو وہ بھی ڈراپ کر گئے اور ہم چار بے فکرے آفاق، جواہر لعل، بل جی اور میں جم کے چھ بجے شام سے دس گیارہ بجے تک بغیر کسی ذہنی چپقلش کے برج کھیلنے لگے۔ کبھی مجھ کو کالج سے گھر آنے میں تاخیر ہوگئی تو باقی تین کٹ تھروٹ یا سیلو کھیلتے ہوئے ملتے تھے۔ دسمبر جنوری میں کشمیر کی یخ بستگی اور سردیاں اور اس کے درمیان گیارہ بارہ بجے شب میں ان تینوں کا اپنے اپنے گھر واپس جانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر "شاباش میرے شیرو، زندہ باد۔ تم نے کشمیر کے میرے قیام کو زندگی دیدی تھی۔"

شیریں کی شادی کے بعد جب گرمیوں میں میرے خویش الیاس صفوی آجایا کرتے تھے تو برج اور زور پکڑ لیتا تھا۔ الیاس سلمہ برج کے شوقین اور اس کے غیر معمولی اچھے کھلاڑی ہیں۔ ریٹائرمنٹ پر وطن واپس جانے کے لئے میں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کشمیر چھوڑا تھا اور وہاں برج کی آخری نشست ۲۸، ۲۹ اکتوبر کی درمیانی شب بھر ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ In-door Game (گھر بند کھیلوں) میں شطرنج کے بعد برج سے بہتر کوئی کھیل نہیں۔ بس اس کھیل میں ایک عیب ہے تو یہ کہ وہ کھلاڑی کو استغراق کی بناء پر بد اخلاق بنا دیتا ہے۔ ملاقات کرنے والے جو برج نہیں جانتے آتے۔ آداب سلام ہوتا، بیٹھتے نوکر ان کو اور ہم لوگوں کو چائے یا کافی پلاتا اور وہ واپس چلے جاتے مگر ہم لوگوں کو خبر نہ ہوتی۔ بعد میں شکوے سننے پڑتے تھے اور ہم فوراً معافی مانگ لیتے تھے۔ چنانچہ شمیم صاحب کے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اور مرحوم نے آئینہ میں ہم لوگوں کے برج کے خلاف ایک اداریہ بھی لکھ ڈالا تھا۔

۱۹۶۲ء میں بڑی بیٹی شیریں ابھی B.Sc. فائنل میں تھی کہ شمس آباد ضلع فرخ آباد کے رئیس نواب سید محمد عباس صاحب طالب صفوی (جو ۱۹۶۱ء میں میرے سمدھی یعنی شمّو کے خسر بن چکے تھے) کا ایک خط ملا کہ وہ اپنے صاحبزادے محمد الیاس صفوی کو میری فرزندی میں دینا چاہتے ہیں اور شیریں کو الیاس سے بیاہ کر کے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ

"اس کے B.Sc. پاس کرنے میں چھ مہینے باقی ہیں اُس وقت تک توقف فرمائیے" جواب آیا "بھابھو یعنی الیاس کی دادی صاحبہ سخت علیل ہیں اور ان کی تمنّا ہے کہ اپنی موت سے پہلے الیاس کا سہرا دیکھ لیں، تب بھابھو ان کی بیٹھ چین سے قبر میں لگے گی" میں عمداً تاخیر سے ان کو جواب دیتا رہا کہ ان کا ایک خط ملا جس میں "بھابھو" کے انتقال پر ملال کی خبر تھی۔ میں نے ان کو تعزیت کا خط لکھا اور مزید کہ "اب تو سال بھر تک اس عظیم سانحہ ارتحال کے بعد الیاس اور شیریں کی کد خدائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو کہ عام رواج ہے"۔ اس کے جواب میں نواب صاحب نے ایک فریادی خط لکھا کہ "دامتِ بھائی۔ اب ہم پر رحم کیجیے۔ بھابھو کے انتقال کے بعد گھر کاٹے کھا رہا ہے الیاس کی والدہ اور میری درخواست ہے کہ اسی دسمبر میں شادی کر دیجئے کہ گھر میں کچھ رونق آجائے۔ رہا شیریں کا B.Sc. پاس کرنا تو وہ گھر بیٹھ کر علیگڑھ سے پرائیوٹ امتحان دے سکتی ہے۔ اس کا انتظام کر لوں گا۔ آپ بالکل تردد نہ کریں"۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۶۳ء میں شیریں اور الیاس کی شادی ہوگئی۔ ماشاءاللہ عون اور اسمٰعیل جیسے میرے دو نواسے بھی جلد کو مل گئے اور شیریں ابھی تک B.Sc. کے امتحان کی تیاری ہی کر رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو اب اس کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اس نے دوسرے مضامین مثلاً راست بازی، امانت داری، ہمدردی، ہمسائگی کے فرائض، صلح پسندی، اطاعت خاوندی اور ممتا وغیرہ میں M.Sc. اور ان سب سے بالاتر صفائی نفس اور رعوطہ و طہارتِ جسم میں Ph.D. کر رکھی ہے اور سسرال بھر میں نندوں کی آنکھ کا تارا ہے۔

ابھی قیام کشمیر کے ابتدائی دور سے گذر ہی رہا تھا کہ پاکستانی افواج نے شمال مغرب کی جانب سے وادی کشمیر پر ہوائی حملہ کر دیا۔ نسیم باغ میں دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کالج کے سب دفاتر کمروں سے نکل نکل کر دھوپ میں لگ گئے تھے۔ سب سے دور باغ کے مغربی کنارے میں ڈاکٹر احمد کی میز اور تھوڑی دور پر میری میز لگی ہوئی تھی۔ میں کسی فائل پر نوٹنگ کر رہا تھا اور ڈاکٹر احمد پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے کسی سوچ میں ٹہل رہے تھے کہ پشت سے کئی میل دور متعدد بموں کے پھٹنے کی گرجدار آواز سنائی دی۔ ہم لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو چار پانچ بمبار مغربی افق سے ملے ہوئے شمال کی جانب تیزی سے واپس جا رہے تھے۔ ٹیلیفون سے اطلاع ملی کہ سری نگر کے ہوائی اڈے پر پاکستان کی ہوائی فوج نے حملہ کر دیا ہے۔

مگر علاوہ U.N.O. کے ایک جہاز کے کوئی بم نشانہ پر نہیں بیٹھا۔ اس دن سے تین چار حملے روزانہ ہو جایا کرتے جس سے کالج کے طلبا اور اسٹاف میں کافی ہراس اور ہیجان پھیل گیا تھا۔ کچھ لوگ پریشان اور کچھ خوش نظر آرہے تھے۔ دوسرے دن خبر ملی کہ سرحد کے اندر سادہ لباس میں کچھ پاکستانی فوجی مع اسلحہ پکڑے گئے ہیں۔ تین چار دن تک اسی نوعیت کی بمباری اور گرفتاریاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ یہ خبریں ملنے لگیں Infiltrators (گھس پیٹھیے) سری نگر کے نواحی دیہاتوں میں داخل ہو گئے ہیں اور گھر گھر گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ تقریباً ایک ہفتہ میں گلمرگ اور یوس مرگ کے درمیانی درّوں کو پار کر کے پاکستانی افواج ٹنگ مرگ تک آ گئی تھیں اور کہیں کہیں تو شہر کی سرحد سے اتنا قریب ہو گئیں کہ ان کی مشین گنوں اور رائفلوں کی آوازیں امیراکدل اور پرتاپ پارک تک شب میں سنائی دیتی تھیں۔ اور شب میں بھی ہوائی حملے ہونے لگے تھے۔ مگر اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ ہندوستانی فوجوں نے ان کا منہ توڑ جواب دیا اور زندہ بچی ہوئی پاکستانی افواج کو اپنے Pill Boxes (اسلحہ خانے) چھوڑ چھوڑ کر سر پر پیر رکھ کر سرحد پار جا کر دم لینا پڑا۔ شب میں Tracer Bullets (تاریکی شکن گولیوں) کی مدد سے ہماری افواج نے ہوائی حملہ آوروں کو زمین بوس کرایا۔ اتوار کا دن تھا اور میں اپنے فلیٹ کی ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوا پاکستان کی جسارت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات پر غور کر رہا تھا کہ ایک ہوا باز آدھے دھڑ سے لٹکا ہوا اپنے ڈانوا ڈول بمبار میں تقریباً سو گز کی بلندی پر پرتاپ پارک کے ٹھیک اوپر سے مشرق کی طرف اڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کوئی زخمی ہوا باز تھا اور بمبار قابو سے باہر معلوم ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ آٹھ دس میل سری نگر کے باہر کہیں کریش ہو گیا ہوگا۔

جب یہ جنگ اپنے شباب پر تھی اور دیہاتوں میں پاکستانی گھس پیٹھیے پناہ تلاش کر رہے تھے تو گرفتاریاں بھی زوروں پر تھیں اور جب ان کو گھر والے پناہ نہ دیتے تھے تو وہ لوگ گھر والوں کی زد و کوب بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن دیکھتا کیا ہوں کہ علیگڑھ کی شیریں کی دوست زبیدہ مع اپنے کشمیری شوہر امان اللہ خاں کے میرے فلیٹ کے سامنے اپنی کار سے اتری۔ میں دوڑ کر نیچے ان سے ملنے گیا تو دونوں میاں بیوی بہت پریشان تھے اور میرا مکان تلاش کر رہے تھے۔ وہ میرے یہاں

پناہ لینے آئے تھے۔ چنانچہ میں نے ان دونوں کو دلاسا دیا اور مع ان کے سامان کے اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ اور سکون کے ساتھ رہنے اور آرام کرنے کے لیے اپنا ایک کمرہ ان کو دیا۔ بقول ان کے کئی دن بعد وہ میرے یہاں آرام اور سکون کی نیند سوئے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے پاکستانی سپاہیوں کے حملے کو دیکھ چلے تھے۔ ہمارے یہاں آکر ان دونوں کو محفوظ پناہ گاہ اور ہم میاں بیوی کو ان کی اچھی کمپنی ملی اور وحشت خیز تنہائی کا احساس ختم ہوا۔ بڑے لطف سے ہم لوگوں نے آٹھ دس دن گذارے۔ چونکہ امان بغیر کشمیری نمکین چائے اور رگو کے رہ نہیں سکتے تھے اسلئے ہم لوگوں نے بھی اسکو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ امان اللہ وہاں ٹرانک سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کا دفتر سری نگر ہی میں تھا۔ وہ روز صبح دفتر اپنی کار سے جاتے اور شام کو واپس آتے۔ میرے بھی یہی اوقات دفتر تھے۔ باقی دن بھر زبیدہ اور میری بیگم گپیں لڑایا کرتیں انواع واقسام کی افواہیں ایک دوسرے سے بیان کیا کرتیں۔ اٹھارہ انیس دن میں اس لڑائی کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ پاکستانی افواج کا جانی اور مالی بہت نقصان ہوا۔ ہزار ہا گھس پیٹھیے مارے گئے اور ہزار ہا گرفتار ہوئے اور لڑائی ختم ہوئی۔ اس جنگ میں زیادہ تر کشمیری پاکستان کے خلاف تھے اور اقلیت میں ایک طبقہ تھا جو پاکستانیوں کو پناہ دے رہا تھا۔ اور ان کا ہمنوا تھا۔ مگر نتیجہ میں کچھ نہ نکلا ٹائیں ٹائیں فش۔ اور زبیدہ جو علیگڑھ کی جمیلہ آپا کی رشتہ کی بہن ہوتی تھیں اور ان کے میاں امان اللہ خاں خوش خوش اپنے گھر واپس گئے۔

یہ صحیح ہے کہ مجھ کو نصابی کتابوں سے کم دلچسپی رہی ہے البتہ میں اچھے اساتذہ کے لکچر اور سبق میں ضرور شریک رہتا تھا۔ ان میں سرفہرست نام آتا ہے پروفیسر اینی کے سدھانت کار۔ موصوف کو صدر شعبہ انگریزی ہونے کے سبب سے M.A. کے علاوہ B.A. کو پڑھانے کا کم ہی موقع ملتا تھا تاہم سال میں دس بارہ لکچر تو ہو ہی جاتے تھے۔ اس زمانہ کے اساتذہ اپنے طلبا کو کس درجہ عزیز رکھتے تھے اور طلبا ان کا کتنا احترام کرتے تھے مثالی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی چھوڑ دی تھی اور اب ۱۹۶۳ء میں کشمیر میں تھا۔ کم و بیش پچیس سال کے بعد یہ ہوا کہ ایک دن ابر و باد کے بعد سری نگر میں سنہری دھوپ نسیم باغ کو باغ ارم بنائے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر احمد اس نعمت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے مع اپنے دفتری

تمام جہام کے Turf (ہری دوب) لالۂ صحرائی اور ڈیزی کے تختہ پر دکان جما چکے تھے اور مجھکو بھی کچھ فاصلہ پر ان کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ چنار کے نیچے پورے نسیم باغ میں پھیلا ہوا یہ ٹرف دھوپ چھاؤں کا عجیب دلفریب منظر پیش کر رہا ہو تو ایسے میں کوئی دفتری کام کس طرح کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں مسحور کیفیت میں ڈوبا ہوا اِدھر اُدھر دور دور نظریں پھینک رہا تھا کہ میری میز سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر خاموش گوشہ باغ میں ایک شخص کسی گہرے رنگ کے سوٹ اور فلیٹ ہیٹ میں اور ہاتھ میں چھڑی کے سہارے آہستہ محوِ خرام نظر آیا۔ دو چار قدم چل کر کہیں رک جاتا۔ زمین و آسمان کو دیکھتا اور رُخ بدل کر دوسری سمت چلا جاتا۔ نہ معلوم کیوں مجھ سے نہ رہا گیا۔ کرسی چھوڑ کر میں بھی اس گوشۂ امن و سکون کی جانب محتاط قدم روانہ ہو گیا۔ چنار کے تنوں سے اپنے کو چھپاتا ہوا کہ کسی کے تخلیہ میں دخل اندازی معیوب بات ہے، جس قدر قریب ہوتا جاتا تھا اتنا ہی خیال تقویت پکڑتا جاتا تھا کہ میں نے اس شخص بزرگ کو ضرور کہیں دیکھا ہے۔ ٹرف پر چلنے کی آواز تو ہوتی نہیں (قالین پر کوئی آواز ہوتی ہے؟) اس لیے بغیر ان کو متوجہ کیئے ہوئے پندرہ بیس قدم قریب تک پہنچ گیا۔ اور درخت کی آڑ سے جھانک کر ان کو پہچاننے کی کوشش کی تو "ارے یہ تو پروفیسر سدھانت ہیں"۔ اور تیز قدم چل کر میں ان کے سامنے پہنچ گیا اور وہ مجھ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے کہا Good morning Sir اور موصوف نے ہاتھ کی ایک انگلی کو میری جانب اٹھاتے ہوئے اپنی اسی نرم مگر کمزور آواز میں سلام کا جواب دیا اور قبل اس کے وہ کچھ کہیں میں نے عرض کیا

"Sir you would not recognise me for you are seeing me after full twenty five years."

جواب تھا:۔

"No, But I am certain I have seen you somewhere. Here out of context I would'nt know you."

"Sir I had been your student in 1934-35. My name is Mujtaba. Kindly dont strain your venerable self."

یہ کہتے ہوئے میں ان کے قریب چلا گیا۔ موصوف نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور مزید قریب آ گئے اور فرمایا:۔

"But you will bear me out you succeeded giving me my life sirprise"

میں نے جواب دیا:۔

"I beg your indulgence sir. Kindly come with me and have a cup of coffee with us"—"who is this us?" "My immediate boss, Dr. Ahmad from Roorkee University our principal."

اور ہم دونوں دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ آہستہ چل رہے تھے اور میں بھی ایک قدم ان کے پیچھے۔ اس زمانے میں وہ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے چیرمین تھے۔ راستہ بھر مجھ کو پوچھتے رہے کیا کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ میں تفریح کی غرض سے آیا ہوں اور تمہارے نسیم باغ کے پھاٹک کے سامنے جو ہاؤس بوٹ ہے اسی میں ٹھہرا ہوں۔ کل آیا۔ سات دن رہوں گا اور شہر سے باہر یہیں آرام کروں گا۔ بڑی سکون کی جگہ ہے۔ باتیں کرتے ہوئے ہم ابھی چند قدم فاصلہ ہی پر تھے کہ ڈاکٹر احمد ایک معمر اور پروقار شخصیت کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہماری طرف آنے لگے۔ قریب آئے تو میں نے کہا

"My teacher Professor Sidhanta & now chairman Union P.S.C. Kindly meet Dr. Z. Ahmad, Principal of this college."

اور دونوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پروفیسر سدھانت کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھلایا اور میں نے پیک کے اردلی سے بہت اچھی کافی اور کاجو لانے کو کہا۔ لوٹا تو ڈاکٹر احمد ان سے اتفاقیہ ملاقات میں اپنی خوش نصیبی کا اظہار کر رہے تھے اور پروفیسر سدھانت نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"And I am inpleased to find e-eh Mujtaba my old student, will pleased under your august patrouyer."

کافی سے سب نے شغل کیا اور ڈاکٹر احمد نے اپنے قبل جنگ جرمنی کے تجربات بیان کرنا شروع کر دیئے، اور اخلاقاً پروفیسر سبحانی نے اپنے کیمبرج سے ٹرائی پاس ہونے اور کو ئنز کالج کی عظمت کا ذکر۔ یہ صحبت ایک گھنٹے تک جاری رہی جس کا میں خاموش تماشائی تھا۔ اس کے بعد ہمارے استاد معظم نے رخصت چاہی تو ہم دونوں ان کو نسیم باغ کے پھاٹک تک پہنچانے گئے۔ ان کا آخری جملہ تھا:۔

"I never knew that by way of my constitutional I was comitting a tresspass over your privay but that gave me a few memorible surprise".

اب نہ اپنی وہ اگلی سی جوانی تھی اور نہ جوشِ جوانی مگر عمر کی قید و بند، دسن و سال حسن و جمال سے متاثر ہونے کی انسانی فطرت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالب کا یہ شعر جمالیاتی حس کی بہترین مثال ہے۔ ادب میں اس شعر کی ہمداری کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اخلاقیات کے ٹھیکیدار اذہان اس شعر کو بڈھے کی ہوس ناکی کہہ کر اپنی بے حسی کا ثبوت دیتے ہیں جب کہ حسن اور بالخصوص انسانی حسن سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ البتہ یہ پاک جذبہ کبھی کبھی واقعاتی طور پر شرمندگی کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اور باوجود کوشش کے انسان اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ کئی سال تک پھیلا ہوا مسلسل واقعہ یہ ہے کہ جب بھی میں نسیم باغ کی طرف جانے والی بس میں سوار ہوا تو گاندربل جانیوالا ایک بکروال جوڑا بس میں بیٹھا ہوا ملا کرتا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا شوہر جس کی عمر تقریباً ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ مونچھوں اور سر کے بالوں پر سیاہ خضاب لگائے، ایک بیس بائیس سال کی انتہائی حسین اور سڈول چھریرے جسم والی بھرپور جوان لڑکی کو کاندھوں اور کبھی کمر سے دبوچے ہوئے ملتا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر کرب و نفرت کے آثار اس امر سے ظاہر ہوتے تھے

کہ وہ کبھی اپنے شوہر کی طرف مڑ کر نہ دیکھتی اور زبان حال سے کہتی کہ "ہاں یہ قبیلہ کا سردار اور میرے دادا کا ہم عمر ہے، بارسوخ اور صاحب ثروت ہونے کی طاقت سے اس نے مجھ کو اپنی شرعی زوجیت میں لے رکھا ہے۔ یہ سب میری مرضی کے خلاف ہوا ہے ——————

—————— "۔ محنت کش ہونے کے سبب سے کندن جیسا رنگ تھا۔

سرو جیسا قد تھا۔ صنوبر کی شاخوں جیسے ساعد و بازو۔ ادھ کھلے کنول جیسی آنکھیں زیادہ تر جھکی ہوئی نظریں۔ جھکی ہوئی نظروں سے فائدہ اٹھا کر میں کبھی گوشۂ چشم سے اور کبھی سر گھما کر اسکو دیکھ لیا کرتا تھا۔ جس سے کوئی سیری نہ ہوتی اور جب کبھی اس نے مجھ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تو میں پانی پانی ہو جاتا تھا۔ باوصف ہزار رکاوٹوں کے لوہے کی سوئی کو مقناطیس کی جانب کھو منے سے نہیں روکا جا سکتا۔ میں اکثر اپنے دل کو کریدتا تھا کہ اس کو دیکھ کر میں اس قدر بے قابو کیوں ہو جاتا ہوں مگر کوئی معقول جواز یا جواب نہ ملتا تھا کہ ایک دن جب میں بس میں جا بیٹھا تو اس کا شوہر موجود نہ تھا۔ چند کشمیری کسان موجود تھے۔ وہ سر کھولے ہوئے اپنی چوٹیاں ٹھیک کر رہی تھی۔ مجھ کو دیکھتے اس نے ڈوپٹے کے پلّو سے سر ڈھانک لیا مگر میں نے اس کی صندلیں صراحی دار گردن دیکھ لی تھی۔ دل بلیوں اچھلنے لگا تھا " ارے یہ تو ہماری شہناز نکہت کی ڈپلیکیٹ ہے "۔ اور اس دن سے میں نے اس ساڑھے نو بجے والی بس میں جانا چھوڑ دیا۔ کبھی یونیورسٹی بس سے چلا جاتا تھا کبھی اور کسی بس سے ــ اور کچھ دنوں بعد ہمارے کالج کی نئی اسٹاف بس آ گئی تھی۔

اس کے تقریباً ایک سال بعد بولیورڈ سے چشمہ شاہی پیدل جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بھاری بھرکم چھ فٹ قد والے بکروال کے بازوؤں پر نیم غشی کے عالم میں اور جس پر بڑھاپے کے ساتھ ساتھ زچگی کے آثار اور کرب نمایاں تھے لٹکی ہوئی چشمہ شاہی سے گاندربل جانیوالی بس کی طرف وہ کشاں کشاں چلی جا رہی تھی۔ شوہر کے سر اور مونچھوں کا خضاب آدھے سے زیادہ اتر چکا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھ کو کبھی نظر نہ آئی ۔ ورنہ میں تو اپنے کو نفرین کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ تفریح اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے سری نگر آئے تو حسید ستور بخشی صاحب نے اپنی قیام گاہ پران کو ٹھہرا نہ دیا۔ اس قسم کی دعوت میں

ہم انجینئرنگ کالج والے اپنے پرنسپل ڈاکٹر احمد کے ساتھ چار چھ میزیں ملا کر سب سے علیٰحدہ اپنا ایک گروپ بنا لیتے تھے۔ ایک پیالی چائے پینے کے بعد ذاکر صاحب افسران اور معزز شہریوں سے متعارف ہوتے اور مصافحہ کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تعارف کا کام بخشی صاحب کرتے جاتے اور مصافحہ کی صعوبت ذاکر صاحب برداشت کر رہے تھے۔ سو ڈیڑھ سو نمائندین کا مجمع تھا۔ جب وہ ہم لوگوں سے دس پندرہ قدم پر رہ گئے تو احتراماً ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے ہم لوگوں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور تھک کر واپس ہی ہونے والے تھے کہ موصوف نے مجھے دیکھ لیا اور بخشی صاحب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے میری طرف تیز قدم سے چلے تو میں پیش قدمی کر کے ان سے جا ملا۔ "واثق صاحب آپ یہاں کیسے؟" "جی انجینئرنگ کالج سری نگر میں بہتر نوکری مل گئی تو علی گڑھ سے چلا آیا۔" اب بخشی صاحب بھی ذاکر صاحب کے قریب آ چکے تھے اور لقمہ دیا کہ "جی ہاں۔ میں خاص طور پر علیگڑھ سے ان کو یہاں لایا ہوں" ذاکر صاحب نے فرمایا "میں چشمہ شاہی مہمان محل میں مقیم ہوں۔ کل شام کو آیئے لطف کی باتیں رہیں گی" میں نے کہا "ضرور حاضر ہوں گا"۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر احمد ڈاکٹر رئیس اور پروفیسر سید احمد علی وغیرہ سے ہاتھ ملایا جن کو وہ علیگڑھ سے جانتے تھے اور اپنی جگہ پر واپس چلے گئے۔

پس اب کیا تھا۔ "دیوانہ را ہوئے بس است"۔ دوسرے دن صبح نو بجے دیکھتا کیا ہوں کہ ڈاکٹر احمد میری فلیٹ پر تشریف فرما ہیں۔ میں گھبرایا ہوا اپنے کمرہ سے نکلا "ڈاکٹر صاحب خیریت تو ہے۔ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ بلوا لئے ہوتے" "نہیں۔ میں آپ سے بالکل تنہائی میں بات کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں"۔ میں نے درخواست کی "ارشاد" "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بخشی صاحب مونس رضا کی تقرری کی فائل دبائے بیٹھے ہیں۔ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین روا داری ہی میں بخشی صاحب سے پوچھ لیں کہ میں نے سنا تھا کہ مونس رضا کی بھی انجینئرنگ کالج میں تقرری ہو چکی مگر وہ نظر نہ آئے تو یقین کیجئے کہ دوسرے ہی دن بخشی صاحب مونس کی تقرری کی توثیق کر کے فائل واپس کر دیں گے۔ مجھ کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ذاکر صاحب تفریح و تفریح کرتے نہیں آئے ہیں بلکہ وہ صدر جمہوریہ اور پنڈت جی کے بھیجے ہوئے بخشی صاحب کے خلاف افواہ کی

تحقیقات اور لوگوں کی رائے معلوم کرنے آئے ہیں اور بخشی صاحب کو بھی اس کا علم ہے۔ یہ سب باتیں پوشیدہ تو رہتی نہیں"۔ "آپ اب جلدی سے کپڑے تبدیل کر لیجئے میں بیٹھا ہوں۔ بیکار آپ ٹیکسی کے زیر بار کیوں ہوں۔ کالج چل کر سردار بلونت سنگھ فور مین ورکشاپ کو تیار کروں گا کہ وہ یہاں سے چھ بجے شام آپ کو اپنی کار میں چشمۂ شاہی لے جائیں اور کام ہو جانے کے بعد میرے مکان پر آپ کو پہنچا دیں"۔ چنانچہ کالج میں وہ دن اُن سے کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ سہ پہر کو تین ہی بجے انھوں نے دفتر ختم کر دیا اور مجھ کو میرے فلیٹ پر پہنچاتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔ ڈاکٹر احمد ایسی ہی Im- pulsive (اضطراری) طبیعت کے آدمی تھے۔

سردار بلونت سنگھ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے کار لیکر میرے یہاں پہنچ گئے۔ میں ان کا منتظر بیٹھا ہی ہوا تھا۔ کار چشمۂ شاہی محل کے پھاٹک پر باہر ہی رکوا کر میں محل کی راہ سربلند کو طے کر کے محل کے لاؤنج میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو مجھ سے پہلے سے نو دس حضرات نائب صدر جمہوریہ سے ملنے کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں ابھی چھ بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ نائب صدر کے ذاتی معاون نے میرے سامنے ایک رجسٹر کھولا جس پر میں نے اپنا نام لکھ کر دستخط کر دیئے۔ مگر میری چھٹی حس بتلا رہی تھی کہ حضرت واثق در آنحالیکہ ذاکر صاحب پروفیسر مونس رضا کو عزیز رکھتے ہیں اور انکی ترقی کے خواہاں ہیں یہ کام آج ہونیوالا نہیں ہے۔ ذاکر صاحب بے فیضے نہ تھے مگر ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پروٹوکال کی نہج سے میرا نمبر دیر میں آئے گا اس لئے اپنا پائپ جلا لیا۔ ابھی پائپ جلا کر دیا سلائی بجھائی تھی کہ پی۔ اے صاحب بغل کے کمرہ سے برآمد ہوئے اور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ پائپ کو بائیں انگوٹھے سے بجھاتا ہوا میں کمرہ میں داخل ہو گیا۔ ذاکر صاحب نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور فرمایا کہ "میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو گی۔ اور کہیئے کالج کیسا چل رہا ہے۔ آپ خوش ہیں؟ مجھ کو تو اور بہت سی علیگڑھ کی صورتیں کل پارٹی میں نظر آئیں۔ باہر اور کون کون لینے جاننے والوں میں ہے؟ میں تو آج صرف اپنے شناساؤں سے ملنا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے" اسی طرح ایک سانس میں وہ کئی سوال کر گئے۔ وہ وقت کی قدر و قیمت کے پختہ کار ماہر تھے۔ سب سے پہلے میں نے کہا "باہر کے نو دس حاضرین میں سے صرف پروفیسر اشفاق کو پہچانتا ہوں"۔ "یہ کون ہیں؟

"آپ ان کو دیکھیں گے تو پہچان لیں گے۔ وہ جامعہ کے طالب علم رہ چکے ہیں"۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے سب حالات سنائے۔ اپنی پوسٹنگ کا ذکر کیا۔ اور یہ کہ "اگر آپ مجھ کو علیگڑھ سے نہ بلا لیتے تو غالباً آج میں یہاں نہ ہوتا۔ پرانی مثل ہے کہ "مربی بیار و مربہ بخور" جس پر موصوف نے کافی اظہار امتنان کیا۔ میں نے اپنی تقرری کے معاملہ کو اور آگے بڑھایا اور کہا کہ "آپ مونس رضا کو تو جانتے ہیں"۔ "ہاں ہاں خوب جانتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ اساتذہ کو سیاسی نظریے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کس کو کون سا کھانا پسند ہے۔ ہاں تو مونس کا ذکر آپ نے کیسے چھیڑ دیا"۔ "ڈاکٹر صاحب بات بہت معمولی اور صرف اتنی ہے کہ کشمیر P.S.C. نے مونس رضا کو ہیومینٹیز کی سینیر پروفیسری کے لیے منتخب کیا تھا مگر بخشی صاحب اس فائل کو دبائے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ بخشی صاحب سے محض یہ پوچھ لیں کہ انھوں نے مونس کے کیس میں کیا کیا تو کام بن جائے گا"۔ بس یہ سننا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی آرام کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ "مونس کو میں اس جگہ پر دیکھنا چاہتا ہوں اور میں بخشی غلام محمد سے براہ راست کہہ سکتا ہوں کہ وہ مونس رضا کے معاملہ کو لیت و لعل میں کیوں ڈالے ہوئے ہیں مگر آپ کو معلوم ہے مجھ کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی جس کے لیے کم از کم اس دورہ کشمیر میں میں اپنے کو معذور پاتا ہوں"۔ اتنے کم الفاظ میں وہ اپنے دورہ کشمیر کے مقصد کی اہمیت کے متعلق بغیر کچھ کہے ہوئے سب کچھ کہہ دینے پر کس قدر قادر تھے۔ "آپ نے کشمیر پر کوئی نظم لکھی ہو تو سنائیے"۔ میں نے عرض کیا "کشمیر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں ان تاثرات سے اس قدر دب گیا ہوں کہ بغیر یہاں سے نکلے ہوئے کشمیر پر کچھ نہ لکھ سکوں گا۔ اس سرزمین کے محاسن کو حروف کی شکل دینا بہت مشکل کام ہے۔ مگر انشاءاللہ کوشش کروں گا"۔ اس بات چیت نے آدھ گھنٹہ سے کچھ زیادہ ہی لے لیا تھا۔ اس لیے میں نے اجازت چاہی۔ خدا حافظ کہتے ہوئے انھوں نے فرمایا "بس دو چار دن رہوں گا۔ اور گو بیک ٹو پویلین (Go back to povilion) جاتے ہوئے اشفاق صاحب کو بھیج دیجیے گا"۔

ڈاکٹر صاحب کے دہلی واپس جانے کے بعد کامراج پلان کی میٹنگ ہوئی اور بخشی صاحب نے کانگریس کے چار آنہ ممبر بن کر عہدوں سے مستعفی ہونے والوں میں اپنا نام بھی دے دیا جس کو پنڈت جی چند دوسرے ناموں کے ساتھ منظور کر لیا۔ اور کشمیر میں ایک دھوم مچ گئی۔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس

نے شمس الدین کو اسمبلی کے لیے اپنا رہنما منتخب کیا اور وہ چیف منسٹر ہو گئے ۔ یہ بخشی صاحب کے گروپ کے آدمی تھے ۔ بخشی صاحب کے چھوٹے بھائی بخشی رشید کا خیال تھا کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے اور وہ باوجود بخشی صاحب کی تادیب کے شمس الدین کے خلاف ہے اور شمس الدین کی وزارت کی کشتی ڈبکیاں لینے لگی ۔

سردیوں کا موسم اپنے شباب پر آ رہا تھا کہ درگاہ حضرت بل سے "موئے مبارک" چوری ہو گیا۔ وادی کشمیر اور بالخصوص سری نگر میں بغاوت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ عورتوں کے ماتمی دستے نکلنے لگے ۔ مردوں نے سرکاری مکانات، سرکاری بسیں اور بہت سے ہوٹل پھونک دیے ۔ ہوٹلوں میں بخشی رشید کا ہوٹل خاص طور پر آتش زنی کا نشانہ بنا۔ بلوا روکنے کے لیے پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر کامیابی نہ ہوئی فوجوں نے بھی مشتعل عوامی جذبات کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ میں بھی عیال کو وطن پہنچا کر سری نگر پھر واپس آ گیا تھا اور یہ واقعات میری آنکھوں کے سامنے ہو رہے تھے۔ تنہائی کی وجہ سے میں نے ڈاکٹر طاہر مرزا کے یہاں قیام کیا تھا۔

ہر کشمیری کی زبان پر یہ تھا کہ "اصلی مجرم" گرفتار کیا جائے اور شمس الدین حکومت استعفےٰ دے۔ ہر کشمیری کو یہ بھی معلوم تھا کہ "موئے مبارک" کس طرح چوری ہوا، کس نے چرایا اور کہاں ہے۔ مگر شیر کی ماند میں کون ہاتھ ڈالے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا ۔ بالآخر بے بس ہو کر شمس الدین حکومت نے استعفیٰ دیدیا اور غلام محمد صادق صاحب کشمیر کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے ۔ ایک سہانی صبح کے وقت درگاہ حضرت بل کے خدام نے "موئے مبارک" کو درگاہ کے اندر کسی نمایاں مگر محفوظ جگہ پر رکھا ہوا پایا ۔ یہ خبر بھی وادی کشمیر میں اسی طرح گونجی تھی جس طرح چوری کی خبر پھیلی تھی ۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

"موئے مبارک" کے سارقوں نے صادق صاحب کو پریشان کرنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا کہ یہ اصلی موئے مبارک نہیں ہے ۔ موئے مبارک کی بازیافت کے بعد یہ دوسری مصیبت صادق صاحب کے سر آن پڑی ۔ مگر وہ اور ان کے ساتھی میر قاسم اور ڈی پی دھر وغیرہ بھی کوئی کچی گولی کھیلے ہوئے نہیں تھے ۔ وادی کشمیر اور سری نگر کے مختلف سیاسی اور مذہبی اداروں کی رائے سے سب سے زیادہ سن رسیدہ اور صدہا بار موئے مبارک کی زیارت کئے ہوئے بزرگوں میں میراں شاہ

مذہبی رہنماؤں کی صدارت میں ایک "موئے مبارک شناخت کمیٹی" بنائی گئی جس کو اہل کشمیر نے کسی ایک بھی اختلافی آواز کے بغیر مان لیا اور جس میں صادق وزارت کے مخالفین کو شکست فاش ہوئی۔ شناخت کے لیے ایک جمعہ مقرر ہوا۔ نماز جماعت کے بعد ممبران کمیٹی نے حلبی شیشے میں بند موئے مبارک کو ہر رُخ سے دیکھا، پہچانا اور اس کو بوسہ دے کر ایک عام اعلان نامہ پر دستخط کرنے کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر زبانی اعلان کیا کہ یہ موئے مبارک اصلی ہے۔ پورے کشمیر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر جانب سے صادق صاحب کی تعریفیں ہونے لگیں۔

میری مذہبی معلومات برائے نام ہیں مگر چھوٹے موٹے مولوی ملاؤں کو چکر میں ڈال دینے کے لیے بہت کافی ہیں۔ اب تک نہ میں نے صادق صاحب کو ان کے وزارت اعلیٰ پر فائز ہونے کی مبارکباد دی تھی اور نہ ان کی مشغولیات کو دیکھتے ہوئے ان سے ملنے گیا تھا۔ تخ باری ختم ہو چکی تھی برف پگھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی کہ ایک اتوار کو ہمت کر کے میں ان کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ اطلاع کروائی اور باہر کے بائیں کمرہ میں دیوار سے لگی ہوئی گدّہ دار سیٹی پر بیٹھ گیا۔ وہ جب سیڑھیوں سے اتر کر نیچے کمرہ میں تشریف لائے تو میں نے ان کو تین مبارکبادیاں پیش کیں۔ وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر موئے مبارک کی بازیافت پر اور تیسری اس کی شناخت پر۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ صادق صاحب بہت خوش تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ "جب تک شرعی مسائل کو مسلمان نظر انداز کرتے رہیں گے اس وقت تک موئے مبارک کی چوری جیسی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے۔" صادق صاحب نے تجسس آمیز لہجے میں فرمایا "وہ کیسے؟" تو میں نے عرض کیا "مذہب میں تجہیز و تکفین کا بنیادی اصول ہے کہ مرنے والے کا ہر عضو جسم یا مختصر اجزائے جسم دستیاب ہونے پر میت کے ساتھ دفن ہونا چاہیں۔ اور اگر دفن کے بعد ملیں اور ممکن ہو تو اس کو اسی قبر میں دفن کر دیں یا اس کو غسل میت اور نماز جنازہ ادا کر کے کہیں بھی اس کی قبر بنا دیں۔ انگلیوں کے ناخن، سر اور ریش وغیرہ کے بال یا دانت عضو جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ سختی سے شرع کے پابند ہیں ان تین اشیاء کو بھی جمع کرتے رہتے ہیں کہ ان کے ساتھ قبر میں دفن ہوں گے۔ اس کے خلاف مرنے کے بعد اعضائے جسم کی نمائش کھلی بدعت ہے۔ اس لیے موئے مبارک کو اگر مدینہ میں قبر رسول کے سپرد کرنا ممکن نہیں تو اس کو حضرت بل ہی میں پورے شرعی اور دنیاوی اعزاز کیساتھ دفن کروا دیجیے۔ اس طرح وہ دوبارہ چوری اور

بے حرمتی سے محفوظ رہے گا"۔ صادق صاحب نے گھبرا کے کہا "اے واثق صاحب خدا کے لیے اس شرعی مسئلہ کو یہیں ختم کیجئے۔ اگر لوگوں کے کانوں میں اس کی بھنک پہنچ گئی تو دوسرا وبال کھڑا ہو جائے گا۔ یوں آپ چپ رہنے کو کہتے ہیں تو میں چپ رہوں گا۔ بدعت ایک فقہی مسئلہ ہے جس کو میری خاموشی ختم نہیں کر سکتی"۔ اس کے بعد میں نے کہا آپ کے یہاں ہمارے کالج کی ایک فائل پڑی ہوئی ہے۔ مونس رضا کی تقرری کا فائل"۔ چنانچہ کالج کھلنے پر صادق صاحب نے ان کی تقرری کی تجویز پر توثیق کر دی اور پروفیسر مونس رضا نے آ کر اپنی جگہ کا چارج لے لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اظہار حسین پروفیسر ریاضیات کا تقرر ہوا۔

کچھ مدت بعد پرنسپل ڈاکٹر ذکی الدین احمد کو اس الزام میں معطل ہونا پڑا کہ وہ سرکاری نوکروں سے گھر پر اپنے نجی کام کرواتے تھے۔ اور ایک دو مزید الزام لگا کر ان کے خلاف تفتیش کا حکم ہو گیا۔

اب کشمیر حکومت کے سامنے ایک عارضی پرنسپل کی تقرری کا سوال تھا۔ میں اس وقت اسسٹنٹ رجسٹرار Establishment تھا اور میرے پاس چپراسی سے لیکر پرنسپل تک کی پرسنل فائل رہا کرتی تھی اور تقرری کی جملہ کارروائیاں میری نوٹنگ پر ہوا کرتی تھیں۔ میرے پاس کالج کے چیرمین بورڈ آف گورنرز یعنی وزیر اعلیٰ کشمیر کا (Despatch rider) موٹر سائیکل سوار نامہ بر ایک حکم نامہ لیکر آیا کہ بغیر تاخیر موجودہ سب سے سینئر پروفیسر کا نام مع پرسنل فائل کے بھیج دیا جائے۔ ہماری سول لسٹ کی رو سے سب سے سینیر پروفیسر گھوش تھے جو طویل رخصت پر روانہ ہو چکے تھے۔ نمبر دو پر پروفیسر مونس رضا کا نام آتا تھا جو موجود تھے۔ اس نوٹ کے ساتھ میں نے دونوں فائلیں رجسٹرار چودھری کو بھیج دیں اور چودھری نے ان سب کو سیلڈ کور میں بند کر کے سرکاری نامہ بر کے حوالہ کر دیا۔ تقریباً تین بجے دوپہر بعد صادق صاحب کا دستخطی حکمنامہ آیا کہ "بذریعہ اس حکمنامہ کے میں بحیثیت چیرمین بورڈ آف گورنرز کی حیثیت سے تا انفصال مقدمہ بابت ڈاکٹر ذکی الدین احمد پروفیسر مونس رضا کو عارضی پرنسپل کالج ہٰذہ مقرر کرتا ہوں"۔ دستخط غلام محمد صادق۔

چودھری نے حکمنامہ کو نفاذ کے لیے میرے پاس بھیج دیا۔ اور اس کو لیکر میں مونس رضا کے کمرہ پر جا پہنچا۔ وہ اپنی کرسی پر نیم دراز بڑے مزے سے سگریٹ کے کش پر کش لے رہے تھے۔ میں نے کہا "جلدی سے دو پیالی کافی بنوائیے تو آپ کو ایک بہت دلچسپ داستان سنائیں"۔ جب کافی آ گئی

اور ہم لوگوں نے اس کا ایک ایک گھونٹ لے لیا تو مونس نے ایک نئی سگریٹ جلائی اور میں نے اپنا برائر جلا کر داستان یوں شروع کی کہ "ایک تھا راجہ اور اس کے تھے دو بیٹے ۔ راجہ شیر کے شکار میں زخمی ہو کر زیر علاج ہے اور ویدوں کا خیال ہے کہ اگر بھگوان کی کرپا رہی تو شاید بچ جائے ورنہ کوئی امید نہیں ۔ یہ خبر پا کر پردھان منتری بڑے راجکمار کے محل کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور دروازہ کھلنے پر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے راجکمار پہاڑی میں جا کر تپسیا کر رہے ہیں اور اپنے پتا کی آگیا ہے ۔ تب پردھان منتری چھوٹے راجکمار کے پاس جا کر اپنی اور پرجا کی پریشانی بیان کرتا ہے کہ اگر مہاراج ابھی ابھی چل کر سنگھاسن پر بیٹھ کر اپنی عارضی حکومت کے پتر پر ہستاکشر نہ کردیں گے تو بد امنی کا خطرہ پیدا ہو جائیگا ۔ ان حالات میں مونس صاحب چھوٹے راجکمار کو کیا مشورہ دیں گے تو وہ بڑی لاپرواہی سے بولے کہ میں اس گدھے راجکمار کو یہی رائے دونگا کہ "ان دی انٹرسٹ آف دی پیپلز آف دی اسٹیٹ" وہ فوراً راج کا کام سنبھال لے" میں نے کہا تو پھر اٹھئے جلدی سے میرے ساتھ آیئے ۔ اور میں ان کو پرنسپل کے خالی آفس میں لے گیا، سرکاری حکم نامہ دکھلایا اور Taking over کے فارم پر ان کا دستخط لیکر اردلی کو دیا کہ دونوں کاغذ چودھری صاحب کو دے آؤ ۔ اب مونس رضا کسی طرح ڈاکٹر احمد کی کرسی پر بیٹھ نہیں رہے تھے ۔ خیر بہت کہنے سننے پر اس ریوالونگ چیئر پر بیٹھے کہ واقعی صاحب میں تو کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں ۔ میرے ذہن وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لعنت یا نعمت جو چاہے کہہ لیجیے میرے سر آئے گی ۔ پروفیسر گھوش مجھ سے سینئر ہیں ۔ ان کا کیا ہوگا ۔" ان کا کیا ہوگا ۔ کچھ نہیں ۔ وہ طویل رخصت پر ہیں جب تک وہ واپس آئیں گے ڈاکٹر احمد کے خلاف تفتیش ختم ہو چکی ہوگی ۔ اس وقت تک چھوٹے راجکمار ہی کی حکومت چلے گی ۔" اور مونس کی حکومت چلی اور کئی سال تک چلی اس کے بعد وہ P.V.C ہو کر Delhi University چلے گئے اور اب J.N.U. Delhi کے V.C. ہیں ۔ سیڑھی کے پہلے ڈنڈے پر جو پہلے چڑھ جائے گا وہی آخری ڈنڈے پر سب سے پہلے پہنچے گا ۔ ابھی تین ڈنڈے اور باقی ہیں ۔ گورنری، نائب صدارت جمہوریہ اور سیڑھی کا سرا صدارت جمہوریہ ہے ۔

نظریاتی قدر مشترک کی بنا پر جن لوگوں سے میرے بہت گہرے تعلقات تھے ان کے اسماء یہ ہیں :- غلام محمد صادق ، ڈی ۔ پی دھر ، میر قاسم ، رتن زو ، دینا ناتھ نادم ۔ اکبر لداخی

افسوس کہ صادق صاحب اور ڈی۔پی۔دھر کی زندگیوں نے وفا نہ کی۔ ڈی۔پی۔دھر کا شعری مذاق بہت اچھا تھا۔ انھوں نے بڑا اچھا کام میں ہندوستان کے چوٹی کے دانشوروں کو لیے۔ ایک دن کے کھانے پینے کی دعوت دی تھی جس کی یادگار تصویر اس خود نوشت میں شامل ہے۔

کشمیر کے تین ڈاکٹروں سے مجھ کو بڑی خصوصیت تھی۔ ڈاکٹر طاہر مرزا، ڈاکٹر علی جان اور سرجن پروفیسر پربانک۔ ان تعلقات کے خاص خاص پس منظر تھے۔ ڈاکٹر طاہر مرزا بابا کے پرانے دوست ہمایوں مرزا صاحب ڈسٹرکٹ سیشن جج بارہ بنکی کے صاحبزادے اور میرے ہم جماعت اور دوست احمد مرزا عرف نھو جو اپنے والد بزرگوار کی طرح ڈسٹرکٹ سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوئے، کے چھوٹے بھائی تھے۔ ڈاکٹر طاہر مرزا سینہ کے امراض کے اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور میرے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست اور ہمارے خاندانی ڈاکٹر۔ میری بیوی جنم کی بیمار ان پر بڑا اعتقاد رکھتی تھیں اور ڈاکٹر مرزا جب کبھی ٹہلتے ہوئے ہمارے فلیٹ پر آتے، اپنے میکنٹوش کے جیبوں سے تین چار ٹانک کی بوتلیں اور دس پندرہ نمونے کی دواؤں کے پتے ان کے سامنے رکھ دیتے۔ وہ کہا کرتے کہ قبض سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پیشاب اور گردوں کی تکلیف سے بچنا چاہیئے۔ قبض کا علاج ہے۔ خوب ساگ اور سبزی کھائی جائے تو قبض دور ہو جائے گا۔ اور چوکی پر جانے کا ایک وقت معین ہونا چاہیئے۔ کسی بڑی سے بڑی شخصیت، ضروری سے ضروری کام اور اچھے سے اچھے مشغلہ کو چوکی کے وقت خاطر میں نہیں لانا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ قبض دور کرنے کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ثابت ہوا۔

ڈاکٹر علی جان کشمیر کے سب سے بڑے فزیشین تھے۔ وقت اور اپنے اصول کے سخت پابند۔ مشہور تھا کہ فیس کے معاملہ میں وہ اپنے سگے بھائی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ فیس بھی لمبی لیتے تھے مگر ہاتھ میں شفا تھی۔ گھر پر لوگ ان کو کم ہی بلاتے تھے۔ وہ روزانہ چھ بجے شام سے دس بجے شب تک اپنے مطب میں بیٹھتے تھے اور وہاں اُن سے ملنے کے پہلے دن کی فیس دس یا پانچ روپے تھی۔ ایک نرس ملے ہوئے ہال کمرہ میں عین دروازہ کے پاس اپنی رسید بھی اور رجسٹر لئے میز سے لگی بیٹھی رہتی۔ مریض داخل ہوا اور اس نے مقررہ فیس لیکر رسید دیدی اور رجسٹر پر نام چڑھا کر ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھ آئی۔ مجھ پر ہائپر ایسیڈٹی کا سخت دورا پڑا تھا۔ جب کسی علاج سے فائدہ نہ ہوا تو میں ڈاکٹر علی جان کے انبوہ مریضاں میں جا ملا۔ فیس ادا کی اور اپنے نمبر کا انتظار کرتا رہا۔ صوفے سے

لگے ہوئے تھے جن کے سامنے نیچی میزوں پر انگریزی اردو کے درجنوں پرانے مصور رسالے پڑے رہتے تھے۔ ان کو پڑھتا رہا کہ تقریباً آٹھ بجے نمبر آیا۔ جب میں ان کے (consultation Room) مشاورتی کمرہ میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب نے سامنے رکھے رجسٹر کو بغور سے دیکھا۔ مجھ سے کہا "تشریف رکھئے" اور گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی نرس بھاگی ہوئی آئی۔ "جناب! تم نے واثق صاحب سے بھی فیس لے لی۔ کیا تم نے ان کو پہچانا نہیں۔ یہ کشمیر میں ہمارے مہمان ہیں، اور ان سے میں فیس لوں۔ فوراً ان کے روپئے واپس کردو اور یہ روپے میرے ذاتی اکاؤنٹ میں ڈیبٹ کردو۔" جب میں نے فیس واپس لینے میں تکلف کیا تو وہ بولے "واثق صاحب اب زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ اور بتلائیے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے"۔ میں نے اپنا حال بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ "اس مرض کو جڑ سے ختم تو نہیں کیا جاسکتا البتہ وقتی دفاع ممکن ہے"۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب زکام بھی ہو رہا ہے" تو انھوں نے کہا کہ "زکام کے ختم ہوتے تک معدہ کا علاج بند رکھئے۔ زکام کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ اپنا وقت لیتا ہے۔ اور آپ جس قدر آرام کریں گے اتنی ہی جلدی یہ اچھا ہو جائے گا۔ دوران آرام اگر چوبیس ۲۴ گھنٹے میں تین بار اسپرین کی ایک ایک ٹکیہ لے لیں گے تو دو ۲ دن میں انشاء اللہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں دوسرے مرض کی دوا دوں گا۔ آرام اور اسپرین کے علاوہ زکام سے شفا پانے کا اور کوئی علاج نہیں ہے" اس کے بعد میں اپنے فلیٹ واپس آیا اور اسپرین کی ایک ٹکیہ گرم پانی کے ساتھ لیکر لحاف میں داخل ہو گیا۔ دو دن میں زکام سے نجات ملی اور حسن اتفاق کہ ہائپر ایسیڈٹی سے بھی۔ دقیام وطن میں ایک بار پھر ہائپر ایسیڈٹی کا دورہ اور زکام ساتھ ساتھ آیا تھا۔ پہلے زکام کا علاج میں نے کوسس ایول سے کیا اور زکام کے ساتھ ہی ایسیڈٹی بھی جاتی رہی۔ جونپور کے ڈاکٹروں سے میں نے اس کے اسباب پوچھے مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کے بعد میری خالہ مدن بی بی پر ایسے ہی دونوں امراض کا ساتھ دورہ پڑا اور جب مرحومہ نے میرے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہا تو ان کے جسم پر لال چٹے ابھر آئے جو بڑے علاج کے بعد گئے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک ہی مرض کے دو مریضوں کو کون دوا فائدہ کرے گی اور کون نقصان۔ بالخصوص اینٹی بایوٹکس کے معاملہ میں۔

ڈاکٹر پریمانک لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور میڈیکل کالج کشمیر میں سرجری کے پروفیسر

میری ان کی ملاقات ڈاکٹر طاہر مرزا کے گھر پر ہوئی تھی۔ ایک شام ہم لوگ طاہر مرزا کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ میری پیٹھ میں عین ریڑھ کی ہڈی پر گردن سے ایک بالشت نیچے سخت جلن اور کھجلی پیدا ہوگئی۔ تکلیف کی جگہ پر میری انگلیاں بڑی مشکل سے پہنچ پائیں تو مجھ کو محسوس ہوا کہ اس مقام پر ایک گٹھلی سی ہے جس میں سے کچھ رطوبت بھی خارج ہو رہی ہے۔ جب میں نے ڈاکٹر پرمانک اور طاہر مرزا سے اس کا ذکر کیا تو دونوں نے قمیض بنیائن اتروا کر اس کا معائنہ کیا۔ دونوں کی متفقہ تشخیص تھی کہ یہ (Skin Tumour) جلد کی رسولی ہے اور اگر جلد از جلد آپریشن کر کے نکال نہ دی جائے گی تو اس کے (Mnalignant) مسموم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تب میں نے پرمانک سے کہا کہ "یہ تو آپ کا شعبہ" انھوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ "کل دس بجے دن کو میرے آپریشن تھیٹر میں آجائیے، سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ جب میں دوسرے دن وہاں پہنچا تو آپریشن تھیٹر میں ہلکی نیلی روشنی ہو رہی تھی اور پرمانک ایک عورت کے پیٹ کا آپریشن کر رہے تھے۔ آپریشن ٹیبل پر اس کی چھوٹی آنتوں کو کاٹ چھانٹ رہے تھے۔ ایک طرف سے خون جسم کو دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف پیٹ سے خون کی ندی بہ رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔ دوسرا بیہوشی کے مقیاس پر نظریں جمائے تھا۔ نرسیں ڈاکٹر پرمانک کے دائیں بائیں جراحی کے تمام ضروری آلات ٹرے میں لئے کھڑی تھیں اور سب کے سب ان معنوں میں نیم برہنہ تھے کہ ننگے پاؤں، جانگھیا یا منی اسکرٹ اور بنیائن پہنے۔ ہاتھوں پر کہنی تک ربر کے دستانے اور ناک اور منھ کو باریک سفید کپڑوں سے ڈھانکے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے میں یہ آپریشن ختم ہوا تو ایک نرس نے آکر میرے سب کپڑے اور جراب جوتے اتروا دیئے۔ اب میں بھی انڈر شرٹ اور انڈر ویئر میں نیم برہنہ تھا۔ تھیٹر میں داخل ہوتے ہی پرمانک نے اشارے سے میری انڈر شرٹ بھی اتروا دی اور میز پر پٹ لیٹ جانے کو کہا۔ لیٹتے ہی میری پیٹھ پر یخ سے بھی زیادہ سرد کسی رقیق شئے کی بارش ہوئی۔ بمشکل پندرہ سیکنڈ کے بعد اس ٹیومر کے مقام پر مجھ کو تکلیف محسوس ہوئی تو میں نے بیچین ہو کر ڈاکٹر پرمانک سے کراہتے ہوئے کہا کہ "آپریشن میں کتنی دیر لگے گی"۔ اس کے جواب میں انھوں نے تام چینی کے ٹرے میں مٹر برابر گوشت کا ایک ٹکڑا دکھلایا اور بولے کہ "آپ کا آپریشن تو بہت دیر ہوئی ہو چکا۔ اب ڈریسنگ ہو رہی ہے"۔ پٹی بندھوا کر میں تھیٹر کے باہر آیا اور کپڑے پہنے۔ نرس نے دوا کی دو ایک ٹکیاں دیں اور میں گھر واپس آگیا۔

دوسرے دن کی ڈریسنگ آپریشن تھیٹر میں ہوئی۔ تیسرے دن ڈاکٹر پرمانک ڈریسنگ ٹرالی اور عملِ جراحی کے ساتھ مریضوں کے معائنہ پر نکلے ہوئے تھے۔ اور کوری ڈور میں کھڑے کھڑے میری ڈریسنگ کروادی۔ اس شب میرے زخم پشت میں تکلیف دہ درد محسوس ہوا اور میں کاڈو پائرین کھا کر سو رہا۔ جب دوسرے دن اپنا حال لیکر ڈاکٹر پرمانک کے پاس گیا تو آپریشن تھیٹر میں لے جا کر مجھ سے کہا کہ "(sterilized) بیکٹیریا سے پاک ماحول اور کھلی جگہ میں یہی فرق ہے۔ تھیٹر سو فیصد اسٹرلائزڈ ہوتا ہے اور اس کے باہر کی فضا میں لاتعداد قسم کے بیکٹیریا ہوتے ہیں جو کپڑوں میں، آلات میں، مرہم پٹیوں میں آنکھ جھپکتے پہنچ جاتے ہیں اور انھی سے مواد پیدا ہوتا ہے اور اکثر سپٹک اور کبھی کبھی ٹیٹنس بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا نازک اور توجہ طلب مسئلہ ہے مگر ہم لوگوں کے ذرائع بہت محدود ہیں جبکہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں سرجری کے معاملہ میں بیکٹیریا انفکشن پر پورا قابو حاصل ہو چکا ہے۔

کشمیر کے اردو ادیبوں میں مجھ کو نازکی صاحب اور پیر قیصر قلندر بہت پسند تھے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ نہایت خوش مذاق خوش پوش خوش طعام اور دوست قسم کے شریف آدمی تھے۔ درس تدریس، تحقیق اور خدمت ادب کے معاملات میں دھن کے پکے تھے۔ قلی قطب شاہ دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے اور اس کے ثبوت میں ان کے قلمی دیوان کی بازیافت کا سہرا انھی کے سر تھا۔ ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد میں) اس کی عمارت اور اس میں مخطوطات اور نوادر کا ذخیرہ دیکھنے والا عش عش کرتا ہے۔ ایک فرد نے یہ کام تنہا کس طرح انجام دیا۔ میرے ان کے مراسم ایسے تھے کہ دسویں پندرھویں میں ان کے یہاں یا وہ میرے یہاں ضرور آتے تھے۔ ایک شام میرے یہاں آئے بہت خوش و خرم، چائے پی اور اپنے چاندی کے ڈبے سے پان کھائے اور مجھ کو کھلائے اور نہ معلوم کیوں آج گلے مل کر رخصت ہوئے۔ دوسرے دن سویرے ٹیلیفون سے معلوم ہوا کہ زور صاحب کا حرکت قلب رک جانے سے انتقال ہو گیا۔ یہ بخشی صاحب کا زمانہ تھا۔ وہاں پہنچنے پر سری نگر کا کوئی قابل ذکر آدمی ایسا مع بخشی صاحب کے نہ تھا جو ان کے مکان پر موجود نہ ملا ہو۔ پوری صوبائی حکومت سطح کی شان و شوکت سے ان کے سفر آخرت کا ماتمی جلوس چلا

جس کی قیادت خود بخشی صاحب نے کی تھی اور خانقاہ خان یار میں سپردِ خاک کئے گئے۔ وطن واپس آکر میں نے ان پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جس کو میں نے قاضی جلیل عباسی کی نگرانی میں لکھنؤ سے نکلنے والے ایک رسالہ کو بھیجا تھا مگر نہ وہ رسالہ شایع ہوا اور نہ میرا مضمون مجھ کو واپس ملا۔ اس کا مسودہ میرے پاس کہیں محفوظ رکھا ہوگا لیکن اس کو تلاش کرنے کی زحمت کون گوارہ کرے۔

(اس وقت میرے پاس زمانہ وکالت سے اب تک آئے ہوئے کئی ہزار خطوط محفوظ ہیں جن میں چند اپنے موضوعات اور شخصیتوں کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ اسی خود نوشت کے سلسلے میں میں نے ان خطوط کا ایک صندوق کھولا۔ تین چار گھنٹے کی محنت کے بعد دس بارہ اچھے خطوط ملے اور دوسرا ٹین کا صندوق کھولنے کی ہمت نہ پڑی، بہت تھک گیا تھا)۔

ہمارے کالج میں پروفیسر مونس رضا نے ایک بہت اچھی اسکیم شروع کی تھی کہ کالج کے ہر شعبہ کا پروفیسر بالخصوص صدر طلبا اور اساتذہ کے سامنے اپنے پسندیدہ موضوع پر کوئی تحریری یا زبانی، سال میں ایک تقریر ضرور کرے۔ پہلی تقریر انھوں نے خود کشمیر کے تاریخی جغرافیہ پر کی جس میں مغل بادشاہوں کی کشمیر سے دلچسپی اور ان کے سفر کشمیر کے راستوں پر خاص طور پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان کی تحقیق تھی کہ وہ لوگ مغرب میں واقع دسمرگ اور گلمرگ کے دروں سے ہوکر آتے تھے اور مرکزی اور ریاستی حکومت کی مشترکہ توجہ سے ان راستوں کی نشاندہی ہونی چاہیئے۔

(کالج لائبریری سے مجھ کو ایک مستعار بہت پرانی اور بوسیدہ کتاب ملی تھی جس میں اوائل بیسویں صدی کے ایک انگریز سروے آفسر نے اپنے (Theodolite) آلۂ حد براری سے پیمائش کر کے تبت، چین اور ہندستان کی سرحدوں کا تعین کیا تھا۔ NEFA کے سوال پر ہماری حکومت اس کتاب کو استعمال کر سکتی ہے۔ اس کتاب کا خیال مجھ کو مونس صاحب کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے آگیا جس کو یہیں تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوا)۔ ہاں تو بات تھی کالج میں تقریروں کی۔ دوسری سالانہ تقریر ڈاکٹر اظہار حسین صدر شعبۂ ریاضیات کی تھی۔ جس کا مرکزی خیال تھا کہ اعلیٰ اسناد حاصل کرنے کے لئے باہر جانیوالے طلبا کو کن کن امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ڈگریوں کی کتنی قسمیں ہیں اور ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور اس ضمن میں فرنچ اور جرمن زبانوں کا سیکھنا ناگزیر ہے۔ (اس موقع پر ڈاکٹر ثریا ڈاکٹر اظہار کی بیگم بھی موجود تھیں) چنانچہ

دوران تقریر اظہار صاحب نے کہا کہ "غیر زبان جلد از جلد اسی استاد سے سیکھی جا سکتی ہے جو علاوہ اپنی زبان کے کوئی دوسری زبان نہ جانتا ہو اور اگر وہ صنف نازک ہو تو کیا ہی کہنا اور سیکھنے سکھانے والے کے درمیان اس ملک کے قومی مشروب کا بھی ہونا ضروری ہے مثلاً ایک فرانسیسی زبان سیکھنے کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت اور جوان فرانسیسی لڑکی اور شیمپین کی بوتل ہونی چاہیئے۔ ایک مہینہ میں آپ فر فر فرینچ بولنے لگیں گے۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے کے لئے دو ایک فرینچ ریڈرز خرید لیجئے۔ دوسرے مہینے آپ فرینچ لکھنے اور پڑھنے لگیں گے۔ اسی سے زیادہ کم وقت میں غیر زبان سیکھنے کا کوئی اور شارٹ کٹ نہیں ہے۔ رہا ڈاکٹریٹ کی اسناد کا معاملہ تو وہ فرانس میں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک امپیریل .Ph.D جس کے لئے دن رات ایک کر دینا پڑتا ہے جو اس کمترین نے حاصل کی ہے اور دوسری ہے پرادنشل Ph.D جو دو ڈھائی سال میں کسی موضوع پر کسی معیار کا کام کرنے کے بعد اخلاقی طور پر مل جاتی ہے جو میری بیگم کے پاس ہے اور جو اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں"۔ اس ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر میں کچھ اور کہنے کو باقی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر اظہار سے میری خوب چھنتی تھی۔ ان کا شعری مذاق بھی بہت اچھا تھا اور انھوں نے اپنی میٹھی باتوں میں پھنسا پھنسا کر مجھ کو شعر گوئی کی طرف پھر راغب کرایا تھا۔ مصوری، موسیقی خطاطی اور دوسرے فنون لطیفہ سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ میں نے ان کو کئی وصلیاں اور طغرے بنا کر دیئے تھے۔ ان سے مجھ کو اس لئے بھی تعلق خاطر تھا کہ وہ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی سے بہت مشابہ تھے جن کی بہت سی باتیں اظہار صاحب میں ملتی تھیں۔ آج کل علیگڑھ یونیورسٹی میں اظہار صاحب صدر شعبۂ ریاضیات ہیں اور ڈاکٹر ثریا اظہار حسین صدر شعبۂ اردو ہیں۔ مدتوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے اور دونوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔

کشمیر میں اور بہت سے ان دیرینہ احباب، بزرگوں، ادیبوں، دانشوروں، فلمی ستاروں اور فنکاروں سے بھی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں جن سے کوئی نہ کوئی واقعہ، لطیفہ، تجربہ یا مشاہدہ وابستہ ہے جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔

بنے بھائی جب کشمیر آئے تو "پگھلا نیلم" کا مسودہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ڈل کے

کنارے ایک مہمان خانہ میں مقیم تھے۔ خبر پاتے ہی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دل تو بھرا ہوا تھا ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کے قتل عمد اور زیادہ تر اس کے اسباب پر اُن سے بھرا ہوا تھا۔ میں اُن سے کہہ رہا تھا کہ حکومت کو خوش کرنے کے لیے یہ سب حرکتیں کی گئیں اور آپ نے اس کو مناسب سمجھا یا برداشت کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کی Blessing اس میں شامل رہی ہے تو وہ میری اس دیدہ دلیری پر کچھ متعجب اور خفا سے ہو کر کہنے لگے اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ البتہ ہم اس المیہ پر نظر ثانی کر رہے ہیں اور جلد ہی کسی نئی شکل میں انجمن کا احیا کرنے کی سوچ میں ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم کو وسیع تر بنانے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں۔ ہم منشور کو بھی وسیع کریں گے۔ میں نے عرض کیا اب آپ جو کچھ کریں گے اس سے یہی بات ثابت ہو گی کہ انجمن کے Liquaidation کا حادثہ چند ادیبوں کے Brain Barbed wheep کی پرورش سیکڑوں ترقی پسندوں پر کیوں تھوپی جا رہی ہے۔ آپ تو P.W.A کے فاؤنڈر ممبر ہیں اس کو ختم کرنے کے بجائے اس کے منشور کو اسی وقت زیادہ Broad based بنا دیتے تو کیا تحریک کا مقصد حل اور تحریک میں ضروری پھیلاؤ پیدا نہ ہو جاتا۔ وہ برابر یہی کہتے رہے کہ آخر تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اور میں کہتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خوب سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ وہ یہ بھی بتلانا نہیں چاہتے تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے سے پہلے کوئی کل ہند کانفرنس کیوں نہ بلائی گئی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نسیم باغ میں مقیم ڈاکٹر عابد حسین بھی آگئے اور بات بنے بھائی کی شعر و شاعری پر شروع ہو گئی اور بنے بھائی نے "پگھلا نیلم" کی چند نظمیں سنائیں۔ مواد اور زبان کے اعتبار سے یہ نظمیں بہت اچھی تھیں۔ نظم ہو یا نثر اس میں ایک آہنگ ہونا ضروری ہے۔ نثر میں اگر بے موقع منظوم جملہ یعنی موزوں مصرع آجائے تو وہ بھی اتنا ہی برا لگتا ہے جتنا کسی نظم میں ناموزوں یا نثر کا جملہ۔ اس سلسلہ میں میں نے کچھ ان سے کہنا ہی چاہتا تھا کہ عابد صاحب نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا کہ آپ کی اس تخلیق کا کس صنف ادب سے تعلق ہے۔ بنے بھائی نے کہا "نثری نظم" ایک طرح کی بلینک ورس ہے۔ عابد صاحب نے کہا اگر یہ نثر ہے تو اس میں منظوم مصرعے کس طرح آگئے۔ اگر یہ نظم ہے تو اس میں ناموزوں مصرعوں کی کثرت ہے۔ بہرحال نظم کے مصرعے چھوٹے بڑے بھی ہوتے ہیں مگر ان کا موزوں ہونا ضروری ہے۔ اور شاعری کی شرط اول ہے کلام موزوں ہونا۔ بنے بھائی نے

کہا بہر حال یہ ایک تجربہ ہے دیکھنا یہ ہے کہ یہ قبول عام ہوتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں "پگھلا نیلم" شدت خیالات اور اپنے استعارات اور علامات سے مالا مال ہے۔ پرواز تخیل بھی بہت بلند ہے مگر اس میں نثر و نظم کا امتزاج sans harmony بے آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زین العابدین احمد جو ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہوں میں ہیں اکثر کشمیر آیا جایا کرتے تھے اور جب بھی آتے مجھ کو ملاقات کا شرف ضرور بخشتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اس زمانہ میں آئے جب کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور CPI اور CPI (M) بن چکی تھی۔ تحریک کے اس المیہ پر میں بیحد محزون تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے میں اس مسئلہ پر بحث پڑ گیا کہ پارٹی کے حصے بخرے آخر کب تک ہوتے رہیں گے۔ جہاں تک اندرونی تضاد (Inner struggle) اور تصادم کا سوال ہے وہ ناگزیر بھی ہے اور مارکسزم لینینزم کے اقوال سے قابل حل بھی تو اس بحران کو آپس کی گفت و شنید سے کیوں حل نہیں کیا جا سکا۔ ہم کب تک یوں ہی تقسیم ہو ہو کر کمزور سے کمزور تر ہوتے جائیں گے۔ آپس کے اختلافات سے تحریک کا مقصد زیادہ عظیم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم بائیں بازو کی دوسری جماعتوں کو اپنے ساتھ لائیں اپنے ہی کو اندرونی اختلافات کی بنا پر تقسیم کرتے رہیں۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس تقسیم پر اظہار افسوس کرتے ہوئے وہ اس کو ناگزیر ثابت کرتے رہے اور میں باوجود تحریک سے اپنی غیر مشروط وابستگی کے اس امر کو تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوا کہ یہ بحران لاینحل تھا۔ اس گفتگو کو کم و بیش بیس برس ہو چکے ہیں اور آج آپس میں مصالحت کی وہ تمام مساعی دیکھی جا سکتی ہیں جن کو Rift کے پہلے ہی روبکار لانا چاہئے تھا۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ دیر آید درست آید۔ مگر یہ سوال میرے ہونٹوں پہ تاحیات رہے گا کہ کیا (Floor of the House) فرش ایوان سے کوئی عوامی انقلاب لایا جا سکتا ہے اور اگر ممکن ہے تو کیا وہ دیرپا رہ سکتا ہے۔ جواب میں کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ایسے انقلابات آئے مگر جڑیں کمزور یا مصنوعی ہونے کے سبب سے قائم نہ رہ سکے۔ اور جس سواری سے آئے اسی سواری سے واپس چلے گئے۔

انسان میں اگر صبر، ہمت اور فراست ہو تو وہ بد سے بدتر حالات میں بھی کامران ہو کر اپنے لیے ایک بلند اور پائدار مقام پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی مثال میں ڈاکٹر وارث کرمانی کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اس سے عظیم تر مثال ڈاکٹر وزیر حسن عابدی کی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری جوانی اپنے عیال کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے کمیون میں ہول ٹائمر کی حیثیت سے گزاری۔ تحریک کی جس طرح

خدمت کی وہ بھی مثال ہے۔ ان کے بڑھتے ہوئے خاندان اور بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو دیکھ کر پارٹی نے اجازت دیدی کہ کھانے کمانے کا کوئی پیشہ اختیار کرو۔ چنانچہ وہ شیعہ کالج لکھنؤ میں ایک چھوٹی تنخواہ پر ریاضی کے استاد ہو گئے اور اسی دوران انھوں نے .Ph.D کی سند بھی حاصل کر لی۔ علاوہ ہم وطن ہونے کے میرا ان کا رشتہ کامریڈ ہونے کا زیادہ تھا۔ جب ہمارے کالج میں ریاضی کے سینیر استاد کی ایک جگہ خالی ہوئی اور اس کا اشتہار ہوا تو میں نے درخواست کا ایک فارم خرید کر ان کو اس مضمون کے ساتھ روانہ کر دیا کہ اس کی خانہ پوری کر کے ضروری اسناد کے ساتھ مجھ کو واپس کریں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ انکے تعلیمی نتائج بہت اچھے تھے اور کشمیر پبلک سروس کمیشن، کشمیر یونیورسٹی اور کالج کی ایک مخلوط ہائی پاور سلکشن کمیٹی نے ڈاکٹر عابدی کو اتفاق رائے سے اس آسامی کے لیے منتخب کر لیا۔ ان کو ایڈوانس انکریمنٹ بھی ملا تھا مگر کشمیر کی سخت سردی، فلک بوس گرانی نے ڈاکٹر عابدی کی اقتصادی پریشانیوں کو کم نہ ہونے دیا۔ ایک دن پریشان حال وہ میرے کمرہ میں آئے اور بیان کیا کہ "اب اس کا کیا علاج ہے کہ اسکاٹ لینڈ کی ایک موقر یونیورسٹی سے ان کو ریاضی میں ریسرچ پروفیسر کی جگہ کا ایک معتد بہ تنخواہ پر دعوت نامہ آیا ہے مگر جیب میں بجلی اور دوکانداروں کے غیر ادا شدہ مطالبوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے"۔ میں نے کہا بخاری کے پاس بیٹھے چائے پیجیے اور ہم دونوں مل کر دعا کریں اور کوئی حل نکالیں کہ یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ڈاکٹر طاہر مرزا کے یہاں کبھی کبھی بہت اچھے اور علم دوست حضرات سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ ایک ادب کے پرستار پنجابی شریف آدمی کا خیال آتے ہی میں نے عابدی سے کہا کہ ابھی تین بجے میں دیر نہ کیجئے اور فوراً میرے ساتھ سری نگر چلیے۔ نسیم باغ کے پھاٹک پر پہنچتے ہی سری نگر کی بس مل گئی اور ہم لوگ بیس تیس منٹ میں پنجاب نیشنل بینک کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ بینک کے اہلکاروں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ان سب پر اپنے اپنے گھر دن کا بھوت سوار ہے۔ فرسٹ کلاس کے ایک دروازہ پر لکھا ہوا تھا Manager اور ہم لوگ بغیر اجازت لیے اندر داخل ہو گئے۔ "لیجیئے صاحب یوں تو عرصہ سے آپ کو ایک معقول اور خلیق آدمی سمجھتا رہا ہوں مگر اس وقت آپ کا یہ امتحان مقصود ہے کہ کچھ کام کے بھی آدمی ہیں یا بس ملاقات پر اظہار مسرت ہی کرنا جانتے ہیں"۔ اسے بھی کچھ کہئے تو اور تب دیکھئے کہ میں کیا کیا کر سکتا

ہوں۔ کے لاکھ روپئے کی ضرورت ہے۔ فرمایئے اور اگر ابھی پھر سے دفتر کھلوا کے اپنی ضمانت پر روپئے نہ دیدوں تو نام ا نہیں۔

"عام فائدہ کے لیے قاعدہ کے خلاف کام کرنے میں مجھ کو بہت مسرّت ہوتی ہے" اور اُسے میں نے عابدی کے سارے مسائل بتا دیے اور یہ بھی کہ ان کے پاس علاوہ علم اور نوکری کے اس وقت کوڑی نہیں ہے۔ پہلا خرچہ یہاں سے اڈنبرا تک ہوائی سفر کا خرچ مع اضافی اخراجات کے۔ دوسرا یہ کہ ہر مہینہ بینک کے نام ڈھائی سو پونڈ آیا کریں گے۔ آدھا ان کے اکاؤنٹ میں اور آدھا بیگم عابدی کے نام بینک میں جمع کروں گا" میں نے اپنے سامنے سب بانڈ وغیرہ بھروائے اور بینک کے پیسوں سے اچھا فوراً اس وقت تو ان کو آپ دس ہزار روپے ایڈوانس کر دیں تاکہ آج ہی سے یہ سفر کی تیاری شروع کر دیں اور اسکاٹ لینڈ کیبل دیدیں کہ جلد از جلد آ رہے ہیں"۔ معاہدہ پر انھوں اور میں نے بحیثیت ضامنوں کے دستخط کئے اور ہمیشہ کے لئے بھول گئے۔ عابدی نے نئی زندگی پائی۔ پیٹ بھر کے کھانے کو تو ملنے لگا مگر سخت سردی سے عابدی کی نہ ولایت میں گلو خلاصی ہوئی اور نہ ان کے عیال کو سری نگر میں۔ وہ وہاں ڈھائی سال رہے۔ اور وہیں آسٹریلیا کے ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کو سڈنی لیجانے پر مصر ہوا۔ مگر عابدی اس سے ایک سال کی مہلت مانگ کر کشمیر واپس آگئے اور میرے لیے ایک Dunhill Brier لائے۔ سری نگر سے پھر شیعہ کالج کے پرنسپل ہو کر لکھنؤ گئے اور وہاں سے مع اپنے اہل و عیال کے آسٹریلیا۔ اب ریٹائر ہو کر ایک آسودہ حال زندگی لکھنؤ میں بسر کر رہے ہیں۔ ان کا خط آیا تھا اُسی سے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ آج کل UNESCO کے کسی بڑے پروجیکٹ پر حسب دستور گھٹنے ٹیک کر کام کر رہے ہیں اور خوش ہیں۔

صادق صاحب کے عہد کشمیر میں ہندوستان کے دوسرے دانشوروں کے دورے بھی ہوا کرتے تھے مثلاً مخدوم محی الدین، ظ۔ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور نیاز حیدر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر بڈشاہ ہوٹل میں قیام کیا کرتے تھے البتہ نیاز حیدر میرے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ نیاز حیدر مغلوب الغیظ ہوتے ہوئے صادق اللہجہ ادیب تھے۔ اور وہ اکثر بمبئی کے ادیبوں کے ناگفتہ بہ اور ناقابل اشاعت حالات سناتے تھے جس کو سن کر تعجب اور افسوس ہوتا تھا۔

ظ۔ انصاری کا کہنا تھا کہ کشمیر میں بالعموم عورتوں کی ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ سر بڑا اور اوپر کا دھڑ

لمبا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے ان کے حسن میں اس عدم تناسب کی وجہ سے کمی پائی جاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی ان سب کو الگ سے بالاتر ہو کر علمی باتیں کیا کرتے تھے۔ مخدوم محی الدین نے عالم خوندمیری کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ جس جدیدیت کا ہندوستان میں ڈنکا بج رہا ہے اس کو فرانس اور تقریباً پورے یورپی ممالک میں ٹی ایس ایلیٹ کا ایک دھوکا سمجھ کر آؤٹ آف ڈیٹ کہا جا رہا ہے۔ اپنے نوٹ کے ساتھ اس خط کی اشاعت کا وہ منصوبہ بنا رہے تھے کہ ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ہندوستان میں جدیدیت کی گرم بازاری کو وہ C.I.A. کی جدوجہد کا ایک شاخسانہ کہتے تھے۔

ایک زمانہ میں کسی فلم کی شوٹنگ اور ریکارڈنگ کے سلسلہ میں اپنے پروڈیوسر کے ساتھ مجروح بھی آئے تھے۔ یہ پورا قافلہ اوبرائے پیلیس ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ خبر ملتے ہی میں مجروح سے ملنے سردار بونت سنگھ کی کار پر گیا۔ مجروح اپنے یار کی حیثیت سے بڑے تپاک سے ملے مگر کچھ بے کیف اور سست سے دکھائی دے رہے تھے۔ کہنے لگے۔ یہاں تفریح کے لیئے آئے تھے مگر اب تک تم سے ملنے تک کی فرصت نہ ملی۔ اور کشمیر کے اس سب سے بڑے اور گراں ہوٹل کے کھانے سے تنگ آگیا ہوں۔ خیال تھا کہ تمہارے یہاں چھپ کر آرام کریں گے اور اگر ٹراؤٹ کے شکار کا انتظام ہو جائے تو زندگی آجائے''۔ میں نے مڑ کر سردار بونت سنگھ کو دیکھا۔ Trout Fishing ان کی ہوبی تھی اور وہ کشمیر میں Casting اور Spining کے سب سے بڑے ماہر شمار کئے جاتے تھے۔ میرے اشارہ پر سردار صاحب نے ٹراؤٹ کے شکار کا ذمہ لے لیا۔ اور منصوبہ یہ بنا کہ ہم لوگ مجروح کو اغوا کر کے چلیں۔ ان کا طعام و قیام میرے یہاں رہے گا۔ اور دو تین دن تک سردار صاحب کی رہنمائی میں مسلسل ٹراؤٹ فیشنگ کریں گے شکار میں پیکڈ لنچ ساتھ کار میں لیجاتے تھے۔ دن بھر کبھی لیدر واٹ میں کبھی گاندربل میں دریائے سندھ کے بالائی حصّہ میں شکار کھیلا کرتے تھے اور شب میں ٹراؤٹ کے انواع و اقسام کے پکوان تیار کئے جاتے تھے جس میں میری بیگم بہت بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی تھیں۔ دنیا کی سب سے نازک، خوش ذائقہ، خوشبودار اور فرائی بینی پر سب بیٹھ نہ لگوانے والی مچھلی یہی ایک ہے۔ غرض کہ ہم لوگوں نے تین دن تک عیش کیا اور مجروح مجھ سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ اب سے پہلے تک تو ہم لوگ دوست تھے مگر اب میں تم پر عاشق ہو کر جا رہا ہوں۔ عشق کے وجوہ کئی ہیں جو ہم دونوں کے درمیان ایک گھریلو راز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلراج ساہنی ایک زمانہ میں انڈین پیپلز تھیٹر کی روح رواں تھے اور ان سے میری کافی بے تکلفی اور تعلقات تھے۔ بعد میں وہ فلموں میں چلے آئے تھے اور جو بے داغ نام اور شہرت ان کو ملی کسی اور کو نہ ان کے پہلے اور نہ ان کے بعد نصیب ہوئی۔ بڑے پڑھے لکھے آدمی اور ادب و فنون لطیفہ کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ فلم میں نام اور دولت پیدا کر لینے کے بعد بڑے بڑے کسر نفسوں اور متوازن مزاجوں کا توازن باقی نہیں رہتا مگر بلراج ساہنی ایک ایسا اشتراکی گذرا ہے جس نے علاوہ اپنے نظریات کو عام بنانے کے کوئی دوسرا رول ادا نہیں کیا۔ یہ واحد فلمی ستارہ تھا جو پردۂ سیمیں پر اپنی زندگی برتنے میں ہر دو رخ سے ایک ہی کردار نظر آتا تھا۔ سری نگر کے ایک بہت بڑے ہال میں بیگم اختر اور دمینتی جوشی کتھک رقاصہ کا فنی مظاہرہ ہو رہا تھا۔ میں قدرے تاخیر سے پہنچا تھا تو سب سے پیچھے والی قطار میں مجھ کو جگہ ملی تھی۔ دمینتی جوشی کا رقص ختم ہونے کو تھا اور میں اس میں دل ہی دل میں اسی دمینتی جوشی کو تلاش کر رہا تھا جو ۱۹۴۶ء میں بنارس میوزک کانفرنس میں آئی تھی۔ آج نہ ایک بے عیب کلاسیکی فنی رقص کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر نہ اس کی کمر میں پیا عدد بازو اور چشم و ابرو میں جوانی کی پہلی سی وہ امنگ تھی نہ حسن کا جادو تھا نہ گھنگروؤں کی جھنک بلکہ طبلہ کی تھاپ پر غالب آ رہی تھی۔ فنی رقص ایک گرامر تھی جو حاضرین کو پڑھائی جا رہی تھی۔ ابھی میں اسی خیال میں غوطے لے رہا تھا کہ میرے بغل کی کرسی پر ایک مرد معقول نہایت خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ رقص ختم ہوا اور ہال میں روشنی ہوئی اور میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ تشریف رکھتے ہیں۔ تقریباً پندرہ سال کے بعد یہ ملاقات ہوئی تھی۔ پہچاننے اور اپنے کو پہچوانے میں کبھی کوئی Risk نہیں لیتا۔ میں کبھی کسی سے یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے مجھ کو پہچانا۔ اس میں خود ذلیل ہونے اور دوسرے کے ذلیل ہونے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ان سے کہا "ساہنی صاحب میں وامق جونپوری ہوں۔ آپ کا دیرینہ ساتھی اور بلاشک وشبہ آپ بلراج ساہنی ہیں"۔ یہ سنتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور بہت کس کے مجھ سے گلے ملے "وامق صاحب آپ میں اتنا تغیر ہو گیا ہے کہ اگر آپ پہلے ہی اپنا نام نہ بتلا دئیے ہوتے تو مجھ کو بہت ہی شرمندہ ہونا پڑتا"۔ اب بیگم اختر غزلیں اور ٹھمریاں سنا رہی تھیں اور ہم لوگ ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے پیش نظر مظاہرہ پر ایک نوعیت کا دلی کرب محسوس کر رہے تھے۔ میں نے بلراج ساہنی سے کہا "آپ کو اس وقت اس کا گانا کیسا لگ رہا ہے"۔ وہ بہت مہذب انسان تھے بولے "میں اسی زندہ پروگرام

کو اس لئے اہم سمجھ رہا ہوں کہ ہماری ایج گروپ کے لوگوں کا چل چلاؤ ہے۔ یہ درست ہے اب بیگم اختر کی نہ وہ آواز ہے اور نہ زبان کی وہ چٹاخ پٹاخ۔ بلکہ احساس ہوتا ہے کہ زبان کچھ موٹی ہو گئی ہے۔ چہرہ پر بھی نور کی کمی ہے۔" "آپ نے بالکل میرے خیال کی ترجمانی کی ہے"۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بیگم اختر ہوٹ ہو گئیں اور وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ اور ہم لوگ بھی ہاتھ میں ہاتھ دیے ہال سے باہر آ گئے۔ ایک تانگہ کیا اور بنڈ پر "احدو" میں کھانا کھایا اور ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد نہ میں نے پھر کبھی بلراج ساہنی، مخدوم محی الدین اور نہ اختر بیگم کو دیکھا نہ سنا۔ مخدوم کی موت پر ایک مختصر مضمون میں نے پڑھا تھا جو سری نگر، دہلی، حیدرآباد، بھوپال اور لکھنؤ ریڈیو سے کئی بار نشر ہوا۔

یوں تو کشمیر میں فلمی ستاروں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا تھا مگر کشمیر کی زندگی کے اس رخ سے مجھ کو کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ بچوں کے اصرار پر شرمیلا ٹیگور سے ملنے کو دل ضرور چاہا۔ میری بہن معصومہ اور بہنوئی اختر عباس مع اپنے بچوں کے آئے ہوئے تھے اور شیریں بھی موجود تھی۔ آغا علی شاہ جو اس زمانہ میں کشمیر کے کوتوال شہر تھے اور اختر عباس کے مراد آباد سے پولیس ٹریننگ کالج کے شاگرد تھے ان سے ملنے آئے تھے اور سب کے اصرار پر شرمیلا ٹیگور سے ملاقات کروانے کا ذمہ لے لیا بلکہ اپائنٹمنٹ حاصل کر لیا۔ شرمیلا ٹیگور کی یہ پہلی فلم تھی اور کشمیر کا سفر بھی پہلا۔ وہ ایک Super Delux ڈل کے ہاؤس بوٹ میں ۹ بجے صبح اپنے مہمانوں کا انتظار کرتی ہوئی ملی۔ قیافہ سے نہایت شریف معلوم ہوتی تھی۔ اس کا حسن بھی کلاسیکی تھا۔ ٹیگور کے خاندان کا رنگ گورا تو ہوتا ہی ہے مگر ناک نقشہ عام ستاروں کے ڈولتی انداز سے مختلف تھا۔ بہت کم گو اور اپنے مستقبل کی طرف سے قدرے نروس معلوم ہوتی تھی۔ آج کل کے فیشن میں داخل کوڑیوں کی طرح موٹے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ بالکل مختلف تھے جن کو دیکھتے ہی میر صاحب کا شعر یاد آیا کہ ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بحیثیت مجموعی وہ فلمی دنیا میں حسن و اخلاق کا ایک نمونہ لیکر داخل ہوئی تھی جس کو بہت مدت ہوئی ارباب فلم فراموش کر چکے تھے۔ "پنکھڑی اک گلاب کی "سی" ہے"۔ "سی" کا استعمال ہمارے ادب میں جا بجا بہت ہوتا ہے مگر میر صاحب کی اس "سی" جیسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہمارا خاندان اور بالخصوص لڑکیاں اسی کو بور کرتی رہیں۔ اور ہم لوگ خوش خوش فلیٹ

پر واپس آئے۔ اس کے مدتوں بعد کسی اخبار سے معلوم ہوا کہ نواب پٹودی کرکٹ Skipper کی شرمیلا سے شادی ہو گئی اور اس طرح مزید مسرت یہ ہوئی کہ ہماری "بیا" بیگم پٹودی و بھوپال کی وہ بہو ہو گئی۔
اب سنئے میر صاحب کے استعمال "سی" کا معجزہ اور تجزیہ۔ کشمیر فنون لطیفہ کے پرورش کے لئے فرد وس فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اس کی سڑکوں پر سر تا برہنہ یا جین اور جرکن میں ملک کے چوٹی کے مصوروں مثلاً حسین اور ستیش گجرال کو دیوانہ وار چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ خود کشمیر نے بھی ملک کو اچھے اچھے مصور دیے ہیں چنانچہ انہی نوجوان فنکاروں میں سے ایک فنکار خواجہ غلام السیدین سے ملنے آیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے اردو شاعری کو مصوّر کرنے میں اپنی پوری صلاحیت پر قابو حاصل کر لیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ خواجہ صاحب اس کا امتحان لیکر اس کو اسی فن کی سند دیدیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا میں شعر لکھ کر دیتا ہوں تم اس کو مصوّر کر کے لاؤ۔ اور اگر میں تمہارے کمال کا معترف ہو جاؤں گا تو تم کو ضرور سند دوں گا اور تمہاری تربیت اور ترقی کے لئے پوری کوشش بھی کروں گا۔ اور وہ وہی میر صاحب کا شعر تھا جس کا دوسرا مصرع تھا "پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے"۔ کب تک تصویر بنا کر لاؤ گے۔ پرسوں شام تک۔ میں نے کہا میں بھی اس تصویر کو دیکھنے آؤں گا۔ غرض کہ وہ شام آئی مصور آیا تصویر لایا اور خواجہ صاحب نے اس تصویر کو بغور دیکھنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی شے وہ اس تصویر میں ڈھونڈ رہے ہیں جو مل نہیں رہی ہے۔ مصوّر نے دریافت کیا "آپ کیا تلاش کر رہے ہیں"۔ "یہ تصویر تو واقعی تم نے بہت اچھی بنائی ہے مگر اس میں مجھ کو ایک چیز نہیں مل رہی ہے"۔ "وہ کیا" تو خواجہ صاحب نے فرمایا "اس کے لبوں میں مجھ کو مصرع کا لفظ "سی" نہیں مل رہا ہے۔ اس میں تم نے لبوں کو گلاب کی پنکھڑیوں سے بالکل ملا دیا اور کمال کیا ہے مگر میر صاحب کہتے ہیں اس کا کہ ہونٹ گلاب کی پنکھڑی نہیں ہیں بلکہ گلاب کی پنکھڑی "سی" کوئی چیز ہے اور یہیں سے شاعر کے ذہن میں محبوب کے لب کی جو تصویر ہے اس تک تمہارا قلم نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا ہے۔ شاعری اور مصوری میں یہی فرق ہے کہ تم اس شعر سے بھی اچھی تصویر بنا سکتے ہو مگر شعر میں مضمر بے شمار ایسے پہلو ہیں جن کا پینٹ کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ شاعر اگر مصور بھی ہے تو وہ اپنے اشعار کو بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ پینٹ کر سکتا ہے۔

ہمارے کالج کی ورکشاپ کے سپرنٹنڈنٹ شرما جی اور سردار بلونت سنگھ نے

دن رات ایک کر کے ایک موٹر لانچ تیار کی جس میں بہت طاقتور انجن فٹ کیا اور اس میں بیس پچیس آدمی ڈل کی سیر کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس کے میڈن وائج پر پرنسپل احمد اور ان کا سکریٹریٹ ڈل کا چکر لگانے کے لیے نکلے۔ طے ہوا کہ پہلے چار چنار چلیں گے۔ اس کے بعد نہرو پارک تک جا کر واپس آئیں گے۔ جب ہم لوگوں کا لانچ چار چنار (ڈل کے وسط میں ایک جزیرہ جس میں چنار کے چار درخت چار سائبان اور چاروں جانب سیڑھیاں ہیں) پہنچا تو وہاں ایک موٹر بوٹ پہلے سے موجود تھی اور ایک چنار کے درخت کے نیچے سفید ساری میں ایک خاتون اور ان کے دو باڈی گارڈ موجود تھے ہم لوگوں کے پہنچنے سے ان کے سکون میں جب خلل پڑا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ سردار بونت سنگھ نے ان کے محافظوں سے دریافت کیا کہ یہ کون دیوی جی ہیں تو معلوم ہوا "لتا منگیشکر" ہیں تنہائی اور سکون کے لئے شالمار سے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر احمد نے کہا آپ لوگ یہیں آرام کیجئے۔ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ ابھی ہماری لانچ چلی بھی نہ تھی کہ پانچ چھ موٹر بوٹوں نے جن میں طلبا سوار تھے آکر چار چنار کو گھیر لیا ۔ اور چند نے بڑھ کر لتا منگیشکر سے گانے کی فرمائش کر دی۔ اس پر لتا منگیشکر کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ اپنے محافظوں کی مدد سے اپنی موٹر بوٹ میں جا بیٹھیں اور وہاں سے تیز رفتاری سے بھاگنا چاہا۔ مگر طلبا نے ان کو مجبور کیا کہ جب تک وہ گانا نہ سنا لیں گی ان کی کشتی آگے نہیں جا سکتی اور وہ کسی طرح گانے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اتنی دیر میں دور پولیس کی کشتیاں وہاں پہنچ گئیں اور سپاہیوں کو لاٹھی چارج کرنا پڑا تب لتا منگیشکر اپنی کشتی میں نکل بھاگیں اور اس کے پیچھے طلبا کی کشتیاں پیچھا کر رہی تھیں۔ نتیجہ کیا ہوا معلوم نہیں مگر ہم لوگ چار چنار ہی سے اپنے کالج واپس آگئے۔

۱۹۶۶ء میں میں ترقی کر کے ڈپٹی رجسٹرار ہو گیا مگر اس ترقی سے میری تنخواہ یا کام کی نوعیت میں کوئی فرق نہ آیا بس عہدہ کا نام بدل گیا تھا۔

پیر غیاث الدین جب صادق وزارت میں شامل کئے گئے تو میں ان کو مبارکباد دینے گیا۔ پیر غیاث الدین بڑے جوشیلے کامریڈ اور باعمل مارکسسٹ تھے۔ چند خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے ان کو سال میں ایک بار جامہ و دستار پیری بھی پہننا پڑتی تھی۔ میں چونکہ جذباتی طور پر ان سے بڑی قربت محسوس کرتا تھا اسی لیے دوسروں کے مقابلہ میں ان کے یہاں زیادہ جایا بھی کرتا تھا اور کبھی کبھی باز دید کے لیے وہ بھی میرے یہاں آتے جاتے تھے۔ یہ اختلاط کچھ مشترک دوستوں کو غیر ضروری معلوم ہوا

اور میرے کانوں میں یہ افواہیں آنے لگیں کہ پیر غیاث الدین میری کثرت آمدورفت سے بور ہو رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ آخر مرے کتنے کام وہ کر سکتے ہیں۔ میں کان کا کچا بھی ہوں اور افواہ اڑانے والے احباب سے بھی میرے دیرینہ تعلقات تھے۔ ان سب کا مجھ پر مجموعی رد عمل یہ ہوا کہ وہ زمانہ اور آج کا زمانہ میں نے پیر غیاث الدین کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ دل سے چاہتے تھے کہ میرے ساتھ کوئی سلوک کریں مگر میں مطلبی تعلقات والا آدمی نہ کبھی تھا اور نہ ہوں۔ تو بہت ممکن ہے کہ اپنی انا کو تقویت پہنچانے کے لیے یہ شوشا انھیں نے چھوڑا ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

قیام کے آخری تین برسوں میں آغا مظفر I.A.S. ان کی بیگم اور صاحبزادی سے میرے مراسم بےحد بڑھ گئے تھے۔ ہمارے فلیٹ اور ان کے ذاتی مکان کے حد فاصل کے طور پر صرف دریائے جہیلم درمیان میں تھا۔ کم ازکم ہر اتوار کے دن کا زیادہ حصہ انھیں میاں بیوی کے ساتھ گذرتا تھا۔ نہایت خلیق، نہایت حسین اور متوازن جوڑا تھا۔ نہایت کلچرڈ اور یہ کہ وہ میری شاعری بغیر ٹیپ ریکارڈ کے کبھی نہ سنتے تھے۔ بیگم مظفر فرمایا کرتی تھیں "یہ سب ٹیپ ہم اپنے اعزہ کو نئے سال کے تحفے کے طور پر لاہور بھیجتے ہیں یا ساتھ لے جاتے ہیں۔ کشمیر میں ہر قابل ذکر شخصیت سے میری دوستی تھی مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مظفر اور ان کی بیگم سے مل کر میں اپنے کو بہت زیادہ مسرور کیوں پاتا ہوں۔ ایک روز وہ لوگ اپنے ٹرف پر بیٹھے ہوئے سنہری دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ میں ان کے تخلیہ میں مخل ہوا۔ سردی کے اثر سے سر میں سخت درد تھا۔ عام طور پر ان کے یہاں قہوے کی خاطر سے کافی بن کر آتی تھی مگر اس دن یہ ہوا کہ وہ اٹھ کر فوراً اپنے مکان میں گئے اور ایک ہاتھ میں ایک شیشے کا پرکولیٹر اور دوسرے میں گھر کی کھنی ہوئی چیری برانڈی کی بوتل لیے ہوئے وارد ہوئے۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ پرکولیٹر دیکھتے ہی حفاظت حسین صاحب کمشنر بنارس کا خیال اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ مظفر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ حفاظت صاحب اور رضیہ بیگم سے کس قدر مشابہ ہیں۔ اور اس دن تحت الشعور کی کارفرمائیوں کا مجھ کو دل سے قائل ہونا پڑا۔ مظفر صاحب نے کافی اور چیری برانڈ سے میرے درد سر کا علاج کیا۔ اب جب کبھی حفاظت صاحب کا خیال آتا ہے تو آغا مظفر بھی یاد آتے ہیں اور جب آغا مظفر صاحب کا خیال آتا ہے تو حفاظت صاحب یاد آتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور کو قلم بند کرنے کے بعد بھی یہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ بیان اک رخا ہے

اور کشمیر سے وابستہ ابھی بہت سی ایسی یادیں ہیں جن کے پیروں پر چل کر اس خطۂ جنت نشاں کے ذکر کو اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ مگر خود نوشت کی پابندیاں قلم کو جولانی دکھلانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ تاہم کشمیر کی اتھاہ الماسی تراش خراش سے مفر نہیں۔

کشمیر کی چند خصوصیات باب کے ابتدائی حصہ میں تحریر کر چکا ہوں جس میں قدرے اضافہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ دنیا میں کوئی دریا نہیں جس کے منبع کا تعین چند گزوں کے اندر کیا جا سکے۔ البتہ جہلم وہ واحد دریا ہے جو وادی کشمیر کے جنوب مشرق کوہ ہمالہ کے دامن میں بسے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں ویری ناگ میں چند پختہ اور زیادہ تر ریخ بستہ حوضوں میں سے ابلتے ہوئے دس بارہ قدرتی فواروں سے اپنا سفر شروع کر کے تھوڑی دیر آرام کر کے اور غسل کر کے پاکستان میں دریائے سندھ کے کاندھوں پر سوار ہو کر پاکستان سے گزرتا ہوا بحیرۂ عرب سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

دریائے جہلم اور یہاں کی جھیلوں کے علاوہ کشمیر کا ذریعہ آب پاشی یہاں کی برف باری ہے جس سال برف باری کم ہوئی اور اہل کشمیر کو سردی کی صعوبت کم برداشت کرنا پڑی تو قحط سالی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی پگھلی ہوئی برف ہے جو دھان کی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی باغات اور میدانی کشت کو سیراب کرتی ہے۔ ہم نے جواہر سرنگ میں برف کے جھاڑ فانوس دیکھے ہیں جن پر جب کار کی روشنی پڑتی ہے تو نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ (icicles) برفیلی سلاخوں اور آئینوں سے بنا ہوا ان میں کا ایک جھاڑ گر کر سرنگ میں سے گذرتی ہوئی کار کو بالکل چپٹا کر سکتا ہے۔ اس قدر وزنی ہوتا ہے۔

"مثل مشہور ہے کہ کیوں ہنس رہے ہو کیا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہے"۔ اس کا مطلب عام طور پر غلط لیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زعفران کا کھیت دیکھ کر اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے کہ یہ بھی سفر کی اتنی تکلیف برداشت کر کے دیکھنے والی کوئی چیز ہے۔ کشمیر کے پھولوں میں زعفران کا پھول واحد بدبودار پھول ہے۔ اس کے پھول میں سرخ رنگ کے ایک ایک انچ لمبے تین زیرے ہوتے ہیں اور جب وہ خشک ہو جاتے ہیں تب اس میں سے رنگ و بو کا طوفان پھوٹ نکلتا ہے۔

کشمیر کی سب سے چھوٹی جھیل مانس بل ہے اور یہی سب سے خوبصورت بھی ہے۔ پانی کا اتنے رنگ بدلتے ہوئے میں نے کسی اور جھیل میں نہیں دیکھا

کشمیری زبان فی الاصل ایک بولی تھی جس کو چند تاریخی ہستیوں اور ان کی تخلیقات نے ادبی

کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مثلاً حبّا خاتون کے عوامی گیت، رسل میر کے شہری گیت اور اب بہت سے کشمیری ادیبوں میں دینا ناتھ نادم کا نام سرفہرست آتا ہے۔ یوں تو کشمیری زبان میں اردو، فارسی، عربی، ترکی اور بہت سی دوسری زبانوں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر اس پر سب سے زیادہ جس زبان کے اثرات پائے جاتے ہیں وہ سنسکرت ہے۔ چنانچہ اپنے نو سال کے قیام میں میں نو دس کشمیری فقروں سے زیادہ نہ سیکھ سکا۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ کشمیر کی سرکاری زبان اردو تھی اور ہر کشمیری اگر اردو بول نہیں سکتا تو سمجھ ضرور لیتا تھا اور اسی طرح کام چلتا رہا۔ دوسرے کی زبان تو مجبوراً ہی سیکھی جا سکتی ہے۔ کشمیری زبان کے نشاۃ الثانیہ سے پہلے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں ادیبوں کا مغل اثرات کی وجہ سے فارسی کا عالیشان دور رہا ہے۔ ان میں مہجور کاشمیری کی شاعری کا چرچہ ایران تک میں ہوتا تھا۔ مہجور نے اپنے کسی فارسی شعر میں "کرال پن" استعمال کیا تھا اور جو ایرانی فارسی لغت میں نہ ملا تو وہاں سے ایک فارسی محقق پیدل سفر کر کے کشمیر پہنچا اور مہجور کاشمیری سے مل کر "کرال پن" کا مطلب دریافت کیا اور یہ کہ وہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مہجور نے بتلایا کہ "کرال" کے معنی ہیں کمہار مٹی کے برتن بنانیوالا اور "پن" سوت کے اس ڈورے کو کہتے ہیں جس کی مدد سے چاک سے تراشی کر وہ برتن اتارتا ہے" اور تب سے "کرال پن" فارسی لغت میں داخل ہے۔ اب بھی وہاں مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں کے پرانے خاندانوں میں فارسی غزل لکھنے کا رواج باقی ہے۔ اگر کشمیر کی قدیم اور جدید فارسی غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا جائے تو بعد تحقیق وہ کسی بھی حافظ، سعدی یا نظیری سے کم تر نہ ملے گا۔

بہت سے لوگوں میں نئی زبان بلا ضرورت سیکھنے کا بھی ایک خبط ہوتا ہے۔ چنانچہ میری بیگم صاحبہ ایک بار اس خبط میں مبتلا ہوئیں۔ بازار سے دو تین کشمیری قاعدے اور مختصر لغت خرید کر لائیں اور رٹنا شروع کیا۔ یہاں یہ اضافہ کر دینا ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھا لیتی تھیں اسی کو پورا کر کے دکھلا دیتی تھیں۔ چنانچہ علیگڈھ میں انھوں نے ادیب ماہر جامع علیگڑھ کا امتحان بلا سمجھے ہوئے کتابیں رٹ کے سیکنڈ کلاس میں پاس کر لیا تھا۔ یہاں امتحان تو نہیں مگر کشمیری بولنا بولنے اور سمجھنے کا شوق ہوا تھا۔ اس دور سے گذر رہی تھیں کہ ایک عبد اللہ نامی نوکر سے بازار سے لانیکے لئے جہاں دوسری اشیاء کا نام لکھا وہیں فہرست میں "گاڑھا ٹھس" بھی درج تھا۔ سب سامان آگیا مگر "گاڑھا ٹھس" کسی دکان پر نہیں ملا۔ انھوں نے نوکر کی نااہلی کی مجھ سے شکایت کی اور نوکر تسیلی

کھاکر کہنے لگاکہ "گارڑھاٹھس" بازار میں ہے ہی نہیں۔ بیگم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ایک پھیری والا "گارڑھاٹھس، گارڑھاٹھس" کی آواز لگاتا پھرتا ہے۔ ہم نے اس سے ایک دن ایک سیر مچھلی لی تھی مگر اس میں کانٹے بہت تھے۔ ہم نے سوچا بازار میں شاید اچھی مچھلی مل جائے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وہی پھیری والا فلیٹ کے نیچے گلی میں آواز لگاتا گذر رہا تھا کہ "گارڑھا چھس گارڑھا" یعنی مچھلی ہے مچھلی اور تب یہ راز کھلا کہ وہ "چھس" کو "ٹھس" سمجھتی تھیں جو کشمیری زبان میں کہیں نہیں آتا۔ موصوفہ بہت خفیف ہوئیں اور ہم اب بھی ان کو یہ واقعہ سنا کے لطف لیتے ہیں۔

جس نے جنوری فروری میں وادی کشمیر کا فراسٹ نہیں دیکھا اس نے پورا کشمیر نہیں دیکھا۔ موسم چند اعتبار سے بہترین اور چند سے بدترین ہے۔ ہر وقت بھوک۔ ہر کھانے پر چربی دار گوشت کی تلاش گھر میں کم از کم ایک کمرہ بخاری سے بالکل گرم، گرم پانی کی بوتل سے بستر گرم، کافی، چائے، مکھن، ڈرائی فروٹ ہر وقت موجود۔ معلوم نہیں کب کیا کھانے کو دل چاہ جائے اور گرم کپڑے۔ یہ سب لوازم ہاتھوں کی لمبائی کے اندر اگر موجود ہیں تو آپ کی تندرستی قابل رشک ہو جائے گی۔ اس اہتمام میں کوئی بھی کمی رہ گئی تو جنوری فروری کے کشمیر کو سرد جہنم ہی سمجھنا چاہیے Frost میں جس کو اردو میں پالا اور پنجابی میں کہر کہتے ہیں کشمیری اعتکاف ہائی برنیشن (Hybrnation) میں چلا جاتا ہے۔ پانی کے پائپ پھٹ جاتے ہیں۔ آبدست کے لوٹوں کا پانی جم جاتا ہے۔ درجۂ حرارت کبھی کبھی درجۂ انجماد سے چودہ ڈگری نیچے تک گر جاتا ہے۔ جھیلوں کی سطح آب چھ انچ سے دو فٹ تک دبیز میلوں لمبی چوڑی برف کی سل بن جاتی ہے جس پر جیپ، کار اور سائیکل وغیرہ بغیر کسی خطرے کے دوڑائی جا سکتی ہے۔ مگر کبھی اگر دھوپ نکل آئے تو یہ عمل خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جھیل کی سطح پگھلنے سے پہلے ٹوٹتی ہے اور دراڑیں طویل درازیں پڑ جاتی ہیں اور جب یہ برف چٹختی ہے تو توپ سے زیادہ گرجدار آوازیں سننے میں آتی ہیں اور ان کی بازگشت بھی۔

انڈا اندر سے جم جاتا ہے اور توڑا جاتا ہے تو شیشے جیسی سخت سفیدی میں سے پکھراج کی طرح زردی جھلکتی ہے۔ گرم فرائنگ پین پر پہلے یہ جما ہوا انڈا پگھلتا ہے اور تب استارہ تیار ہوتا ہے۔ اس طرح کے منجمد انڈوں کا آملیٹ بنانے میں طوالت ہوتی ہے۔ فراسٹ برف سے (Snow) یخ جلدی پگھل کر پانی بنتی ہے اس لیے حجامت کے لیے یخ کے استعمال سے وقت کی بچت ہوتی

ہے۔ اور سب سے زیادہ بے بسی کا وہ عالم ہوتا ہے جب دھوپ کی حدت سے (Attic) چھاجن میں سے گذرنے والی پائپ لائن کی برف پگھل کر سب سے اوپر والی منزل میں رہنے والوں پر برستی ہے۔ فلیٹ کی ہر چیز لتھ پتھ ہو جاتی ہے۔ فراسٹ کے زمانے میں زیادہ تر بچوں کے پیروں میں اور عام آدمیوں کو (Chil Blain یا Frost lite) خون میں روانی سست ہونے سے ہاتھ ہاتھ پیر ایک تکلیف دہ قسم کی کھجلی پیدا ہو جاتی ہے جو بڑھ کے زخم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اس بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جب میری بیٹی شیریں کے پیروں میں چل بلین ہوا اور اس سے میں نے کہا کہ علاوہ صبر کے اس مرض کا کوئی علاج نہیں تو وہ چیخ مار کے رونے لگی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ کچھ شیریں کو بہلانے کے لیے اور کچھ تجربہ کے خیال سے میں نے اس کو کرسی پر بخاری کے سامنے بٹھا کر اس کے پیروں کے قریب دو چھوٹی چھوٹی لگنیں رکھ دیں۔ ایک گرم پانی سے بھری ہوئی اور دوسری ٹھنڈے پانی کی اور پہلے اس کو گرم پانی میں دونوں پاؤں رکھنے کو کہا اور اس کو مساج کیا۔ اس کے فوراً بعد ٹھنڈے پانی میں یہی عمل دوہرایا۔ اور تین چار بار یہی کرنے کے بعد اس کے پاؤں سکھا کر گرم موزہ پہنا دیا اور بستر میں لحاف اڑھا کر سلا دیا۔ رات بھر وہ چین سے سوئی۔ ڈاکٹر طاہر مرزا۔ ڈاکٹر پریانک وغیرہ سے میں نے اپنے اس تجربہ کا ذکر کیا تو سب بےحد متعجب ہوئے اور اس عمل کا کوئی سائنٹفک جواز بھی نہ پیش کر سکے۔ ڈاکٹر طاہر مرزا نے بتلایا کہ انھوں نے اپنے اوپر اور اپنے کئی مریضوں پر اس کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے اور بہت دور تک اس کی شہرت ہو گئی۔

چل بلین عجیب و غریب مرض اس نہج سے بھی ہے کہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جواہر سرنگ پار کرنے کے بعد دھوپ میں پہنچتے ہی وہ جموں تک بالکل اچھا ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے چل بلین پاؤں اور ہاتھ تک محدود نہیں۔ وہ کسی بھی عضو جسم میں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر رئیس احمد کے کانوں کی لو میں چل بلین ہوتا تھا۔ اسسٹنٹ لائبریرین زیدی صاحب کی آنکھوں اور پلکوں میں چل بلین ہوتا تھا۔

زندگی بھر میں کہیں بھی میرے گھر میں چوری نہیں ہوئی تھی، جبکہ دوسری جگہوں پر مکانات کھلے ہوئے ہونے کے سبب چوروں کے لیے بڑی آسانی ہوتی تھیں۔ فلیٹ میں چوری اس لئے مشکل ہے کہ ہر طرف سے بند ہوتا ہے اور بالعموم اس میں نکاسی کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے۔

مگر سری نگر میں میرے فلیٹ میں چوری ہوئی۔ بجلی کے میٹر ریڈر کے آجانے سے چور گھبرا گیا اور صرف ایک قلم، ایک نیل کٹر، ایک ٹائم پیس اور دو قمیصوں کے علاوہ وہ فرار کی عجلت میں کوئی اور چیز نہ لے جاسکا۔ ورنہ اس نے میرے کمرے کے سب صندوقوں کے تالے وہ توڑ چکا تھا جس میں شیریں کی نند کا ایک چاندی کا بھاری گنگا جمنی پاندان بھی تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ شیریں، الیاس اور ان کے تینوں ماموں زاد بھائی احمد علی عباس صاحب، صادق صاحب، اور علی جعفر صاحب سیر کشمیر کے لیے مع اپنے اہل و عیال کے آئے ہوئے تھے۔ ٹھہرے تو سب ہوٹلوں میں تھے مگر اپنا قیمتی سامان اور زیورات وغیرہ میرے فلیٹ کے ایک محفوظ ترین کمرے میں رکھ کر اطمینان سے سیر و سیاحت میں مشغول رہا کرتے۔ جب "راؤنڈ دی ورلڈ ان اے ڈے" کا پروگرام بنا تو سب کے ساتھ میں بھی ہو لیا۔ غروب آفتاب کے قریب واپسی ہوئی تو دیکھا کہ فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ٹوٹا ہوا کنڈا اور بند گاڈریج کا نو تالا اندر برآمدہ میں ایک طرف پڑا ہوا ملا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے مہمانوں کے سامنے اعلان کیا "فلیٹ میں چوری ہو گئی" اور سب کا رنگ فق ہو گیا۔ کوریڈر سے اندر گیا تو صرف میرے کمرے کا کنڈا ٹوٹا ہوا ملا جس میں صندوق کھلے اور سامان بکھرا ہوا ملا۔ دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی کہ زیورات والے کمرہ کا تالا بند تھا۔ اور اسی پر چور نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ چور ابھی میرے ہی کمرے میں مشغول تھا کہ میٹر ریڈر آیا اور دروازہ کھلا دیکھ کر برآمدہ میں ریڈنگ لیکر واپس چلا گیا اور نیچے گلی میں کسی سے باتیں کرنے لگا۔ چور اوپر سے اس کو جھانک کر باتیں کرتے دیکھ کر نروس ہو گیا۔ اپنے ایک جھولے میں جو سامان جلدی میں سمیٹ سکا اسی کو لیکر فرار ہو گیا۔ اور اس طرح چور اور میرے سر کی بہت بڑی بلا ٹل گئی۔ وہ چور بجلی کا پیشہ ور مکینک تھا۔ اسی بہانے وہ مکانوں میں جایا کرتا تھا۔ جب مکان کا دروازہ بند اور سناٹا پاتا تو اپنے اوزار سے تالا توڑتا اور چوریاں کرتا۔ کہ ہمارے یہاں چوری کے ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ کسی دوسرے فلیٹ میں داخل ہوا۔ وہ ابھی اندر ہی تھا کہ اس فلیٹ کی پنجابی تن و توش والی مالکہ واپس آگئی اور چور کو کمر سے مضبوط پکڑ کر لگی شور مچانے۔ محلہ اور قرب و جوار کے لوگ جمع ہو گئے اور اس کو گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔ جب اس کے مکان اور اس کے ایک گودام کی تلاشی ہوئی تو اسی میں سے درجنوں ریڈیو۔ ٹرانزسٹر، فرکوٹ

زیورات اور دوسری گرانقدر اشیا برآمد ہوئیں۔ اس میں میرا قلم، نیل کٹر اور ٹائم پیس بھی نکلیں۔ جن کی میں نے شناخت کی اس پر مہینوں مقدمہ چلا۔ سزا ہوئی اور وہ اپیل میں چلا گیا اور ادھر میں ریٹائر ہو کر وطن آگیا۔ معلوم نہیں میرے چلے آنے کے بعد مقدمہ اور میری مسروقہ چیزوں کا کیا حشر ہوا۔ میں نے پولیس کو یہاں سے خط لکھا تھا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے فلیٹ میں چوری کے وقت میٹر ریڈر کا واقعہ پولیس کو اسی نے بتلایا تھا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

کشمیر چھوڑنے سے کچھ مدت پہلے میں نے دو ایسے کام کئے جو بالعموم غیراہم سمجھے جا سکتے ہیں مگر میرے نقطۂ نظر سے وہ انتہائی سکون بخش قابل اطمینان اور مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اکتوبر میں سونا مرگ جانا اور اس سے اوپر جا کر ریچوں کے جنگل میں اپنے ٹٹو والے کی مدد سے کافی مقدار میں دبیز طویل اور عریض "بھوج پتر" کی چھال اس کے درختوں سے اتار کر لانا۔ تخت کو الٹا کر کے اس کے نیچے دبا کر سیدھا کرنا۔ سیدھا کرنے کے بعد قطع و برید کر کے چھال کے اندر سے اچھے اچھے رنگ اور نقشوں والی پرتیں نکالنا۔ اس پورے عمل میں مجھکو تقریباً دو ہفتے لگے تھے۔ اس محنت شاقہ کے نتیجے میں میرے پاس اس وقت نایاب اقسام کے بھوج پتر کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور طبعیت موزوں ہونے پر ان اوراق پر خطاطی اور مصوری کے نمونے تیار کرتا رہتا ہوں۔ بھوج پتر کی تعریف یہ ہے کہ اس میں دیمک نہیں لگتی اور ہزار سال بھی کیچڑ یا پانی میں پڑے رہنے سے سڑتا نہیں۔ رنگ یا روشنائی کے طور پر Reves یا Camel کی روشنائیاں استعمال کرتا ہوں جو بہت دیرپا ہوتی ہیں اور برسوں میں بھی ان کا رنگ پھیکا نہیں پڑتا۔

دوسرا اس سے بھی زیادہ اہم کام یہ کیا کہ چار مہینے کی فرلو رخصت اور ریٹائرمنٹ کی درخواست دیدی۔ دیکھا گیا ہے کہ ریٹائرمنٹ پر عام طور پر لوگ نوکری کی مدت میں توسیع کی کوشش یا نئی نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں اور اس کوشش میں ایسی ایسی دنایت سے گری ہوئی اور گھٹیا حرکتیں کرتے ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اور اپنے کو شرم معلوم ہوتی ہے۔ اسی کشمیر میں میں نے ڈپوٹیشن پر گئے ایسے فرعون صفت افسروں کو تیری میری خوشامدیں کرتے دیکھا ہے جو اپنی چڑھی کمان کے زمانہ میں سیدھے منھ سے سلام نہیں لیتے

تھے۔ درخواست دینے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد میں صادق صاحب سے رخصت ہونے گیا تو موصوف نے چھوٹتے ہی فرمایا "وامق صاحب کل ہی میرے سامنے آپ کی فائل آئی مگر میں نے اس پر کوئی حکم نہیں دیا کہ آپ سے بات کر لوں تو کچھ لکھوں۔ آپ کے سروس بائی لاز بھی میں نے پڑھے۔ ان کی رو سے ابھی تو آپ کو ڈیڑھ ڈیڑھ سال کی یعنی کل چار سال کی توسیع مل سکتی ہے تو آپ کو اتنی عجلت کیوں ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ ابھی نہ جائیں"۔ میں نے عرض کیا "صادق صاحب آپ میرے افسر ہی نہیں ہیں بلکہ پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ساتھ کام کرنے میں مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ اب ایک دن بھی نوکری کرنے پر دل مائل نہیں ہو رہا ہے۔ کچھ تھک سا گیا ہوں اور اس کے بعد آپ سے ایک خالص دوست اور ساتھی کی حیثیت سے ملنے کی تمنا باقی ہے۔ آپ سے رشتۂ ملاقات نہ ٹوٹنے پائے گا۔ اب مجھ کو رد کیجئے نہیں۔ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ وطن کی مٹی مجھ کو کھینچ رہی ہے۔ ساٹھ برس کا تو ہو ہی گیا ہوں"۔

میری مختصر تقریر سن کر ان کے دل پر وہ اثر ہوا کہ اُسی وقت موصوف نے رخصت ریٹائرمنٹ اور ڈیڑھ ہزار روپئے بطور وطن کی واپسی کے سفر خرچ کے منظور کر کے میری فائل کالج واپس کر دی۔ اور میں نے پیکنگ شروع کر دی۔ رخصتی کی کئی دعوتیں تھیں مگر میں نے محض اپنے سینئر رجسٹرار ہربنس لال چودھری کی دعوت اور اپنے اسٹاف کا رخصتی عصرانہ منظور کیا تھا۔ ہربنس لال چودھری نے عمر کے اعتبار سے مجھ کو ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا اور ابتک نئے سال کی تہنیت کا کارڈ بھیجتے رہتے ہیں۔ ہربنس لال چودھری، کرشن چندر اور مہندر ناتھ کے ہموطن یعنی کے رہنے والے تھے اور بھائیوں کے لاتعداد لطیفے سناتے تھے۔ خود بھی پنجابی زبان کے خاصے ادیب تھے اور وارث شاہ کے کلام بالخصوص ہیر رانجھا کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ پنجابی میں اس پر ان کا ایک طویل مقالہ بھی تھا۔

●●

دسواں باب

وطن کو واپسی

یکم نومبر ۱۹۶۹ء کی صبح جس وقت آسمان اپنا نیلمیں چتر تانے کھڑا تھا اور آفتاب جہاں تاب آگ کا ایک سرخ بیضوی بہت بڑا گولا افق سے نمودار ہو رہا تھا میں اپنی بیگم کے ساتھ اپنے وطن کجگاؤں کی سرحدیں پورے ۱۴ برس کے بن باس کے ایام پورے کر کے داخل ہو رہا تھا۔ رکشے لال کوٹھی کے بڑے پھاٹک کے سامنے رکے اور حمید خاں کیئرٹیکر لال کوٹھی نے اسباب کے رکشا سے اتروا کر مکان کے جدید رام نگری تالے کو کھولا۔ میں اپنے رکشا سے اُتر چکا تھا اور وہ رکشا بیگم کو لیے ہوئے ڈیوڑھی کے اندر چلا گیا۔ بیگم سفر کی طوالت سے بہت خستہ ہو چکی تھیں مگر گھر واپس آنے کی خوشی میں رکشا سے بغیر کسی مدد کے زنانے مکان میں آگئیں اور میں بھی ان کے ساتھ۔ ہمارے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے پھل پھول سے لدے ہوئے شباب پر تھے۔ حمید نے مکان کو ستھرا بنا رکھا تھا۔ سب سامان گھر کے اندر لا کر بڑے برآمدہ میں ابھی رکھا ہی جا چکا تھا اور رکشے والے رخصت کیے جا چکے تھے کہ پھاٹک پر تواتر سے پانچ گولے چھوٹنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ آئی آتشباز کے بیٹے چھتن نے ہمارے مع الخیر وطن واپس آنے کی خوشی میں یہ گولے داغے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ میری کوٹھی سے ملے ہوئے بازار حشمت گنج کے پاسی دوکاندار وغیرہ ناشتہ چارپان مٹھائیوں وغیرہ قسم کی چیزیں لیے ہوئے گھر کے اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں نے بیگم سے ایک کمرہ میں بیٹھنے کو کہا اور ان سب کو باہر جا کر اندر ساتھ لایا۔ گوری ہمارے بازار کے سب سے بڑے دوکاندار سب کے آگے تھے۔ باہر تو خاموش کھڑے تھے مگر گھر کے اندر آکر مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ "بڑے بھیا لال کوٹھی کے چاہنے والے آپکے دشمن کہے تھے کہ آپ کبھی نہ آیئے گا اور اگر کشمیر سے لوٹے بھی تو لکھنؤ یا کسی بڑے شہر میں رہیئے گا۔ یہاں نہ آیئے گا۔ مگر آج سب کے منھ میں تیاگی لگ گئی۔ آپ ایسے آئے ہیں جیسے بھگوان رامچندر جی سیتا جی کے ساتھ بن باس سے ایودھیا آئے ہیں۔ اسی لیے ہم روئے پڑن۔ اب تو رہیں نا۔

آج وہ کتنا سندر لگت ہو" ان سب کے بعد عورتوں کے آنے کا تانتا ایک گھنٹے تک لگا رہا۔ وہ سب بھی بیگم کے پاؤں پکڑ کر روئیں، ہنسیں اور گائیں۔ جب یہ سب چلی گئیں تو ہم نے کچھ اپنے ساتھ کا ناشتہ اور کافی پی اور تحفہ جات سے منھ کا مزا بدلا اور تب احساس ہوا کہ ہم واقعی کچھ گاؤں آ گئے ہیں۔ گڑ کی چائے تھی ہر مٹھائی میں شکر کی کثرت تھی۔ اب چوتھی بڑھئی ... لوہار مع اپنے دو نوجوان لڑکوں اور کام کا سب سامان لیے ہوئے دھڑّانہ گھر میں داخل ہوئے ان سب سے بیگم کا پردہ نہ تھا کہ روز کے کام کرنے والے تھے۔ دو گھنٹے میں میرے کشمیری تخت اور گھر کی پرانی مسہریوں کو کرسیوں میزوں کو ٹھونک ٹھانک کر اور نوار کسی کے کھڑا کر دیا اور ہماری دو مسہریوں پر پریرا پر دو بستر لگ گئے۔ ۱۰-۱۱ بجے کے قریب گوری ساؤ کی بیوی اور سب لڑکے بہوئیں ایک ایک تھالی ہاتھ میں لیے کوئی ٹھیٹھ دیہاتی گیت گاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں اور تخت پر سارے کھانے لگا دیے۔" ای آج دن اور رات کی روٹی ہو۔ کل دُسرا تا جا کھانا آئیہے۔ جب تک میاں کا چو لھانہ جل جیہے تب تک آئیہے" اور میری بیگم کا پاؤں چھو کر چلی گئی۔ حمید سے میں نے کہا "یہ ہفتہ بھر کا کھانا ہے اتنا ہم لوگ کیا کھائیں گے۔ ایک ہانڈی سجاد ظہیر کے دہی والی۔ آدھی ہانڈی دہی بڑے، آدھی پوری اور رکھینڈی کا سبزیاں اور میٹھے اچار چھوڑ کر سب کھانا مٹھائیاں تم اپنے گھر لے جا کر بچوں کو دیدو اور رکھنؔی اور مدینہ سے کہہ دو کہ وہ آ کر اس وقت تک یہاں کا کام سنبھال لیں جب تک کوئی مستقل خادمہ یا خادم باورچی نہیں مل جاتا۔" اور ہاں اسحاق بوہتراتی کو بھی ہم لوگوں کا سلام کہ ہم میاں بیوی تمہارے عاشق زار آ گئے ہیں اور تمہارے ہاتھ میں ہماری زندگی ہے۔" باتوں باتوں میں میں نے حمید سے یہ بھی دریافت کیا کہ ہمارے آنے کی خبر تم نے ان سب کو دیدی تھی۔ کہ علاوہ تمہارے ہم کسی اور کو تو اپنے آنے کی خبر نہیں دی تھی۔ حمید نے گردن جھکا کے جواب دیا "جی ہاں کل شام جونپور اسٹیشن جانے سے پہلے گوری، چھتی اور چوتھی بڑھئی کو میں نے بتلا دیا تھا۔ ان کے علاوہ گاؤں میں کسی سے نہیں کہا تھا۔" "ٹھیک کیا۔"

حمید پہلے بابا کا خادم تھا ان کے بعد اس کو ۱۹۵۰ء میں گاندھی سار جنک انٹر کالج میں چپراسی کی جگہ مل گئی تھی، میں نے اپنے علاقہ پر سے نداف ذات کے ایک آدمی کو بلا لیا تھا اور یہاں سے علیگڑھ اس کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہ بھی اچھا باورچی اور خدمت گار تھا۔ بن باس پر روانہ ہونے کے

بعد کو ٹھی کی حفاظت کے خیال سے حمید کو اس کا کیر ٹیکر بنادیا تھا اور اس کی اجرت میں عارضی طور پر اپنے سب کھیت، باغ، چمن اور کوٹھی دیدی تھی کہ وہ کھیتی وغیرہ سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے عیال کی پرورش کرے اور مکان کو ٹیپ ٹاپ حالت میں رکھے۔ چنانچہ واپسی پر ہر چیز کو اپنی جگہ پایا۔ دو ایک ضروری اشیاء نہیں ملیں، تو میں نے اس پر کوئی تعرض نہیں کیا۔

دن اور رات کا کھانا ہم نے گوری کا بھیجا ہوا کھایا جن میں سجادٹ کا دہی لاجواب تھا۔ ہمارے گاؤں کا یہ دہی دو دن میں تیار ہوتا ہے جو تیار ہوتے ہوتے بالکل لال ہو جاتا ہے اور اس پر کم از کم ایک انچ موٹی دہی کی بالائی ہوتی ہے۔ میں نے تو دونوں وقت اسی سے پیٹ بھرا تھا۔ کئی سال سے اس دہی کا ترسا ہوا تھا۔

دن میں اور شام کو اعزہ اور احباب آئے اور اظہار مسرت اور وطن کی واپسی پر مبارکباد دے کر چلے گئے اور ہم لوگ دس بجے شب میں اپنے اپنے بستر پر۔ کشمیر میں مَیں (vesparex) خواب آور قرص کے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔ اس شب مجھ کو اس دوا کی کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ سامنے صحن کی شمالی دیوار قہقہہ تھی۔ چاندنی رات نہ تھی مگر صحن اور دیواریں اتنی روشن کہ یقین نہ آتا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ "دیکھئے گھر پہنچ کر اتنا سکون اور اطمینان ملا ہے اور دل روشن ہے کہ صحن اور دیوار تک اس کی روشنی جا رہی ہے۔ دیکھئے ہم آپ اسی پورے مکان میں بالکل تنہا ہیں مگر کسی قسم کی تنہائی اور یا وحشت کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔" سچ کہا ہے:

حب الوطن از مسلک سلیماں خوشتر — خار وطن از سنبل ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد — میگفت کہ قید چہ کنعاں خوشتر

دوسرے دن صبح کو جب حمید نے دروازہ کھٹکھٹایا تب تقریباً ۷ ½ بجے ہم دونوں کی آنکھیں کھلیں۔ مکان میں اس وقت بجلی کی فٹنگ نہیں ہوئی تھی اس لیے دن میں ایک پیپا مٹی کا تیل اور ضروری خورد و نوش کی جنس گوری کی دوکان سے منگوالی تھی۔ اسٹو و ساتھ آیا تھا۔ چائے اور کھانے کے برتن بھی ساتھ تھے اور گھر میں پہلے سے موجود تھی۔ حمید نے چائے بنائی اور ہم لوگوں کو پلائی۔ لاتعداد اہیرنیں دودھ لائی تھیں جن میں سے بیگم نے اپنی پرانی جان پہچان کی ایک

دودھ والی سے دودھ لے لیا اور روزانہ سیر بھر دودھ لینے کا وعدہ لیا۔ پانی بھرنے کے لیے کھتن اور کھانا پکانے کے لئے مدینہ بھی آگئی اور ہمارے سُسل کل کی پہلی منزل طے اور بڑے سکون اور بے فکری کی زندگی شروع ہوگئی۔ دوسرے دن سے نوکری اور جلا وطنی کی زندگی گذارنے کے بعد ہم نے اپنی گذشتہ زندگی سے پہلا انتقام لینا یوں شروع کیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد پابندی سے سے دو گھنٹہ سونے لگے جو سلسلۂ انتقام آج تک جاری ہے۔ چونکہ اس وقت شب کے ڈیڑھ بج رہے ہیں اس لیے یہ ذکر بند کرتا ہوں۔ نزلہ بھی جاری ہے اس لیے (Return of the native) اپنے وطن کی واپسی کی داستان اسی جگہ سے کل پھر شروع کروں گا۔



تین چار دن میں تکان سفر دور ہو چکی تھی اور گھر کا کچھ (Routine) روزمرہ بھی درست ہو چلا تھا کہ رانچی سے باقر کے دوست شیو ناتھ پرشاد کا خط آیا کہ "باقر کی شادی کی تاریخ اب بہت قریب آگئی ہے۔ اگر آپ رانچی آجائیں تو اس کی تفصیلات پر ایک نظر ثانی کرلی جائے"۔ باقر اپنی ایک ہم جماعت پنجابی ہندو لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ شادی میں نے لڑکی کے والد سے قیام کشمیر ہی میں طے کرلی تھی۔ شادی کی تاریخ ۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء مقرر ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کے شرنارتھی آبادیوں میں آر۔ ایس۔ ایس نے پھر فرقہ وارانہ تناؤ پیدا کر رکھا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر چاقو یا بندوق چل جاتی تھی اور انھی کے درمیان یہ تقریب ہونے والی تھی۔ لڑکی کے باپ جیت راج ادبرائے صاحب ریٹائرڈ ملٹری اکاؤنٹس افسر کافی پریشان تھے اور کچھ ہم لوگ بھی۔ وجہ یہ تھی کہ ادبرائے صاحب کے رشتے کے ایک بھائی اس رشتے کے خلاف تھے اور انھوں نے عین شادی کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد کروانے کی دھمکی بھی دیدی تھی۔

وطن میں گول کوٹھی خالی پڑی تھی۔ دوسرے گھروں میں اعزہ اور احباب کم ہی رہ گئے تھے۔ کچھ مر چکے تھے، کچھ بیمار تھے۔ کچھ اپنی نوکریوں پر تھے اور کچھ جو باقی تھے ان سے میں ملتا رہتا تھا۔ گاؤں کی اقتصادی حالت تو خراب نہ معلوم ہوتی تھی۔ نئے نئے پکّے مکانات بن رہے تھے۔ لوگوں کے پاس محنت کے پیسے مزدوری اور کاروباری پیشہ لوگ آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔ البتہ سماجی، اخلاقی اور بازار کے حالات بہت بے لگام اور خراب ہو چکے تھے۔ غنڈہ گردی۔ لوٹ پاٹ چاقو کٹے، جوا، چوری اور ڈاکہ زنی گاؤں کے معمولات بن چکے تھے۔ شام ہوتے ہی گھروں کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ گاؤں کی اُبھرتی ہوئی نسل کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی اور بزرگان دیہ اپنی رہی سہی عزت بچانے کے خیال سے گوشہ نشیں ہو چکے تھے۔ دوکانداروں اور پھیری والوں سے خریداری کے بعد قیمت کے مطالبہ پر چھُری یا پستول دکھلانا رواج پکڑ چکا تھا۔ محگاؤں قرب وجوار کے قریوں کے شہرہ پشت لوگوں کی چراگاہ بن چکا تھا۔ اس گاؤں میں کبھی دودھ دہی سبزی ترکاری کی کثرت رہا کرتی تھی مگر اب اشیائے ضروری و خوردنی شہر جونپور سے حاصل کرنا پڑتی ہیں۔

ابھی خاطر خواہ میں اپنے وطن میں جم نہ پایا تھا کہ مجھ کو باقر کی شادی کے سلسلے میں بڑے لڑکے شمون کے یہاں جھریا دھنباد چلا جانا پڑا۔ پہلے خیال تھا کہ شادی بنگلور سے کروں مگر یہاں کے حالات دیکھ کر یہ طے پایا کہ شادی دھنباد سے زیادہ مناسب ہوگی۔ اور اس کی اطلاع میں نے باقر اور شیو ناتھ کو رانچی دیدی تھی۔ جھریا پہنچ کر میں نے کسی عزیز کو اس نسبت اور شادی کی اطلاع نہ دی صرف شیریں کو شمس آباد خط لکھا کہ ۲؍دسمبر ۶۹ء کی شام کو میں تقریباً دس افراد پر مشتمل باقر کی بارات کے ساتھ کالکا میل سے دہلی پہنچ رہا ہوں۔ برات میں علاوہ باقر اور باقر کے احباب کے بس تمہاری اماں اور تمہاری بھابھی جان مع اپنے بچوں کے ہوں گی۔ تم تنہا اور اگر تمہارے خسر معظم الیاس سلمہ کو اجازت دیں تو ان کے ساتھ ہم لوگوں سے دہلی اسٹیشن پر ۲؍دسمبر کی شام کو ملو۔ شمون کو مجبوراً چھوڑ رہا ہوں کہ دعوت ولیمہ کا انتظام کریں اور ابھی واپسی پر دلہن کو Receive کرنے کے لیے کسی کو تو ہونا چاہیے۔ نہ میں نے اپنے بھائی حسنات نہ معصومہ زہرا بجی کو کوئی اطلاع دی ہے اور نہ دھنباد جھریا میں مقیم بہت سے اعزہ اور احباب کو۔ اپنوں کے علاوہ دوسروں کی جان خطرہ میں ڈالنے سے کیا حاصل۔

اور باقر اور شیو ناتھ کے دوسرے احباب یکم دسمبر ۶۹ء کو دھنباد پہنچ گئے اور دن گذار کے نیم شب میں برات دہلی کے لئے روانہ ہوگئی۔ دہلی سے دھنباد واپسی برات کا ریلوے رزرویشن ۳؍دسمبر کے لئے اور برائے صاحب کے ذریعہ سے پہلے ہی کروالیا تھا۔ جب شام کو برات دہلی پہنچی تو اسٹیشن پر شیریں، الیاس سلمہٗ، لڑکی کے والد اور برائے صاحب اور ان کے صاحب زادے روی اور ان کی سب صاحبزادیاں برات کی خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ وہاں سے ہم سب لوگ سیدھے ہوٹل ٹورسٹ مقابل نئی دہلی اسٹیشن لے جائے گئے۔ ہوٹل میں برات کے قیام کے لیے چار بڑے کمرے تیار ملے۔ سب نے حمام کیا اور کپڑے بدل ہی رہے تھے کہ کافی اور دو ایک ہلکی چیزیں کمروں پر ہی آگئیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کے بعد طالب جگوالی کے صاحبزادے یوگندر کپور جو برات کے ناشتہ کھانے کے مہتمم تھے ہم لوگوں کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں لے گئے۔ جہاں نہایت لذیذ اور ضرورت سے زیادہ کھانا ایک بڑی لمبی میز پر سجا ہوا تھا۔ براتیوں اور گھر والوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ کافی کا دور چلا اور ہم لوگ میزبانوں سے رخصت ہو کر تقریباً گیارہ بجے اپنے اپنے کمروں پر واپس آگئے۔

بند کمرہ پر اپنے اپنے بستروں میں لیٹ کر میں نے الیاس اور شیریں سے اپنے سمدھی محمد عباس صاحب طالب صفوی کی خیریت دریافت کی تو شیریں نے بیان کیا کہ موصوف نے مجھ کو شادی میں شرکت کی اجازت دی اور الیاس صاحب کو حکم کر دو بھی اس تقریب میں شرکت کرنے میرے ہمراہ دہلی جائیں اور کل جب ہم لوگ روانہ ہونے کے لیے رخصت طلب ہوئے تو موصوف آبدیدہ ہو کر ہم لوگوں کو گلے لگایا اور خدا حافظ کہہ کر اس تیزی سے اپنے کمرے کی طرف گردن جھکائے ہوئے

چلے گئے گر خدانخواستہ اب پھر ہم لوگ نہ دہلی سے زندہ واپس آئیں گے اور نہ وہ ہم لوگوں کو کبھی پھر دیکھ سکیں گے۔ اسمیں شک نہیں کہ ابا جان بہت رقیق القلب آدمی ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات سے یوں بھی پریشان رہتے ہیں۔ یہ تو ابا آپ کا معاملہ تھا ورنہ ان حالات میں ہم لوگوں کا دہلی آنا ممکن نہ تھا اور کل کے دن وہ کن حالات سے گذریں گے" سوچ کے دل بھر آتا ہے۔

دوسرے دن بیدار ہوئے اور ناشتہ کرکے ہم سب لوگ قتل گاہ کو روانہ ہونے کو تیار ہو گئے۔ برات کو لیجانے کے لیے چار کاریں آگئیں۔ تقریباً تیس چالیس منٹ دہلی کی مختلف سڑکوں اور راستوں سے گذرتے ہوئے ہم لوگ ایک ایسے پرانی ساخت کے بنگلے میں پہنچے جس کی پشت پر ایک کھلا میدان تھا اور دور دور کوئی آبادی نہ تھی۔ اوبرائے صاحب نے مجھ کو مطلع کیا کہ یہ بنگلہ ان کے ایک دوست کا ہے جس کا پتہ لگانا ان اشرار کے لیے ممکن نہیں اور خبر ملی ہے کہ وہ لوگ میرے مکان کے سامنے اور محلہ میں نعرے لگاتے پھر رہے ہیں اور محلہ والے بھی ہمارے موجودہ پتہ سے واقف نہیں یوں بھی آج دہلی میں دس بارہ شادیاں ہیں۔ وہ لوگ ہم کو کہاں کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔ آپ سب لوگ مطمئن رہیں ہمارے ہمدرد اکثریت میں ہیں۔ ہم لوگ چکوال (پاکستان) سے ہجرت کرکے یہاں آئے ہیں۔ طالب صاحب بھی چکوالی ہیں جو آپ کے پہلے سے دوست ہیں۔ شادی کا تمام انتظام ان کے صاحبزادے ہی نے کیا ہے۔ ہمارے بہت سے اعزہ اور دوست سکھ حضرات بھی ہیں جو یہاں موجود ہیں"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چائے و ناشتہ وغیرہ آگیا۔ دنو اوبرائے جس کی شادی باقر سے ہو رہی تھی ایک جانب گڑیا بنی بیٹھی تھی۔ براتی اور گھراتی آپس میں مل جل کر باتیں کرنے لگے۔ میں اور طالب چکوالی مدتوں بعد ملے تھے اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے کی فکر میں تھے کہ اوبرائے صاحب کے ایک سکھ عزیز طالب اور میرے درمیان میں آکر بیٹھ گئے اور بحیثیت شاعر کے اپنا تعارف کروا کے اپنے اشعار سنانے لگے اور ہم دونوں سامعین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ناموزوں اشعار پر زیادہ داد دی جا رہی تھی۔ یونہی نظریں گھما کر دیکھا تو جیت راج اوبرائے صاحب باقر اور دنو اوبرائے نظر نہ آئے۔ شیریں نے بتلایا کہ چونکہ سردار انکل کے اشعار سننے میں آپ محو تھے اس لیے انھوں نے مخل ہونا نہ چاہا اور ایک گھنٹہ کی اجازت لیکر سول کورٹ چلے گئے۔ پروگرام یہ ہے کہ ۱۱ بجے تک وہ سول میرایج سرٹیفکٹ لیکر واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد آریا سماج رسم سے شادی ہوگی۔ اس کے بعد لنچ اور رخصتی۔

دہلی برات لے جانے سے پہلے میں نے یہاں کے چند با اثر احباب کو لکھا تھا کہ آج کی شام نکاح پڑھنے کیلیے وہ کوئی مولوی تلاش کر رکھیں گے مگر سب کے جواب آئے کہ یہاں کے حالات کے پیش نظر کوئی مولوی اس شادی میں نکاح پڑھنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ دو بجے دن کو جب برات دلہن کو لیکر اپنے مستقر ہوٹل ٹورسٹ واپس آئی

تو میں نے اپنے خویش محمد الیاس صفوی کو جامع مسجد بھیجا کہ وہ اردو بازار سے سیر بھر برفی، دو نکاح نامے اور دو کتابیں صیغۂ نکاح کے طریقہ پر خرید کرے آئیں۔ جس کو تقریباً دو ڈھائی گھنٹے میں وہ لیکر واپس آ گئے۔ بعد غروب آفتاب میری بڑی بہو نے جو الیاس کی بہن بھی ہیں و نود او برائے اور باقر کو وضو کروایا اور دونوں کو قبلہ رو بٹھا کر کلمۂ شہادت پڑھوایا۔ اور و نود او برائے کا نام میں نے وسیمہ او برائے رکھا جو سب کو پسند آیا۔ اس کے بعد جامع مسجد سے آئی ہوئی مٹھائی براتیوں نے کھائی۔ باقر کے دوست شیو ناتھ پرشاد جو بہت روشن خیال آدمی تھے۔ ان جملہ رسوم میں برابر کے شریک تھے۔ اب الیاس اور میں نے بھی وضو کیا۔ میں نے وسیمہ سے اُن کے وکیل بننے کی سب کے سامنے اجازت لی اور الیاس باقر کی طرف سے وکیل ہوئے اور مہر شرعی پر دونوں کو اتفاق تھا۔ یوں تو ایک ہی صیغہ میں ایجاب و قبول کے بعد نکاح مکمل ہو جاتا ہے مگر میں نے اور الیاس نے سات یا آٹھ صیغے جو کتاب میں درج تھے با قرأت پڑھے۔ جب ہم لوگوں نے کتاب بند کی تو اس مختصر سے مجمع میں ہر طرف سے مبارکبادیوں کی صدا آنے لگی۔ چھوارے اور شکر تقسیم ہوئے۔ اس اجتماع میں سب سے زیادہ خوش باقر کی اماں نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے شیریں اور بڑی بہو زہرہ ضیاء کو حکم دیا کہ وہ لوگ دو تین شادیانے گائیں۔ چنانچہ ان دونوں نے میزوں کی تھاپ پر دو تین گیت سنائے اور نکاح نامہ پر سب کے دستخط ہوئے۔ اس طرح وسیمہ اور باقر کی ایک دن میں تین بار شادیاں ہوئیں۔ ۱۱ بجے صبح سول میرج، ایک بجے دن کو ہندو قاعدہ سے شادی اور چھ بجے شام کے وقت اسلامی قاعدہ سے عقد نکاح کی رسمیں ادا ہوئیں۔

صبح دوسرے دن ہم لوگ وسیمہ کو لیکر کالکا میل پکڑنے جب دہلی اسٹیشن پہنچے تو وسیمہ کے والدین اور بھائی بہنیں اور رکپور صاحب وغیرہ مزید وسیمہ اور بارات کو رخصت کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھے۔ ۸ بجے صبح کالکا میل روانہ ہو کر ۲ بجے شب میں دھنباد پہنچی۔ شموں ہم لوگوں کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کئی کاریں اور سامان کے لیے ایک ٹرک موجود تھا۔ تقریباً ۵ بجے صبح ہم لوگ لویا باد پہنچے۔

شموں نے دھنباد میں رہ کر جملہ ضروری کام کر ڈالے تھے۔ تمام اعزہ اور احباب اور اپنے قریبی ہم پیشہ لوگوں کو ۶ دسمبر بروز اتوار دعوت ولیمہ میں شرکت کے دعوت نامے بھیج دیئے تھے۔ وقت کا کوئی تعین نہ تھا۔ دعوت ولیمہ کے اوقات تھے ۱۲ بجے دوپہر سے ۶ بجے شام تک۔ تقریباً سبھی اعزہ اور احباب شریک ہوئے مگر قریبی اعزہ اس بات کے شاکی تھے کہ ان کو برات میں نظر انداز کیا گیا۔ جس کا جواب یہ تھا کہ مجھ کو ان سب کی جانیں بہت عزیز تھیں۔ اور اس برات میں محض ان ہی افراد کو تکلیف دی گئی تھی جو باقر کے جان نثار دوستوں میں سے تھے اور علاوہ شموں کے صرف میری بیوی بچے تھے۔ ہم ہتھیلیوں پر جان رکھ کر گئے اور دوسرے اعزہ یا احباب

کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ دعوت ولیمہ کے دعوت نامے بھی ہمارے دہلی روانہ ہو جانے کے بعد دیے گئے تھے۔ میں نے تو اپنے سگے بھائی بہنوں تک کو برات میں چلنے کی دعوت نہیں دی تھی۔

اس کے دو تین دن بعد میں اور میری بیگم صاحبہ وسیم اور باقر کے ساتھ کانکے رانچی پہنچے۔ باقر اور وسیم کے جاننے والوں کی تعداد کانکے اور رانچی میں سب سے زیادہ تھی۔ وسیم نے بھی کانکے ہی سے کلینکل سائیکولوجی کا ڈپلوما لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنی چھوٹی بہو کو استقبالیہ دیا جس میں علاوہ اسپتال کے ڈاکٹروں اور اسٹاف کے رانچی شہر کے بھی احباب اور عمائدین کو دعوت دی تھی۔ یوں تو اس استقبالیہ میں سب خوش نظر آتے تھے مگر چند مسلمان اور چند ہندو حضرات اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ یہ لوگ رانچی کے فرقہ وارانہ جماعتوں کے سربراہوں میں سے تھے مگر چونکہ میری اور باقر سے شناسائی تھی اس لیئے ہم نے ان کو دعوت دیکر اپنا فرض ادا کیا تھا اور میرا ضمیر مطمئن تھا۔

اب میں اپنے تینوں بچوں کی شادی کر کے گنگا نہا چکا تھا۔ کانکے میں ہفتہ عشرہ قیام کر کے اپنی بیگم کو لیکر اپنے وطن کجگاؤں واپس آگیا اور ایک لمبا سانس لیا۔ اپنی کارکردگی کا جائزہ لیا تو اپنی تخلیقات سے دل اس قدر مطمئن نہ ہوا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ ہمیشہ سے میرا خیال رہا ہے کہ جو شاعر جتنی اچھی نثر لکھے گا اتنا ہی اچھا وہ شاعر بھی ہوگا چنانچہ میں نے انشاپردازی کی مشق شروع کی اور شاعری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

ابھی مجھ کو رانچی سے آئے ہوئے چند ہی ہفتے گذرے ہوں گے کہ شہر جونپور سے آنیوالوں میں جو شخص سب سے پہلے مجھ سے ملنے آیا وہ ایک چھریرے بدن کا چھبیس تیس برس کا جوان آدمی تھا۔ میں حسب دستور اپنے مردانہ برآمدے میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا یا پڑھ رہا تھا یاد نہیں کہ یہ صاحب جو پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھے کاندھے سے اپنا جھولا اتارتے ہوئے میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا آپ کی تعریف۔ تو بولے کہ مجھ کو ابھے کمار کہتے ہیں۔ میں نے کہا "فرمائیے آپ نے کیسے تکلیف کی"۔ "بس آپ سے ملنے آیا ہوں"۔ "مگر مجھ سے ملنے کا خیال آپ کو کیسے آیا اور آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟" "میں جونپور شہر کا رہنے والا ہوں۔ راج کالج میں ہسٹری پڑھاتا ہوں اور جرنلسٹ بھی ہوں۔ ہندی میں کہانیاں، مضامین اور کویتا بھی لکھتا ہوں اور یہ کہ آپ بابو ریشیشر پرشاد جی کو تو جانتے ہوں گے ان کا بیٹا ہوں"۔ "مگر آپ مجھ کو کیا جانیں۔ میں تو پورے چودہ سال کے بعد وطن واپس آیا ہوں"۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ چودہ برس بعد واپس آئے ہیں مگر میں برابر آپ کی شاعری پڑھتا رہا ہوں اور جب ایک دوست سے اڑتی ہوئی خبر ملی کہ آپ کشمیر سے ریٹائر ہو کر اپنے جنم بھومی کجگاؤں میں رہنے کے لیے آگئے ہیں تو آپ کا پتہ لگاتا ہوا یہاں پہنچا ہوں کہ آپ سے بھینٹ کروں۔ اور لیکھک اور پتر کار ہونے کے ناتے آپ سے کچھ پوچھوں"۔ میں نے کہا "ضرور پوچھیے"۔ "پہلا سوال تو یہ ہے کہ

آپ زندگی بھر بڑے بڑے شہروں میں رہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد اس چھوٹے سے دیہات میں اور اتنے بڑے مکان میں آپ نے اکیلے رہنا اور باقی جیون گذارنا کیوں پسند کیا؟"۔ میں نے جواب دیا "یہ سوال اور آپ کا اشتر ج (استجاب)، تو بالکل مناسب اور درست ہے مگر اس کا جواب بہت لمبا (طویل) ہے"۔ "مگر اس وشئے میں کچھ تو کہئیے"۔ "درآنحالیکہ میں مجبوراً زندگی بھر شہروں میں رہا مگر (essentially) بنیادی طور پر میں ایک دیہاتی ہی ہوں۔ مجھ کو یہ کھیت کھلیان، یہ کچے مکانات، یہ دیہاتی لوگ، یہ ہریالی، یہ صاف ہوا اور پانی بہت پسند اور پیارے لگتے ہیں۔ یہاں کے بدلتے ہوئے موسم اور برسات بھی شہروں کے مقابلہ میں زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں ہر چیز اپنے اصل رنگ و روپ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ رہا ہماری لال کوٹھی کی تنہائی اور سناٹا، تو اس کی مجھ کو سخت ضرورت ہے۔ پڑھنے لکھنے کے لیے ایسے ہی سکون اور سناٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہروں میں مصنوعی چہروں کی نمائش کو بھی دیکھنا چاہوں گا مگر مستقل قیام تو اب لجگاؤں ہی میں رہے گا۔" "آپ صورت شکل سے تو ذہین آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے مختصراً جو کچھ کہا ہے اس کو آپ خود ڈیولیپ کرسکتے ہیں۔" "جی ہاں، بس اتنا میرے لیے کافی ہے۔ اگر اجازت دیجیے تو دو ایک سوال اور کروں"۔ میں نے کہا "ایسا کیجیے کہ چونکہ میں ہندی برائے نام ہی جانتا ہوں، اس لیے آپ چار پانچ کے سب سوالات انگریزی میں لکھ ڈالیے۔ میں دو تین دن میں طبیعت موزوں ہوتے پر ان کا جواب آپ کو تحریر میں دیدوں گا۔ اور اب میں چائے کے لیے اندر جا رہا ہوں"۔ یہ کہ کر میں اندر آیا اور نوکرانی سے چائے لانے کو کہکر پھر باہر چلا آیا۔ اور ان کو ایک کاغذ پر سوالات لکھتے ہوئے پایا۔ آدمی (One track minded) اور دھن کے پکے معلوم ہوتے تھے۔ چائے پر اور بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ اُن سے زیادہ میں نے ان کا انٹرویو لے ڈالا۔ کریدنے پر ان کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی وہ یہ تھی کہ وہ (Extreme leftist views) انتہا پسند بائیں نظریات کے آدمی ہیں۔ مارکسزم اور ماؤازم کا اچھا مطالعہ ہے اور اردو کے عشق کی حد تک دلدادہ ہیں۔ اور چرس اور کافی ان کے پسندیدہ نشے اور مشروب ہیں اور کافی بھی بلیک بغیر دودھ شکر کی۔ رخصت ہوتے ہوئے دس سوالوں پر مشتمل ایک سوالنامہ دے گئے۔ سوالات میری شخصیت، فن اور نظریات کے متعلق تھے، جن کے جوابات میں نے دو تین دن میں لکھ ڈالے۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد جب اجے کمار آئے تو میں نے جوابات کا اسکرپٹ ان کے حوالے کردیا۔ اب کی وہ ایک ٹیپ ریکارڈ بھی ساتھ لائے تھے۔ جس کو چلا کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے پہلے اپنی چند چھوٹی چھوٹی کویتائیں سنائیں۔ مختلف موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پھر مجھ سے چند نظموں کی فرمائش کی جو میں نے ان کو سنائیں۔ بلا شکر اور دودھ کی کافی آئی تو انھوں نے چارمینار سگریٹ کی ڈبیا نکالی، اس میں سے ایک سگریٹ نکالا جس کا تمباکو نکال کے اس میں کوئی اور چیز (غالباً چرس)، بھری۔

دو ایک گشت کے بعد ان کی باتوں میں زندگی آ گئی اور وہ اپنے چند تجربات بیان کرتے رہے جس کو سن کر اندازہ ہوا کہ ان کا تعلق نکسل وادیوں سے بھی رہا ہے۔

دو تین ملاقاتوں کے بعد ان کا آنا جانا مدتوں بند رہا۔ نکسل وادیوں کی ملک میں گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ آج کل روپوش ہیں اور کہاں ہیں کسی کو نہ معلوم تھا۔

اب شہر سے جو میرا تھوڑا بہت رابطہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ کجگاؤں میں پہلے ہی سے قحط الرجال تھا۔ اپنے ہم عمروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے دل بہلانے کے لیے طبیعت مائل ہوتی۔ جونپور میں تقریباً سب ہی اجنبی ہو چکے تھے اس لیے اپنی عمر سے کم چند ہم وطنوں سے ملنا پڑا۔ میرے تقریباً ہم عمر نصیر میاں پنشن لیکر وطن آ گئے تھے۔ جوان پارٹی ممبروں میں محمود میاں، نذر حسین عرف مولو میاں بس ایسے تھے جن سے دفع الوقتی ہو سکتی تھی۔ دیہات میں شام کا وقت بہت بھیانک ہوتا ہے۔ دل ہلا دینے والا سناٹا۔ کوئی خاص حلقہ احباب نہ تھا۔ دن اور شب میں تو پڑھا لکھا جا سکتا ہے مگر شام کے وقت کوئی کام کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کبھی نصیر کے یہاں کبھی محمود کے یہاں اور کبھی مولو اور ان کے عزیز حیدر مہدی کے یہاں جا کر شام گذارنے لگا۔ ایک عزیز قریب عباس حسین تھے، ہر وقت سادات وظیفہ فنڈ کے سکریٹری ہونے کے سبب سے ان کی جان میں نے بخش دی تھی۔ علاوہ عباس کے مندرجہ بالا ہم وطنوں میں ہر ایک اپنے اپنے فن میں طاق تھا۔ نصیر بڑے مردم شناس تھے اور ہر شخص سے ہر وقت مشکوک رہا کرتے تھے۔ محمود انتہائی ذہین اور بلا کا حافظہ رکھتے تھے۔ گاؤں اور قرب و جوار کے لاتعداد واقعات اور قصے یاد تھے، جن کے بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے تھے اور غیبت کے تو پٹارا تھے۔ مولو پارٹی C.P.I. کے ممبر تھے اور ہر بات کو گھما پھرا کر سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے ملا دیتے تھے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا کمیونسٹ پارٹی تھی۔ ہٹ دھرمی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ حیدر مہدی B.A.B.Ed. اور سب سے زیادہ پڑھے لکھے کم گو اور متوازن طبیعت رکھتے تھے۔ یہاں کوئی اردو یا انگریزی کا روزنامچہ تو آتا نہ تھا اس لیے علاوہ ریڈیو اور حیدر مہدی کے اخبار عالم تک پہنچنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مجبوراً مجھ کو اپنے ان کم عمر ہم وطنوں سے دوستی کرنا پڑی اور کافی بے تکلفی ہو گئی۔ چند ماہ بعد ہم لوگوں نے ایک "غیبت کلب" بنایا جس کی نشست روزانہ شام کو محمود کے مکان پر ہونے لگی۔ نصیر، محمود، مولوی حیدر مہدی اور میں اس کے (Founder member) بانی ممبران قرار پائے (Oath of secrecy) حلف رازداری لیا گیا اور غیبتوں کا کاروبار جاری ہو گیا۔ روزانہ وطن کے کسی بزرگ خاندان یا نمایاں فرد کا نام چن لیا جاتا اور اس کی بخیہ ادھیڑی جاتی۔ کلب کی کارروائی یا مذاکرات کے راز کو فاش

کرنے کی سخت سزا تھی۔ یعنی قاعدہ کی خلاف ورزی کرنیوالے کو بہت بڑی دعوت دینا پڑتی۔ اس کلب میں واقعات واخبار حاضرہ پر بھی تبادلۂ خیال ہوتا۔ کسی سنجیدہ موضوع یا کسی فلسفہ، بڑے مورخین، ادیبوں، شخصیتوں، سماجیات اور جنسی مسائل پر بھی تقریریں ہوتیں، جن پر زیادہ تر میرا قبضہ رہتا اور یہ تقریریں دو۔ دو، تین۔ تین دن تک بالاقساط جاری رہتیں۔ بالعموم کلب کی نشستیں دو ڈھائی گھنٹے تک چلتیں اور سب ممبران خوش خوش اپنے اپنے گھر واپس جاتے۔ موسم کی سختیاں کلب کی نشست میں رکاوٹ نہ بنتی تھیں۔

دوران نشست جب کوئی چھوٹا آدمی آجاتا تو گفتگو کا رخ بدل دیا جایا کرتا۔ مگر "بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا"۔ رفتہ رفتہ گھروں میں گاؤں کے دوسرے حضرات میں اور جونپور کے شہر تک یہ خفیہ کلب موضوعِ بحث اور سبب تجسس بننے لگا۔ اور چند مجرموں نے اس کی ممبری اور راز معلوم کرنے کی کوشش شروع کی۔ نئی ممبری کے شرائط یہ تھے کہ تین مہینہ تک امیدوار۔ تین مہینہ تک ممبر انڈر ٹریننگ رہنا پڑے گا اور روزانہ ایک گھنٹہ سے زیادہ اس کو کلب میں چھ مہینہ تک بیٹھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اور اس کے چال چلن کا جائزہ لیا جائیگا۔ اس کے ممبری کے لیے خفیہ رائے شماری ہوگی۔ پانچ میں سے اگر ایک نے بھی اس کو (Black ball) ممبری کا ووٹ نہیں دیا تو وہ ممبر نہ ہوسکے گا۔ اور اگر سب نے اس کو ممبری کے قابل تسلیم کرلیا تو اس کو ایک (Initiation Dinner) دعوت داخلہ دینا پڑے گی۔ نتیجہ میں آج تک اس کلب کا کوئی چھوٹا ممبر نہیں ہو سکا۔ کلب ابتک قائم ہے مگر اب اس کی نشستیں بہت کم ہوتی ہیں۔ سب ہی معاش کی فکر میں منہمک رہنے لگے۔ میری بھی زندگی ایک ڈھرّے پر چل نکلی تھی، اس لیے مل بیٹھنے کے مواقع کم ملتے تھے۔

لال کوٹھی میں جب زندگی پاؤں نکالنے لگی تو معلوم ہوا کہ کوٹھی کی کسی کسی جگہ پلاسٹرنگ دیواروں کی سفیدی اور بارش میں ٹپکتی ہوئی چھتوں کی مرمت ہونی چاہیے۔ چنانچہ راجگیر اور مزدوروں کے ساتھ ساتھ کام کرکے میں نے دو ہفتہ میں لال کوٹھی کو واٹرپروف یعنی پروف اور رونٹر پروف بنالیا۔

شہروں میں مکانات بالعموم چھوٹے ہوتے ہیں اس لیے وہاں کبھی کبھی بغیر ملازم یا مددگار کے بھی زندگی بسر ہوسکتی مگر والدین سے ترکے میں پائے ہوئے اس "فورٹ ولیم" میں کم از کم بغیر ایک باورچی یا باورچن کے کام نہیں چل سکتا بالخصوص بیگم کی گرتی ہوئی صحت کے مدنظر۔ اتفاق یہ ہوا کہ شکراللہ بونامی ایک عورت بیگم کے پاس آئی اور ان کے پاؤں دبا دبا کر اور رو رو کر اپنی داستان سنانے لگی کہ اس کا شوہر آٹھ سال سے لاپتہ ہے۔ اقبال نامی منجھلا لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ پانچ سال کا چھوٹا آفتاب ساتھ میں ہے اور بڑے لڑکے نے اپنی بیوی کے کہنے پر اس کو مار کے گھر سے

نکال دیا ہے۔ چھ مہینوں سے وہ قرب وجوار کے دیہاتوں میں پھیری کر کے اپنا اور اپنے چھوٹے بچے کا پیٹ پال رہی ہے، مگر ابھی تک گاؤں میں سر ڈھانکنے کی جگہ نہیں ملی۔ جس جس کے گھر میں وہ رہی اس کی دو چار پیسہ کی کمائی اور دال چاول جو وہ بازار سے لاتی ہے اس کو وہ لوگ چرا لیا کرتے ہیں۔ اگر باہر کے ساگر پیشے میں اس کو ایک کوٹھری مل جائے تو وہ باورچی خانہ کا کام بھی کرے گی اور خالی اوقات میں دیہات دیہات پھیری بھی۔ اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ۔ بیگم نے کہا کہ اس کو اس شرط پر کوٹھری دے سکتی ہیں کہ وہ باقاعدہ ان کی نوکری کرے اور معقول تنخواہ پر باورچن کا کام انجام دے اس کے بعد اس کے بچہ کو کھانا عید بقرعید پر وہ اس کو ساری اور کپڑے بھی دیں گی اور فرصت کے اوقات میں پھیری کی اجازت بھی۔ شکر اللہ بونے جواب دیا کہ وہ نوکری کرنے پر تو تیار رہے مگر اس کو صاحب اور بیگم لوگوں کا کھانا پکانا نہیں آتا تو بیگم نے کہا کہ وہ اس کی فکر نہ کرے، دو تین مہینوں میں وہ اس کو چپاتیاں اور چار چھ ہانڈیاں سکھلا دیں گی۔ وہ بہت خوش ہو کر ان شرائط پر راضی ہو گئی۔ اس دن سے آج تک وہ گھر کا پورا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ جب کبھی ہم میاں بیوی باہر جاتے ہیں تو پورا مکان اور گرہستی اس پر چھوڑ کر جاتے ہیں۔ علاوہ کھانے پینے کے چیزوں کے کسی دوسری چیز کی چوری نہیں کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کو مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا بھی آگیا ہے۔ آرام کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ بازار کی خرید و فروخت میں اس کے چند پیسے مار لینے پر زیادہ معترض نہیں ہوئے۔

ہمارے وطن میں چند خاندان اچھے پٹھانوں کے بھی ہیں۔ زراعت پیشہ خاندان ہیں۔ ان میں نہر خاں ایک بزرگ تھے جو اپنے کھیتوں میں خود ہل چلاتے تھے اور غلہ کے گٹھے اٹھا کر گھر لاتے تھے۔ ان کے بیٹے فقیر محمد خاں اور پوتے محمد جمیل اپنے کھیتوں میں اب بھی کام اسی طرح کرتے ہیں۔ اس دوران قیام وطن میں ۱۹۷۰ء میں یہ ہوا کہ ایک دن فقیر محمد خاں اپنے نوعمر بیٹے جمیل خاں کو لیکر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "یہ میرا لڑکا ہے۔ اس نے اسی سال II ڈویژن میں T.D.College Jaunpur سے جغرافیہ کے ساتھ B.A. کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ جغرافیہ میں M.A. کرے۔ بنارس۔ الہ آباد اور گورکھپور تمام گھوم آیا مگر II ڈویژن ہونے کے سبب سے ہر جگہ سے جواب مل گیا۔ اب اگر آپ علیگڑھ میں کوشش کر دیں تو شاید کامیابی ہو جائے" میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اس وقت شعبۂ جغرافیہ سب سے اچھے اور معیاری جغرافیہ کا مرکز مانا جاتا ہے۔ وہاں علاوہ اوّل درجے کے طلبا کے دوئم درجہ کا بھی داخلہ نہیں ہوتا تو ان صاحبزادے کا وہاں داخلہ ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے اور وہاں اب داخلے بھی بند ہو چکے اور پڑھائی بھی شروع ہو چکی ہوگی اور تیسری مشکل یہ ہے کہ اس منزل پر داخلہ کا فارم بھی نہیں مل سکتا۔ وہاں سے لوگ دو دو مہینہ پہلے فارم منگوا لیتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ غرض والا اندھا ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ وہ اندھے سے زیادہ بہرا ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا

تو میری باتیں سنکر کا نمعا ڈال دیتا مگر نفیر محمد خاں اپنی اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپ ہم لوگوں کے ساتھ علیگڈھ چل کے کوشش کر دیں گے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی ہو گی جب میں نے یہ رُخ دیکھا تو مغز اسی میں معلوم ہوا کہ ایک اچھا سا خط ڈاکٹر محمد شفیع صدر شعبۂ جغرافیہ کو لکھ دوں اس کے بعد دیکھا جائیگا۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ یہ لڑکا جمیل خاں بہت نیک اور اُس وقت کم سخن تھا۔ اس میں بالکل چلت پھرت نہیں تھی۔ جبکہ علیگڑھ میں کام نکالنے والے طلبا نہایت تیز اور طرار ہوتے ہیں بہرحال میں نے ڈاکٹر شفیع کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "آپ در اصل ایک جونپور کے رہنے والے ہیں اور مدت سے علیگڑھ میں ہیں۔ اور چاہیں تو آپ ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس کو آپ مناسب تصور کریں خواہ وہ قاعدہ کی رو سے غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ آج میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ہم وطنوں کا کتنا خیال ہے اور آپکے قلم اور فہم میں کتنی قوت ہے۔ حامل خط محمد جمیل خاں کو M.A. Geography داخلہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔ یہ حضرت II کلاس B.A. ہیں جغرافیہ میں بھی اچھے نمبر نہیں ہیں مگر ان میں محنت کرنیکا فطری جذبہ ہے۔ خالص زراعت پیشہ ہیں۔ خود ہل چلاتے ہیں، بیل ہانکتے ہیں، آبپاشی خود کرتے ہیں، فصل کاٹتے ہیں اور جس کو سر پر لاد کر گھر لاتے ہیں۔ یعنی کسان ہیں اور اجبٹ دیہاتی کیا آپ کے یہاں ایسے بچوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا آپ نے ذاکر صاحب کا وہ خطبہ نہیں سنا تھا جس میں انھوں نے تھرڈ کلاس طلباء کے لیے ایک مخصوص یونیورسٹی کھولنے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ اُمید ہے کہ آپ اس بچہ کو مایوس نہ کریں گے۔ خواہ جمیل اپنے امتحان میں فیل ہو جائے مگر میں آپ کو اس مشکل امتحان میں کامیاب دیکھنے کے لیے بےچین رہوں گا۔

یہ خط بند کر کے میں نے جمیل کو دیا اور کہا کہ اب میری ہدایات کو بغور سنو اور ذہن نشین کر لو اور علیگڑھ پہنچ کر حرف بحرف ان پر عمل کرنا۔ اگر میری باتوں کی ایک کڑی بھی تم بھول گئے تو داخلہ کی کوئی گنجائش نہ رکھنا۔ امید تو یوں بھی نہیں ہے۔ جغرافیہ کیا موجودہ دنیا میں II کلاس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سے ایک سیاہ شیروانی اور ٹوپی پہن کر علیگڑھ جانا ہے ساتھ ایک دری ایک تکیہ ایک اوڑھنے کی چادر اور دو جوڑے کپڑے اسی دری میں لپیٹ کر در بغل لے جانا۔ اخراجات کے روپئے وغیرہ کرتے کے اندر جیب میں رکھنا اور کسی وقت نہ بھولنا کہ تمہارے پاس روپئے ہیں۔ بھولے اور جیب کٹی علیگڑھ پہنچ کر سیدھے یونیورسٹی جانا اور شعبۂ جغرافیہ میں داخل ہو کر ڈاکٹر شفیع کے دفتر کے سامنے برآمدہ میں اُن کے دروازہ سے لگا کر اپنا بستر کھول دینا اور آرام سے اس پر لیٹ کر ان کا انتظار کرنا۔ ان کا چپراسی روکے گا مگر تم اس کا کوئی نوٹس نہ لینا۔ شفیع صاحب کو دیکھتے ہی السلام علیکم کہکے کھڑے ہو جانا۔ وہ "سم کُم" کہکر اپنے دفتر میں چلے جائیں گے۔ علیگڑھ میں کوئی السلام علیکم نہیں کہتا۔ سب "سم کم" کہتے ہیں اور جواب بھی "سم کُم" ہوتا ہے۔ اس کے بعد تم پردہ ہٹا کر داخل ہونے کی اجازت لیکر اندر جانا اور میرا خط دینا اور چُپ کھڑے رہنا جب تک وہ خود کوئی

سوال نہ کریں۔ اغلب یہ ہے کہ تمہارے سامنے ہی وہ میرا خط پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں گے اور تم سے کہیں گے کہ آپ واپس جائیے۔ آپ کا داخلہ ناممکن ہے اور یہ کہ میرے خط کا جواب ڈاک سے دیدیں گے۔ تو تم خاموشی سے باہر چلے آنا اور باہر اپنے بستر پر لیٹ جانا۔ اور ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا۔ جب وہ کہیں جانے کے لیے باہر آئیں تو تم پھر سلام کرنا۔ وہ تم سے دریافت کریں گے کہ آپ ابھی تک گئے نہیں۔ تم کہنا نہیں جناب۔ وہ پھر کہیں گے آپ واپس جائیے داخلہ نہیں ہو سکتا۔ تم کہنا جی جناب اور ان کے چلے جانے کے بعد پھر بستر پر لیٹ جانا۔ درمیان میں بھوک لگے تو بستر در بغل قریب شمشاد مارکٹ جاکر کسی ہوٹل میں کھانا کھانا۔ اور پھر واپس آکر ان کے دفتر کے دروازہ کے بغل میں اپنا بستر لگا دینا۔ رات کو بھی وہیں سونا۔ چوکیدار نکالے تو قریب کسی دوسرے کھلے برآمدہ میں سو رہنا۔ مایوس بالکل نہ ہونا اور اس عمل کو دو تین دن تک دہرانا۔ تیسرے ہی دن وہ تم کو دفتر میں بلائیں گے اور بہت ڈانٹیں گے۔ اور تم بس جی جناب کہتے رہنا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے چپراسی کو بلا کر حکم دیں کہ ان کو دور پھاٹک کے باہر چھوڑ آؤ۔ تم کچھ تعرض نہ کرنا۔ اور چلے جانا اور پھر موقع ملتے ہی اپنی پرانی جگہ پر جاکر بستر بچھا دینا اور دیکھنا اب کیا ہوتا ہے۔ اگر تمہارا داخلہ تب بھی نہ ہوا تو اس کے آگے میں کچھ نہ کرسکوں گا۔

جمیل بستر در بغل علیگڑھ گئے اس کے چھ مہینہ تک نہ ان کے باپ مجھ سے ملنے آئے اور نہ جمیل خود یوں بھی فقیر محمد خاں لکھنؤ میں سرکاری نوکر تھے اس لیے بھی ان سے مدتوں ملاقات نہ ہوئی۔ مگر ایک دن دیکھتا کیا ہوں کہ جمیل خاں نہایت عمدہ سلی ہوئی بش شرٹ اور پتلون پہنے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا "ارے میاں کہاں کھو گئے تھے، تم نے تو علیگڑھ جانے کے بعد خط بھی نہیں لکھا"۔ جمیل خاں نے جواب دیا "بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آیا ہوں۔ داخلہ ہو گیا تھا اور پڑھائی چونکہ پچھڑ گئی تھی اس لیے آپ کو خط لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ معافی چاہتا ہوں"۔ "اچھا تو یہ بتاؤ کہ وہاں ہوا کیا اور تمہارا داخلہ کس طرح ہوا"۔ جمیل خاں نے اپنی داستان سنائی۔ "آپ نے جتنی ہدایتیں کیں تھیں میں نے اس پر حرف بحرف عمل کیا۔ کئی بار ڈاکٹر شفیع کی ڈانٹیں بھی کھائیں۔ بستر بھی پھکوایا گیا۔ مگر میں ڈٹا رہا۔ چوتھے یا پانچویں دن دفتر میں جاتے ہوئے مجھ کو اپنے ساتھ اندر لے گئے اور فرمایا کہ "آپ کے ایسا ضدی اور گستاخ لڑکا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر وامق صاحب کا خیال نہ ہوتا تو آپ کو پرائکٹوریل جیل بھجوا دیتا مگر خیر۔ بیٹھو"۔ اور میں ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کے بغل کی میز پر دس پندرہ اُن فرسٹ کلاس طالب علموں کی درخواستیں رکھی ہوئی تھیں جنھوں نے گھر سے قریب کہیں اور داخلہ لے لیا تھا۔ ان کو وہ الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر ایک کاغذ پر رجسٹرار کو یہ لکھا کہ ان کو لیٹ فی لیکر ایک

داخلہ کا فارم As a special case دیدیا جائے" میں وہ خط لیکر رجسٹرار آفس اور وہاں سے ایک فارم خرید کرلے آیا۔ تصویر ساتھ تھی ہی اس کو چسپاں کرکے وہ فارم میں نے انھیں کے سامنے بھرا۔ اور اپنے جملہ کاغذات اس کے ساتھ نتھی کردیے۔ میری اس درخواست پر ڈین آف فیکلٹی آف سائنس کو انگریزی میں جو ریمارکس لکھے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ باہر سے آنیوالے چند طالب علموں نے کہیں داخلے لینے کی اطلاع دیدی ہے اس لیے ابھی ان کی جگہ کو پُر کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر درخواست ایک II کلاس .B. A جمیل خاں کی ہے۔ قاعدہ کی رو سے ان کا داخلہ نہیں ہوسکتا مگر میں بحیثیت صدر شعبہ اس کو As a special case اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ ایک کسان پیشہ غریب اور کم تعلیم یافتہ اور پس ماندہ طبقہ کا لڑکا ہے جس کی ہمارے یہاں کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ جگہ خالی رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو داخلے کی اجازت دی جائے"۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کاشت اور فصل وغیرہ پر سوالات کئے جن کا میں نے تسکین بخش جواب دیا۔ تب انھوں نے ڈین کی حیثیت سے میری درخواست کو وائس چانسلر کی طرف اپنی سفارش کیساتھ رجوع کردیا۔ اور V.C نے میرے داخلہ کی توثیق کردی اور میرا داخلہ ہوگیا۔"

جمیل خاں نے علیگڑھ سے سیکنڈ کلاس جغرافیہ میں .M.A پاس کیا۔ اس کے بعد وہیں سے .M. Ed اور .B. Ed کیا۔ ان کو میں نے یہاں کے شیعہ کالج میں ایک خالی جگہ پر نوکر رکھوادیا اور یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک چلتا رہا۔ جب محکمہ تعلیمات کا حکمنامہ آیا کہ جو اساتذہ کسی خالی جگہ پر عارضی دو سال سے کام کررہے ہیں ان کو مستقل سمجھا جائے تو وہ مستقل ہوگئے اور آج ان کا شمار کالج کے اچھے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اور وہی میرے بچوں کے اسکول کے منیجر بھی ہیں۔ مجھ کو خوشی ہے کہ ذاکر صاحب کے خواب کی تعبیر جمیل خاں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مٹی کا تیل کبھی کبھی ناپید ہوجایا کرتا تھا اور اب بھی۔ شہر کی زندگی نے دو لعنتیں اور سر تھوپ دی تھیں۔ بجلی اور پیسے کا پانی۔ بجلی تو میں نے ۱۹۷۱ء میں ہی لگوالی تھی مگر پیسے کے پانی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ یہاں کے لیے واٹر ورکس کا حکم جاری ہوچکا تھا مگر اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہورہا تھا۔ شہر دوڑا دھوپا مگر کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اوائل ۱۹۷۲ء میں سے کسی سفر سے واپس آرہا تھا کہ راستہ میں پولیس لائن اور اس سے ملا ہوا .P.W.D کا ڈاک بنگلہ پڑتا ہے۔ وہاں دیکھا کہ بہت سی کاریں کھڑی ہوئی ہیں اور کافی تعداد میں لوگ اندر باہر آجارہے ہیں۔ چوراہے کے سپاہی سے جب دریافت کیا کہ کون صاحب آئے ہوئے ہیں تو معلوم ہوا کہ اپنے پرانے ساتھی آغا زیدی ڈپٹی منسٹر آبپاشی اور واٹر سپلائی دورے پر آئے ہیں۔ مع بستر اور سامان کے میں نے رکشا والے سے کہا کہ "دوڑ دے رکشا ڈاک بنگلہ کے اندر" کوئی بارہ بجے دن کا وقت تھا۔ برآمدہ کے سامنے رکشا رکا اور قبل اس کے کہ دربان کچھ تعرض کرے میں چلمن اٹھاکر .V.I.P

کمرہ میں داخل ہوگیا۔ آغا زیدی سب کام اور میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے انجنیئروں اور نیتاؤں کو مبہوت چھوڑ چھاڑ کھڑے ہو گئے۔ "ارے وامق بھائی آپ نے کیوں تکلیف کی میں تو خود آنے والا تھا" اور یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے۔ "یہاں میں آیا ہوں تو کھانا بھی کھاؤں گا اور کجگاؤں میں آپ کو چائے بھی نہ پلا سکوں گا۔" "کیوں وامق بھائی خیریت تو ہے۔" "خیریت ہوتی تو آتا ہی کیوں۔ منسٹروں اور سرکاری افسروں سے میں اُس وقت تک نہیں ملتا جب تک (عوام) جنتا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ میرے گاؤں کے لوگ بڑی تکلیف سے گذر رہے ہیں۔ بن بھروں نے بیڑی بنانا اور قالین بننا شروع کر دیا ہے اس میں ان کو زیادہ اجرت ملتی ہے۔ واٹر ورکس کب کا سینکشن ہو چکا ہے مگر آپ کے متعلقہ ضلع افسران باوجود دوڑ دھوپ اور کوشش کے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔" "مجھ کو تو اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ابھی ابھی میں نے اپنے قصبہ مچھلی شہر کے لیے دو ٹنکیوں کی فوری تعمیر کی منظوری دی ہے S.D.O. صاحب وہ کاغذ لائیے اور وامق بھائی آپ یہاں بیٹھیے (اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں ابھی اپنے آرڈر میں ترمیم کیے دیتا ہوں" اتنا کہنے پر بیک وقت آغا زیدی کے بغل کی دو کرسیاں خالی ہوگئیں اور میں شکریہ کہہ کر ایک پر بیٹھ گیا۔ انجنیئر نے آغا زیدی کے سامنے وہ کاغذ رکھ دیا اور انھوں نے اپنے پرانے حکم کو بیک گردش قلم مسترد کر کے "پہلے ایک ٹنکی کجگاؤں اور دوسری مچھلی شہر کے لیے جلد از جلد تعمیر کیے جانے" پر دستخط کر دیئے۔

اس کے بعد میں نے چپراسی سے اپنا اسباب دوسرے کمرہ میں رکھوایا اور رکشہ والے کو کرایہ دے کر آزاد کر دیا۔ لنچ آغا زیدی کے ساتھ کیا۔ آغا زیدی نے کہا کہ "آپ بروقت آگئے ورنہ مجھ کو آپ سے بہت شرمندہ ہونا پڑتا۔" میں نے جواب دیا "یہ تو حسن اتفاق تھا کہ آج ہی میں ایک مشاعرہ سے واپس آیا ہوں۔ سڑک سے یہاں کا مجمع دیکھا تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ چلئے بڑی خوشی ہے کہ آپ سے مدت کے بعد ملاقات ہوئی اور ایک بڑا کام آپ کے ہاتھوں سے ہو گیا۔ منسٹری رہے یا نہ رہے۔ جب اپنے گاؤں میں پانی کی ٹنکی دیکھوں گا تو آپ کی یاد تازہ ہو جایا کرے گی۔" کھانے کے بعد ان کو کوئی موقع دیکھنا تھا۔ ایک طرف وہ روانہ ہوئے اور مجھ کو انجنیئر کی گاڑی پر کجگاؤں روانہ کیا۔

اب روشنی اور پانی کی تکلیف کم ہے مگر بالکل اس سے مفر نہیں ملا ہے۔ بجلی آئے تو پانی ملتا ہے بجلی نہیں تو پانی بھی نہیں۔ بجلی کا عالم یہ ہے کہ دن یا رات میں آٹھ دس گھنٹے مل جاتی ہے اور کبھی کبھی اس سے کئی کئی دن ملاقات نہیں ہوتی۔ وولٹیج کا (Fluctuation) اتار چڑھاؤ اتنی تیزی سے اور جلد جلد ہوتا ہے کہ ہر مہینہ دو ایک بلب ضرور فیوز ہو جاتے ہیں۔

کاشت کا کام اگر اپنے ہل بیل اور اپنے ہاتھ پیر سے کیا جائے تو اس میں یقیناً منفعت ہے مگر میں کھیتی کرائے کے ٹریکٹروں اور مزدوروں سے کرواتا ہوں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بازار سے غلہ اور سبزی مجھ کو گراں پڑتی ہے۔ آراضی بھی اتنی بڑی نہیں کہ ضرورت سے زیادہ پیداوار ہو اور اس کو فروخت کر کے نقصان پورا کیا جا سکے۔

کشمیر سے واپس آنے کے بعد میری بیگم نے اپنی ایک زمین پر آموں کا ایک چھوٹا سا باغ لگوایا تھا جو اب پھلنے لگا ہے۔ اس سے ہر فصل میں اتنا آم مل جاتا ہے کہ خرید کے آم کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بس اس میں خرابی یہ ہے کہ ہم دونوں کو آم بہت پسند ہے اس لیے مجھ کو ہمیشہ آم کی طرف سے ناآسودگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ آم کی فصل میں اپنے قریب ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں جن کو آم سے رغبت کم ہوتی ہے۔ آم مجھ کو نقصان کرتا ہے مگر زیادہ سے زیادہ آم کھانے کے لیے میں ہر تکلیف گوارہ کر لیتا ہوں۔ میری خالاؤں میں اب ایک ہی خالہ طیبہ بی بی عرف طبن بفضلہ حیات ہیں اور عمر میں مجھ سے چھوٹی ہیں جن کو آم بالکل پسند نہیں۔ اس لئے میں نے ان کو اکثر آم کی فصل یعنی بارش کے موسم میں آنے کی دعوت دی مگر ابتک وہ میری حسرت پوری نہ کر سکیں۔ آم کی فصل میں ان کے آنے سے یہ فائدہ ہو جاتا کہ کھانے پر آم کے تین حصے لگا کرتے۔ بیگم کے سامنے ان کے آم ہوتے میرے سامنے میرے اور طبن خالہ کے حصے کا بھی آم ہوتا۔ اس پر بیگم کوئی اعتراض نہیں کر سکتیں کہ طیبہ بی بی میری خالہ ہیں ان کی نہیں۔

۲۷ ، میں جونپور میں یوم حفیظ جونپوری منایا گیا اور شب میں مشاعرہ تھا۔ علاوہ اس کے کہ سامعین مشاعرہ زیادہ تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ نہ تھے اس میں تین ایسے شعرا سے میری ملاقات ہوئی جو علاوہ اچھے شاعر ہونے کے کافی پڑھے لکھے بھی معلوم ہوتے تھے اور وہ تھے شفیق بریلوی صاحب پرانے انگریزی کے ایم اے۔ اور پرنسپل محمد حسین انٹر کالج جونپور۔ بہت اچھے اور نادر اشعار کہتے ہیں۔ دوسرے عبدالباری صاحب ایڈووکیٹ۔ انگریزی کے ایم۔ اے اور روایتی انداز کے بہت سجی ہوئی غزلیں کہتے ہیں۔ تیسرے روپ نرائن ترپاٹھی جو ہندی اور اردو کے برابر کے کوی اور شاعر ہیں۔ اور اردو نظم پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔ جونپور پر انھوں نے بہت اچھی نظم سنائی۔ کوی سمیلن اور مشاعروں کے بہت ہی اچھے سنچالک بھی ہیں۔

اب ٹی۔ وی اور ریڈیو پروگراموں اور مشاعروں میں پھر بکثرت شرکت کرنے لگا تھا۔ بمبئی، دہلی، کلکتہ، رانچی، پٹنہ، چمپارن، بھوپال، لکھنؤ، آگرہ، ناگپور، فیض آباد، بارہ بنکی، الہ آباد، جالندھر، شملہ، دھرم شالہ، گونڈا، بہرائچ، جھانسی، مرزاپور، دھنباد، جھریا، آسنسول، اعظم گڑھ، غازی پور اور گورکھپور وغیرہ۔ جونپور، اعظم گڑھ، گورکھپور اور فیض آباد کے مشاعروں میں زیادہ تر مجھ ہی کو صدارت کے فرائض انجام دینا پڑتے تھے جس سے گریز کرنے کی میں

بہت کوشش کرتا تھا کہ آزاد رہوں مگر جان نہ بچتی تھی۔

عام طور پر مشاعروں کا معیار اور سامعین کا مذاق شاعری بہت گر چکا تھا چنانچہ میں نے مشاعروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ شروع میں صدارتی تقریروں میں مشاعروں کی افادیت اور اہمیت پر اجمالاً چند جملے کہدیا کرتا تھا مگر کچھ نا قص نظامت کچھ منتظمین کی نااہلی اور زیادہ تر سامعین کے انحطاط پذیر مذاق شعری کے آگے میری کچھ نہ چلتی تھی۔ تو میں نے اپنے شہر کے مضافات گورہ بادشاہ پور کے سالانہ کل ہند مشاعرہ میں ایک صدارتی خطبہ پڑھا جو ذیل میں درج ہے :۔

تاریخ ۲۱ رمئی ۱۹۷۷ء

شعرائے کرام اور معزز حاضرین مشاعرہ! مجھ کو اس امر کا پورا احساس ہے کہ آپ حضرات یہاں شعر سننے اور سنانے آئے ہیں۔ لمبی چوڑی تقریر یا مقالہ نہیں ۔اس لئے آپ کو بتلا دوں کہ میں مقرر نہیں اور نہ اسی وقت آپ کی سمع خراشی کے لیے میرے پاس کوئی طویل مقالہ ہے۔ بس آپ سے مشاعرہ کی اہمیت کے متعلق چند ثانیہ گفتگو کروں گا۔ اور بیٹھ جاؤں گا۔

ایک مدت سے میرے ذہن میں مشاعروں کی موجودہ ہیئت کے متعلق کچھ باتیں کروٹیں لیتی رہی ہیں جن کو مختصراً آج آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مشاعرہ ہمارا ایک تہذیبی ورثہ ہے اور اس کی چند مخصوص روایات ہیں جن کو ترک کرنے سے مشاعرہ کی افادیت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آج کا یہ مشاعرہ مدرسۂ رفیق الاسلام گورہ بادشاہ پور نے منعقد کیا ہے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے مدرسہ کے سرپرستوں نے جملہ اسباب اور سہولتیں بہم پہنچا دی ہیں مگر مشاعرہ کی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک شعرا اور منتظمین مشاعرہ کو سامعین مشاعرہ کا تعاون حاصل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ آپ حضرات شعرا کے کلام سے استفادہ کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں مجتمع ہوئے ہیں تو یقین ہے کہ اپنے کسی غیر ضروری اقدام سے رات بھر کے جاگنے کی اپنی اجتماعی سعی کو آپ برباد نہ کریں گے ۔ اور اپنی موجودگی کا بہتر سے بہتر مظاہرہ اور استعمال کریں گے۔

ایک کامیاب مشاعرہ وہ ہے جس میں شعرا اپنا بہترین کلام سنائیں اور سامعین اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ مشاعرہ کے آغاز سے اختتام تک شعرا اور سامعین کے درمیان ایک خوشگوار رابطہ قائم رہے اور شاعروں کو احساس نہ ہو کہ نا اہلوں کو اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

اور یہ سب صورتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب آپ کے اذہان مشاعرہ کی ادبی اور سماجی اہمیت کا

کا احساس و عرفان رکھتے ہوں۔

آپ بخوبی واقف ہیں کہ ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ھے۔ زندگی ایک متحرک شے ہے۔ اسی لیے ادب اور شاعری کا بھی متحرک ہونا لازم آتا ہے۔ یعنی شاعری زندگی کی عکاسی اور ترجمانی کرتے ہوئے اس کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ زندگی کے ساتھ پستی سے ارفع کی طرف پرواز کرتی ہے۔ اور ہماری کسی غلطی کی وجہ سے ارفع سے پستی کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ یوں تو نقادوں کا نشترِ قلم وقتاً فوقتاً ہماری کارکردگی کے ساتھ جراحی کرتا رہتا ہے مگر شاعری کی ترقی تا تنزلی کو منظرِ عام پر لانے کا سب سے حسّاس بیرومیٹر مشاعرہ ھے۔ جو شاعری کی بلندی، پستی اور ادبی ہواؤں کے دباؤ اور رُخ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ آلہ علاوہ اور باتوں کے یہ نازک پہلو بھی واضح کرتا ہے کہ سامعین کے لطف و کرم کے لیے شعرا ادب کو کس رُخ پر لے جا رہے ہیں۔ بیرومیٹر اپنی بے اطمینانی ظاہر کرنے لگتا ہے جب شاعر اپنے فرض کو بھول کر Catering اور سمجھوتے کرنے لگتا ہے۔ اور اس کساد بازاری کے دور میں موقع پا کر وہ لوگ بھی شاعری کرنے لگتے ہیں جو جانتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ اور ارباب ادب کی نگاہ میں مشاعرہ کا یہی ایک کمزور رُخ بھی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم شعرا رسالوں میں اپنا بہتر کلام شایع کرواتے ہیں اور مشاعروں میں چلتا ہوا کلام سناتے ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب قدرے تلخ ہے۔ ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ سامعین کی اکثریت معیاری شعر پر غور و فکر کر کے اپنے ذہن کو زیر بار کرنا نہیں چاہتی۔ اس کو ان کی سہل انگاری کہیے یا پھر وہ مشاعروں کو دوسرے تفریحی اجتماعات کا بدل یا مترادف سمجھنے لگی ہے۔ مگر اس حقیقت کو سمجھ لینے کی سخت ضرورت ہے کہ مشاعرہ کسی محفل رقص و سرود یا سینما تھیٹر یا سرکس وغیرہ جیسی قسم کی چیز قطعی نہیں ہے۔ یہ انسان کی لطیف ترین صلاحیت کی جلوہ گاہ ھے۔ تمام فنون لطیفہ میں شاعری سب سے بلند پایہ نازک اور مشکل ترین صنف ہے اس لیے مشاعرہ میں شعر کا احترام لازم ہے۔ شاعر آپ کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ صحتمند رابطہ قائم رکھنے کے لیے شاعر کو بھی فن کا معیار برقرار رکھتے ہوئے سامعین کی جمالیاتی تسکین اور تربیت ذوق کا خیال رکھنا چاہیے۔ شاعری اور تکبندی میں فرق ھے۔ ہر کلام موزوں شعر نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے جو کلام موزوں شعر کی تعریف میں نہ آئے وہ تکبندی ہے۔ شاعری ایک پیچیدہ تخلیقی عمل ہے۔ جبکہ تکبندی کا فرق سمجھنے لگیں گے تو جان لیجیے کہ آپ سخن فہموں کے زمرہ میں آگئے۔

مشاعروں میں ہوٹنگ کا بھی ایک اہم رول ہوتا ھے بشرطیکہ ہوٹنگ صحیح مقام پر اور تہذیب

کے دائرے میں ہو۔ میں ہوٹنگ کو ذہانت اور جہالت دونوں کی کسوٹی تصوّر کرتا ہوں۔ ہوٹنگ کے طریقوں اور فقروں سے سامع کی ذہنی سطح کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہوٹنگ اس لیے کی جا رہی ہے کہ شاعر کی صورت یا آواز اچھی نہیں ہے یا اس کا لباس بوسیدہ ہے، یا اس کے جسم میں کوئی قدرتی عیب ہے یا شاعر سے آپ کی پہلے سے بے تکلفی ہے تو ہوٹنگ کا یہ غلط استعمال کہا جائے گا۔ شعرا اور سامعین کے درمیان نوک جھونک جملہ بازیاں چھیڑ چھاڑ اور کبھی کبھی بیحد لچر باتوں کو ملک کے چند شاعروں اور شاعروں کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے رواج دے رکھا ہے۔ جس سے ماضی قریب میں مشاعروں کی سنجیدہ روایات بیحد مجروح ہوئی ہیں اور جس نے ان ادبی اجتماعات کو بجائے مشاعرے کے مضاحکہ بنا دیا ہے۔ ہم کو عملی طور پر اس بدعت سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے۔ البتہ ہوٹنگ اُس وقت ناگزیر ہو جاتی ہے جب شاعر عمداً مضحکہ خیز حرکت کرے یا اپنے کو اس انداز میں پیش کرے جو ہوٹنگ کی دعوت دیتا ہو۔ یا غلط یا ناموزوں شعر پڑھے یا ترنم کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے ترنم سے شعر سنائے۔ بسا اوقات اچھا خاصہ شعر غلط ترنم سے خاک میں مل جاتا ہے۔

فی زمانا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشاعرہ میں ترنم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مگر یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ شعر کے مقابلہ میں ترنم ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اگر شعر اچھا ہے تو ترنم بھی اس شعر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ ہر شعر ترنم برداشت نہیں کرتا۔ شاعری کی چند اصناف تحت لفظ ہی میں لطف دیتی ہے۔ مثلاً رباعی، قطعہ یا متفرق اشعار اور زیادہ طویل نظمیں وغیرہ

مشاعرہ میں سامعین مختلف ذہنی سطح اور مختلف شعری ذوق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ کوئی نظم سننا چاہتا ہے، کوئی غزل پسند کرتا ہے، کسی کو گیت اچھے لگتے ہیں کوئی مزاحیہ شاعری پر قہقہے لگانا چاہتا ہے اور چند صحیح ادبی ذوق رکھنے والے ہر صنف کے اچھے اور معیاری اشعار سننا چاہتے ہیں۔ اور ہر گروہ کو اپنے اپنے ذوق کی تسکین کا حق بھی حاصل ہے جن کو برابر کا موقع ملنا چاہیے۔ اس لیے اپنی اپنی پسندیدگی کو دوسروں پر مسلط کرنا مناسب نہیں۔ اور اسی لیے یہ کہ کس شاعر کو کب کلام سنانے کی دعوت دی جائے اس کا فیصلہ اسی شخص کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جس کو انتظامیہ نے اس اہم کام پر مامور کیا ہے۔ اس کو کمپیئر کہتے ہیں (اس موقع پر اناؤنسر کا لفظ غلط استعمال ہوتا ہے) کمپیئرنگ کو "نظامت" کہ لینا چاہیے اور جو اس فن کا

ماہر ہوتا ہے اس نظم میں مشاعرہ کا پورا نقشہ ہے اور شعرا کی ترتیب میں اس کا فیصلہ ناطق سمجھنا چاہیئے۔ ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ کس شاعر کو پڑھنے کی تکلیف کب دی جائے آپ کو اپنے محبوب شاعر کا کلام سننے کے لیے اپنی نیند اور آرام کی قربانی دینا پڑے گی کیونکہ آپ اس کا کلام قبل از وقت نہ سن سکیں گے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ مشاعروں میں شور شغب دو ہی موقع پر ہوتا ہے۔ ایک اس فرمائش پر کہ "فلاں شاعر کو بلائیے" اور دوسرے کسی شاعر کو بار بار بلوانے کی فرمائش پر۔ جو اس لیے ممکن نہیں ہوسکتا کہ شعرا کی فہرست عام طور پر طویل ہوتی ہے، اور عرصۂ شب قلیل۔ ہاں! آپ کو اپنے محبوب شاعر کو سننے کا موقع ایک بار ضرور ملے گا۔ اور تب یہ اختیار آپ کو ہوگا کہ آپ اُس شاعر سے کتنا اور کتنی دیر تک سننا چاہتے ہیں بشرطیکہ وہ آپ کی مطلوبہ طویل خدمت پر راضی ہو۔ چونکہ ایک ہی شاعر کو بار بار آپ کے سامنے آنیکی تکلیف نہ دی جاسکے گی اس لئے موقع آنے پر آپ اس کو جی بھر کے سن لیجیے۔ شاعر سے فرمائش اُس وقت کیجیے جب وہ اپنا پسندیدہ کلام سنا چکے۔

مجھ کو توی امید ہے کہ اگر آپ صبر و ضبط سے کام لیں گے میری تجاویز پر عمل کریں گے اور انتظامیہ سے تعاون کریں گے تو مشاعرہ یقیناً کامیاب ہوگا۔ اور آپ زیادہ لطف اندوز ہوں گے۔

مشاعرہ کی اہمیت، ضرورت اور کامیابی کے مسائل یہیں نہیں ختم ہو جاتے۔ مشاعرہ کرنے کا ارادہ کرتے ہی مشاعرہ کرنے والوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ سامعین مشاعرہ کس مزاج اور ذہنی سطح کے لوگ ہیں اسی سے مناسبت رکھنے والے شعرا کو مشاعرہ میں دعوت سخن دینی چاہیے۔ مزاحیہ مشاعرہ خواتین شاعرات کا مشاعرہ بہت اچھے ترنم سے غزلیں سنانے والے شعرا کا مشاعرہ۔ تحت کلام سنانے والے شعرا کا مشاعرہ اسی سے مناسبت رکھنے والے Comperer کو نظامت کے لیے بلانا چاہیئے۔"

ان چند جملوں کے بعد میں نے عمر قریشی کو مائک پر بلایا اور مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ میں نے یہ بھی صاف الفاظ میں کہدیا تھا کہ اگر اب بھی سامعین نے میرا اور ناظم مشاعرہ سے تعاون نہ کیا تو قبل از وقت مشاعرہ کو برخواست کر دینے میں مجھ کو ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرہ ۱۱ بجے شب سے طلوع آفتاب کے بعد تک نہایت سکون، اچھے اشعار پر داد تحسین اور مناسب مواقع پر ہوٹنگ کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے اختتام کی منزل تک پہنچا۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام خود بدنظمی کو پسند نہیں کرتے اور ان میں زیادہ تر شعر سننے آتے ہیں۔

چند نفوس البتہ تفریح کے لیے آتے ہیں اور مشاعرہ کو غلط راستے پر لگا کے بارہ بجے نیم شب تک اپنے اپنے بستروں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ مشاعرہ میں ایسے عناصر کی ہمّت افزائی تہ ہونی چاہیے۔ تو کوئی سبب نہیں کہ مشاعرہ اپنی سنجیدہ روایات کی طرف واپس نہ آ جائے۔

اس کے بعد میں نے مستقل کالم شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات میں علم لسانیات کے احوال میں فنِ تخلیق، الفاظ کے تلفظ پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت، مشاعروں میں تحت لفظ اور ترنم کے معیار اور رائج الوقت انداز شعر خوانی وغیرہ پر مضامین لکھے جو مقامی ہفت روزہ اخبار "شہپر" میں بالاقساط شایع ہوتے رہے۔ کثرت سے غزلیں اور نظمیں کہیں جن کی تفصیل حسب ضرورت موقع موقع سے آتی رہے گی۔

خالی اوقات میں چمن بندی، خطاطی اور مگس بانی سے بھی دل بہلایا کرتا۔ اپنے ساتھ کشمیر سے بھوج پتر کا جو ذخیرہ لایا تھا اس کا بھی استعمال مدنظر تھا۔ چنانچہ اپنے پسندیدہ اشعار کو خطاطی کی چھوٹی ہوئی مشق پر پھر قالو پانے کے لیے وصلیوں کی شکل دینے لگا۔ غالب، انیس، ٹیگور اور اقبال کے شاہین کی تصویریں بنائیں۔ یہ کام چار پانچ برس تک ہوتا رہا کہ انگلیوں کو تکان سی محسوس ہونے لگی اور میں نے اپنی کلک اور برش کو یکدم بالائے طاق رکھ دیا۔ اب پھر کچھ تحریر کرنے اور مصوری کی طرف طبیعت مائل ہے مگر ابھی تک کوئی قابلِ توجہ تصویر یا وصلی مکمل نہیں کر سکا ہوں۔

چمن بندی بدستور جاری ہے۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب میرے مکان میں بجائے خس و خاشاک کے ہر طرف تازے اور سوکھے ہوئے پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ دیواروں کو سرسبز اور اپنے موسم میں پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں نے بالکل چھپا لیا ہے۔ میرے چند معمر ہند واحباب لال کوٹھی کے مردانہ حصے کو آشرم کہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو مجھ سے ملاقات کرنے محض اس لیے آتے ہیں کہ ان کو یہاں بڑا سکون ملتا ہے۔ ابھے کمار نے تو "لال کوٹھی کا سناٹا" عنوان سے ایک فیچر ہندی میں لکھ ڈالا ہے جو کتابی شکل میں آ چکا ہے۔

گذشتہ بارہ سال سے مگس بانی بھی کر رہا ہوں۔ یہ صرف ایک شوقیہ مشغلہ ہے۔ اس وقت میرے پاس صرف تین (Hives) چھتے گھر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہد کی مکھیاں پالنے سے زیادہ دلچسپ اور محویت طلب کوئی ہوبی نہیں ہے۔ اس مدت میں شہد تو کم ہی ملا البتہ شہد کی مکھیوں کی طرز حیات کا مطالعہ کرنے کا بہت موقع ملا۔ مگس بانی شروع کرنے سے پہلے عملی ٹریننگ لینا اور اس پر کافی لٹریچر پڑھنا بہت ضروری ہے۔ بغیر علمی اور عملی منزلوں سے گذرے ہوئے اگر کسی نے یہ شوق شروع کر دیا تو علاوہ

اسپتال کے اس کو کہیں زندگی واپس نہیں مل سکتی اور وہ بھی اس شرط پر کہ مکھیوں سے بھنبھوڑے جانے کے بعد فوراً اسپتال چلا جائے۔ میں اب شہد کی مکھیوں کے متعلق اتنا جانتا ہوں جو سب کا سب کسی ایک کتاب میں بھی نہیں مل سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مگس ہر جگہ پال کر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہوبی وہیں منفعت بخش ہو سکتی ہے جہاں سال بھر درختوں میں کوئی نہ کوئی پھول کھلتا رہے۔ جیسے جنگلات، پہاڑ اور وادیاں، جبکہ میدانوں میں کثرت سے شہد دینے والی صرف تین ہی فصلیں ہوتی ہیں۔ سرسوں کا پھول، آم کا بور اور نیم کا پھول ان کے علاوہ دوسرے پھول ضرورت سے کم نکٹر دیتے ہیں۔ اس لیے انگنت مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے چھتوں میں بیماریاں لگتی ہیں ان کا کس طرح مقابلہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں میں نے بہت سے تجربات کیے، جن میں کم و بیش مجھ کو کامیابی بھی ہوئی۔ اب میں مگس کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ اس پر ایک مکمل ضخیم کتاب لکھ سکتا ہوں۔ تو اس کی گنجائش ان صفحات میں نہیں ہے۔ البتہ مگس بانی کی چند باتیں عام دلچسپی کی خاطر یہاں تحریر کر دینے کو دل چاہتا ہے۔

ہزار ہا قسم کی مگس میں (علاوہ بھنگا مکھی کے)، صرف ایک قسم (Apis indica) اندھیری بند جگہوں درخت اور دیوار کے کھوکھلوں، بکسوں، الماریوں یا دوسری قسم کی تاریک اور محفوظ جگہوں میں نظروں سے اوجھل چھتا لگانے والی ہندوستانی مگس ہے جو پالی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ جو چھتا کھلا ہوا نظر آ سکتا ہو اس کی مکھی پالی نہیں جا سکتی۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی شہد کی مکھی کو یہ علم نہیں کہ وہ ڈنک مارنے کے بعد ایک منٹ میں مر جائیگی۔ پالتو قسم والی مکھی سات سے چودہ چھتے تک لگاتی ہے جب کہ دنیا کی ہر دوسری مکھی صرف ایک (Comb) چھتہ لگاتی ہے۔ مکھیوں کے ایک خاندان میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے جس کا کام صرف انڈے دینا ہے۔ Hive میں اس کا وجود ضروری ہے بغیر اس کے مکھیاں ٹک نہیں سکتیں۔ یہ تصور بھی غلط ہے کہ ملکہ کے حکم پر مکھیوں کی حرکات و سکنات کا دار و مدار ہے۔ اس کا فیصلہ خاندان کی چند سب سے پرانی مکھیاں کرتی ہیں۔ علاوہ (Drone) نر مکھی کے تمام مکھیاں مادہ ہوتی ہیں البتہ نامکمل۔ مکمل مادہ صرف ملکہ ہوتی ہے۔ جو اپنی پیدائش کے سات آٹھ دن بعد بکس کے باہر نکل کر بہت اونچی اڑ جاتی ہے۔ اور اس کے تعاقب میں ہزار ہا ڈرون بھی نکلتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ تیز پھرتیلا اور تندرست ملکہ سے ملتا ہے پھر ملکہ سیدھے اپنے گھر میں واپس آ جاتی ہے اور تین چار دن کے بعد انڈے دینا شروع کر دیتی ہے اور پھر کبھی گھر کے باہر نہیں آتی۔ ملکہ تین چار سال تک زندہ رہ سکتی ہے اور بغیر کسی نر

کی مدد کے برابر انڈا دے سکتی ہے۔ سازگار حالات میں ایک اچھی ملکہ پانچ لاکھ مکھیوں کی ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک معمولی شہد کی مکھی کی عمر جو درکر بی کہی جاتی ہے چھ مہینہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حالات ناسازگار ہونے پر یہ مکھیاں بکس چھوڑ کر بھاگ بھی جاتی ہیں۔ اس لیے نئی مکھیوں کو تلاش کر پکڑنا اور یا اس کے اڑتے ہوئے غول (Swarm) کو نیچے اتار لینے کی ٹریننگ بھی ضروری ہے۔ چونکہ میری دخل اندازی سے پریشان اور خوف زدہ ہو کر میری مکھیاں بھاگتی رہی ہیں اس لیے مکھیاں گھر میں اتار لینا میرے لیے ضروری ہے۔ ہر سال دو ایک غول تو اتار ہی لیتا ہوں۔ ایک دن میرے یہاں ہوش، نثار، شاعر جمالی اور راجے کمار وغیرہ بیٹھے ہوئے بڑی سنجیدہ ادبی گفتگو میں الجھے ہوئے تھے کہ مجھ کو ہمسایہ کے ایک بچے اسلم نے اطلاع دی کہ Swarm کوٹھی کے اوپر سے گذر رہا ہے چونکہ میرے پاس ایک Hive خالی پڑا ہوا تھا میں ننگے پاؤں چل کھڑا ہوا اور اپنے ان ادیبوں کی موجودگی میں دیکھتے دیکھتے پورے غول کو نیچے اتار کر Hive میں بند کر دیا۔ سب کو بیحد تعجب ہوا۔ مگر مگس کو اس کے کسی پرانی قیام سے گرفتار کر کے لانا یا اڑتے ہوئے غول کو نیچے اتارنا کوئی ٹوٹکا یا کرتب نہیں ہے۔ یہ سب سائنٹفک باتیں ہیں۔ اس میں محض چہرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے جالی کا ایک کنٹوپ پہننا پڑتا ہے کیونکہ مگس طیش میں سب سے پہلے آنکھوں پر حملہ کرتی ہے، اس کے بعد ہاتھوں میں اس طبعی توازن کو بروئے کار لانا ہوتا ہے کہ مگس کو کم سے کم تکلیف ہو۔ باقی دوسری باتیں سیکھنے سے آتی ہیں ؎

دیوانگی و جامہ دری کے علاوہ بھی آتے ہیں مجھ کو کتنے ہنر تم بھی دیکھ لو

(۲)

کبھی کبھی گفتنی اور ناگفتنی میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کشمیر سے وطن واپس آئے ہوئے ابھی چھ سات سال گذرے ہوں گے کہ ایک جوان سال ادیب شاعر، افسانہ نگار اور ایڈووکیٹ ایس۔ ایم عباس جو مجھ سے اکثر ملنے آتے تھے آئے اور اپنی ایک نو تالیف کتاب کا مسودہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے دریافت کیا خیریت تو ہے۔ اتنا طویل افسانہ؟ بولے "جی نہیں۔ میں نے شفیق جونپوری کی شخصیت حیات اور شاعری پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اور اب آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں"۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے لقمہ دیا کہ "اس میں اب باقی کیا رہا جس کا اضافہ میں کروں" بولے کہ "اس پر مقدمہ لکھ دیجیے" اب میں نے متردد ہو کر کہا کہ "بھائی عباس صاحب میں کہاں کا مقدمہ باز ہوں کہ اس عظیم کام کے لیے آپ نے مجھ کو منتخب

گیا ہے۔ یہ تو بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور عملی تنقید تو سب سے زیادہ مشکل صنف تنقید ہے، اور میں اس میدان کا شہسوار بھی نہیں۔ اور بہت سے بلکہ بیشمار ایسے نقاد ملیں گے جو اس مشکل کام کو بخوشی کریں گے"۔ ان کی اطلاع کے لئے میں نے دو تین نقادوں کے نام بھی لیے مگر ان کا اصرار تھا کہ بڑھتا چلا گیا۔ "نہیں واثق صاحب آپ سے بہتر یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا آپ کے ان سے بڑے اچھے تعلقات بھی تھے اور آپ ان کو بہت قریب سے جانتے تھے"۔ میں نے جواب دیا کہ "دیکھئے عباس صاحب! میں ایک مقامی آدمی ہوں اور میرے ان کے تعلقات بھی تھے۔ اسی لیے یہ مقدمہ مجھ کو نہ لکھنا چاہیے۔ انھی وجوہ کی بنا پر میرا مقدمہ Objective نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک شفیق صاحب کی شاعری کے محاسن کا تعلق ہے وہاں تک تو بات نبھ جائے گی اور اگر اس میں کہیں کوئی کمی محسوس ہوئی تو فطرتاً اس کا ذکر میرے قلم کو روک دیگا۔ اس لیے مجھ کو معاف کیجیے" انھوں نے سنی ان سنی سب برابر کر کے کہا "مقدمہ تو آپ ہی کو لکھنا ہے اور پوری دیانتداری سے لکھنا ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ ان کے خلاف جاتا ہے یا موافق۔ تنقید بہر حال تنقید ہے اور ہر شخص اپنے زاویہ نظر سے تنقید کرنے میں آزاد ہے، خواہ وہ کسی کو پسند آئے یا ناپسند" میں نے کہا "یہ تو آپ کا خیال ہے۔ دوسروں کی پسند اور ناپسند کا ذمہ آپ کس طرح لے سکتے ہیں"۔ "جناب یہ میری کتاب ہے اور میں آپ ہی کا مقدمہ پسند کرتا ہوں تو دوسروں کو اس سے کیا سروکار۔ بس اب آپ انکار نہ کیجیے"۔ اور یہ کہکر وہ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا کہ "کافی وقت چاہیئے میں شفیق صاحب کے کلام کا پھر سے مطالعہ کروں گا اور جب موڈ آئے گا تب مقدمہ لکھوں گا"۔ اور عباس نے یہ شرط مان لی۔

میں ایک بزرگ کی حیثیت سے شفیق صاحب کی بیحد عزت کرتا اور مرحوم بھی مجھ کو کچھ کم عزیز نہ رکھتے تھے مگر شاعری کے معاملہ میں میں نے ان کو تخلیقی فنکار کبھی نہ سمجھا۔ وہ شعر گوئی کے بڑے استاد تھے مگر تخلیقی فن کی ان کے کلام میں ہمیشہ کمی محسوس ہوئی۔ تاہم میں نے ان کے دستیاب ذخیرہ کلام کو از سر نو پھر سے پڑھا اور اس جذبہ کے ساتھ کہ شاید میرا خیال غلط ہو اور ان کے کلام میں پختگی، قوت ناظمہ، قواعد کی پابندی کے علاوہ تخلیقی شاعری کے بھی کچھ نمونے مل جائیں گے مگر افسوس کہ اس سعی میں کامیاب نہ ہو سکا۔

شعری مجموعوں پر بالعموم ایسے مقدمے لکھے جاتے ہیں کہ شاعر کا تخلص اور مثالوں کے اشعار نکال لو تو سب کی زبان، انداز تنقید و تبصرہ، ڈھانچہ اور اسلوب ایک سے ملتے ہیں اور بس توصیف ہی توصیف۔ مقدمہ بازی کا یہ فرسودہ انداز مجھ کو ہمیشہ سے ناپسند رہا ہے۔ اب سے چالیس سال قبل محمد اشرف الہ آبادی نے اسی انداز تحریر کے خلاف ایک بہت اچھا مضمون "اردو دواوین کے دیباچے" کے عنوان سے لکھ دیا تو دہلی میں ایک شور مچ گیا تھا۔ تو میں نے طے کیا کہ انکشاف حقائق کے لیے مقدمہ کا ڈھانچہ ہی بدل دونگا۔ چنانچہ میں نے انتہائی محنت، دیدہ ریزی، حقیقت پسندی

اور دیانت داری کے ساتھ اِس۔ اِم۔ عباس کی کتاب پر مقدمہ لکھا اور ہمت کر کے وہ سب کچھ لکھ دیا جو امر واقعی تھا اور میری نظر میں ٹھیک تھا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد میں نے عباس کو بلایا اور شروع سے آخر تک مقدمہ کا وہ مسودہ ان کو سنایا اور دوبارہ ان کو خود پڑھنے کو دیا۔ جب وہ پڑھ چکے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ "کیا خیال ہے۔ کیا اس مقدمہ کو شایع ہونا چاہیے" انھوں نے جواب دیا "یہ یقیناً شائع ہوگا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے آپ کو راضی کیا تھا۔" میں نے کہا "مگر ایک شرط پر یہ شایع ہوگا۔ اس کو آپ سب سے پہلے عبدالباری صاحب کو دکھلائیے اگر وہ اس کو پسند کریں تب شفیق صاحب کے چھوٹے بھائی عزیر ربانی صاحب کو دکھلائیےگا۔ اگر دونوں حضرات کتاب میں اس کی شمولیت پر راضی ہوں تو میں بھی راضی ہوں۔ اگر ان حضرات میں ایک بھی اس کے خلاف ہوا تو میں بھی اس کے شمولیت کے خلاف ہوں" اِس۔ اِم۔ عباس کا بیان ہے کہ عبدالباری صاحب نے مقدمہ کو بہت پسند کیا اور عزیز ربانی نے اس کو پسند تو نہیں کیا البتہ یہ کہکر مقدمہ عباس کو دیدیا کہ "یہ تو اپنی اپنی رائے ہے۔ جب آپ نے وامق صاحب سے مقدمہ لکھوایا ہے تو اسکو کتاب میں ضرور شامل کیجیے"۔

غرض کہ وہ کتاب بمبئی میں طبع ہوئی اور وہیں سے شایع ہوئی۔ اور اس کے ایک مہینہ بعد سے میرے پاس گمنام، فرضی نام اور اصلی ناموں سے گالی گفتہ، دھمکی وغیرہ کے خطوط کا ایک تانتا بندھ گیا۔ شہپر اور نئی دنیا میں میرے خلاف مضامین کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ عباس سے میں نے پوچھا "بھئی! یہ سب کیا ہو رہا ہے" تو "جھلا سے آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ شفیق صاحب چھوچھکڑ بھی تو کرتے تھے۔ یہ سب ان کے مرید لوگ ہیں۔ یہ کوئی پڑھے لکھے کی رائے تو ہے نہیں۔ چند دنوں میں یہ سب بدتمیزی ختم ہو جائیں گی"۔ عباس نے بات ٹھیک ہی کہی تھی خطوط میں زبان اور املا کی غلطیاں بہت ملتی تھیں۔

مگر میں یہ چکنا گھڑا نکلا۔ ایک مضمون جوہر بنارسی کی شاعری پر لکھا۔ جوہر صاحب اور ان کے شاگرد رشید عبدہٗ اعظمی کے اصرار پر یہ مضمون لکھنا پڑا تھا۔ ان کے یہاں بھی قدامت پسندی اور روایت پرستی کے کافی عناصر ملتے تھے مگر چونکہ جوہر صاحب میں ان کا سیاسی سماجی اور اقتصادی شعور بھی زمانہ کے ساتھ سر اٹھاتا رہتا تھا اس لئے ان کی شاعری میں دونوں رُخ کے تصادم کا شائبہ ملتا تھا۔ تاہم ان کے شاگردوں نے میری صاف گوئی کو پسند کرتے ہوئے وہ مضمون جوہر صاحب کو دکھلایا اور ان کی اجازت چاہی کہ وہ مضمون ان کے جشن کے سووینیر میں شامل نہ کیا جائے مگر انھوں نے اس کو خصوصیت سے شایع کروایا اور شاگردوں سے کہا کہ ایک شخص تو ہے جس نے میری شاعری کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ ہم لوگوں کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اور میرے اور جوہر

صاحب کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر شفیق جونپوری حیات ہوتے تو اس مقدمہ کو بہت پسند کرتے۔ وہ بہت دیانتدار آدمی تھے۔ اس سے بڑی ان کی ادبی دیانتداری کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ پورے پانچ سال تک متعدد بار میری نظم "مینا بازار" سننے کے بعد مرحوم نے شبلی کالج اعظم گڑھ کے ایک مشاعرہ میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ "آج آپ کی یہ نظم سمجھ میں آئی ہے اور بیحد پسند آئی۔ بالکل نئی چیز ہے" یعنی یہ اعتراف مرحوم نے "مینا بازار کو کم از کم پچیس بار سننے کے بعد کہا تھا۔ سب سے بڑا مجھ پر اعتراض یہ تھا کہ میں نے شفیق صاحب کے کلام پر ترقی پسند زاوے سے تنقید کی ہے۔ معترضین کو شاید جدید سائنٹفک تنقید کا کوئی علم ہی نہیں۔ ہر زمانہ کے ادب کو پرکھنے کا وہی ذریعہ ہے۔ ولی، میر اور غالب اور اقبال بھی اسی ادبی اور عملی تنقید کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے اردو میں تنقید ہی کہاں تھی۔

یہ ایک سوانحی حقیقت ہے کہ میں نے اپنے دوسرے پسندیدہ مشاغل کے علاوہ ان برسوں میں بیشمار مشاعروں میں شرکت کی مگر ہر مشاعرہ کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں البتہ ان مشاعروں کا ذکر خالی از دلچسپی بھی نہیں جنھوں نے خصوصیت کے سبب سے یادوں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

قاضی جلیل عباسی اور شفیق وغیرہ نے بستی میں ایک ترقی پسند یوم ثقافت کا انعقاد کیا۔ کافی پیسے خرچ کر کے نرگس دت M.P.، شبانہ اعظمی، نوشاد موسیقار، سردار جعفری اور کیفی اعظمی وغیرہ کو بمبئی سے بلایا اور علاوہ چند ترقی پسند شعرا کے مجھ کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ دن میں قومی یکجہتی اور اس جہت میں فلمی دنیا اور ترقی پسند شعرا کی کارکردگی پر تقریریں ہوئیں۔ شام کو فلمی ستاروں اور موسیقاروں نے عوام کی دلچسپی کے لیے چند مختصر (Cultural Show) ثقافتی فلمی اداکاری کے نمونے پیش کئے۔ اس کے بعد شب میں مشاعرہ ہوا۔ ریڈیو اور ٹی۔وی۔ کی ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ چونکہ شعرا گنے چنے تھے اور ڈائس بہت وسیع تھا اس لیے فلمی ستاروں کو ڈائس پر بٹھا کر ان میں شعرا کا اضافہ کر دیا گیا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشاعروں میں ایک فلمی ستارے کی موجودگی بھی شاعروں کی فضا کو مکدر کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ بستی کے اجتماع میں حاضرین جلسہ و سامعین مشاعرہ انتہائی نظم و ضبط سے کام لیکر پوری طرح ہر شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تعریفیں بھی ہو رہی تھیں خوشی کے مظاہرے اور برموقع جملہ بازیاں بھی مگر سب تہذیب کے دائرہ میں۔ معلوم ہوا کہ اگر فلمی ستارے اپنے گلیمر کے ساتھ خود سادہ شعار اور سنجیدہ رہیں تو سامعین ان کی شخصیتوں سے متاثر ہو کر خود بھی اپنی سنجیدگی اور تہذیب کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ خود ان کے ہوٹ ہو جانے

کا خطرہ رہتا ہے۔ اور اس موقع پر اہل بستی نے اس کا پورا ثبوت دیا کہ وہ بڑے مہذب اور بامذاق لوگ ہیں۔ شخصیت میں سنجیدگی کی جلا اور چھچھورے پن کی فضا میں زمین آسمان کے فرق کو عوام خوب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ناممکن تھا کہ نرگس کی موجودگی میں کوئی غیر سنجیدہ ہو جاتا۔ اس مشاعرے کی ایک اور خصوصیت تھی کہ اس میں نوشاد نے بحیثیت شاعر کے اپنی غزل سنائی تھی جن کے ترنم میں دور کا بھی موسیقی سے واسطہ نہ تھا۔ جہاں تک اشعار کا سوال تھا ان میں شعرا اور سامعین کی خاص توجہ نے مزید لطف پیدا کر دیا تھا۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھوایا گیا اور مشاعرہ ان کے کلام پر ختم ہوا۔ میں نے اس مشاعرہ میں کیا سنایا تھا' یاد نہیں۔ بس ایک شعر یاد ہے ؎

آہن نہیں کہ چاہیئے جب موڑ دیجئے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجئے

جب پرویز شاہدی زندہ تھے تو میں اور وہ کلکتہ سے ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے پٹنہ آئے۔ کسی کالج کے ہال میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں حسب عادت ایک غزل اور ایک نظم سنا کر اپنی جگہ پر جانے لگا تو سامعین کا مطالبہ ہوا "کجلی سنائے کجلی" میرے انکار بعد پر مجمع کا اصرار بعد بڑھتا گیا اور مجبوراً مجھ کو اپنے یہاں کی پوربی بولی میں کجلی سنانا پڑی اس کا پہلا بول تھا:

میں تو کھیلن جیہوں ساون ماں کجریا
مورے جادو ایسے نین
میں اس چنچل جیسے درپن
گنڈا ڈری میں دیکھے موری کٹریا
میں تو کھیلن جیہوں ساون ماں کجریا
گھر آئی بدریا سکھیا

اس وقت بھیپھڑوں میں قوت تھی۔ کجلی میں تو باقاعدہ گانا پڑتا ہے۔ میں کجری سنا رہا تھا اور سامعین پر وہ مستی طاری ہوئی کہ پورا مجمع میرے ساتھ گا رہا تھا۔ اور جب میں اس بول پر پہنچا کہ:

کوئی بولی بول کے دیکھے
کوئی انکھیا ڈول کے دیکھے

تو پورا مجمع کھڑا ہو کر اور جھوم جھوم کر میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نوعیت کا مشاعرہ میری زندگی کا پہلا اور آخری مشاعرہ تھا۔

اس مشاعرہ کے دو تین دن بعد پرویز شاہدی کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ میں بھی مرحوم کی تجہیز و تدفین میں شریک تھا۔ نماز جنازہ ہو چکی تھی قبر میں کچھ کسر باقی تھی اور میں ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا کہ میرے قریب ایک بزرگ شاہ محمد حسن صاحب بسمل عظیم آبادی آکر بیٹھ گئے۔ میں متوجہ ہوا تو فرمانے لگے "واقعی صاحب! دنیا میں ہر چوری اور بے ایمانی کی پاداش ہوتی ہے اور اگر چوری کا مال برآمد ہونے پر معلوم ہوا کہ یہ فلاں شخص کا ہے تو اس کو واپس مل جاتا ہے مگر ادب میں جب چوری ہوتی ہے تو اس کی واپسی کا بھی کوئی طریقہ ہونا چاہیئے"۔ یہ کہتے ہوئے موصوف نے ۱۹۲۲ء کے عصر جدید کلکتہ کی ایک کاپی مجھ کو دکھلائی جس میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا مطلع تھا ؎

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اور شاہ صاحب فریادی ہوئے کہ "میرا یہ مطلع لوگوں نے رام پرشاد بسمل کے نام سے مشہور کر دیا ہے"۔ میں نے کہا یہ تو واقعی آپ کے ساتھ بڑی حق تلفی ہوئی ہے۔ میں اس کے ازالہ کے لیے ضرور کچھ کروں گا۔ وہاں سے واپس ہو کر میں نے انجمن ترقی اردو علیگڑھ کے ہفت روزہ "ہماری زبان" میں انجمن اور قارئین کی توجہ اس طرف دلائی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، البتہ ریکارڈ پر ایک بات آگئی۔

۱۹۷۳ء میں مہاراشٹر کالج بمبئی کا سالانہ مشاعرہ سابو صدیق کے کھلے میدان میں ہو رہا تھا۔ جب میں نے

رباعی
دستور کی نے روح سے خالی نکلی — تصویر معیشت بھی خیالی نکلی
اب کثرت زر یہ ہے کہ ٹکسال سے بھی — جو مورتی نکلی وہ سوالی نکلی

پڑھی تو حاضرین مشاعرہ میں سے ایک وزیر صاحب کو حکومت کی یہ تنقید پسند نہ آئی اور وہ اٹھ کر مشاعرہ سے چلے گئے۔ اس کے بعد سے میں مہاراشٹر کالج کے مشاعروں میں نہیں بلایا جاتا۔ اس جہل مرکب کا ہے کوئی جواب!

اگست ۱۹۷۳ء میں ایک دوسرے مشاعرہ میں شرکت کے لئے بمبئی جانا ہوا۔ مظفر شاہجہاں پوری اس کے کنوینر تھے۔ تاریخ یاد نہیں مگر یاد ہے کہ جب صبح وی۔ ٹی پر کلکتہ بمبئی میل پہنچا تو اسٹیشن کے باہر عجب ہو کا عالم تھا۔ جہاں چوبیس گھنٹے ہزاروں ٹیکسیاں آتی جاتی رہتی ہیں وہاں ایک ٹیکسی کا نام نشان نہ تھا۔ قلی نے اپنی مزدوری لی اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ آج سرکار نے پٹرول پر ٹیکس بڑھا دیا ہے اس لیے پورے بمبئی شہر میں ٹیکسی ہڑتال ہے۔ مظفر بھی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا

ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ کوئی ٹیلیفون کر رہا تھا کوئی چائے پی رہا تھا اور کوئی زمین پر بستر لگا کر آرام کر رہا تھا۔ تلی نے جاتے ہوئے یہ ضرور کہا تھا کہ کوئی گھوڑا بھی دکھائی دے اس پر چلے جانا۔ مگر کوئی بھی نظر نہ آئی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد پشت سے ایک آواز آئی "ارے وامق بھائی کیا آپ بھی آج کے مشاعرہ میں آئے ہوئے ہیں؟" مڑ کے دیکھا تو انور مرزاپوری ایک ہلکی سی اٹیچی ہاتھ میں لئے ہوئے میری جانب بہت خوش و درخشاں چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا "بھئی تم خوب آگئے۔ ایک سے دو ہو گئے۔ خوب گذرے گی۔ ہاں اسی مشاعرہ میں آیا ہوں"۔ مگر یہ معاملہ کیا ہے؟ یہاں سے کس طرح نکلا جائے"۔ انور نے کہا "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ بمبئی کے میرے مستقل میزبان نیم چند جین صاحب اپنی کار میں آرہے ہیں۔ جہاں میں ٹھہروں گا، وہیں آپ بھی ٹھہریں گے۔ میں آپ کو یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ چل کر دیکھئے گا کہ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں اور آپ کو میاں بیوی کتنا آرام دیتے ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ تم مل گئے ورنہ میں آج کے اس اجاڑ بمبئی میں کدھر جاتا۔ مظفر بھی نہیں آئے"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک کار رغلام گردش میں آکر رک گئی۔ انور لپک کے اس کار کے پاس گئے اور جین صاحب سے کچھ کہا۔ دبلے پتلے جین صاحب کے ساتھ ان کے چوگنے سائز کی ایک خاتون کار میں سے برآمد ہوئیں اور بغیر کچھ کہے سنے میرا بستر اور سوٹ کیس اٹھا لیجا کر اپنی کار کے بوٹ میں بند کر دیا۔ انور اور میں بھی ایک بیگ لٹکائے ہوئے ان کے پیچھے ہو لئے تب مسز جین بولیں وامق صاحب! اب سے کم از کم ایک ہفتہ تک آپ میرے مہمان ہیں۔ آیئے بیٹھئے"۔ پیچھے کی سیٹ پر مجھ کو اور انور کو ٹھونس کر وہ آگے اپنے میاں کی بغل میں جا بیٹھیں اور کوئی پندرہ بیس منٹ میں ہم لوگ ۱۲ کلابا چیمبرز (ٹائمز آف انڈیا کالونی) پہنچ گئے۔ ایک کمرہ میں میرا اور اس سے ملحق دوسرے کمرہ میں انور کا اٹیچی رکھ دیا گیا۔ ڈنلپ کشن کے بستر لگے ہوئے تھے۔ ہم چاروں میرے ہی کمرہ میں بیٹھ گئے۔ نوکر کافی لیکر کمرہ میں داخل ہوا اور ٹرے میز پر رکھ کر چلا گیا۔ ان خاتون نے ہم لوگوں کو ایک ایک پیالہ سے نوازہ اور بولیں۔ ہم کو معلوم ہو گیا کہ آپ وامق صاحب ہیں مگر آپ کو نہیں معلوم کہ ہم کون ہیں۔ یہ میرے ہسبنڈ نیم چند جین ہیں جو ٹائمز آف انڈیا کے ایڈورٹزمنٹ منیجر ہیں اور میں ان کی پتنی اوشا جین گھر کی مالکہ ہوں اور مہاراشٹر R.S.S. کے ویمنز شاکھا کی کمانڈر ہوں اور آپ کی بہن اوشا۔ ہمارے پتی جین صاحب گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں مگر اس گھر کے باہر۔ گھر میں آپ کو سب کھانے ویجیٹیرین اور گوشت کی شکل کے ملیں گے۔ کبھی مرغ کبھی مچھلی اور کبھی انڈے کی شکل کے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو"۔ میں نے کہا "میں گوشت کھاتا ضرور ہوں مگر بہت کم۔ زیادہ تر سبزی اور ترکاری ہی پسند کرتا ہوں۔ اس لیے آپ کا مینو سن کر مجھ کو بڑی خوشی ہوئی"۔ اچھا اب آپ تھوڑی دیر آرام کریں تاکہ لنچ وقت پر مل جائے"۔ یہ کہکر وہ اور جین صاحب چلے گئے۔

میں نے مظفر کو رنگ کیا کہ" بمبئی میں آپ کے مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آج صبح بمبئی پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر ذرا آپ ملے اور نہ کرایہ کی ٹیکسی۔ حسن اتفاق سے انور مرزا پوری مل گئے جن کو لینے شاید آپ جانتے ہوں نیمی چند جینی اور ان کی بیوی کار لیکر آ گئے۔ انور اور مجھ کو وہ لوگ اپنے یہاں لے آئے ہیں کوئی تکلیف نہیں ہے تاہم آپ اگر مجھ کو یہاں سے اپنے مستقر یا کسی ہوٹل لے جائیں تو مناسب ہوگا۔ مظفر سہ پہر کو آئے پہلے اوشا جینی سے ملے اور پھر میرے پاس آئے کہ آپ یہیں رہیے۔ یہ لوگ بہت معقول ہیں اور ہم سے ان کے تعلقات بھی ہیں ایک دن کا معاملہ ہے۔" میں نے کہا یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ میاں بیوی پہلی ہی ملاقات میں اتنا تکلف برت رہے ہیں جس کا میں عادی نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ آر ایس ایس کے ہیں۔ میری باتیں سن کر مظفر اوشا جینی کے پاس گئے اور معلوم نہیں کیا باتیں کر کے ان کو لیکر میری کمرے میں دوبارہ آئے۔ اوشا جینی آنسو پونچھتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں اور بولیں " وامق بھائی! آخر ہم سے کیا غلطی ہوئی کہ آپ یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ میں کچھ سٹ پٹا سا گیا۔" نہیں نہیں میں یہیں رہوں گا اور آپ جبتک خوشی سے اجازت نہ دیں گی میں بمبئی سے بھی نہیں جاؤں گا۔" اور اپنا ایک مصرع پڑھا ع " ہمیں نہیں تاب چشم گریاں"۔ " تو پھر چلئے چائے پی جائے۔ انور صاحب بھی ہیں۔ دوسرے لوگ بھی جو آپ کے درشن کرنا چاہتے ہیں"۔ میں ان کے ساتھ کھانے کے کمرہ میں چلا گیا۔ وہاں علاوہ انور کچھ اور لوگ بھی جس میں ایک اردو کے شاعر بھی مع اپنی اہلیہ کے موجود تھے اور چائے کے ساتھ شعر و شاعری بھی ہو رہی تھی۔ دوسرے صاحب نے کہا " میں کامل چاند پوری ہوں اور یہ میری بیوی۔ مجھ کو آپ سے ملنے کا بیحد اشتیاق تھا۔ آج جینی صاحب کا پیغام ملا کہ آپ تشریف لائے ہیں تو میں حاضر ہوا ہوں۔ ابھی ابھی چند دن ہوئے میری نظموں اور غزلوں کا مجموعہ آیا ہے۔" غزنم " جو حاضر خدمت کر رہا ہوں" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے " غزنم " کی ایک کاپی دی۔ مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ اچھے شاعر ہیں۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ظ۔ انصاری جو بالکل قریب میں رہتے تھے آ گئے۔ اور دوسرے دن بمبئی ٹی۔ وی۔ پر ایک شعری نشست کی مجھ کو دعوت دی۔ میں نے کہا" اگر آج رات کے مشاعرہ کے بعد سکت رہی تو T.V. پر ضرور آؤں گا۔"

شب میں سب لوگ مشاعرہ میں گئے۔ جس ہال میں یہ مشاعرہ تھا اس کا نام غالباً ٹیگور ہال تھا۔ ہملوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈائس پر پہنچ کر دیکھا تو ایک پکّے رنگ کا خوبصورت آدمی جس کے بال میرے ایسے بلیے بلیے تھے مگر بالکل سیاہ۔ بڑی سنجیدگی سے گاؤ تکیہ پر کہنی ٹیکے ہوئے صدارت کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو باوردی محافظ مع پستولوں کے کھڑے ہوئے تھے۔ میں اس کی بائیں جانب بٹھایا گیا۔ اور وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے کسی سے پوچھا" یہ صدارت کون صاحب کر رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ مستان شاہ

ہیں۔ اور اس سے کوئی بڑا ڈونیشن ملنے والا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ریستان شاہ بالکل پڑھا لکھا نہیں ہے مگر خاموشی بھی عجیب جادو ہے کہ پورے مشاعرہ بھر ایک لفظ نہ بولا اور نہایت پُر وقار معلوم ہو رہا تھا۔ جاں نثار بھی اس مشاعرہ میں شریک تھے مگر غزل سنا کر آہستہ سے نکل بھاگے۔ مشاعرہ تقریباً ایک بجے تک چلا اور دو بجے ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ صبح آٹھ بجے سے ظ۔ انصاری کا ٹیلیفون آنا شروع ہوا۔ میں نے کہلوا دیا کہ میں سو رہا ہوں۔ T.V. اسٹیشن سے پھر ان کا فون آیا مگر میں نے کچھ تکان کی وجہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ ٹی۔ وی۔ والوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ایسے مشاعرہ میں کس حیثیت سے جاتا۔ دوپہر کے کھانے پر جینی صاحب نے مجھ سے کہا کہ آج آپ کے اعزاز میں اپنے یہاں ایک قوالی کی محفل کا انعقاد کیا ہے۔ جس میں حیدرآباد کے مشہور قوال پدم شری عزیز احمد وارثی گائیں گے۔ مجھ کو خود قوالی سننے کا بہت شوق ہے۔ والد مرحوم کو بھی قوالی سے بڑی دلچسپی تھی۔ غالباً محفل سماع سے دلچسپی ہمارے صلب میں ہے۔ ہمارے مورث سیّد بڑے میر کا سلسلۂ چشتیہ کے صوفیوں میں تھا اور وہ اثر ہمارے خون میں اب تک موجود ہے۔ میری شاعری میں بھی اس کے اثرات ملتے ہیں جس سے انکار صداقت کے خلاف ہوگا۔ عزیز احمد وارثی حیدرآبادی بڑے پائے کے صاحب فنِ موسیقی ہیں۔ اس محفل میں کافی لطف آیا۔

دوسرے میں نیمی چند جینی کے ساتھ ٹائمز آف انڈیا اور السٹریٹڈ ویکلی کی دفتر گیا جہاں قرۃ العین اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ وہ مجھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور میں ان کو عینی نے دریافت کیا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوں۔ میں نے جیسے ہی کہا کہ آپ کے کلیگ نیمی چند جینی کے یہاں تو وہ کرسی سے اٹھ کر میز پر بیٹھ گئیں اور چہرہ غصّہ سے لال ہو رہا تھا۔ "آپ اور جینی کے مہمان! یہ کس طرح ممکن ہے۔ یہ لوگ سب R.S.S. کے لوگ ہیں، تو آپ وہاں کس طرح پہنچ گئے"۔ تب میں نے پورا قصہ سنایا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ "آپ کو فوراً وہاں سے ہٹ جانا چاہیے"۔ میں نے کہا "آج کوشش کروں گا۔ جب میں نے اوشا سے کہا کہ اب جانے کی اجازت دیجیے تو جواب ملا "آج آپ کیسے جا سکتے ہیں آج تو نیمی نے Boby میں Palace Theater دیکھنے کے لیے رزرویشن کروایا ہے اور ابھی تو آپ کو پوری طرح بمبئی دکھلانا ہے"۔ شام کو جلدی پر عینی نے بلایا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے پھر اپنا قصہ سنایا تو وہ بولیں "آپ وہاں ٹھہرے ہی کیوں" میں نے کہا میں تو سب باتیں آپ کو بتلا چکا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ چھٹکارا ملے تو کس طرح"۔ پہلے انھوں نے "کارِ جہاں دراز ہے" کے چند باب پڑھ کر سنائے۔ کیا کہنا، قلم تو عینی کا غلام ہے۔ وہ جو چاہے لکھ سکتی ہیں۔ کارِ جہاں دراز کی حیثیت ایک ناول کی کم تھی۔ وہ عینی کی اپنی خاندانی تاریخ تھی۔ مگر انداز تحریر عالمانہ اور بہت اچھا تھا۔ ان کے یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ سردار جعفری کے گھر گئے

وہاں فراق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ زبان اور اردو کے محاورات پر گفتگو چھیڑے ہوئے تھے۔ میں تھکا ہوا تھا اس لیے سردار کے سونے کے کمرہ میں جاکر ان کے بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں سردار بھی آگئے وہ اور بھی دیر تک سر پکڑے ہوئے لیٹے رہے۔

جب میں نے جلنی میاں بیوی سے کہا کہ اب جانے دیجیے، یہاں ہمارے بہت سے احباب ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں کچھ دن ان کے یہاں بھی قیام کروں تو وہ لوگ بولے "کہ ہم آپ کا جب کہئے بمبئی کلکتہ میل میں رزرویشن کروا دیں۔ اور آپ کو رخصت کردیں، گاڑی چھوٹ جانے کے بعد آپ جہاں چاہیں وہاں سے واپس آکر جا ہے جس کے پاس ٹھہریں ہم کو کوئی ابجکشن نہ ہوگا۔ ہم آپ کو بمبئی سے بغیر رخصت کئے ہوئے کہیں دوسری جگہ ٹھہرنے کے لیے نہ جانے دیں گے۔ ہم محبت سے آپ کو لائے ہیں، اس میں دوسرا کوئی حصہ دار نہیں ہوسکتا۔ اور آپ جائیں گے کس طرح۔ ایک مہینہ تک کلکتہ میل میں بکنگ ہوچکی ہے مگر ہمارے ذرائع ہیں۔ جس دن آپ کہیں آپ کا رزرویشن ہوجائے گا۔ اور بڑی مشکل سے اپنے یہاں سے چھٹے دن ان لوگوں نے جانے دیا اور ۷.۳۰ بجے گاڑی پر بٹھا کر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ اوشا جین روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں کہ ہم کو شک ہوتا ہے کہ اب جب آپ بمبئی آئیں گے تو ہمارے یہاں نہ ٹھہریں گے مگر دیکھئے کبھی بغیر ملے ہوئے نہ واپس جایا کیجئے گا۔ یہ ایک بہن کی محبت ہے، اس کو نہ ٹھکرائیں گے۔ میں نہیں کہتی کہ R.S.S. میں خراب لوگ نہیں ہیں۔ یہ جھگڑے فساد انھیں خراب اور فرقہ پرست لوگوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ بھگوان نہ چاہے اگر کوئی پریشانی کبھی آئے تو فوراً فون کیجئے گا۔ ہم ہوائی جہاز سے آکر آپ کی حفاظت کا انتظام کریں گے۔ آپ سچے ہندوستانی ہیں اور میرے بھائی ہیں"۔ میں نے کہا یہ طویل بحث ہے اس کو یہیں چھوڑیے۔ بس اتنا بتلایے کہ آخر یہ فسادات ہوتے کیوں ہیں۔"

جواب" ہم ان مسلمانوں کے دشمن ہیں جو یہاں رہ کر دوسرے ملکوں سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو بالکل اپنا جیسا سمجھتے ہیں جو اس ملک کے وفادار ہیں" مگر اس کی پہچان کیا ہے کہ جتنے مسلمان مارے جاتے ہیں وہ غدار مسلمان ہیں۔" "ہمارے پاس ان کی فہرست رہتی ہے"۔ "مگر ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معصوم اور وفادار بھی مارے جاتے ہیں" "یہ ہمارے والنیٹروں کی غلطی ہے"۔ "تو آپ کو اپنا رویہ بدلنا چاہیئے اور جن کی وفاداری مشکوک ہے ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیئے۔ یہ کشت خون کیسا۔ کہیں فسادات سے یہ مسائل طے ہوتے ہیں۔ یہ مسائل طے ہوتے ہیں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے سے۔ آج تک اتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے کسی میں مجرمین پر مقدمہ چلا؟ کسی کی سزا ہوئی؟ اب تو فرقہ وارانہ فسادات کرنا ہندو مسلم غنڈوں کا پیشہ ہوگیا ہے۔ لوٹے ہوئے مال اسباب سے دونوں کی روزی روٹی چلتی ہے۔ پولیس یا حکومت سختی کرتی ہے تو یہ غنڈے باقاعدہ گروہ بنا کر لٹیرے ڈاکو بن جاتے ہیں۔ میرے گاؤں میں اسکی

زندہ مثال موجود ہے"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ریل نے سیٹی دی اور ہمارے میزبان رخصت ہوئے اور ٹرین چل کھڑی ہوئی۔



ہمارے گاؤں میں ایک انٹر کالج ہے مگر یہاں کوئی چھوٹے بچوں کا اسکول نہ تھا، نتیجہ میں چھوٹے بچے لاوارثوں کی طرح سڑکوں پر مارے مارے گھوما کرتے۔ گولی کھیلتے تھے اور گالیاں بکتے۔ کوشش کر کے میں اپنے (out houses) میں ہموطنوں کی مدد سے ایک مانیٹری کنڈر گارڈن اسکول کھولا اور اس کا منیجر جمیل خاں نامی ایک M.A., M.Ed. لکچرر جغرافیہ کو بنایا اور تین سن رسیدہ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹروں اور ماسٹروں کو اس میں نوکر رکھا۔ یہ سب بڑے تجربہ کار اساتذہ ہیں۔ انگریزی کے علاوہ ہندی یا اردو کی تعلیم ضروری قرار دی۔ اس کا نہ حکومت سے ریکگنش لیا اور نہ مالی امداد۔ وہ اس لیے کہ مالی امداد ملتے ہی ان پرانے اساتذہ کو علٰحدہ کر دینا پڑتا جو بچوں کی تعلیم کے لیے مسرت رسان ہوتا۔ اسکول کھلتے ہی تین سو بچوں کی ایک فوج داخلہ کے لیے ٹوٹ پڑی۔ عمر اور گھروں پر حاصل کی ہوئی استعداد کی بنا پر K.G. سے لیکر پانچویں جماعت تک داخلہ ہوا۔ ٹیوشن فی K.G. اور پہلی جماعت کی ایک روپیہ ماہوار، دوسری کی دو روپئے، تیسری کی تین روپئے، چوتھی کی چار روپئے اور پانچویں کی پانچ روپئے ہے۔ جس سے استادوں کی تنخواہ، ٹاٹ اور ضروری میز کرسی اور ایک پن بھرا پانی پلانے اور پہریدار کی تنخواہ بہ آسانی نکل آتی ہے۔ گذشتہ دس برس سے یہ اسکول نہایت کامیابی سے چل رہا ہے Principal Misra کو پانچ فیصد بچوں کی فیس معاف کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارا یہ اسکول رجسٹرڈ نہیں ہے اس لیے درجہ پانچ پاس کرنے کے بعد دوسرے اسکول اور کالجوں میں داخلہ کا امتحان دینا پڑتا ہے۔ تعلیم اتنی اچھی اور بالخصوص انگریزی جاننے کی وجہ سے ہر سال ہمارے اسکول کا پانچواں درجہ پاس دو ایک لڑکا ساتویں درجہ میں داخلہ ضرور پا جاتا ہے۔ ہمارے اسکول کے پڑھے ہوئے بچے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور تربیت یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو چھوٹے موٹے کھیل کود اور اداکاری اور ہلکی پھلکی موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی جس کا مظاہرہ وہ ہر سال ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کو کرتے ہیں اور میں ان کے اجتماع میں قومی یکجہتی، سیکولرزم اور تہذیب و تربیت کے مسائل پر ان سے گفتگو بھی کرتا ہوں۔ ترقی کر کے اس وقت اساتذہ کی تعداد چھ ہے۔ ان خاص موقعوں پر امتحان کے نتائج اور رشد اور صاف رہنے پر انعامات بھی تقسیم ہوتے ہیں جس میں بچوں کے والدین بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ تجربہ نے بتلایا کہ سن رسیدہ اور تجربہ کار اساتذہ نئے استادوں سے بہتر کام کرتے ہیں۔ جمیل خاں حساب کتاب رکھتے ہیں اور میں نگرانی کرتا ہوں۔ یہ میرے لیے مفید اور دلچسپ مشغلہ ثابت ہوا۔



۴ اپریل ۱۹۷۶ء کے ہفت روزہ جریدہ "حیات" میں ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو دہلی میں ہونے والی اردو کی ترقی

پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کا اعلان نامہ ملا اور غلام ربانی تاباں کنوینر کانفرنس کے دعوت نامہ کو پڑھ کر بنے بھائی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس کانفرنس کے اعلان نامہ اور مراسلات میں لفظ " انجمن " ضرور لگا ہوتا ترقی پسند مصنفین تو ۱۶ مارچ ۱۹۳۶ سے پہلے ہی وجود میں آچکے تھے مگر ایک مرکزی انجمن کا نام فیڈریشن آف پروگریسیو رائٹرز قرار پایا تھا۔ اور چونکہ مجھ کو نام کی اس تبدیلی سے بنیادی اختلاف تھا اس لیے میں نے اس کے خلاف اشاعت کے لیے ایک بیان "حیات" میں بھیجا جو ذیل میں درج ہے:

موجودہ نام کے ساتھ مجوزہ کانفرنس سے مجھکو بنیادی اختلاف ہے کیونکہ اسکو آئینی اور مرحوم انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانشینی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے درآنحالیکہ اسکے اجزائے ترکیبی سب دہی ترقی پسند مصنفین ہیں جو ایک کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہوتے۔ مگر ابھی کل ہند انجمن کا وجود کہاں ہے؟ اس کے جواب میں مجوزہ کانفرنس کی ایڈھاک کمیٹی موجود ہے اسی پر انجمن کی کانفرنس طلب کرنے سے پہلے اساس رکھی جاسکتی تھی۔ اس میں کوئی آئینی اڑچن نہ تھی۔ خیال ہے کہ کانفرنس طلب کرتے وقت دہلی کے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے کانفرنس کے نام کا مسئلہ ضرور آیا ہوگا اور میرے جیسے چند سر پھروں نے لفظ انجمن کی شمولیت پر زور بھی دیا ہوگا مگر انکی آواز شاید صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسکی وجہ صاف ہے۔ ہم اب فردیت، لابی ازم، سمجھوتہ بازی اور موقع پرستی کے بری طرح شکار ہو چکے ہیں۔ چونکہ انجمن ہی ان کمزوریوں کا انسداد کر سکتی تھی اسلئے اس کا احیاء اس کانفرنس کے محرکین کو مصلحت کے خلاف معلوم ہوا۔

انفرادی طور پر ترقی پسند ادیبوں نے اچھا ادب پیدا کیا ہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے مگر انجمن کی عدم موجودگی میں ہم ترقی پسند تحریک کے مخالفین کا انفرادی طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اپنے مخالفین کا بالعموم اور بالخصوص جدیدیوں کی دریدہ دہنی کا ہم نے ابتک کوئی منہ توڑ جواب نہیں دیا۔ ہم اپنے مخالفین کا اس لئے بھی مقابلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ ہم اجتماعی حیثیت سے کمزور رہیں اور انفرادی طور پر ان عناصر کے سرپرست سرمایہ داروں اور رجعت پرستوں سے ہمارے

خود ذاتی تعلقات بھی ہیں ۔ ہم خود اُن کی خوش آمد میں لگے رہتے ہیں ۔ اُن کے جود و کرم کے منتظر رہتے ہیں ۔ ہم انکی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں اور اُنکے آلۂ تفریح بنتے ہیں ۔ البتہ انجمن کے ہوتے ہوئے یہ بے راہ روی ممکن نہ ہو سکتی ۔

رہا ترقی پسند تخلیقات کا ۴۰ سالہ جائزہ تو یہ محض خیال ہے ۔ یہ کوئی چند گھنٹوں یا دو ایک دن کا کام نہیں ہے ۔ سرسری جائزہ خطرناک حد تک بے سود ہوتا ہے ۔ اس کام کے لیے مستند نقادوں کا ایک بورڈ ہونا چاہئے جو جغرافیائی حدود کی نمائندگی پر مشتمل ہو اور جس کے سامنے گذشتہ ۴۰ برسوں کی تمام ترقی پسند تخلیقات موجود ہوں ۔ انفرادی طور پر ادب کا جائزہ تو وقتاً فوقتاً لیا جاتا رہا ہے مگر مقامی اثرات، تعلقات، داخلی تعصبات، مواد کی فراہمی کی دشواریاں اور خود نقاد کی سہل انگاری نے ان جائزوں کو تاریخی دستاویز نہ بننے دیا ۔ دستیاب ادبی ذخائر کے علاوہ ادیبوں کو دعوت بھی دی جانی چاہئے تھی کہ وہ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات بورڈ کے پاس بھیجیں تاکہ تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جا سکے ۔ بنگال اور بہار کے ادیبوں کو بڑی شکایت ہے (اور وہ اس شکایت میں حق بجانب ہیں) کہ ہر ایسے موقع پر انکو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بمبئی اور دہلی کے چند ادیبوں کے نام چن لئے جاتے ہیں ۔ تو اس امر میں بڑی احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ کام کرنیکی ضرورت ہے ۔ کسی خاص فرد یا گروپ کا غلبہ مناسب نہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ افراد ہی ادب تخلیق کرتے ہیں مگر اجتماعیت اور ڈسپلن کے خیال سے انجمن کا ہونا از حد ضروری ہے ۔ ترقی پسند ادیبوں کی محض کانفرنس طلب کرنا نشستند و گفتند و برخواستند سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ بالعموم ایسی بے سرو پا کانفرنسیں ذاتی حصول مقصد کے لیے موقع پرستوں کی ذہنی اُپج ہوا کرتی ہیں ۔ انجمن کے نام سے نئے ادیبوں کو الرجی ہماری موقع پرستی اور انتشار پسندی (مزاجیت) کی واضح دلیل ہے ۔ ہم کس کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور ہم کب تک سمجھوتہ کرتے رہیں گے ۔ غالباً اُسی وقت تک جبتک ہم خود اپنے مخالفین میں مدغم نہ ہو جائیں ۔

شاید میرے اس بیان کے بعد مجوزہ کانفرنس میں کل ھند انجمن ترقی پسند مصنفین کا احیاء ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم کو انتہائی مسرّت ہوگی اور اس سے زیادہ اس وقت مسرت ہوگی جب انجمن کی کل ھند کانفرنس طلب کی جائیگی اور ہم اس میں شرکت کرتے ہوئے فخر محسوس کریں گے۔ اِس وقت تو ہم کسی ڈھکے چھپے مقصد کے حصول کا آلۂ کار بننے سے قاصر ہیں۔

میرے ان خیالات کے اظہار کے بعد ممکن ہے کہ مجھ پر یاسیت (Frustra - tion) کا الزام صادر کیا جائے تو قارئین کی تشفی کے لئے یہ بات واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یاسیت کا شکار وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے اجر و مراعات یا سند کی توقع رکھتا ہو اور اپنی مساعی میں ناکام رہ جائے یا جس میں قناعت کی کمی ہوتی ہے۔ تو بفضلہ مجھ میں ان اضافیات کی کوئی ہوس نہیں ہے۔ میں پورے بھروسے کے ساتھ کہتا ہوں اور اپنی تخلیقات کو اپنی کاوشوں کا صلہ سمجھتا ہوں۔ مجھکو کسی دوسرے صلہ یا سند کی حاجت نہیں۔ میری ادبی حیثیت کا تعین کسی سازش کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا اگر ایسا ہوا تو وہ دیرپا نہ ہوگا۔ ادیب کو سستی شہرت کی چاٹ سے بچنا چاہئے اور عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرنا چاہئے۔ قبولِ عوام ہونا واحد سند دوام ہے۔" ______________ وامق جونپوری

• میرے اس بیان پر دہلی میں بحثیں ہوئیں اور طے یہ پایا کہ رضیہ بھابھی اور اجمل اجملی مجھ پر اپنا ذاتی دباؤ ڈال کر یہ بیان واپس لینے پر مجبور کریں۔ میں نے جب یہ رنگ دیکھا تو بیان واپس لے لیا اور کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔

جب شور میں جالے لگ جاتے ہیں تو اعمال میں تضادات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ ادھر دہلی میں Federation of Progressive Writers موجود ہے مگر جادو سر پر چڑھ کے یوں بول رہا ہے کہ مرکزی P.W.A کی گولڈن جوبلی لکھنؤ میں اپریل ۱۹۸۶ء میں منائی جانیوالی ہے۔ دریافت طلب یہ بات ہے کہ وہ مرکزی P.W.A ہے کہاں، اب تو اس کا نام F.P.W. پڑ چکا ہے۔ یہ سب گھپلے عمداً کئے جاتے ہیں کہ موقع پرستی کی ڈور ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اگر میری صحت نے اجازت دی اور اس لکھنؤ جشن میں شرکت کر سکا تو اس میں میں شرکت کر کے آئین میں مندرجہ ذیل تبدیلی تجویز کروں گا کہ آئندہ پھر کبھی ہم ترقی پسند مصنفین کو شرمندگی کا منھ نہ دیکھنا پڑے:

(۱) مرکزی P.W.A. کا صدر کسی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو یا فارسی کو ہونا چاہیے جو شاعر نہ ہو۔ اس کا نقاد یا محقق ہونا کافی ہے۔ اس لیے کہ ماضی میں شعرا صدروں کا ریکارڈ غیر اطمینان بخش رہا ہے۔

(۲) ایک سکریٹری نثر کا ہونا چاہیے اور دوسرا نظم کا اور انجمن کو جوان تندرست اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

(۳) ادارہ کا نام مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین ہونا چاہیے۔ انجمن کا نام بدل کر فڈریشن رکھنے سے کسی کی تالیف قلب نہیں ہو سکتی اور اس کے جلسے ہر ماہ ہونے چاہئیں یا کم از کم ہر دوسرے مہینے۔

(۴) اور شہروں اور قصبوں میں P.W.A. کی شاخوں کا بھی یہی ڈھانچہ ہونا چاہئے۔ مختصر یہ کہ شعرا کو ذمہ داری کا کوئی کام نہ دینا چاہیے۔ شعرا سے زیادہ خود غرض اور گروہ بند کسی دوسری صنف کا ادیب نہیں ہوتا۔

(۵) یہ اہم بات نہ بھولنا چاہیے کہ مرکزی انجمن کے عہدہ داران ایک نوع کے تحریک کے سربراہ بھی ہوتے ہیں جن کو خفیف الحرکاتی سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اور شاعر اپنی کمزوریوں پر قابو نہیں پا سکتا۔ پروفیسروں، نقادوں یا محققین کی کارکردگی بحیثیت المجموع بہتر رہی ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی رہے گی۔

(۶) غیر شاعر ادیبوں کی زونل بنیادوں پر جو اچھے نقادوں پر مشتمل ہو، کمیٹیاں بننی چاہئیں جو سالانہ رپورٹ شعرا کی تخلیقات پر موقر جریدوں میں بھیجا کریں۔ اسی طرح نثری ادب کے جائزہ کے لیے شاعروں کی کمیٹیاں بننی چاہئیں۔

(۷) سال میں مرکزی P.W.A. کی ایک کانفرنس ضرور ہونا چاہیے جس کے سامنے سال بھر کی رپورٹنگ ہونی چاہیے۔ اس طرح سے سربراہان ترقی پسند ادب کے بے لگام ہو جانے کے مواقع کم پیدا ہوں گے۔

۱۹۷۸ء میں میرا تیسرا مجموعہ "شب چراغ" شائع ہوا جس پر مجھ کو ۱۹۷۹ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اردو کا پہلا انعام دیا۔

۱۹۸۰ء میں "شب چراغ" اور میرے جملہ ادبی خدمات پر مجھ کو اردو کا پہلا سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ اور روس کا سفر ادائل ۱۹۸۱ء میں آگرہ فورٹ کے دربار عام میں اکبر اعظم کے اعلان نامہ صلح کل کے چار سو برسوں جوبلی منائی گئی شب میں مشاعرہ تھا اس میں شرکت کرنے کے لیے میں گنگا جمنا اکسپریس سے مشاعرہ سے ایک دن پہلے آگرہ کے لیے جونپور سے روانہ ہوا۔ لکھنؤ پہنچ کر میں نے بستر کھول دیا تھا اور سوتا ہوا کانپور پہنچا۔ یہ کوئی ۱۱½ بجے شب کا وقت رہا ہوگا۔ شور سے آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کانپور سنٹرل ہے۔ پھر چادر اوڑھ کر سو رہا۔ ۳½ بجے آنکھ کھلی تو میں نے سمجھا کہ ٹرین ٹونڈلا پہنچ گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا نہیں ابھی ٹرین کانپور ہی میں کھڑی ہے۔ کوئی ٹرین الٹ گئی ہے اس لیے راستہ بند ہے۔ جس کو

کرایہ واپس لینا ہو وہ اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں کرایہ واپس لے لے۔ میں نے بھی بستر لپیٹا۔ قلی کیا اور پلیٹ فارم نمبر ایک پر پہنچا تو دیکھا کہ دفتر کے سامنے کئی ہزار مسافروں کا کیو لگا ہوا ہے۔ ٹکٹ دیکر کرایہ واپس مل رہا ہے۔ کرایہ جس سستی سے واپس مل رہا تھا اس کو دیکھتے ہوئے حساب لگایا تو میرا نمبر دن کے دو تین بجے تک آسکتا تھا۔ میں نے قلی سے پھر سامان اٹھوایا اور بس اسٹیشن گیا کہ اگر کوئی آگرہ کی بس مل گئی تو اسی سے نکل جائیں۔ کلکٹر گنج بس اسٹیشن پر آگرہ کے لیے ایک بس تیار ملی۔ ایک سیٹ خالی تھی، اسباب قریب رکھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس چلنے سے پہلے میں اتر کر دیاسلائی خریدنے چلا گیا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت میری سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی ہے اور دوسرے مسافر اس کو روک رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر وہ وہاں سے چل کے بایونٹ پر التی مار کے بیٹھ گئی۔ جب بس کا کنڈکٹر آیا تو اس نے عورت سے ہٹ جانے اور کسی دوسری سیٹ پر بیٹھنے کو کہا تو وہ میری طرف اشارہ کر کے بولی کہ "وہ بڈھا کھالی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔" میں عورتوں پر جملہ بازی سے گریز کرتا ہوں تاہم اس عورت کے اس جملہ پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا "اخ۔ خیر اور آپ بڑی جوان ہیں۔" اس پر بس کے سب مسافر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور وہ عورت کھڑی ہو کر مجھ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ مگر ہم دونوں کے درمیان کنڈکٹر تھا۔ اس نے اس عورت سے کہا کہ "یہ بس ہر بس اڈہ پر رکتی ہوئی آگرہ جائے گی اور رات کے ۹۔۱۰ بجے سے پہلے نہ پہنچے گی۔ اس لیے تم ایسا کرو کہ یہاں سے رکشہ کر کے چنی گنج کانپور کے بس اسٹیشن چلی جاؤ۔ وہاں سے راستہ میں نہ رکنے والی اسپیشل بسیں آگرہ جا رہی ہیں اور تم سورج ڈوبتے ڈوبتے آگرہ پہنچ جاؤ گی۔" یہ بات اس عورت کے سمجھ میں نہ آئی مگر میں چنی گنج جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ رکشا کیا اور چنی گنج پہنچا ہی تھا کہ ایک بس سے آواز آئی "وامق صاحب وامق۔ جلدی آیئے ابھی ایک سیٹ خالی ہے اور سب سے پہلے آگرہ یہ بس جائے گی"۔ گھوم کے دیکھا تو بس کی ایک کھڑکی سے ماہر لکھنوی مجھ کو بلا رہے تھے۔ رکشا والے کو کرایہ ادا کر کے میں فوراً اس بس میں مع اسباب کے داخل ہو گیا۔ ماہر لکھنوی بولے "آگرہ چل رہے ہیں نا"۔ میں نے جواب دیا "جی ہاں"۔ "تو پھر آیئے نا ایک سے دو بہتر ہیں"۔ اور ہم دونوں راستہ بھر باتیں کرتے ہوئے غروب آفتاب کے کچھ بعد آگرہ پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ قلعہ سے قریب کسی ہوٹل میں علی جواد زیدی نے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ حمام کیا کپڑے بدلے اور کھانے کے کمرہ میں لے جائے گئے۔ وہاں سے ہم لوگ آگرہ فورٹ گئے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ بلکہ اختتام پر تھا۔ سر شام ہی سے جیسے جیسے شعراء آتے جاتے تھے اشعار سناتے جاتے تھے۔ سامعین بیٹھنے سے زیادہ ٹہل ٹہل کر شاعروں کو سننا زیادہ پسند کر رہے تھے۔ ہر شخص آزاد رہنا چاہتا تھا۔ ملک بھر کے تقریباً ہر مدرسۂ خیال کے شعراء ۶۰۔۷۰ کی تعداد میں آئے تھے مگر ڈائس پر جب ہم لوگ پہنچے میں تو صرف چار پانچ شعراء باقی تھے جن میں علی جواد زیدی، ساغر نظامی، ماہر لکھنوی، میں اور دو ایک اور۔ ہم لوگوں کے بعد یہ مشاعرہ تقریباً دس بجے ختم ہو گیا۔ ہوٹل

پر واپس پہنچے تو جذبی، غلام ربانی تاباں اور وحید اختر وغیرہ سے ملاقات ہوئی ۔ یہ لوگ مشاعرہ میں شرکت کر کے واپس آ چکے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ اتنے میں سینٹ جانس کالج کے اردو کے استاد ڈاکٹر علی احمد فاطمی آ گئے اور دوسرے دن اپنے کالج میں مشاعرہ کی دعوت دے گئے۔ کالج میں ڈاکٹر کاظمی اور دوسرے بہت سے شعرا سے ملاقات ہوئی اور اس کے دوسرے دن ہم لوگ خیریت سے اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ریل کا راستہ کھل چکا تھا اور راستہ میں کسی بڈھی جوان عورت سے تو تو میں میں کرنے کا حادثہ پیش نہیں آیا۔

••

گیارہواں باب

سفرِ روس

سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ کے سلسلہ میں جولائی ۱۹۸۱ء میں مجھ کو روس جانا تھا۔ اہل جونپور کو مجھ سے جو محبت اور خلوص ہے اسکا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ جب ان کو یہ علم ہوا کہ میں جولائی ۱۹۸۱ء کے پہلے ہفتے میں سوویت دیس جانے والا ہوں تو یہاں کے جملہ اداروں، سیاسی ادبی ثقافتی اور سماجی جماعتوں، اسکولوں، کالجوں اور ہر شعبۂ زندگی کی نمائندہ ہستیوں نے اجتماعی طور پر ہندی بھون میں یکم جولائی ۱۹۸۱ء کو ایک ودائیہ دیا جسکی مجلس صدارت بابو مرتنجے سہائے ایڈوکیٹ، ڈاکٹر کملا کانت ورما اور لکھنؤ سے آئے ہوئے کامریڈ رمیش چندر پر مشتمل تھی۔ کامریڈ مفتی انوار حیدر ایڈوکیٹ لبے کمار صدر ہندوستانی بھاشا سنستھان نثار جونپوری، ہوش جونپوری اور دوسرے جوان سال اردو اور ہندی کے شعرا اور کویوں نے اس میں عملی حصّہ لیا۔ چائے پانی ہوا، تقریریں ہوئیں۔ بچوں اور بچیوں نے ودائیہ کورس سنائے۔ تمام اداروں کی جانب سے پھول مالائیں پہنا کر اور تصویر لیکر مجھ کو بانی بنایا گیا اور ۴ جولائی کو میں احباب کے گھیرے میں گنگا جمنا اکسپریس سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔

۶ جولائی کی شب میں کیرت ببانی ایک سندھی ادیب اور میں رات گئے ۳ بجے روسی ایروفلاٹ ایر جیٹ لائنز پر پالم ہوائی اڈے سے روانہ ہوکر ۷ جولائی کی صبح کو اپنی گھڑی سے ۸½ بجے ماسکو کے بین الاقوامی ہوائی اڈہ "ونوکووا" پہنچ گئے۔ اُس وقت وہاں کی گھڑی میں سوا دس بج رہے تھے۔ "گینڈی سوچنکو" ہمارے انگریزی کے ترجمان خیر مقدم کیلیے موجود تھے۔

اسی ہوائی جہاز سے ہندوستان کے تقریباً دو سو فلمی ستارے بھی سفر کر رہے تھے۔ ۷ جولائی سے ماسکو میں بین الاقوامی فلم فیسٹول شروع ہونیوالا تھا۔ اس لیے پورا جہاز مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں چار پانچ سے پہلے کی ملاقات بھی تھی اور سفر لطف سے کٹا۔

ایرپورٹ کے باہر ٹیکسی موجود تھی اور ہم لوگ گینڈی سوچنکو کی معیت میں وہاں سے روانہ ہوکر ماسکو کی سب سے بڑی قیام گاہ ہوٹیل یوکرین پہنچے۔ اس ایک ہزار کمروں کی تیس منزلہ عمارت میں ہم لوگوں کے کمرے ۲۱ ویں منزل پر تھے۔ اپنے اپنے کمروں میں جاکر ہم نے حمام کیا اور کپڑے بدل کر ناشتہ کے لیے تیز رفتار لفٹ سے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے جس میں بیک وقت ایک ہزار کھانا کھانیوالوں کی گنجائش ہے۔ ناشتہ کرکے حکومت روس کے نمائندہ میزبان و منتظم سیر و سیاحت (A.P.N.) Novosti press Agency H.Q. Moscow. کے دفتر گئے

جہاں اس کے افسر اعلیٰ مسٹر کولنڈا ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کولنڈا سے میری دہلی کی ملاقات تھی۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے، خیریت سفر دریافت کی۔ ہم لوگوں نے ان کو پُرلطف سفر کی روداد سنائی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "ہم آپ کو اس قلیل وقت میں بہت کچھ دکھلانا چاہتے ہیں۔ آپ کے ترجمان گینڈی سوچنکو مستقل آپ کے ساتھ رہیں گے۔ یہ نہایت تجربہ کار گائیڈ بھی ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے آپ کو زیادہ تر روس کے اندر بھی ہوائی جہاز سے سفر کرنا ہوگا۔ پہلے آپ "ریگا" جائیں گے۔ اس کے بعد "لینن گراڈ" اور تب تاشقند، سمرقند وغیرہ اور اس کے بعد پھر ماسکو کی واپسی اور یہاں کی سیر۔ آج بھی ماسکو کی سیر کر لیجیے کل سے ریگا وغیرہ کا سفر شروع ہو جائے گا"۔ باتیں ہوتی رہیں اور ہم سب لوگ کافی چاکلیٹ اور دوسری مشروبات سے شغل بھی کرتے رہے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد لنچ لیا گیا اور ماسکو کی سیر کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ کار ہر وقت موجود رہتی تھی اس لیے ایک دن کی مختصر مدّت میں بھی ہم لوگوں نے ماسکو کی کافی سیر کر لی۔ سب سے پہلے ہم کریملن پہنچے تو کریملن کے "اسپاسکایا" ٹاور کی دیو قامت گھڑی نے پونے دو کے جائم سے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ طے پایا کہ سمرقند سے واپسی پر کریملن اندر سے بالتفصیل دیکھیں گے۔ اور ریڈ اسکوائر میں آگے بڑھ کر ہم لوگ لینن کی (مسلوسیم) دوامی خوابگاہ (مقبرہ) دیکھنے گئے۔ چونکہ زیارت کرنیوالوں کا مجمع بہت تھا اس لیے اس کے اندر جانا بھی دوسری بار آنے پر ٹال دیا گیا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ اندر سے کریملن کوئی ایک قلعہ یا عمارت نہیں ہے بلکہ ایک عظیم شہر ہے۔ ایک دنیا ہے، ایک عالم ہے جو کئی کلومیٹر لمبی اونچی فصیلوں سے گھرا کئی ہزار ہیکٹر میں پھیلا ہوا ہے۔ اور لینن کے جسد خاکی کو دیکھنے ملکی اور غیر ملکی کئی کئی لاکھ آدمی روزانہ اس مقبرہ کے اندر سے گذرتے ہیں، اور ڈیڑھ دو کلومیٹر تک انکا کیو دیکھا جا سکتا ہے۔ ریڈ اسکوائر کے بعد ہم نے گورکی اسٹریٹ، مارکس اسٹریٹ اور کیلی لن اسٹریٹ وغیرہ کی سیر کی۔ اور دنیا کی سب سے زیادہ چوڑی سڑک لینن گراڈ روڈ دیکھی۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ہوائی اڈے تک جس کے بعد یہ سڑک تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے بیک وقت بلس کاریں داہنی جانب اور بلس کاریں بائیں جانب دوڑتی رہتی ہیں۔ آگے اور پیچھے کتنی کاریں لگی ہوئی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں۔ ماسکو کے سب سے بڑے گوم سوم بازاروں کا "چکر" لگایا۔ وہاں ہر چیز بکتی ہے۔ خریداروں کی اتنی بڑی تعداد اس سے قبل کبھی نہ دیکھی تھی۔ مذاق میں روسی ان بازاروں کو پاگل خانہ بھی کہتے ہیں۔ K.G.B. اور وزارت داخلہ کی قلعہ نما جدید عمارتیں دیکھیں۔ ماسکو یونیورسٹی کی باہر سے زیارت کی۔

موسم گرما کی تعطیل کا زمانہ تھا اس لیے وہاں کے اساتذہ اور طلبا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ماسکو کے مشہور بیلے رقاص اور رقاصہ بھی دوسرے ملکوں کو چلے گئے تھے۔ اُن کے تھیٹر بند تھے۔ ہوٹل روسیا بھی دیکھا۔ وہ ہوٹل لوکرین سے بڑا

ضرور ہے مگر جو کلاسیکل طرز تعمیر، اندرونی سجاوٹ اور رہن سہن کا انتظام ہوٹیل یوکرین میں ہے وہ ہوٹیل روسیا میں نہیں۔ ہوٹیل روسیا میں کمروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور عمارت جدید طرز کی ہے مگر ہمارے ہوٹل کی سی سنجیدگی اس میں نہیں۔ ہوٹیل یوکرین دو طرف سے دریائے ماسکو سے گھرا ہوا ہے جس میں ہر وقت سیاحوں سے بھری ہوئی کشتیاں چلتی رہتی ہیں۔ ۳۰ ویں منزل سے پورا ماسکو دیکھا جا سکتا ہے جو افق کے دائرہ کو پار کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہوٹل واپس آکر میں نے اپنے کمرہ سے دیرینہ دوست (بلکہ عزیز) تقی حیدر کو رنگ کیا اور کہا کہ میرے لیے تتّور و بل لیکر فوراً چلے آؤ۔ وہ تقریباً پون گھنٹہ میں میرے پاس آگئے۔ میں نے ان سے تتّور و بل مستعار لیے اور اپنا پورا پروگرام بتلا دیا اور یہ کہ روس کا دورہ ختم کرنے کے بعد دو ہفتے میں پھر یہیں واپس آؤں گا اور مطلع کروں گا۔ چند دن ان کے ساتھ بھی رہنے کا ارادہ تھا۔

۸ر جولائی ۱۹۸۱ء کی صبح کو میں یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ آکاش وانی دہلی نے کامریڈ بھوپیش گپتا کے ماسکو اسپتال میں انتقال کی خبر سنائی۔ یہ سانحہ ارتحال میرے لیے بیحد روح فرسا تھا۔ کامریڈ گپتا کے انتقال میں ہماری پارٹی نے ایک بڑا لڑاکو سپاہی کھو دیا تھا اور راج سبھا کی پارلیمانی زندگی میں وہ خلا پیدا کر دیا جو مدتوں پُر نہ ہو سکے گا۔ یہ نابینا رہنما دنیا کے بہترین پارلیمنٹرین میں سے ایک تھا جواب نہیں رہا۔ افسوس!

اس دن ناشتہ کے بعد ہم لوگ ماسکو کی سیر کو پھر نکل گئے۔ دنیا کا سب سے بلند T. V. Tower دیکھا۔ باغات، چمن، لان اور بڑے فواروں سے مزین اور مستقل آل یونین زراعتی نمائش دیکھی جو نہایت خوبصورت پکّی عمارتوں میں سجی ہوئی تھی۔ ماسکو میں "سات بہنوں" کے نام سے بہت اونچی اونچی سات عمارتیں ہیں جن میں سے دو یعنی ہوٹیل یوکرین اور لومونوساف ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں، باقی پانچ کو آج دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عمارتیں ہر اعتبار سے انتہائی حسین ہیں اور اہل روس ان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ بین الاقوامی اولمپک کا اسٹیڈیم اور متعلقہ عمارتیں دیکھیں جو انسانی ضروریات کو دیکھتے ہوئے پورے ایک شہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چند کتب خانے دیکھے۔ مشہور زمانہ بالشوئی تھیٹر دیکھا۔

اسی دن ہم لوگ ۲ بجے سہ پہر کو ماسکو فلائٹ سے روانہ ہو کر ساڑھے چار بجے "ریگا" پہنچ گئے۔ ہوائی اڈہ پر نووستی پریس ایجنسی کے ریگا نمائندہ الکزنڈر میل جنوف نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ ایک ہنس مکھ خوش رو اور خوش پوشاک چالیس کی عمر کے نہایت پھرتیلے آدمی تھے۔ سامان کار کی بوٹ میں رکھ کر اور ہم لوگوں کو کار میں بٹھا کر آدھ گھنٹے میں ریگا کے ہوٹیل لیٹویا پہنچ گئے۔ وہ ریگا میں ہمارے میزبان خصوصی تھے۔ تھوڑی ہندوستانی

اور انگریزی بخوبی بول لیتے تھے اور دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ کمروں میں سامان رکھوا کر ایک گھنٹے کے لیے رخصت ہو گئے۔ ہم لوگ بھی منھ ہاتھ دھو کر اور کافی وغیرہ پی کر تازہ دم ہو گئے تھے۔ اب پھر ہمارے سامنے الکزنڈر کا وہی شاداب اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ "آئیے چلئے آپ کو ایک عجیب منظر دکھلائیں۔ ریگا ایک دلہن ہے جو غروب آفتاب کے وقت دریائے داؤگاوا کے آئینہ میں اپنا حسین چہرہ دیکھ رہی ہے اور لاتعداد سیاحوں کو اپنا عاشق بنارہی ہے" ہم لوگ شہر کا داہنا پل پار کر کے جب دریا کے دوسرے ساحل پر پہنچے تو طبیعت عش عش کرنے لگی کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک نیلے آسمان اور ٹھہرے ہوئے دریا میں اصلی شہر کون ہے اور عکس کون ہے۔ ریگا سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی مگر کس درجہ رومانٹک۔

ریگا آٹھ سو سال پرانا شہر ہے جس کی آبادی آٹھ لاکھ سے اوپر ہے۔ ریگا مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک آمیزہ ہے۔ باغات، چمن، جنگلوں اور پارکوں کے سائے میں طویل وعریض لان جس میں پختہ راستے بنے ہوئے ہیں اور جابجا بنچیں پڑی ہوئی ہیں، جن کے ساتھ دریا سے کاٹ کر لائی ہوئی گہری نہریں بہار میں بہار دکھاتی ہیں۔ اگر ایک جانب پرانا شہر اپنی قدیم طرز تعمیر کے گرجاؤں اور مکانوں سے مزین ہے تو دوسری طرف نیا شہر جدید فلک بوس عمارتوں سے سربلند ہوتا جارہا ہے۔ ریگا بحیرۂ بالٹک پر ایک بندرگاہ ہے جس کو لٹویا اپنی گود میں لیے ہوئے ہے۔ ریگا کے انڈسٹریل میوزیم کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کی زندگی بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ مشین سازی، الکٹرانک ساز و سامان، کراکری، ٹیکسٹائل وغیرہ میں اس نے اپنی صنعت کے نہایت معیاری نمونے تیار کیے ہیں۔ عام طور پر لیٹویا کے باشندے ادب شاعری، مصوری، مجسمہ سازی اور فن موسیقی سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں کئی میوزیم، کتب خانے، تھیئٹر، پکچر گیلریاں ہیں اور یہ جگہیں ہر وقت لوگوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ہیں۔ یہاں نشر و اشاعت کا کام بھی اعلیٰ پیمانے پر ہو رہا ہے۔ یہاں کے شہروں میں صناعی اور فنکاری کی فطری صلاحیت ہے۔ یہاں کی ادبی انجمن کی نشست میں یہاں کے ادیبوں سے بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ یہاں ٹیگور، پریم چند اور دوسرے ہندوستانی کلاسکی ادب پر کافی کام ہو رہا ہے۔

یہاں دنیا کا سب سے بڑا کوائر آرگن چرچ ہے جس کا نام ڈوم کتھیڈرل ہے اس میں تقریباً ایکہزار نے (پائپ) ہیں جو کسی ایک آواز کو ہزار آوازوں کی سمفونی کی عظمت بخشتے ہیں۔ حسن اتفاق سے ہم لوگوں نے اس کے ایک خاص مظاہرہ میں شرکت کی جس کا لطف ابتک باقی ہے۔ میں نے تو اپنی زندگی میں ایسی موسیقی نہیں سنی تھی۔ مزید حسن اتفاق یہ کہ کمپوزیشن بیتھوون کا تھا۔ ریگا کے شہری بیحد حسین اور پھرتیلے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بہت اچھے رقاص ہیں اور فنون لطیفہ سے ان کو فطری لگاؤ ہے۔ یہ لوگ رنگ برنگے کپڑے پہننے کے شوقین

ہیں۔ ان کے حسن میں مجھ کو وہ ملاحت نظر آئی جو اسپین کے جپسیوں میں ملتی ہے۔

دوسرے ممالک سے دوستی اور ثقافتی تعلقات کی لیٹوین انجمن کی صدر الصدور جینس بردلس اور ایک اہم ممبر سلویا الڈوما سے تفصیلی ملاقات رہی۔ ان لوگوں نے مجھ سے اردو نظم سنانے کی فرمائش کی مگر میں نے معذرت کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ لیٹوما کے متعلق میں اپنے تاثرات انگریزی میں بھیجوں گا (اگر ہوسکا تو نظم کی شکل میں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور انگریزی کی وہ نظم اس باب کے ضمیمہ میں شامل ہے) انھوں نے مجھ کو لیٹویا کے دو نوجوان عوامی شاعروں کی منتخب نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی پیش کیا۔ جن میں مختلف نظموں کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ہمارے میزبان الگزینڈر ریملجنوف نے یہ بھی بتلایا کہ یہاں ٹیگور اور پریم چند پر بہت کام ہوا ہے۔ لٹویا محض فنکاروں کی سوویٹ نہیں ہے۔ یہاں بجلی سے چلنے والے انجن اور ریل گاڑی کے کارخانے بھی ہیں۔ کار اور موٹر سائیکل کے کارخانے ہیں۔ ٹریم بس کے کارخانے ہیں۔ پولٹری فارم، مویشیوں کی افزائش نسل کے فارم، خلیج ریگا میں بہت بڑا ماہی گیری کا ایک بیڑا ہے اور اس سے تھوڑی دور پر سمندر کے کنارے جرمالا کی نہایت خوبصورت بیچ ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں روسی اور غیر ممالک کے سیاح بیچ کی سنہری ریت پر غسل آب وغسل شعاع مہر سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں سمندر اتنا پایاب ہے کہ کئی سو میٹر تک بچے تیرتے اور نہاتے پانی کے اندر چلے جاتے ہیں۔ اسی سے ملحق ایک بہت بڑا ریستوراں ہے جس میں ہم لوگوں نے لنچ لیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ کھانے میں خاص چیز مرغ و ماہی تھے۔ ریگا کے شہری بڑے ملنسار اور مہمان نواز معلوم ہوئے اس احساس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہاں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد کافی ہے۔ روسی زبان سے بالکل نابلد ہونے کی وجہ سے تبادلۂ خیال ممکن نہیں۔ اور حسن اتفاق سے گینیڈی اور الگزنڈر دونوں بہت اچھی انگریزی بولتے تھے۔

یہاں کی دو جگہیں اور قابل دید ہیں "سیگولڈا" اور "سلاسپلس"۔ سیگولڈا اپنی صحرائیت کھوہ اور قدیم عمارتوں کے لیے مشہور ہے اور سلاسپلس اپنے اُن جانبازوں کے دیو پیکر مجسموں کے لیے جو مقامی مجسمہ تراشوں نے ان شہریوں کی یادگار کے طور پر بنائے ہیں جو گذشتہ جنگ میں بے رحمی کے ساتھ سلاسپلس کے کنسنٹریشن کی قیمت میں موت کے گھاٹ اتارے گئے اس میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ روسی ان مظالم اور تباہ کاریوں کو نہ کبھی بھلا سکتا ہے نہ ملک کی از سر نو آباد کاری سے پہلو تہی کر سکتا ہے اور نہ کبھی امن کی تمنا کو دل سے نکال سکتا ہے۔ روس تیسری جنگ کبھی نہ ہونے دیگا، یہ اس کا اولین مقصدِ حیات ہے۔ یاد رہے کہ اس جنگ میں اس کے دو کروڑ آدمی مارے گئے اور ۵ کروڑ ناکارہ یا زخمی ہوئے تھے۔

آج جولائی ۱۹۸۱ء کی ۱۰ تاریخ ہے اور ہم لوگ ریگا سے قریب غروب آفتاب بذریعہ برقی ٹرین لینن گراڈ

جاتے ہیں۔ گینڈی نے ہم لوگوں کے لیے ایک کوپے ریزرو کروا رکھا ہے۔ الکزنڈر ۳ بجے سہ پہر کو اپنی کار لیکر ہوٹل لیٹویا آ گئے۔ پہلے اپنے دفتر میں لے جاکر گرین لیبٹن چار پلائی اس کے بعد راستے میں کسی دفتر میں ضروری کاغذات دینے کے بعد وہ ہم لوگوں کو اسٹیشن ریگا لائے۔ گاڑی میں سوار کرایا اور قدرے سنجیدہ ہوکر دس ودانیا کہا اور رخصت ہوگئے۔ ہم لوگ گیارہ کو صبح ۸ بجے لینن گراڈ پہنچ گئے اور سیدھے بذریعہ ٹیکسی ہوٹل ماسکووا میں اپنے اپنے کمروں میں داخل ہوگئے۔ ہم لوگوں کو یہاں محض دو دن رہنا تھا اور یہ دونوں دن تعطیل کے تھے، سنیچر اور اتوار۔ اسکول کالج یونیورسٹی اور دوسرے ثقافتی ادارے سب بند تھے۔ مجبوری تھی، مگر اس مجبوری کی حدوں کو توڑ توڑ کے گینڈی نے ہم لوگوں کو محترمہ ٹی۔ ای۔ کٹینیا سے ملا دیا۔ یہ ایک پچاس سالہ خاتون ہیں۔ جو لینن گراڈ یونیورسٹی میں اردو ہندی اور دوسری ہندستانی زبانیں روسی زبان میں پڑھاتی ہیں۔ ہندستانی ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتی ہیں۔ ان کی پرائیوٹ سکریٹری بہت ہی حسین تھی۔ چونکہ یہ دونوں دن تعطیل کے تھے اس لیے ہم لوگوں نے لینن گراڈ کی مکمل سیر کے پروگرام پر عمل کیا۔ ہر قابل ذکر سڑک سے گذرے اور ہر اہم مقام کو دیکھا۔ یہ ۲۷۷ برس پرانا شہر ہے، اس کو پیٹر اوّل نے دریائے نیوا کے ساحل پر آباد کیا تھا۔ ماسکو کے بعد لینن گراڈ سوویٹ یونین کا سب سے بڑا شہر ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ماسکو اور لینن گراڈ میں زیادہ خوبصورت کون ہے؟ اس کا ثقافتی پس منظر بھی اتنا ہی عظیم اور شاندار ہے جتنا اس سیاسی پس منظر۔ اس کے عالیشان محلات عمارتیں اور لمبی چوڑی سڑکوں کی اقلیدسی پلاننگ کی وجہ سے شہر کے حسن میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ یہی وہ شہر ہے جس کو نازیوں نے ۹۰۰ دن تک ناکہ بندی کرکے تباہ و برباد کر ڈالا تھا، لیکن تعریف ہے ان اہل شہر کی جنھوں نے اپنی جان عزیز اور عمارات عظیم کی قربانیاں دے کر نازیوں کے چھکے چھڑا دے۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں لڈوگا جھیل کو نہیں بھلایا جاسکتا۔ موسم سرما میں جمی ہوئی جھیل کی سطح لینن گراڈ کی محاصرہ بندی میں واحد نکاسی تھی۔ مگر نازیوں کو شکست دیکر اہل لینن گراڈ اور سوویت حکومت نے چین نہ لیا اور شہر کو اس کی پرانی بنیادوں پر اس طرح از سر نو تعمیر کیا کہ علاوہ چند نشانات کے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کبھی کوئی جنگ ہوئی بھی تھی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ شہر اب پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگیا ہے۔ اس وقت یہاں ۲۶ تھیٹر اور ۷۰ سینما ہیں۔ گذشتہ دس سال سے یہاں ۵۰۰۰۰ فلیٹس سالانہ بن رہے ہیں۔ اسوقت لینن گراڈ میں ۲۵۰۰ کتب خانے ہیں۔ لینن گراڈ زیر زمین میٹرو سے دو لاکھ سے زیادہ مسافر روزانہ سفر کرتے ہیں۔ ہر ڈیڑھ منٹ پر دوسری ٹرین مل جاتی ہے۔ یہاں ۱۱۲ اسپتال ہیں جن میں ۴۱۰۰۰ بستر ہیں، ۹۸ پالی کلینک اور ۷۷ صحت کے مراکز ہیں اور ۲۱۰۰۰ سے زیادہ ڈاکٹر ہیں۔ یہاں ۵۰ عمدہ کھیل کود کے اسٹیڈیم ہیں اور ۲۳ تیراکی کے تالاب ہیں۔ کیراف اسٹیڈیم میں ۷۰۰۰۰ تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ لینن گراڈ شہر میں دس لاکھ اولمپک کھلاڑی ہیں جن میں ۱۰۰ طلائی تمغہ ۱۰۰ نقرئی تمغہ اور ۵۹ کانسے کا تمغہ پائے ہوئے ہیں۔ یہاں

۳۵۰۰ ڈیپارٹمنٹ اسٹورس ہیں۔ لینن گراڈ میں تقریباً تمام عظیم ادیبوں نے اپنے اپنے دور میں یہاں قیام کیا ہے اور اپنی چند بہترین تخلیقات چھوڑی ہیں۔ گلگول، ٹالسٹائے، داستووسکی، چیخوف، پشکن اور گورکی وغیرہ۔ ۱۸۷۲ء میں کارل مارکس کی لافانی تخلیق ’داس کیپٹال‘ پہلی بار یہیں شائع ہوئی تھی۔

روسیوں نے زارشاہی کے خلاف لینن کی رہنمائی میں پہلی بغاوت ۷۔۱۹۰۵ء میں یہیں کی تھی۔ روسیوں نے لینن کی قیادت میں زارشاہی کا تختہ ۱۹۱۷ء میں یہیں پلٹا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں بحری جنگی جہاز "ارورا" نے شاہی محل پر اپنا پہلا گولا داغا تھا۔

ہم نے اسمولنی محل دیکھا۔ لینن نے جہاں سے روس کے عظیم سوشلسٹ انقلاب کی رہنمائی کی تھی اور زار کے سرما محل پر قبضہ کرنے اور لینن گراڈ کی صوبائی حکومت کے وزرا کو قید کر لینے کے بعد جب اس شہر کا انقلاب مکمل ہو گیا تو ۱۰ ارمارچ ۱۹۱۸ء کو سوویت حکومت لینن کی قیادت میں ماسکو چلی گئی اور اس وقت سے آج تک ماسکو سوویت روس کا دارالحکومت ہے۔

لینن گراڈ کے بیشمار عالیشان گرجوں کے علاوہ جو اب میوزیم میں تبدیل ہو چکے ہیں ایک مسلمانوں کی مسجد بھی ہے جو یہاں کے مسلمانوں کے پیسوں سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ عالیشان مسجد سمرقند کے "گورمیر" طرز کی جس میں پورے مشرقی مزاج کا دخل ہے بنائی گئی تھی۔ اس میں وسطی ایشیا کے فن تعمیر کی پوری سجاوٹ موجود ہے۔ اس کے درودیوار اور جھاڑ و فانوس پر آیات قرآنی نہایت خوبصورتی کے ساتھ کندہ کئے گئے ہیں۔

نیوسکی اسٹریٹ یہاں کی تین بڑی سڑکوں میں سے ایک ہے جو ایڈمرلیٹی کی سر بفلک عمارت کی طرف تین سمتوں سے جاتی ہیں۔ باقی دو سڑکوں کا نام ہے ڈوزر ژھنسکی اسٹریٹ اور راداوروف اسٹریٹ۔ ایڈمرلیٹی کی عمارت اپنے طرز کے اعتبار سے روسی کلاسیکی مزاج کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ عمارت ۷۲ میٹر بلند ہے اور لینن گراڈ کی پہچان کہی جاتی ہے

یوں تو لینن گراڈ اپنی قدیم اور عظیم عمارتوں اور مجسموں سے بھرا پڑا ہے جن کا تفصیلی ذکر ان صفحات میں ممکن نہیں مگر چند کا ذکر کافی ہوگا۔ جو باہر ہی سے دیکھے جانے پر دل کو متاثر کرتے ہیں کہ وہ عوامی فنکار معمار اور مزدور تھے جنھوں نے ان کو متشکل کیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا جو نام زبان پر آتا ہے وہ پیلیس اسکوائر ہے۔ یہ چوک ہر جانب سے بڑے بڑے محلوں سے گھرا ہوا ہے جس کے درمیان میں اتنا طویل و عریض میدان پڑا ہوا ہے کہ وہاں سوویت روس کی فوجیں پریڈ کرتی ہیں اور کھلاڑی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس چوک کے وسط میں الگزنڈر کالم ہے جو نپولین پر روس کی فتح کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ گہرے سرخ رنگ کے گرینائٹ کا بہت اونچا اور اپنی

اپنی نوعیت کا دنیا میں واحد مینار ہے۔

لینن گراڈ یونیورسٹی اور آرٹس اور سائنس اکاڈمی کے سامنے جو چوک ہے اس میں کانسے کے ایک گھوڑے اور شہسوار کا مجسمہ ہے۔ گھوڑے کی پچھلی ٹانگ سے ایک سانپ لپٹا ہوا ہے اور گھوڑا الف ہو گیا ہے۔ کہیں بہت دور سے لائی ہوئی سنگ مرمر کی ایک ناتراشیدہ چٹان پر یہ مجسمہ قائم ہے جو مرکز ثقل کی رو سے دو ٹانگوں پر گھوڑے اور سوار کا یہ انداز حیرت انگیز ہے۔ اس کے بعد نمبر آتا ہے سینٹ آئزک گرجا کا۔ نہایت خوبصورت اور عالیشان عمارت ہے جس میں اب آرٹ میوزیم ہے۔ اسی کے قریب گھوڑے پر نکولس اوّل کا مجسمہ ہے جو بہت اچھا ہے۔ پورے شہر میں دریا نوا کی چھوٹی بڑی نہریں پھیلی ہوئی ہیں اور ان پر لاتعداد پل ہیں جو ایک حصہّ کو دوسرے سے ملاتے ہیں۔ شہر کے چند حصے ان نہروں کی وجہ سے جزیرہ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ چنانچہ لینن گراڈ یونیورسٹی جزیرۂ وسلیوسکی چھوٹے اور بڑے نیوا کے سنگم کے کنارہ واقع ہے۔ یہیں پر ادارۂ روسی ادبیات واقع ہے جو پشکن ہاؤس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے میوزیم میں دوسرے عظیم ادیبوں کے اشیار زندگی بھی موجود ہیں۔ مثلاً واستووسکی، ٹالسٹائے اور گورکی وغیرہ کی۔

نووسکی شاہراہ پر انچ خوف پل پار کرنے پر ہم کو سرکش گھوڑوں اور ان کو سدھارنے والے سواروں کے چار مجسمے ملتے ہیں جو فن مجسمہ سازی کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ماسکووسکی شاہراہ پر پلکووہ میں جہاں نازی حملہ کو روک دیا گیا تھا، ایک یادگار بنائی گئی ہے جو دو بیس منزلہ اور بہت سی دس منزلہ عمارتوں کا ایک چوک ہے اور ان کے سامنے بہت بڑا مدوّر جبنذ میدان ہے۔ یہ بھی نہایت قابل احترام کامپلیکس ہے۔ اس کے سامنے محنت کشوں، جانبازوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے مجسمے ہیں اور وسط میں بڑا مجسمہ ایک سپاہی اور ایک مزدور کا ہے۔ سپاہی لڑتا تھا اور مزدور اسکو آلات حرب بنا بنا کر دیتا تھا۔ اسی فتح چوک میں زویا تانیا کا بھی مجسمہ موجود ہے جس پر ۱۹۴۲ء میں میں نے سب سے پہلے نظم کہی تھی۔

لینن گراڈ کے مقامات میں اچھا کم از کم جو جگہیں اور قابل سیر و توجہ ہیں وہ پشکن، پیٹرودورٹس اور ہرمٹیج کا میوزیم ہے۔ پشکن قصبہ کا قدیم نام زارسکوئی سیلو تھا مگر اکتوبر انقلاب کے بعد اس کا نام پشکن رکھا گیا۔ یہاں وہ عمارت مع اپنے سازوسامان کے سوویت حکومت نے محفوظ کر رکھا ہے جس میں پشکن رہتا تھا، پڑھتا تھا اور اس نے شاعری کا آغاز کیا تھا۔ یہ جگہ لینن گراڈ سے ۲۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ آج سوویت دیس میں پشکن کے لاتعداد مجسمے ملتے ہیں اسکے نام پر کئی کتب خانے، سڑکیں، محلے اور چوک ہیں۔ یہیں پر ملکہ کیتھرائن کا عالیشان محل ہے جس کو نازیوں نے بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا اور محل کے نوادر لوٹ لے گئے۔ مگر سپریم سوویت کی مالی امداد اور مقامی معماروں صناعوں

اور دستکاروں نے اس محل کو میرے دیکھنے تک نصف سے زیادہ پھر سے تیار کر دیا تھا اور کام اب بھی جاری ہے۔ جو مرمت کا کام ہوا ہے اس پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ شاید یہ محل اپنی قدیم حالت میں اس قدر خوبصورت نہ رہا ہوگا۔

اس کے بعد ہم لوگ پیٹر ڈڈ ورئیس کا فوارہ محل دیکھنے گئے۔ بڑے محل کے سامنے لاتعداد سنہرے مجسمے ہیں جو فوارہ کی شکل میں کام کر رہے ہیں۔ سب سے بڑے فوارہ سیمسن اور شیر اور دوسرے مجسموں کو نازی فوجیں اُکھاڑ لے گئی تھیں۔ مگر سوویت حکومت نے ان کو از سر نو تعمیر کروا کے محل کے فواروں کو قدیم روپ دیدیا ہے۔ یہ سب فوارے قدرتی چشمہ کے پانی سے چلتے ہیں۔

لینن گراڈ میں تقریباً ایک سو میوزیم ہیں جن میں سب سے بڑا میوزیم ہرمیٹیج کا ہے۔ اور دنیا کے تین سب سے بڑے میوزیموں میں سے ایک ہے، جس میں ۲۶ لاکھ آرٹ اور کلچر کے نمونے ہیں اور جو مشتمل ہے ۱۵۰۰۰ قلمی تصویروں ۱۲ ہزار مجسموں۔ ۶ لاکھ آثار قدیمہ کے اجزا اور دس لاکھ سکوں اور تمغوں پر۔ اس میوزیم کے ۳۵۰ کمرے اور ہال عوام کے مشاہدہ کے لیے ہر موسم اور ہر زمانہ میں کھلے رہتے ہیں۔ تیس لاکھ مشاہدین ہر سال اس کو دیکھنے جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہاں ہر شہری کے لیے روحانی، جسمانی، سماجی اور ثقافتی غذا موجود ہے جن سے ہر شہری حسب توفیق استفادہ کرتا رہتا ہے۔

ہم نے یہاں کا بڑا اوپیرا تھیٹر بھی دیکھا جس میں اُس شام کو سوشلسٹ قدروں اور عوام دشمن عناصر کے تصادم کا تخیلی رقص پیش کیا گیا تھا اور جس میں سوشلسٹ قوتوں نے فتح پائی تھی۔

لینن گراڈ کی خوبصورتی کے ساتھ پورا انصاف نہ ہوگا اگر یہاں گرمیوں کی (Mid night sun) سفید راتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ تو جولائی کا مہینہ تھا کہ میں باہر ہوٹل کے لان پر بارہ بجے شب کے وقت آسمان کی روشنی میں ماسکو نیوز کا انگلش ویکلی بہ آسانی پڑھ سکتا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جون کی راتیں اتنی روشن ہوتی ہیں کہ دن اور رات میں کم فرق رہ جاتا ہے اور اس مہینہ میں اہل لینن گراڈ رات کی رات رقصوں اور کھلی جگہوں پر تفریح میں گذار دیتے ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ ہم لوگ ۱۲ ر جولائی کا دن گذار کے شب میں بذریعہ ہوائی جہاز تاشقند کیلئے روانہ ہو کر ۱۳ ر جولائی ۱۹۸۱ ر کی صبح کو تاشقند پہنچے اور وہاں کے ہوٹل ازبکستان میں مقیم ہوئے۔ سب سے پہلے میں نے اپنے دیرینہ دوست عنظر سلیم جو Progress کی تاشقند شاخ میں کام کرتے ہیں، فون کیا۔ وہ بیچارے بیمار تھے مگر یہ معلوم کر کے کہ میں تاشقند پہنچ گیا ہوں وفور مسرت میں رقص کرنے لگے۔ نہ آنے کی معذرت کی اور رات کا کھانا کھانے کی دعوت دیدی۔ تھوڑی ہی دیر میں دِنے شکلا اور ماتھر جی جو عنظر سلیم کے ہم پیشہ اور دوست ہیں آگئے جب

وہ چلے گئے تو شرف الدین نامے ایک نوجوان ادیب تشریف لائے اور بہت دیر تک اردو اور ازبک ادب اور ازبک شعرا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اتنی شستہ اور صاف و بامحاورہ اردو بولتے تھے کہ میں ان کو قطعی ہندوستانی سمجھ رہا تھا اور جب ان کا وطن دریافت کیا تو وہ معلوم ہوا کہ وہ خاص تاشقند کے باشندہ ہیں۔ لکھنے پڑھنے کی بات اور ہوتی ہے مگر ملکی اور غیر ملکی کا سارا بھید گفتگو اور لہجہ سے کھل جاتا ہے۔ بخشی غلام محمد اور ڈی پی دھر وہ دو کشمیری تھے جو اردو اس طرح بولتے تھے جیسے ان کی مادری زبان اردو ہو اور مجھ کو زندگی میں یہ اشرف صاحب تیسرے شخص ملے جو اردو کو مادری زبان کی طرح بولتے تھے وہ اردو ادب پر بھی اچھی نظر رکھتے ہیں اور انھوں نے ازبکستان کے ایک قومی شاعر رسول حمزہ توف کے کلام کے انتخاب کا اردو ترجمہ مجھ کو پیش کیا۔ یہ منظوم ترجمہ منظر سلیم نے کیا تھا۔ جب شرف الدین صاحب نے میری شاعری کے متعلق گفتگو شروع کی اور اشعار سنانے کی فرمائش کی تو میں نے اپنے تازہ ترین مجموعہ شب چراغ کی ایک جلد ان کو پیش کر دی۔ ابھی شرف الدین صاحب سے باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ تقریباً ۱۱ بجے اداکوف اولیگ ازبک ریڈیو کے ایڈیٹر ان چیف اپنے ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ کمرہ میں تشریف لائے اور سوویت روس کے متعلق تاثرات ریکارڈ کروانے کی درخواست کی۔ چنانچہ انٹرویو کی شکل میں یہ ریکارڈنگ ہوئی اور انٹرویو کرنے والے شرف الدین تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک یہ انٹرویو جاری رہا، اس کے بعد اولیگ صاحب نے نظم کی فرمائش کی اور میں نے ان کی یہ بھی فرمائش پوری کر دی۔ اولیگ صاحب بے حد ممنون اور متشکر رخصت ہوئے۔ شرف الدین صاحب کے ہمراہ ان کے ایک دوست بھی آئے تھے، جن کا نام بختیار تھا۔ ان کو ہندوستانی فلموں اور ان کے گانوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ یہ گانے تاشقند ریڈیو سے نشر بھی کیا کرتے ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ وہ گذشتہ ۱۵ سال سے مستقل ہندوستانی فلمیں دیکھ رہے ہیں اور ابھی تک انھوں نے کوئی ہندوستانی فلم چھوڑی نہیں اور اکثر فلموں کو وہ کئی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ ان کو اردو زبان اور ہندوستانی فلموں سے اتنی دلچسپی ہے کہ فلموں کے چند مکالمے تک یاد ہیں۔ اب یہ حضرات رخصت ہو چکے تھے۔ گینڈمی، بیانی اور میں ناشتہ کر کے تاشقند کی سیر پر نکل گئے۔

۱۹۶۶ء میں ازبکستان میں شدید زلزلہ آیا تھا اور پورا شہر کا شہر مسمار ہو گیا تھا مگر سوویت یونین کی مالی اور ٹکنیکی امداد اور ازبک محنت کشوں اور معماروں نے ازبکستان کے شہروں کو از سر نو جس شاندار نقشہ پر تیار کیا ہے اس پر طبیعت وجد کرتی ہے ابھی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے مگر نئے شہر کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاشقند مستقبل قریب میں کتنا عظیم شہر ہو جائے گا۔ قدیم شہر کا ایک مختصر گوشہ ابھی قائم ہے جس سے سوویت یونین کی مساعی قدیم شہر کی تعمیر میں قابل

صدآفریں ہیں۔

ازبکستان سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کا ایک نیم نخلستانی علاقہ ہے جو ہر طرف ریگستان سے گھرا ہوا ہے، مگر آمودریا کی لہریں اس سرزمین کو زرخیز اور سرسبز بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں کی خاص پیداوار کپاس ہے جو مصری کپاس سے ٹکر لیتی ہے۔ یہاں کا ریشم بھی بہت اچھا ہوتا ہے اور اطلس یہاں کی خاص صنعت ہے۔ قراقلی جنگلی بھیڑ کی کھال اب یہاں فارمنگ ہوتی ہے۔ جن کی ریشمی اون والی کھال کی ٹوپیاں اور گرم کوٹ بنتے ہیں جو قدر و قیمت کے اعتبار سے منک کوٹ کے برابر ہیں۔ پھلوں میں انگور اور خوبانی یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔

ازبکستان میں کپاس کی کھیتی شروع سے آخر تک مشینوں سے ہوتی ہے۔ ایک مشین پر ایک آدمی ہوتا ہے جو ۳۰ مزدوروں کے برابر کام کرتی ہے۔ یہاں کی صنعتیں اور معیشت سب بجلی پر چلتی ہیں۔

ازبکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ جو زار شاہی دور میں نہایت پسماندہ اور اچھوتوں کی زندگی گذارتے تھے۔ یہاں تعلیم کا بھی رواج بہت کم تھا۔ چند مخصوص دولتمند زمیندار کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ عیسائیوں نے یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی بھی صلب کر رکھی تھی مگر اکتوبر انقلاب کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو مذہبی، سماجی، اقتصادی تعلیمی اور ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ میں نے یہاں کی تعلیم یافتہ عورت مرد انجینیروں کو ریلگے کے ریل گاڑی کے کارخانوں میں کام کرتے دیکھا تھا۔ عظیم اکتوبر انقلاب نے ازبکستان کی معیشت اور سماجی نظام میں جو انقلابات پیدا کر دیے ہیں ان کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ بہت اختصار سے لکھا جائے تو بھی چند باتوں کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً انقلاب سے پہلے یہاں کی عورتوں کو کوئی سماجی یا سیاسی حق حاصل نہ تھا مگر اب ان کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ انھوں نے پردہ یکدم ترک کر دیا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بھی وہ مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں۔ اس وقت ۴۰۰ سے زیادہ عورتیں سائنس، ٹکنولوجی اور ڈاکٹری کی ماہر ہیں۔ اس وقت یہاں ۵۰۰۰ عورتیں انجینیر اور ۳۰۰۰ سے زیادہ ماہرین مویشیات اور زراعت ہیں۔

یہاں ۲۰،۰۰۰ مرد ڈاکٹر ہیں۔ دو یونیورسٹیاں اور ۲۵ اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں۔ یہاں کی سائنسی اکاڈمی میں ۱۲۰ Research Institutes ہیں۔ ایک اٹمی ری ایکٹر بھی ہے۔ پانچ ہزار سے زائد کتب خانے ہیں۔ علوم مشرقیات انسٹی ٹیوٹ تاشقند میں لاتعداد مخطوطات کا ذخیرہ ہے۔ ازبکستان میں اس وقت ۲۰۰ سے زیادہ اخبار نکلتے ہیں۔

زلزلہ کے بعد سوویت یونین کی مرکزی حکومت سے مالی اور تکنیکی امداد سے ازبکستان کے معماروں، کاریگروں،

اور محنت کشوں نے تاشقند کا جو شہر تعمیر کیا ہے، اس کے حسن و رنگا رنگی نے شہر کو قدیم و جدید طرز تعمیر کا ایک نمونہ بنا دیا ہے کہ دیکھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ کس کس عمارت کی تعریف کی جائے۔ لینن میوزیم، تھیٹر چوک، لینن چوک، ہوٹل ازبکستان، آرٹ سیلون، کھیل کود کا محل، نیلا گنبد نامے چارخانہ اور ان سب نئی تعمیرات کے درمیان قدیم عمارت مدرسہ گلدانش کچھ عجیب بہار دکھلاتا ہے۔ قریب شام منظر سلیم کے یہاں لے جانے کے لیے وِنے تسکلا اور ماتھر آگئے اور میں ان کے ساتھ ہولیا۔ ہوٹل ازبکستان کے لان اور ٹریسز سے ہوتے ہوئے سڑک پار کر کے ہم لوگ زیر زمین میٹرو پہنچ گئے۔ اور ٹرین پکڑ کے تقریباً دس پندرہ منٹ میں منظر سلیم کے فلیٹ میں تھے۔ منظر سلیم کی مسّرت، محبت اور خلوص کا قلمبند کرنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر نے ان کو چھڑی کے سہارے چلنے کی تاکید کی ہے مگر وہ مجھ کو دیکھ کر اپنی چھڑی بھول گئے اور کرسی سے اٹھ کر اور تیز تیز چل کے مجھ سے لپٹ گئے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو تقریباً پانچ برس کے بعد دیکھا تھا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ہم لوگ کھانے کی میز پر گئے۔ میں کم خور ہوں مگر کھانا اتنا لذیذ اور انواع واقسام کا تھا کہ میں نے پیٹ سے اوپر کھایا۔ یہ سب کھانا منظر کی بیٹی نے پکایا تھا جو اس سال ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر کے ہندوستان واپس چلی جانیوالی تھی۔ میرے وہاں پہنچنے پر مسز ماتھر بھی آگئیں جو ہر اعتبار سے دہلی کی جدید و قدیم کی امتزاجی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ کھانے سے فراغت کر کے ہم لوگ نشست گاہ میں پھر آگئے اور پائپ و سگریٹ کے کشوں پر دیر تک کچھ حبیب مرحوم کی اچانک اور قبل از وقت موت پر گفتگو اور کچھ Programe کی سرگرمیوں پر اور کچھ سوویت یونین کی محیر العقول ثقافتی، صنعتی اور اقتصادی ترقی اور ہند روس دوستی کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد شعر و شاعری کا دور آیا۔ منظر سلیم نے دو تین غزلیں سنائیں جو بہت ہی اچھی تھیں کہ یکایک تسکلا جی نے یاد دہانی کی کہ بارہ بجنے کو ہے میٹرو بند ہو جائے گی اس لیے ہم لوگ ملاقات کی تشنگی کے احساس کے ساتھ رخصت ہوئے اور تسکلا جی اور ماتھر صاحب ہم کو ہوٹل میں ہمارے کمرہ تک پہنچا کر واپس گئے۔

یہاں کے قیام میں ایک دن ایسا ہوا کہ جب صبح کے وقت میں ہوٹل ازبکستان کے کتابوں کے اسٹور میں کتابیں خرید رہا تھا تو قیمت ادا کرنے کے وقت معلوم ہوا کہ پتلون کی جیب سے میرا پرس غائب ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں آدمی اپنے تمام جیبوں کو دیکھ ڈالتا ہے۔ جب پرس کسی جیب سے نہ نکلا تو میں اپنے کمرہ پر گیا اور سوٹ کیس، بستر، تکیہ اور سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا مگر پرس نہ ملا۔ تب میں نے اپنی پریشانی گیندی سے بیان کی۔ اس نے کہا کہ "اگر آپ کا پرس کسی کو مل گیا ہے تو وہ آپ کو ضرور واپس ملے گا۔ اور اگر کسی ایسی جگہ دب گیا ہے جہاں سے وہ نظر نہیں آسکتا تو شاید نہ ملے۔" اس کے بعد ہم لوگوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ کل شام سے رات گئے تک ہم لوگ جہاں جہاں گئے ہیں وہاں وہاں

چل کے دریافت کریں۔ اور یہ تلاش اُلٹے شروع کیجائے یعنی جس ریستراں میں ہم لوگوں نے رات کا کھانا کھایا تھا پہلے وہاں چلیں۔ وہاں پہنچے تو ہیڈ ویٹرس نے دریافت کیا کہ "آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ ناشتہ؟" مگر مجھ سے زیادہ میرے ترجمان پر دہشت طاری تھی۔ اس نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں کہا "نہیں"۔ تب ہیڈ ویٹرس نے روسی زبان میں پوچھا "کیوں کیا بات ہے۔ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کچھ کھو گیا ہے؟" تو گینڈی نے جواب دیا "ہاں۔ کل شب میں ہم نے یہاں کھانا کھایا تھا۔ یہاں یا کہیں اور ہمارا پرس جیب سے نکل گیا۔ اسی کو تلاش کرنے نکلے ہیں"۔ تب وہ مسکرائی اور اپنی میز کی دراز میں سے کوئی چیز نکالی اور اس کے ہاتھ میں میرا پیارا رفیق پرس تھا جو اس وقت اپنی حیثیت سے دس گونہ زیادہ قیمتی اور حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بتلایا کہ یہ پرس کل شب میں صفائی کے وقت کسی میز کے نیچے ایک ویٹرس کو ملا تھا۔ ہیڈ ویٹرس نے بغیر یہ تصدیق کئے ہوئے کہ اس میں کیا کیا ہے اور کتنی رقم ہے گینڈی کے حوالہ کردیا۔

روس میں ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ بھولے بسرے یا پڑے ہوئے مال کو خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو کوئی اپنے تصرف میں نہیں لاتا۔ بلکہ کسی ذمہ دار شخص کے حوالہ کردیتا ہے اس خوف سے نہیں کہ پتہ چلنے پر اس کی سزا ہو جائے گی بلکہ اس لیے کہ وہ آسودہ حال اور روشن ضمیر ہے۔

تاشقند کی خوب سیر کرنے کے بعد ہم لوگ اُڑ کر سمرقند پہنچے۔ ان دنوں وہاں بو علی سینا کی ہزارویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ قدم قدم پر ان کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جھنڈیوں اور قمقموں سے شہر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ دو دن میں ہم لوگوں نے وہاں کی قابل ذکر نئی عمارتوں، زیر مرمت قدیم مدرسوں اور سیرگاہوں کو دیکھ ڈالا۔ تیمور لنگ کے پوتے الغ بیگ کی (Observatory) رصدگاہ بھی دیکھی۔ وہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا مفکر، ریاضیات کا ماہر اور (Astronomy) فلکیات کا عالم تھا۔

روسی سوویت جمہوریہ رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی ریپبلک ہے جس کے بعد جنوب مشرقی ریپبلکوں کا نمبر آتا ہے، جن میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت ہے جو قومی آبادی کے تناسب سے دوسرے نمبر پر آتی ہے۔ ان کی مذہبی اور ثقافتی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کرتا بلکہ روسی قوم بر وقت ضرورت دامے درمے قدمے سخنے ان کی امداد کرتی رہتی ہے۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے متواتر سخت زلزلوں سے تباہ شدہ تاشقند اور سمرقند کی قدیم مساجد مدرسوں اور عمارتوں کی مرمت جن پر کروڑہا روبل اور سیروں سونا خرچ ہو رہا ہے ایک مدت سے جاری رہی۔ ان کے ملحق بڑے بڑے جدید شہروں کو تعمیر اور آباد اور لاتعداد حسین طرز کی عمارتوں، پارکوں اور باغات سے مزین کیا گیا ہے۔ اب یہ دونوں قدیم شہر ریگستان نہیں چمن زار معلوم ہوتے ہیں اور دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہونے کے مستحق بن گئے ہیں۔

عظیم ازبیک شاعر نوائی اور عظیم مفکر بو علی سینا کو روس میں قومی مرتبے حاصل ہیں۔ ہم نے تاشقند کی ایک مسجد کو روزہ دار نمازیوں سے بھرا دیکھا۔ ہم نے وہاں کے مفتی اعظم سے ملاقات کی جو مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی آزادی اور روسیوں کے برادرانہ کردار کے معترف تھے۔ ہم نے ان کا مذہبی مدرسہ دیکھا اور مذہبی کتب خانہ بھی جو ہزاروں کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے۔ ماسکو میں بھی مسجدیں ہیں جن میں لاتعداد مسلمان نمازیں پڑھنے آتے ہیں۔ تاشقند میں اردو ادب سے بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ روسی اور ازبیک کتابوں کا ترجمہ اردو میں اور اردو کتابوں کا ترجمہ ازبیک اور روسی زبانوں میں بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ وہاں سے "سوویت ازبکستان" نام کا اردو رسالہ غیر ملکوں اور ثقافتی تعلقات کی ازبیک انجمن بڑی پابندی سے نکال رہی ہے جس کے نائب سربراہ صورت میر قاسمان اور سرگرم کارکن مرزا شرف الدین ہیں۔ یہ رسالہ میرے پاس ڈاک سے آتا رہتا ہے۔ اس انجمن نے مجھ کو ازبیک برادری میں شامل کرنے کی رسم میں وہاں کی خاص قسم کی چوگوشیا کامدار ٹوپی پہنائی اور ازبیک سوشلسٹ انقلاب کی ایک نظم دکھائی۔ وقت کی تنگی کے سبب سے ازبیک شاعر حمزہ توف سے ملاقات نہ ہو سکی۔

سمرقند کی سیر کرنے کے بعد ہم لوگ روسی ائیر فلائٹ سے ماسکو واپس گئے اور اسی یوکرین ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس قیام ماسکو میں ہم نے پانچ مقامات خاص طور پر دیکھے۔ پہلے لینن کا مقبرہ اندر جا کر دیکھا۔ داخل ہوتے والے دروازہ کے دائیں بائیں سنتریوں کے دو مجسمے دیکھے۔ گینڈی سے معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ مجسمے نہیں تھے بلکہ پہرہ کے دو فوجی تھے جو اٹینشن رہ کر اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ دست و پا اور چشم و ابرو اس قدر ساکت تھے کہ وہ مجسمے معلوم ہوتے تھے۔ جب ہم لوگ مقبرے کے مرکزی ہال میں پہنچے تو اسی طرح کے چار دوسرے سنتریوں کے مجسموں کی نگرانی میں ایک اونچی مسہری پر اپنے مخصوص لباس میں لینن کو محو خواب پایا اور ان کی امتیازی ٹوپی بغل میں رکھی ہوئی تھی۔ دیکھنے کے بعد کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ لینن کا یہ جسد خاکی بے جان ہے۔ زندگی کی وہی شان وہی نرمی اور وہی فطری ذہانت ہمارے سامنے تھی۔ جس کے آگے نظر احترام جھک ہی جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم لوگوں نے شہر کریملن کی خوب سیر کی۔ لینن کی قیام گاہ دیکھی، دفتری کمرہ، خوابگاہ جس میں ایک چھوٹا سا لوہے کا پلنگ تھا۔ مطالعہ کا کمرہ۔ ان کی ہمشیر کا میوزک روم، کرملن ٹاور مع اس کے سنہرے ستارے کے جو شب میں میلوں سے دکھائی دیتا ہے۔ سپریم سوویت کی نشست گاہ، باغات، پارکس، قدیم توپیں اور مجسمے۔ کریملن کو مپلکس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے پوری ایک کتاب چاہیے اور دیکھنے کے لیے کئی ہفتے۔

ماسکو کے قلب شہر میں اوک اور ٹیک کے پارک نما کئی جنگل دیکھے جن کو وہاں (Lungs of the city)

شہر کا یہ بکھیڑا کہا جاتا ہے۔ شہیدان وطن کی یاد میں ایسی شعلہ گاہیں دیکھیں جو کبھی نہیں بجھتیں۔

روس میں لیو ٹالسٹائے کی قبر اس کا مکان اور اس کا گاؤں "پولیانا" دیکھنے کی تمنا بھی پوری ہوئی۔ ماسکو کے مضافات میں تقریباً دو سو کلومیٹر پر پولیانا گاؤں کیا ایک بہت ہی بڑا جنگل نما پارک ہے جس میں ناشپاتی اور سیبوں کے باغات ہیں۔ قدرتی چشموں کی نہریں ہیں۔ سبزہ ہے لان ہے اور اس کے عین وسط میں ٹالسٹائے کے مکانات ہیں۔ اس کا بہت بڑا خاندان تھا۔ اس کے خاص مکان میں (Armoury) اسلحہ خانہ دیکھا۔ اس کا وہ کمرہ دیکھا جس میں ایک میز پر بیٹھ کر اس نے اپنا عظیم ناول "وار اینڈ پیس" لکھا تھا۔ اس کی وصیت تھی کہ مرنے کے بعد اس کی ساری جائداد عوام کی ملکیت میں دیدی جائے اور اس کی قبر کچی بنے۔ چنانچہ گھنے درختوں کے سائے میں ایک چشمے کے کنارے اس کی کچی قبر بھی دیکھی جو سیروں گلاب کے تازہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہم نے بھی اس پر سرخ گلاب چڑھائے۔ معلوم ہوا کہ سب گلاب شب میں قبر سے اس کا محافظ جھاڑ کر نہر میں ڈال دیتا ہے اور دوسرے دن صبح سے اس کی قبر کے زائرین اس پر تازہ گلاب کے پھول پھر ڈالنا شروع کر دیتے ہیں جو دوپہر تک قبر کو ڈھانک لیتے ہیں۔ اس جگہ کو دیکھ کر دل کو وہ سکون ملا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کی قبر کے برابر تھوڑی دیر لیٹ کر سو رہیں مگر قبر کے گرد ٹالسٹائے کے انبوہ عاشقاں کو دیکھ کر جرأت نہ ہوئی۔ شام تک ہم لوگ عجیب جذبۂ احترام کے ساتھ ماسکو واپس آ گئے۔ تیسرے دن ماسکو سے تقریباً سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا ڈیری فارم دیکھنے گئے جہاں کی اسپ تالت گائیں سو لیٹر تک روزانہ دودھ دیتی تھیں۔ وہ فارم کیا تھا ہزار ہا ہیکٹر کے جنگل، پارک اور چراگاہوں پر مشتمل ایک چھوٹا موٹا دیہاتی شہر تھا۔ وہاں مجھ کو ایک سنک سوار ہوئی کہ فارم کی اسٹاف کالونی میں تنہا جا کر یہ دیکھوں کہ اس میں رہنے والے کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم لوگ اس وقت فارم کے اس دو منزلہ مکان میں بیٹھے ہوئے تھے جس میں اپنی روپوشی کے زمانہ میں لینن کبھی کبھی خفیہ طور پر ٹھہرا کرتے تھے۔ پیشاب کرنے کے بہانے میں وہاں سے اٹھا اور نظروں سے چھپتا ہوا کالونی کی جانب چلا گیا۔ دو تین مکانوں کو چھوڑ کر ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ گیلری میں بہت اچھا اونی قالین بچھا ہوا تھا۔ اور اندر گیا تو دیکھا کہ ایک بکسم ٹائپ کی عورت باورچی خانہ میں گیس کے چولہے پر کچھ پکا رہی ہے۔ اور اندر گیا تو دیکھا کہ تین چار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بہت صاف ستھرے رنگین کپڑے پہنے T.V. دیکھ رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم خالی تھا میں بھی جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند ہی ثانیہ میں وہی بکسم عورت نیپکن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرہ میں آئی اور روسی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ میں ایک ہندوستانی ہوں۔ نہرو کے ملک سے آیا ہوں جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً واپس جا کر میرے لیے ایک پیالی کافی اور چند بسکٹ لے آئی۔ میں نے پھر اس سے کہا کہ میں روس کا Tour کر رہا ہوں، تو وہ واپس جا کر اپنے خاندان کے لڑکے لڑکیوں کو بلا لائی جو T.V. دیکھ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا لڑکا تھوڑی انگریزی بول لیتا تھا۔ اس نے بتلایا کہ

یہ میری بیوہ ماں ہے جو ڈیری میں دودھ دوہنے کا کام کرتی ہے اور یہ سب میرے بھائی بہن ہیں جن میں کے کچھ یہاں اور کچھ ماسکو کے کالجوں میں ڈاکٹری اور انجنیرنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ بابائی اور گینڈی وہاں ہانپتے کانپتے پہنچ گئے اور مجھ کو خیریت سے دیکھ کر مطمئن ہوئے۔ گینڈی نے از سر نو روسی زبان میں ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ جب گھر کی مالکہ ان کی بھی کافی اور بسکٹ سے تواضع کر چکی تو ہم لوگ ان سے رخصت ہوئے۔ سب نے بیک آواز "داس ودانیا" کہا اور ہم لوگ کار میں بیٹھ کر ماسکو کے لیے روانہ ہو گئے۔

ماسکو پہنچ کر بابائی خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے کہ دوسرے دن ان کو بمبئی واپس جانا تھا اور میں اپنے میزبان خصوصی کو لندا سے رخصت ہو کر تقی حیدر کے گھر پہنچ گیا۔ تقی حیدر کی دلہن لکھنؤ کے ایک اچھے خاندان کی کشمیری پنڈت لڑکی ہے۔ پورے ڈیڑھ ہفتہ کے بعد اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا ہندوستانی کھانا کھایا تو لطف آ گیا۔ روس کے دودھ، مکھن، دہی، پنیر، مرغ اور مچھلی کا کوئی جواب نہیں البتہ چوں کہ پورک اور بیف سے جو وہاں کی خاص غذا ہے، پرہیز تھا۔ اس لیے کھانوں میں احتیاط اور انتخاب سے کام لینا پڑتا تھا۔ تقی حیدر کی دلہن بڑی ہی نیک اور عقلمند لڑکی ہے۔ ان کا فلیٹ ماسکو میں لاکھوں اقامتی فلیٹوں جیسا ایک فلیٹ ہے۔ اس میں سرد گرم پانی، بجلی، T.V.، ٹیلیفون، ڈرائنگ روم، سلیپنگ روم، باتھ روم، بجلی کے چولہے اور سنٹرل ہیٹنگ ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بس، ٹریم بس، ٹیکسی اور زیر زمین میٹرو ٹرینوں سے ماسکو کو تفصیل سے دیکھا۔ ایک دن غلام السیدین صاحب کی نواسی شاہدہ کے یہاں جو ریڈیو ماسکو میں کام کرتی ہیں خوب جشن رہا۔ دعوت کھائی اور خوب شعر و شاعری اور بحثیں رہیں۔

اسی زمانہ میں ڈاکٹر زیٹیا حماد ر کالاشنکر سے ملاقات ہوئی جو ماسکو کے سرکاری مہمان خانہ میں مقیم تھے۔ یہ لوگ وہاں ہم سے اور ہم ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ "حیات" کے ایڈیٹر شمیم فیضی سے بھی ملاقات تقی حیدر کے فلیٹ پر ہوئی تھی۔

جو کچھ میں نے روس میں دیکھا اس کا ذکر نامکمل رہے گا اگر ماسکو کی زیر زمین ریلوے کی قدرے تفصیل بیان نہ کروں۔ میٹرو جس کو انگلستان میں "ٹیوب" کہتے ہیں، روس کے گیارہ شہروں میں چل رہی ہے۔ جن میں "لینن ماسکو میٹرو لائن" اپنی مجموعی طوالت، خوبصورتی، پابندی اوقات، تیز رفتاری، حسین اور آرام دہ ڈبوں، خودکار سیڑھیوں اور پانچ کوپک برائے نام کرایہ کے لیے دنیا کی سب سے اچھی زمین دوز ریل مانی گئی ہے۔ کسی دو ٹرینوں کے درمیان اسّی سیکنڈ سے زیادہ وقفہ نہیں ہوتا۔ پورے ماسکو شہر کے نیچے بچھی ہوئی ریل کے جال کی مجموعی طوالت ڈھائی سو ۲۵۰ کیلومیٹر ہے جس میں روزانہ پچاس سے ساٹھ لاکھ تک مسافر سفر کرتے ہیں۔ اس کی پہنچ شہر کے ہر محلہ اور گوشہ تک ہے۔ یہ میٹرو ریل

دو مقامات پر دریائے ماسکو کے نیچے سے گذرتی ہے۔ اس کے ایک سو پندرہ[115] اسٹیشن ہیں اور ہر اسٹیشن آئینہ کی طرح صاف شفاف چمکدار اور خوبصورت ہے جن میں تیس چالیس توانائی سجاوٹ' نفاست جھاڑ فانوس' دیوار پینٹنگز مجسموں اور رنگینیوں سے اس طرح آراستہ و پیراستہ ہیں کہ شاہی محل معلوم ہوتے ہیں۔ اُن ہاتھوں کو بوسہ دینے کو دل چاہتا ہے جو سطح زمین پر نازیوں سے زندگی اور موت کی جنگ کرتے ہوئے زیر زمین میٹرو کی تکمیل میں مصروف رہے۔ بغیر سطح زمین پر آئے ہوئے بار بار کوپک میں دن بھر سفر کیا جاسکتا ہے۔ لینن گراڈ اور تاشقند کی میٹرو بھی بہت خوبصورت ہیں۔

(Replay's) ریپلے کا (Believe it or not) یقین کرو یا نہ کرو اپنے حقائق کے لیے بہت مشہور رہے۔ مگر روس کا "یقین کرو یا نہ کرو" کم از کم ہم ہندوستانیوں کے لیے محیر العقول ہے۔ مثلاً ہم نے وہاں جن چیزوں یا باتوں کو ناپید یا یادہ پایا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) ہم نے وہاں کسی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔ (۲) ہم نے وہاں کسی کو پھٹے پرانے کپڑوں میں یا ننگا نہیں دیکھا۔ (۳) ہم نے کسی ساٹھ برس کے کم عمر والے یا والی کو بیکار نہیں دیکھا۔ (۴) ہم نے وہاں کسی کو اسپتال کے باہر بیمار نہیں دیکھا۔ (۵) ہم نے وہاں کسی کو فٹ پاتھ پر یا عمارتوں کے خالی برآمدوں میں سوتا یا قیام پذیر ہوتا نہیں دیکھا۔ (۶) ہم نے وہاں کسی کو شاہراہوں یا سڑکوں پر پیدل چلتے نہیں دیکھا۔ (وہاں پیدل چلنے والے فٹ پاتھ یا سڑک پار کرنے والے پلوں یا سرنگوں کو استعمال کرتے ہیں)۔ (۷) ہم نے وہاں کسی کو جاہل ان پڑھ یا پھوہڑ نہیں پایا۔ (۸) ہم نے وہاں کسی کو مار پیٹ یا جھگڑا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (۹) ہم نے وہاں غنڈا گردی یا داداگیری قسم کی کوئی حرکت نہیں دیکھی۔ (۱۰) ہم نے وہاں چوراہوں پر ٹریفک پولیس نہیں دیکھی۔ (۱۱) ہم نے وہاں روڈ ایکسیڈنٹ یا ٹریفک جام ہوتے نہیں دیکھا۔ (۱۲) ہم نے وہاں نوجوانوں اور طلبا کو تہذیب یا اخلاق یا قانون سے گرا ہوا کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ (۱۳) ہم نے وہاں لڑکیوں یا عورتوں سے راہ چلتے چھیڑ چھاڑ کا کوئی واقعہ نہیں دیکھا۔ (۱۴) ہم نے بیسواگری یا جنسی بے راہ روی کا کوئی مظاہرہ نہ دیکھا نہ سنا۔ (۱۵) وہاں کے باشندوں میں لباس یا افعال کی عریانی یا فحاشی معدوم ہے۔ (۱۶) وہاں کتابوں کی دوکانوں پر عریانی یا فحاشی کا لٹریچر نہیں ملتا۔ (۱۷) ہم نے وہاں فرقہ دارانہ یا رنگ و نسل پر مبنی فسادات ہوتے دیکھا نہ سنا۔ (۱۸) ہم نے وہاں بسوں میں کنڈکٹر نہیں دیکھے۔ چار کوپک ڈالنے سے ٹکٹ مشین سے باہر آجاتا ہے۔ (۱۹) ہم نے وہاں ریلوے اسٹیشنوں پر بکنگ کلرک، گاڑیوں میں ٹکٹ چیکر نہیں دیکھے اور نہ ہی کسی کو بغیر ٹکٹ سفر کرتے دیکھا۔ (۲۰) ہم نے وہاں کی سڑکوں، بازاروں، گلیوں، پارکوں یا کھیتوں میں کتے، گدھے، مویشی یا بیمار جانوروں کو آزادانہ چرتے پھرتے نہیں دیکھا۔ (۲۱) ہم نے وہاں کسی جگہ

کوئی گندگی نہیں پائی علاوہ ان جگہوں کے جہاں کھدائی، تعمیر یا مرمت کا کام ہو رہا ہے۔ (۲۲) وہاں جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، رشوت لینا دینا، منافع خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی ناپید ہے۔ (۲۳) علاوہ شراب کے وہاں بیس سال سے بنیادی اور ضروری اشیاء زندگی کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ (۲۴) وہاں اپنے حال اور مستقبل سے کوئی فرد غیر مطمئن نہیں۔ (۲۵) وہاں نوکریوں یا کاروباروں یا تعلقات میں مذہب، رنگ و نسل یا لسانی بھید بھاؤ نہیں دیکھا۔ وہاں ذاتی صلاحیت کے علاوہ کسی اور حیثیت کو فوقیت حاصل نہیں۔

ہم نے وہاں کی معیشت، زندگی، شخصیت اور کردار کے مثبت رُخ بھی دیکھے:-

(۱) وہاں کے ہر مرد و عورت کو حد سے زیادہ تندرست، خوش پوشاک اور آسودہ حال پایا۔ (۲) وہاں تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ (۳) حفظانِ صحت اور علاج کے ذرائع مفت ہیں۔ (۴) نوکری کے بعد اور بڑھاپے کی پنشن ہر فرد کے لیے لازمی ہے۔ (۵) وہاں ہر بالغ فرد کو اس کی صلاحیت کے اعتبار سے نوکری دینا حکومت کا فرض ہے۔ (۶) ہر فرد یا خاندان کو مکان دینا حکومت کا فرض۔ جس کے لیے حکومت کوشاں رہتی ہے۔ جن کو ابھی تک فلیٹس یا مکان نہیں مل سکے ہیں اُنکی تعداد اس وقت ۴۰ فیصد سے زیادہ نہیں اور ماسکو میں اس وقت تین سو سے زیادہ فلیٹس روزانہ الاٹ ہو رہے ہیں۔ (۷) روس کی معیشت اور خوشحالی کا اندازہ وہاں کے باشندوں کے بلند معیار زندگی، قابل رشک صحت مثالی اخلاقی کردار سے لگایا جا سکتا ہے۔ (۸) قوموں کی اپنی اپنی فطرت اور خصوصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کام کے وقت بیحد مشقت اور تندہی سے کام کرنے اور فرصت کے وقت آرام اور تفریح کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ ان کی محنت وہاں کی بے پناہ زرعی اور صنعتی ترقیوں سے ظاہر ہے اور آرام و تفریح کی طلب میں رقص، موسیقی، تھیٹر، سینما، اوپیرا، پارک، سمندری ساحل، کتب خانوں، عجائب خانوں، کھیل کود، دوڑ اور کسرت جیسے جیم، اسٹیڈیم، پکنک اور تیراکی میں وہ اپنا خالی وقت اور تعطیلوں میں گذارتے ہیں۔ بازاروں میں ان کی خریداری دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ (۹) وہاں اس وقت کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ آمدنی ۵۰ اور ۵۰۰ کا فرق رہ گیا ہے جو فرق زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں ختم ہو جائے گا۔ (۱۰) روسی ادیبوں اور فنکاروں کی انجمن اس وقت ۵۴ زبانوں میں سو سے زیادہ اخبار اور رسالے نکال رہی ہے۔ (۱۱) وہاں تیرہ لاکھ کاریں ہر سال تیار ہو رہی ہیں مگر خریدنے والوں کی باری بہت دیر میں آتی ہے۔ البتہ ٹرانسپورٹ کی اتنی کثرت اور سہولتیں ہیں کہ سب کا آرام سے کام چل رہا ہے۔ (۱۲) وہاں کا ہر باشندہ پورے آرام اور آسودگی سے خرچ کرنے کے بعد ۲۰ فیصد آمدنی کا حصّہ بہ آسانی پس انداز کر لیتا ہے۔ (۱۳) ماسکو میں کوئی سڑک پچاس میٹر سے کم چوڑی نہیں ہے اور ایک تو ڈیڑھ سو میٹر چوڑی ہے۔ (۱۴) روس میں ساڑھے تین لاکھ کتب خانے ہیں جن میں چالیس ارب کتابیں ہیں۔ (۱۵) روس میں

ڈیڑھ ہزار میوزیم ہیں، جن میں دو ارب عجائبات ہیں۔ (۱۶) روس میں اس وقت نو لاکھ ڈاکٹر ہیں۔ ساٹھ ہزار سے زیادہ اسپتال ہیں۔ تیس لاکھ سے زیادہ بستر ہیں۔ اور سینی ٹوریم اور پالی کلینک ان کے علاوہ ہیں۔ فون پر "03" رنگ کرنے سے ۵ منٹ کے اندر ڈاکٹر پہنچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس، دوا کی قیمت اور علاج کے اخراجات حکومت دیتی ہے۔ (۱۷) U.S.A. سے تین گنا زیادہ انجینئر ہر سال تعلیم حاصل کر کے نکل رہے ہیں۔ (۱۸) بتیس منزلہ ماسکو یونیورسٹی کی مرکزی عمارت کو اندر سے دیکھنے کیلئے ڈیڑھ سو کیلومیٹر چلنا پڑتا ہے۔ (۱۹) وہاں پچاس ہزار سے زیادہ غیر ملکی طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ (۲۰) وہاں کی آبادی ۲۷ کروڑ ہے اور ۷ کروڑ روسی پنشن لے رہے ہیں جن میں آدھی تنخواہ سے پوری تنخواہ والے تک ہیں۔ (۲۱) وہاں نو ہزار پانی کو اور دو ہزار ہوا کو گندے اور زہریلے مادوں سے صاف کرنے والے کارخانے کام کر رہے ہیں۔ (۲۲) روس میں عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر ہیں، بلکہ زچگی کے زمانہ میں عورتوں کے حقوق مردوں سے بڑھ جاتے ہیں۔ (۲۳) پندرہ سوویت جمہوریتوں کے بائیس لاکھ پارلیمانی ڈپٹیوں میں آدھی تعداد عورتوں کی ہے اور بائیس لاکھ سے کم ڈپٹی کیمونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ (۲۴) میں نے ماسکو میں بلوچی قوم کے لوگ بھی دیکھے۔ یہاں کے بلوچیوں سے بہت زیادہ قد آور عورتیں اور مرد ہوتے ہیں۔ نہایت اسمارٹ، نہایت خوبصورت تندرست اور آسودہ حال ہیں۔ بڑے رنگین لباس پہنتے ہیں۔ جو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ عورتوں کی لمبی لمبی چوٹیاں، گھٹنوں تک گھاگرہ، چہرہ کا زنانہ پرس کندھوں سے آویزاں، سر پر ریشمی اطلس کا رومال بندھا ہوا۔ بجائے جھوٹے عینک   کے ایک سے ایک قیمتی ضروری اشیاء خریدتے پھرتے ہیں۔ ان کو (Rehe- bilitate) آباد کاری کرنے میں روسی حکومت کو بڑی بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں مگر اب وہ سدھ گئے ہیں۔ سرکاری پختہ مکانوں میں رہتے ہیں۔ زراعت اور مشینوں میں کام کرتے ہیں۔ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر کے دوسرے روسیوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ بالکل روس کے ہائی لینڈرس معلوم ہوتے ہیں۔ (۲۵) روسی دانشور ہندوستانی ثقافت اور ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہندوستانی کلاسیکی ادب رامائن، مہابھارت اور شکنتلا وغیرہ کا روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے مشاہیر ادب کی تخلیقات کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ ماسکو کی اکاڈمی آف سائنس کی ڈاکٹر نتالیا پرگرینا نے غالب اور اقبال پر دو بسیط کتابیں لکھی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ہندوستانی ادب پر بڑے بڑے تحقیقی اور تنقیدی کام ہو رہے ہیں جن میں وہ لوگ سردار جعفری سے کافی مشورے لیتے رہتے ہیں۔ (۲۶) روس میں سب روسی کیمونسٹ نہیں ہیں اور نہ سب لامذہب۔ وہاں تقریباً ۱۲ قسم کے عیسائیوں کے فعال گرجے ہیں۔ سکھوں کے گردوارے اور ہندوؤں کے مندر ہیں۔ وہاں جنسی زندگی کی بالکل چھوٹ نہیں ہے۔ البتہ شادیاں لڑکے اور لڑکیوں کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ شادیاں اس وقت تک نہیں ہوتیں جب تک لڑکے لڑکیاں روزی سے نہ لگ جائیں اور براتیں چند دوستوں اور قریبی اعزہ

پر مشتمل ہوتی ہیں۔

روس پر میری طویل نظم "بیکال سے لڈوگا تک" کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

یہ انقلاب کا سرچشمہ جوئے آزادی — سجی سجائی ہوئی زندگی کی شہزادی
یہ سرزمین نگینوں کا اک نگینہ ہے — عروس دہر کہیں جس کو وہ حسینہ ہے
غلام قوموں کو آزادی کا سراغ دیا — مسافران شبِ تار کو چراغ دیا
جدید طرز ترقی جدید طرز حیات — نئی زمین نیا آسماں نئے حالات
تمہارا خامۂ تنقید روشنی کا منار — بہ سہولت تخلیق جنت فنکار
تمہارا جوہر دانش خلا کی باہوں میں — بدل رہا ہے مشینوں کو سیرگاہوں میں
تم ایک قوم جری ملک کی جوانی ہو — جمال قاف کے محبوبِ داستانی ہو
تمہاری طرز معیشت ہے انقلاب کی دین — چمک ہے چاند ستاروں میں آفتاب کی دین
ہم انقلاب سے پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں — ہماری یادوں کی ٹھوکر میں تخت و تاج بھی ہیں
اُس انقلاب کی ابتک دھمک ہے کانوں میں — اُس انقلاب کی ہے گونج کارخانوں میں
اُس انقلاب کی للکار ہے کسانوں میں — اُس انقلاب کا ہے ذکر آسمانوں میں
وہ انقلاب مہکتا ہے داستانوں میں — وہ انقلاب لہکتا ہے گلستانوں میں
وہ نرسری میں چہکتا ہے بلبلوں کی طرح — وہ ہسپتالوں میں ہنستا ہے نو گلوں کی طرح
وہ انقلاب سفر کر رہا ہے دنیا کا — ہے زیر غور کہیں اور ہے کہیں برپا
وہ درس زندگی دیتا ہے ابن آدم کو — وہ لالہ زار بنا دیتا ہے جہنّم کو
منم کہ بر سر ایں لالہ زار می رقصم — بہ فرط شوق بہ صوت ہزار می رقصم
ببیں کہ رقص مرا خود و لے تماشہ کنم — چوں پیش آئینۂ روئے یار می رقصم

مگر سوویت روس کا یہ ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر وہاں کے وہ مسائل نہ بیان کئے جائیں جن سے آج وہ عظیم ملک دوچار ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ روس میں مئے نوشی بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت جو نوجوان نسل سامنے آرہی ہے اُن میں وہ ضروری سیاسی تاریخی اور اقتصادی شعور نہیں ہے جو

ان کے بزرگوں میں ہے اور تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے زار شاہی کے زمانہ کی زندگی نہیں دیکھی ہے۔ وہ آزادی کی جدوجہد اور انقلاب کے سخت اور جان لیوا راستوں اور فاقہ کشی کے ادوار سے نہیں گذرے ہیں۔ انھوں نے انقلاب کے بعد زندگی کے اس دور میں قدم رکھا جس میں ترقی یافتہ معیشت کا چمن لہلہا رہا ہے اور ہر سمت آسودگی اور لطف ہی لطف ہے جن کے حصول میں انھوں نے کوئی صعوبت نہیں اٹھائی تھی۔ جیسے بغیر محنت کئے اولادوں کو ماں باپ کی دولت مل جاتی ہے۔ وہ دولتمند والدین کی اولادیں ہیں۔ پھل کھانے سے پہلے محنت اور مشقت کا ان کو کوئی تجربہ نہیں۔ وہ اپنے فرائض سے اتنے واقف نہیں جتنا اپنے حقوق سے قوم نئی نسل کی ان کمزوریوں کی طرف اپنی پوری توجہ دے رہی ہے۔ مفکروں، ڈاکٹروں، دانشوروں، ماہرین نفسیات، سماجی کارکنوں، ریڈیو، ٹی وی، جریدے اور وہاں کے نوجوانوں کی جماعتیں (مثلاً کاسومال)، یوتھ لیگ نے پوری طرح اپنی توجہ اور قوت نئی نسل میں ضروری بیداری اور شعور پیدا کرنے کی طرف مبذول کر دی ہے۔ نتیجہ میں یہ خرابیاں اور کمزوریاں بڑی سرعت سے زائل ہوتی جا رہی ہیں اور ملک نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا ہے

جب میں جولائی ۱۹۸۱ء کے اختتام پر وطن واپس آیا تو دہلی میں سوویت سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری گینڈی سیومن نے مجھ سے بات چیت اور سوالات کرنے کے لیے ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں صحافیوں نے روس کے متعلق مجھ سے مختلف سوالات کئے اور میں نے جوابات دیے۔ اس کانفرنس میں زیادہ تر اخباری نمائندوں کو روس سے دلچسپی تھی اور چند ایسے بھی تھے جو مجھ کو (Embarrass) چپقلش میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ "اپنے دورۂ روس سے کیا آپ یہ تاثر لیکر نہیں آئے ہیں کہ روس امریکہ کے مقابلہ میں نیوکلیائی جنگ سے ڈرتا ہے" مجھ کو قدرے غصہ آگیا مگر میں نے بہت ضبط سے کام لیکر جواب دیا کہ "روس نیوکلیائی جنگ سے ڈرتا نہیں ہے۔ وہ اپنی مدافعت اور جنگ میں امریکہ کو تباہ و برباد کر دینے کی پوری قوت اور صلاحیت رکھتا ہے، مگر وہ جنگ ہی نہیں چاہتا۔ دنیا میں مکمل امن چاہتا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کا اس کو تجربہ ہے۔ وہ جنگ سے نفرت کرتا ہے، ڈرتا نہیں۔ نفرت اس لیے کرتا ہے کہ وہ پوری دنیا کو تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ امریکہ کی سرزمین پر کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی ہے، اس لیے امریکہ ایک ناآزمودہ کار کی جرأت دکھا رہا ہے۔" سیومن میرے جوابات سے بیحد مسرور ہوئے اور چار کے بعد یہ پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔ روزنامہ پیٹریاٹ دہلی نے اس کانفرنس کو تصاویر کے ساتھ ایک پورے کالم میں ہائی لائٹ کیا تھا۔ جبکہ دوسرے قومی اور کانگریسی اخبارات نے اس کو چھ چھ سات سات سطور میں ٹال

دیا تھا۔ اور میں بخیریت دوسرے دن لال کوٹھی گجگاؤں پہنچ گیا۔ اور اواخر ۱۹۸۱ء تک اردو انگریزی میں سفر روس کے مختلف تاثرات وقتاً فوقتاً قلمبند کرتا اور ہندوستانی اور روسی جریدوں میں بھیجتا رہا۔

Annexure to the 11th Chapter

News Names

(1) RIGA

Riga, the resting haven of my restless drifting Soul.
Riga, the city often I remember, on Soviet Unions
Rosy Cheeks a gypsy mole.
None the less I rembember the hospitable hands
That ritually brewed for me green Lipton tea fragrant
of my land
Riga, O Riga, the gem on the ring of Jurmala golden Sand,
I remember the marine Stadium
of fishing boats alert for assault on natures aquarium
I remember the mother pearl like lainty palms that held for me
the Radio Banner,
The autumn-pink-maple-leaf like fingers that gave me
muses gifts of refresing Candour.

Riga, I remember thine lush green parks
The twittering larks
Inclody replete with buoyancy
Sun down river moving with unruffled ecstasy.
A mosaic of colourful culture
A balmy cocktail of high spirited Nector.
Riga, thou art nostalgic, welcoming, homely and
natures own baby.
Riga, name thine is 'Haunting memory'.

(2) LENINGARD

Leningard, the cradle of the First Socialist Revolution
Leningard, the gateway of Lenins like mission;
mighty Leningard, great and glorius
Like Red Star of Kremlin,
Leningard, heroic and victorious
In annals of war against Berlin:
Nine hundred days and nights of hunger, cold, bullets and bombs
Pestilence, petience, agony, death and mass-tombs
In defence of the Home land
Repelling ruthless Nazi band,
Returning to youthful beauty like the again "Zulekha"
after the victory finals,
Dancing on the tune of greater industrial music
Greater monumental charms and greater laurel.
Leningard the city of countless martyer's Soule's
immortal flame.
"Leningard" is thine most appropriate name
After the name of the man of endless fame.

(3) TASHKENT

There is none better key to prosperity than adaptibility:
This secret has gone home with the landable character
of Uzbekistan and Tashkent city.
The Simoom of the arid deserts, that were, houls no more.
Industrial ensembles, parks, canals, ever dancing fountains
and cotton fields galore.
Literature, culture, art and architectural amalgams
of ancient and modern ultra concepts growing fast.
An emancipated nation
Marching and dancing unto the wholesome civilisation
of symphonic automation.
City of gardens thou art indeed
Fulfilling the promise of contemporary need.
Scintilating Hotel Uzbekistan is an open book
Luxury oriental, emotionally integrated get up and look.
'Utlus', 'Qaraquli' and embroidered head gear
Keeping thine countenance pride high Sans fear.
Tashkent, thou art pleasingly cool like 'Naseem' during Summer
And warm like lovers heart in icy winter cold.
Tashkent I call thee "White Gold".

(4) MOSCOW

Moscow the heart, brain and nerve centre of all
That is Soviet Union:
Long, board, deep and tall,
The Ultimate reposing place of Lenin.
Look at the sculpurous guards of disciplined Valour,
Lend ears to the chimihg hands of Kremlinclock Tower,
Hats off to the Congress palace, the motive point of
the common man's power.
Moscow the city of seven Daughters.
Moscow the paradise of land and waters.
Moscow the symbol of all that beauteous and good
Moscow's industries are throbing pulse of mature Nation hood.
Moscow thou art breathtakingly wonderful, lusterful and ornate
Thou knoweth thine friends love and foes hate.
Moscow the custodian of world's destiny in peace and war.
Moscow is the tiniest name of U.S.S.R.
U.S.S.R the nomenclature of greater Moscow
Moscow thine only name this day is "Hope of Tomorrow".

••

بارہواں باب

کجگاؤں میں

۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک میں نے جم کے تخلیقی کام کیا۔ کثرت سے مشاعروں میں شرکت اور مطالعہ کرتا رہا۔ کافی تعداد میں غزلیں اور نظمیں کہیں جنہیں "سفر ناتمام" اور "غزل در غزل" اور "ہم بزدل ہیں" لکھ کر بیحد اطمینان ہوا کہ قابل ذکر و توجہ کوئی کام ہوا تو!

ہمارے خاندان میں بالعموم لڑکیوں کی شادی بیس برس کی عمر تک ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب میری پوتی عندلیب بنتِ دختر حشمت مجتبیٰ (شمّوں)، ۱۹ سال کی ہوئی تو میں نے اس کی نسبت ظفرالحسن زیدی پسر بندے حسن زیدی و ہاجرہ زیدی سے طے کی۔ ظفرالحسن کلینکل سائیکالوجسٹ میری اہلیہ کی سگی بہن کے نواسے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ یہ رشتہ ہر اعتبار سے متوازن اور مناسب تھا۔ میرا ایک دوسرا مقصد بھی حل ہوتا تھا۔ ہمارے اور ظفرالحسن کے خاندانوں کے درمیان مدتوں سے جو چشمک، ناچاقی، ذہنی خلیج اور آپسی جذباتی عدم تعاون چلا آرہا تھا اور اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا بھی مقصود تھا۔ اس بدنمائی کو دور کرنے کے لیے میں ہمیشہ کوشاں رہا۔ عزیز قریب ہوتے ہوئے بھی علاوہ چند بیبیوں اور لڑکیوں کے ظفرالحسن کے خاندان کی زیادہ بیبیاں اور لڑکیاں مجھ سے پردہ کرتی تھیں مگر میرے خیالات اور صلح و آشتی کے لیے میری پیش قدمی دیکھ کر ظفرالحسن کی ہمشیر بلقیس کی شادی میں ایک جشن کے طور پر سب عزیز خواتین میرے سامنے ہوئیں۔ میری بڑی خاطر مدارات ہوئی اور تصویریں کھینچیں۔ آپس کے تعلقات کی استواری کی یہ ابتدا تھی اور جب ۴ مارچ ۱۹۸۳ء کو عندلیب اور ظفرالحسن کی شادی ہو گئی تو مضبوط جذباتی تعلقات و یکجہتی پر مہر ثبت ہو گئی۔ اب طرفین میں ایک کی انگلی کٹتی ہے تو دوسری طرف کی دو آنکھوں سے خون برستا ہے۔ مسرت بالائے مسرت یہ کہ اب میں پرنانا بھی ہو گیا ہوں۔ ۷۶ برس کے عمر کے بزرگ کو پرنانا ہونا زیب بھی دیتا ہے۔ مگر میں ایک معنی میں بہت بدقسمت ہوں کہ میری کوئی اولاد یا اولاد کی اولاد یا اولاد کی اولاد کی اولاد میں میری ضعیفی کا سہارا بننے کے لیے میرے ساتھ نہیں رہتی۔ ان میں کا ہر ایک چاہتا ہے کہ میں خود ان سب کے ساتھ رہوں۔ مگر ان گھروں میں مستقل رہنا مجھ کو گوارہ نہیں جس میں بغیر محنت و مشقت کے ہر آرام میسّر ہو جائے۔ میری عمر میں آدمی بچوں سے بھی زیادہ متلون مزاج ہو جاتا ہے تو اس کا بوجھ بھی میں اپنی اولادوں اور اعزہ پر ڈالنا نہیں چاہتا۔ میری دلی تمنا یہ ہے کہ میرے بچے وقت نکال کر باری باری ایک ایک ہفتے یا مہینے میرے

ساتھ لال کوٹھی کجگاؤں میں رہی جو میرا سیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں میری کتابیں ہیں۔ یہاں میرے خطوط اور جرائد آتے ہیں۔ یہاں کا میرا پتہ دنیائے ادب میں سب کو معلوم ہے۔ یہاں میرے ہاتھ کے لگائے پھول اور پھلدار درخت ہیں۔ یہاں میری شہد کی مکھیاں ہیں۔ یہاں میرے دوست احباب اور دور دراز سے شعرا اور دانشور مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ میرے گاؤں اور شہر کے لوگ مجھ کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں۔ میرا احترام اور مجھ سے انتہاہ محبت کرتے ہیں۔ میں اس کو چھوڑ کر کہیں اور کیس طرح زندگی گذار سکتا ہوں۔ یہ کون آرہا ہے؟ جوہر بنارسی آرہے ہیں۔ یہ کون آرہا ہے؟ الہ آباد سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی آرہے ہیں۔ یہ کون آرہا ہے؟ الہ آباد کے رام جی رلئے آرہے ہیں۔ یہ کون آرہا ہے؟ پردیپ سوروپ آرہے ہیں۔ اور یہ کون لوگ آرہے ہیں؟ جونپور کے عبدالباری وکیل شاہ، ابے کمار، ہوش، شاعر جمالی، نثار، عالم غازی پوری، زدار آرٹسٹ، عشرت صدیقی، نفیس غازی پوری، سکسینہ صاحب، ڈاکٹر ورما، اوم پرکاش، کوپردھان اور بہت سے ہموطن دیہاتی لوگ اپنے اپنے مسائل کے ساتھ۔ اگر میں یہاں نہ رہوں گا تو ان کو کلیجے سے لگاکر کون تسکین دے گا۔

۲۱رجون ۱۹۸۲ء کو زیر قلعہ جھانسی میں رانی جھانسی کی یاد میں مشاعرہ اس لیے یاد ہے کہ اس میں ڈائس پر سے میرے اور نذیر بنارسی کے جوتے چوری ہوئے تھے۔ اور ماتھر افسر اطلاعات اور کنوینر مشاعرہ نے ہم دونوں کو مشاعرہ فنڈ سے نئے جوتے خرید وائے تھے اور عجب اتفاق کہ وہ جوتا ۱۴رمئی ۱۹۸۲ء کو کانپور کے مشاعرۂ یوم حسرت موہانی میں پھر چوری ہوگیا۔

۱۳رمارچ ۱۹۸۲ء کو یوم اقبال کا مشاعرہ ناگپور اس لیے یاد ہے کہ اس میں ثقلین حیدر نے پورے ڈیڑھ گھنٹے تقریر کی تھی۔

۳۰رمارچ ۱۹۸۲ء کو گورکھپور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا مشاعرہ اس لیے یاد ہے کہ وہاں انجمن کی دو شاخیں ہوگئی تھیں۔ ایک ہی شب میں ایک مشاعرہ کررہی تھی اور دوسری شام افسانہ منارہی تھی۔ ان دو شاخوں کے درمیان تحریر، تقریر، گفت وشنید اور خط وکتابت کے ذریعہ مصالحت کی میں نے بہت کوشش کی مگر کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا البتہ آپس کا تصادم ضرور بند ہوگیا ہے۔ شاعروں والی انجمن ہر سال مشاعرے کرتی رہی اور شام افسانہ بند ہے مگر مقامی نشستیں برابر ہوتی رہتی ہیں۔ بنارس میں ۲۳رمارچ ۱۹۸۲ء کا مشاعرہ اس لیے یاد ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی کل ہند کانگریس کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ اس دن بنارس میں اتنی تیز بارش ہوئی کہ مشاعرہ کا بنیا باغ میں وہ پنڈال جس میں ایک لاکھ سے زیادہ سامعین کے بیٹھنے کا اہتمام تھا بالکل شرابور ہوکر زمین پر آرہا اور مشاعرہ شہر سے دو دو میل کے فاصلے پر میونیسپل ہال میں ہوا جس میں باوجود بارش کے ایک ہزار سے زیادہ سامعین موجود تھے اور ملک کا قابل ذکر ہر ترقی پسند شاعر مثلاً نیاز حیدر، کیفی اعظمی، سردار جعفری، تاباں، نفیس غازیپوری، راہی کوٹھیادی، اور باقر زیدی شریک ہوئے تھے۔ اور سب نے اپنا تازہ کلام سنایا تھا۔ اس کانگریس میں کامریڈ سرجو پانڈے نے ہر کام کو بڑے معیاری ڈھنگ سے لیا تھا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آکر لاکھوں مندوبین نے

اس میں شرکت کی تھی اور جس میں بہت اہم فیصلے لیے گئے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء پر بھی جس میں زور دیا گیا تھا۔

۱۶ر اپریل ۱۹۸۲ر کو فیض آباد اگریکلچرل یونیورسٹی کے جشن تقسیم اسناد کے سلسلے میں ایک بہت شاندار اور کامیاب مشاعرہ میری صدارت میں ہوا تھا۔ اور مشاعرہ کے کنوینر خوش گو شاعر احسن رضوی تھے۔ یہ غلام حسین I.A.S. کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا اور اس مشاعرہ کو لکھنؤ T.V. نے ٹیلی کاسٹ بھی کیا تھا جس کو دیکھ کر جنگی سنگھ کپتان پولیس جونپور کو مجھ سے ملنے کا بڑا اشتیاق پیدا ہوا، اور حسن اتفاق کہ اس کے چند ہی مہینوں بعد اسے عباس پرنسپل پالیٹکنیک جونپور کے یہاں ایک دعوت میں ملاقات ہوئی۔ جنگی سنگھ خود بہت قابل اور پڑھے لکھے آدمی ہیں اور اسی قدر مشترک کی بنا پر ان سے میرے بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے اور جن کے تبادلہ پر مجھ کو بہت افسوس ہوا تھا۔ ان سے میں نے بہت اچھے اچھے سماجی کام بھی لئے تھے، جن کا ذکر آگے کے واقعات میں آئے گا۔ وہ جب کبھی سخت کاموں سے تھک جاتے تھے تو ذہنی سکون اور آرام کے لیے لال کوٹھی آجایا کرتے تھے۔

آج بقرعید کا دن تھا۔ پانچ بجے شام کو جنگی سنگھ میرے یہاں آئے اور نقاہت کی وجہ سے دھڑ سے آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ میں نے دریافت کیا "خیریت تو ہے۔ آپ کیوں اس قدر پریشان حال اور بے کیف معلوم ہو رہے ہیں"۔ اس سوال کا جواب سننے سے پہلے میں نے گھر میں آکر کافی اور کچھ کھانے کے لیے سالٹو بسکٹ اور سویاں وغیرہ باہر لانے کو کہا اور جلدی سے باہر لوٹ آیا۔ جنگی سنگھ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے کہ "واثق صاحب آخر اس مسلمان قوم کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ ایک تو وہ تو اس ملک میں Minority (اقلیت) میں ہے۔ آئے دن ہندوؤں سے فساد ہوتے رہتے ہیں، دوسری طرف جب اُسے فرصت ملتی ہے تو آپس میں جوتا بیزار ہوتا ہے۔ سُنّی شیعہ کا جھگڑا۔ دیکھئے لکھنؤ میں کیا ہو رہا ہے۔ جب اس میں کچھ Lull (ٹھہراؤ) آتا ہے تو وہابی اور حنفی کا تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ تبلیغی جماعت اور بریلویوں میں مار پیٹ ہونے لگتی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ میں اڑتالیس گھنٹے سے بستر پر نہیں گیا ہوں۔ ہوا یہ کہ اٹالہ مسجد حنفیوں کے قبضہ میں ہے اور عیدگاہ پر وہابیوں کا قبضہ ہے۔ پرسوں خبر ملی کہ وہابی عید کی نماز اٹالہ مسجد میں پڑھنا چاہتے ہیں مگر حنفی لوگ ان کے ساتھ نماز پڑھنے پر تیار نہیں ہیں اور مسجد کے پھاٹک میں انھوں نے تالا ڈال دیا ہے۔ یہ خبر پا کر ضلع مجسٹریٹ اور میں جونپور کو توالی پہنچ گئے۔ دونوں جماعتوں کے بزرگ نمائندوں کو بلوایا اور مصالحت کی کوشش شروع کر دی اور بات چیت پورے چوبیس گھنٹے چلتی رہی مگر کوئی فریق اپنے درشتی کو نرٹ (موقف) سے ہٹنے کو تیار نہ تھا اور نوجوانوں میں یہ جوش تھا کہ وہ تالا توڑ کر مسجد میں داخل ہوں گے۔ حنفیوں کی طرف سے بھی کچھ کم تیاری نہ تھی۔ ہزار ہا آدمی اٹالہ مسجد کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے کہ کل شام کو وہابی لوگ مسجد کے سامنے میدان میں جمع ہونے لگے۔ یہ خبر پاتے ہی ہم لوگ مسجد پر پہنچ گئے اور صلح کی بات چیت

کا آخری دور شروع ہوا۔ حنفیوں نے بتلایا کہ آپ کو نہیں معلوم وہابی نماز پڑھنے کو آج مسجد میں جانا چاہتے ہیں اور کل یہ لوگ اس پر قبضہ کر لینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہابیوں نے کہا ہم کو عیدگاہ دور پڑتی ہے اس لیے ہم مسجد میں عید کی نماز پڑھیں گے اور اگر یہ لوگ نہ مانیں گے تو ہم جھگڑا کریں گے اور تالا توڑ کر مسجد میں داخل ہو جائیں گے۔ دیکھیں ہم لوگوں کو کون روک سکتا ہے۔ اس طرح کی باتیں سن کر مجھ کو بہت افسوس ہوا اور میں چپکے سے کوتوالی چلا گیا اور وہاں سے پولیس لائن فون کیا کہ آدھ گھنٹے کے اندر پوری آرم پولیس اور رائٹ پولیس مع دس مشین گنوں، برین گنوں اور رائفلوں کے اٹالہ مسجد پر پہنچ جائیں۔ اس خیال سے کہ شاید یہ لوگ مشین گنوں کو دیکھ کر ہوش میں آجائیں۔ آدھ گھنٹے میں پوری پولیس فورس مسجد کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور جنکی موجودگی میں .D.M اور میں نے پھر ان لوگوں کو سمجھانا شروع کیا مگر دونوں فریقوں کی طرف سے علاوہ انکار کے کوئی مصالحت پر تیار نہ تھا اور بات چیت کا یہ سلسلہ صبح چار بجے تک جاری رہا۔ میں نے ڈی۔ ایم۔ سے کہا کہ اب آپ کسی طرف کرسی میں آرام سے بیٹھئے اور میں تنہا ان لوگوں سے باتیں کروں گا۔ اور چاہوں گا کہ Statusquo (پچھلی روایت) قائم رہے۔ چنانچہ میں نے پولیس لاؤڈ اسپیکر پر Mob (جم غفیر) کو خطاب کیا۔ "بھائیو! اس وقت آپ سب سے صلح کی باتیں کرتے ہوئے پورے چالیس گھنٹے ہو چکے ہیں مگر آپ لوگ کسی بات پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ اس لیے (District administration ضلع انتظامیہ) نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ عید کی نماز آپ لوگ پرانی پرمپرا (روایت) پر جو پولیس رجسٹر میں درج ہے پڑھیں گے۔ جس فرقہ کی نماز عیدگاہ میں ہوتی تھی وہ عیدگاہ جائے گا اور جس کا قبضہ اٹالہ مسجد پر ہے وہ مسجد میں نماز پڑھے گا۔ اس میں آپ سب لوگوں کو پانچ منٹ کا وقت دیتا ہوں کہ آپ لوگ Disperse تتر بتر (منتشر) ہو جائیے اور گھر جا کر عید اور نماز کی تیاری کیجیے۔ عید جھگڑا نہیں میل ملاپ کا دن ہے۔ مگر اس مجمع کا کوئی آدمی اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب مجھ کو غصہ آیا اور میں نے کہا آپ یہ مشین گنیں و رائفلیں دیکھ رہے ہیں یہ جب چلتی ہیں تو ان میں سے بیلے چمیلی کے پھول نہیں نکلتے، اس میں سے آگ اور گولی نکلتی ہے۔ اس سے پہلے میں اب لاٹھی چارج کا حکم دینے جا رہا ہوں۔ اور میں نے پولیس فورس کو Attention (تیاری) کا حکم دیدیا۔ جوانوں نے لاٹھیاں اور بندوقیں تان لیں۔ دس کی الٹی گنتی ختم ہو جانے پر یہ آپ پر چارج کر دیں گے۔ دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ۔ میں پانچ تک پہنچا تھا کہ مجمع تیزی سے تتر بتر ہونے لگا اور پانچ منٹ میں مسجد کے پھاٹک پر علاوہ حنفی محافظوں کے مسجد کے سامنے میدان میں ایک شہری دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے مسجد کے چاروں طرف سپاہیوں کا گھیراؤ لوا دیا اور خود میں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کرسیوں پر بیٹھے سورج نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔ کوتوال شہر کو حکم دیا کہ پورے شہر اور عیدگاہ پر کوتوالی پولیس اور ہماری لاٹھی پولیس آج شام تک پہرہ دیتی رہے۔ دونوں جگہ نمازیں ختم کروا کے اور شہر کے ہر محلہ اور سڑکوں پر چکر لگا کے

اور پورا اطمینان کر کے کہ کہیں کوئی واردات تو نہیں ہوئی گھر نہیں گیا اور دل ہلکا کرنے سیدھے یہاں چلا آیا"۔ اس کے بعد انھوں نے سویاں کھائیں، کافی پی اور دیر تک آنکھیں بند کئے کرسی پر آرام کرتے رہے۔ اور کبھی کبھی آنکھ کھول کر ہندوستانیوں کی ناعاقبت اندیشی پر باتیں کرتے رہے۔ اور جب نیند کا زیادہ غلبہ ہوا تو رخصت لیکر اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ہندوستان کی انتظامیہ میں جنگی سنگھ جیسے روشن خیال لوگوں کی ضرورت ہے۔

کچگاؤں اس کے مضافات اور قرب و جوار کے اضلاع میں ڈاکہ زنی، غنڈا گردی، چوریاں اور قتل و غارتگری، قمار بازی اپنے شباب پر تھی اور خاص کر اپنے گاؤں کے پردھان کی بے ایمانی اور غیر قانونی حرکتوں کی اطلاعات سے میرے کان بھر چکے تھے کہ (غالباً اپریل ۱۹۸۲ء میں) ایک دن جب میں تنہا بیٹھا سردالانے برآمدہ میں کوئی کام کر رہا تھا کہ ایک سیاہ فام قدآور چھریرے بدن کا نہایت خوبصورت جوان بش شرٹ اور پتلون میں سونے کی گھڑی لگائے قیمتی نگینوں کی انگوٹھیاں پہنے میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس سے قبل اس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پوچھا "تم کون ہو"۔ جواب "میں کلّو ڈاکٹر ہوں" میں نے کہا "تو تم یہاں میرے پاس کس لیے آئے ہو"۔ بولا کہ "گاؤں میں پردھانی کا چناؤ ہونے والا ہے اور اس کے لیے میں کھڑا ہوا ہوں" میں نے کہا کہ "تم کیا وہی مشہور کلّو بدمعاش اور ڈاکو ہو جس کا نام میں نے ہر ڈاکہ کے سلسلہ میں سنا ہے اور پولیس ہر وقت جس کی تلاش میں رہتی ہے"۔ جواب "جی ہاں میں وہی کلّو ہوں" جواب الجواب "تو میں کیا کروں" جواب "ہم آپ کا ووٹ اور آپ کا آشیرواد چاہتے ہیں" جواب "مگر میں کسی ڈاکو یا بدمعاش کو اپنا ووٹ نہیں دے سکتا چہ جائیکہ سپورٹ کرنا لا علمی میں ایک بہت ہی خراب آدمی کو پردھان بنوا کر آجتک پچھتا رہا ہوں اور اپنے اور اس کے اوپر لعنت بھیجتا رہتا ہوں" اس نے کہا کہ "میں اگر پردھان ہوگیا تو ڈاکے مارنا اور بدمعاشی چھوڑ دوں گا" میں نے کہا "اس شرط پر تو میں تم کو ووٹ نہیں دے سکتا۔ پہلے ڈاکہ زنی اور بدمعاشی ترک کرنے کی ابھی اور یہیں قسم کھاؤ تو میں تم کو اپنا ووٹ دوں گا اور تمہاری جیت کے لیے دعا کروں گا۔ ورنہ میں کچھ نہیں کر سکتا"۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچنے لگا۔ تو میں نے کہا کہ توبہ میں جلدی کرو ورنہ یہاں سے جاؤ اور جہنم میں اپنا گھر بناتے رہو"۔ اس نے کہا "میں تیار ہوں۔ مجھ کو نہیں معلوم توبہ کس طرح کی جاتی ہے اور قسم کیسے کھائی جاتی ہے" میں نے کہا "قبلہ رُخ کھڑے ہو کر قسم کھاؤ کہ میں اس وقت سے توبہ کرتا ہوں کہ اب کبھی نہ کہیں ڈاکہ ڈالوں گا، نہ گولی چلاؤں گا اور نہ قانون اور شرع کے خلاف کوئی کام کروں گا"۔ وہ قبلہ رُخ کھڑا ہوگیا، میں قسم بولتا گیا اور وہ لفظ بلفظ اس کو دُہراتا گیا۔ اس کے بعد میں نے اس کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو میں نے اس سے کہا کہ "چونکہ تم نے آج خراب کام کرنے کی توبہ کرلی ہے اس لیے تم ایک شریف آدمی اور اس قابل ہو کہ میرے برابر بیٹھ سکو۔ میں اب تم کو اپنا ووٹ دوں گا۔ یاد رہے کہ اس قسم

میں ہارنے جیتنے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اور اگر ہارنے پر تم نے قسم توڑی تو تم اپنا مجھ سے بڑا دشمن کسی کو نہ جاننا۔ اب جاؤ اور زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اپنی توبہ کا اعلان کردو۔ وہ چلا گیا اور پولنگ کے دن بہت سویرے جاکر مدرسہ پر اپنا کھلا ووٹ میں نے اس کو دیا۔ اس کے بعد بوتھ کے باہر ٹہل ٹہل کر بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا اس وقت تمہارے پاس کوئی اسلحہ موجود ہے" اس نے کہا" جی ہاں ایک پستول ہے"۔ میں نے کہا" اس کو نکالو اور کسی پولیس کے داروغہ کے حوالے کردو۔ بغیر لائسنس کا پستول رکھ کر تم غیر قانونی کام کر رہے ہو"۔ یہ کہ کر میں گھر واپس آگیا۔

دوسرے دن، کاؤنٹنگ کے بعد خبر آئی کہ کلّو جیت گیا۔ اور تب ایک اور شخص اور گاؤں کے پچاس۔ ساٹھ آدمیوں کے ساتھ کلّو مجھ کو سلام کرنے آیا۔ میں نے کہا بیٹھو۔ "یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں" یہ جونپور شہر کے مشہور مہدی ڈاکو ہیں"۔ میں نے اس کو بھی بٹھایا اور کلّو سے کہا کہ" اب تم کو ایک بہت چھوٹی سی قسم اور کھانی ہے" اس نے پوچھا" وہ کیا"۔ میں نے کہا" قسم کھاؤ کہ میں آج سے کسی قیمت پر جھوٹ نہیں بولوں گا، چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ جائے"۔ اور اس نے پورے مجمع کے سامنے یہ قسم کھائی۔ میں نے اس سے کہا کہ" اگر تم نے یہ دونوں قسمیں دل سے کھائی ہیں تو آج سے اپنے کو پارس جانو۔ تم اس وقت بالکل معصوم ہو۔ نوزائیدہ بچّے کی طرح۔ ابھی مرجاؤ تو سیدھے جنّت میں جاؤ گے اور اگر یہ قسمیں جھوٹ دکھادے کے لیے کھائی ہیں تو جہنم کے علاوہ تم کو کہیں جگہ نہیں ملے گی۔ اور اگر تم ڈکیتی اور غنڈہ گردی نہ ترک کروگے تو یاد رکھو کہ اپنی موت سے نہ مروگے۔ گولی کھا کر مروگے۔ پھانسی کے پھندے سے مروگے یا زندگی بھر جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مروگے"۔ اس نے جواب دیا" نہیں صاحب میں نے دل سے توبہ کی ہے اور آپ اس میں مجھ کو بہت ٹھیک (ثابت قدم) پائیں گے"۔ میں نے کہا" تب پھر اب سے دنیا کے ہر پریشانی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ سچائی کا راستہ بہت دشوار گذار ہے۔ رشتہ دار، دوست، ساتھی سب رفتہ رفتہ تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ پولیس بھی تمہاری دشمن ہو جائے گی کہ تم اس کی دلالی نہیں کرسکتے۔ یوں بھی تم اب گاؤں کے پردھان ہو گئے ہو۔ خوش قسمتی سے تم کو جنتا کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ کچھ کرکے دکھاؤ گے تو اچھے لوگ خود بخود تمہاری عزت کرنے لگیں گے اور بُرے جو تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں تمہارے درپئے ہو جائیں گے۔ جُوا جو گاؤں میں بڑھ گیا ہے اس کو بند کراؤ۔ چوری اور غنڈہ گردی کو روکو۔ سال میں دو ایک ڈاکے جو پڑ جاتے ہیں ان کو ختم کراؤ۔ گاؤں کے اندر پکّی سڑک بنواؤ اور ضرورت پڑنے پر پولیس کی مدد لو۔ گاؤں کے جھگڑوں کا ایمانداری سے فیصلہ کرو۔ کوئی رشوت دے تو اس کو مت لو۔ اور اب جاؤ اور محنت کرکے روزی کماؤ"۔ یہ باتیں مہدی ڈاکو اور دوسرے سب لوگ سن رہے تھے۔

اس کے گھر میں اس کی پاگل ماں تھی اور ایک بہن مع ایک چار سال کے بچّے کے۔ وہ علاوہ بیڑی بنانےکے

کوئی دوسرا کام نہیں جانتا تھا۔ دس بارہ بیسے کی کاشت تھی۔ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تاہم بیڑی مزدوری اور مختصر کھیتی سے اس کے گھر کا خرچ نہ چلتا تھا اور فاقوں کی نوبت آ گئی۔ میں نے اس کو رائے دی کہ لکڑی کی ٹال کھولو سو وہ ناتجربہ کاری کی وجہ ختم ہو گئی۔ دوستوں اور عزیزوں کو قرضہ پر یا کبھی کبھی مفت لکڑیاں دینے لگے۔

ایک دن میں نے اپنے کارنامے کا ذکر جب کپتان جنگی سنگھ سے کیا تو وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ نے کام تو بہت اچھا کیا ہے مگر اس میں کلّو کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور میں تو نہیں سمجھ سکتا کہ وہ زیادہ دن تک اپنی قسم اور توبہ پر ٹھہر سکے گا۔ بہر حال اگر آپ اس سلسلہ میں میری مدد چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ میں نے کہا "ابھی نہیں اگر ضرورت ہوئی تو آپ کو رجوع کروں گا۔"

اس کے دیرینہ ساتھی ڈاکو چور بدمعاش آئے اور اس کو بغیر شرکت کے لوٹ کی رقم کا دسواں حصہ دینے کی ترغیب دلانے لگے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ دوسری طرف پولیس والے اس کے پیچھے پڑنے لگے کہ جھوٹے چالانی مقدمے اور رشوتیں دلواؤ تو اس نے اس سے بھی انکار کیا، اور کئی بار اس کو سپاہی پکڑ کر تھانے لے گئے اور خوب مارا پیٹا اور کئی بار اس کو بھاگتے ہوئے یا مقابلہ کرنے کے بہانے (Encounter) گولی مار دینے کی دھمکی دی۔

جب ان سب باتوں کی فریاد اس نے مجھ سے کی تو میں اس کو ساتھ لیکر کپتان جنگی سنگھ کے پاس گیا اور ان کو ساری داستان سنائی۔ جنگی سنگھ نے اپنے گھر کے دفتر میں بلاکر اس سے باتیں کیں۔ اس کے بعد انھوں نے لائن بازار اور ظفرآباد کے تھانیداروں کو فون کیا کہ وہ فوراً حاضر آئیں، اور ہم سے کہا کہ آپ جائیے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دونوں تھانیداروں کو کس کے ڈانٹ پلائی اور تب سے اس کو قدرے سکون نصیب ہوا۔

اس کے بعد اس نے شادی بھی کر لی۔ بیوی بڑی گھر گرہست اور سگھڑ تھی۔ اس نے آکر کھیتی سنبھال لی اور شاید بیڑی بھی بنانے لگی۔ گھر میں دو گنی بیڑی کی مزدوری آنے لگی اور کھیت سے کچھ غلّہ بھی ملنے لگا تب گھر والوں کو موٹا جھوٹا کھانا بھی میسّر ہوا۔

جب اس کو قدرے اطمینان ہوا تو اس نے گاؤں میں سدھار کی طرف توجہ کی۔ جُوا بند۔ کچّی شراب بند۔ چوری بند، ڈاکہ بند۔ گاؤں میں جتنے بزرگ خاندان تھے سب نے اس سے تعاون کیا اور جتنے میلے اور جلوس وغیرہ نکلتے تھے ان کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ کجلی کا میلہ، رام لیلا اور دسہرہ دشمی اور محرّم کا جلوس، ان سب میں مردوں سے زیادہ عورتیں شرکت کرتی تھیں۔ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والوں، دوکانیں لوٹنے والوں اور جھگڑا فساد کرنے والوں کی اس نے وہ زد و کوب کی کہ سب سیدھے ہو گئے۔ کلّو لوہے کا بنا ہوا ہے اور ابھی عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ بس

پچیس چھبیس سال کا ہوگا، مگر جس پر کس کے ہاتھ دھر دیتا تو اس کی ہڈی توڑ کر گوشت کی مچھلی باہر آجاتی تھی۔ کجلی کا میلہ ہمارے گاؤں کا سب سے بڑا میلا ہوتا ہے، جس میں دیہاتی فی البدیہہ کجلی سناتے ہیں۔ اس میں دو گروہ ہوتے ہیں، ایک تالاب کے پچھم رُخ کھڑا ہوتا ہے اور دوسرا پورب جانب اور سوال جواب کی شکل میں کجلی گاتے ہیں۔ مقابلہ سخت ہوتا ہے اور ہار جیت کے معاملہ میں اگر پولیس اور سماجی کام کرنے والے والنٹیر بیچ بچاؤ نہ کریں تو فوجداری تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ ایک سال ایسا ہوا کہ کلو پردھان کپتان جنگی سنگھ کو کجلی دیکھنے کی دعوت دے آئے اور مجھ کو بعد میں بتلایا۔ سرکاری کاغذات کی رو سے کجلی کے میلہ میں ایک D.S.P. چار تھانیداروں اور بڑی تعداد میں سپاہیوں کی ڈیوٹی لگتی ہے اس لیے بھی S.P. معائنہ کے لیے آسکتا ہے۔ چنانچہ جنگی سنگھ باوجود کام سے پریشان ہونے کے میلا دیکھنے آئے اور میں بھی وہاں زندگی میں پہلی بار گیا تھا۔ میلے کے ایک مربع کیلومیٹر میں اتنا مجمع تھا کہ راستہ چلنا مشکل ہوگیا۔ کلو پردھان کی انتظامی صلاحیت کی شہرت پاکر عورتوں اور دوکانداروں نے میلے میں یلغار بول دی اور بدمعاش لونڈے دور دور سے علاوہ جھانک تاک کے کوئی شرارت نہ کرسکتے تھے۔ کلو نے وہاں پولیس اور مہمانوں کے لیے مٹھائیوں، پھلوں اور چائے کی دعوت بول رکھی تھی مگر ہم لوگوں نے اس سے لطف اندوز ہونے سے انکار کردیا اور لال کوٹھی میں واپس آکر چائے پی۔ جنگی سنگھ نے ان معنوں میں میلے کی بہت تعریف کی کہ وہ ہمارے یہاں کے ہندو مسلم جذباتی یکجہتی کا نمونہ تھا۔ اتنے بڑے میلے میں ایک بھی جھگڑے، مارپیٹ اور دکان لٹنے کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ بس ایک عورت کا بچہ کھوگیا تھا جو لاکھوں کے چلتے پھرتے مجمع میں آدھ گھنٹے کے اندر ایک والنٹیر تلاش کرکے لے آیا۔ کلو پردھان میں کام کرنے کا قدرے بھروسہ اس وقت پیدا ہوگیا جب کپتان جنگی سنگھ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے حسن انتظام کی بدھائی دی اور پولیس کے دوسرے افسران اور فورس نے اس بات کو محسوس کیا کہ کلو پردھان دامق ہی صاحب کا چیلا نہیں ہے بلکہ پولیس کپتان بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ گذشتہ چناؤ میں جب کانگریس نے ہمارے گاؤں میں جلسہ کیا تو کلو پردھان اس میں صدارت کرنے کے لیے مجھ کو لے گیا اور راستہ بھر مجھ کو سبق پڑھاتا رہا کہ صاحب ہم تو گاؤں میں پکی سڑک بنوانے کو ان لوگوں سے کہتے کہتے تھک گئے ہیں اگر آج آپ اپنے بھاشن میں اسی کی طرف دو شبد کہہ دیں گے تو سڑک جلد ہی بن جائے گی۔ چنانچہ سب سے آخر میں تقریر کرتے ہوئے میں نے یہ کہا کہ "بابو کملا سنگھ امیدوار (کانگریس آئی) کی خوش قسمتی ہے کہ اس حلقہ سے کوئی کمیونسٹ امیدوار نہیں کھڑا ہوا ہے ورنہ میں اُسی کو ووٹ دیتا اور دلواتا۔ اور کملا سنگھ رولنگ پارٹی کے امیدوار ہیں۔ اس لیے اپنے گاؤں کے تمام باسیوں کی طرف میں ان کو ووٹ دینے کے لیے اس شرط پر تیار ہوں

کہ وہ ہمارے گاؤں کی سڑکوں کو چناؤ سے پہلے پہلے پختہ کروادیں۔ میں تو کنویسنگ کرنے جاؤں گا نہیں مگر گاؤں کے پردھان اسی شرط پر ان کو ووٹ دلوائے گا۔ چنانچہ بابو کھلا سنگھ کو پوری جنتا کے سامنے ہاتھ جوڑ کے سڑک بنوانے کا وعدہ کرنا پڑا اور ایک مہینہ کے اندر اندر ہمارے گاؤں کے سب گلیوں اور کچی سڑکوں پر کھڑی اینٹ بچھ گئی۔ دوسرے چناؤ میں انشاء اللہ کنکر بجری اور تارکول بھی پڑ جائے گا۔ کلّو پردھان زندہ باد!

اب کلّو پردھان نے ایک بھینس بھی خریدی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے وہ ایمانداری کے ساتھ آسودہ حال ہے۔ اور پولیس والوں کی خوب خاطر کرتا ہے اور اب پولیس والوں کو یقین ہوگیا ہے کہ وہ ایک معزز شریف، نیک اور معقول آدمی ہوگیا ہے۔ اس کے دشمن بھی کافی ہوگئے تھے جو اب تھک کر بیٹھ گئے ہیں اور گاؤں میں امن وامان کا سناٹا ہوگیا ہے جو لالاں کوٹھی کو بہت پسند ہے۔

۱۹۸۵ء میں ایک اور واقعہ ہوا۔ ابھی سنائے دیتا ہوں کہ اس کا سلسلہ کلّو سے ملتا ہے۔ ڈاکوؤں اور رغنڈوں میں گروہ بندی بھی ہوتی ہے۔ آپس میں رقابتیں بھی چلتی ہیں۔ جونپور کا ڈاکو مہدی، کلّو کے تائب ہو جانے کے بعد تنہا ہوگیا اور اس کو پولیس نے اور بدمعاشوں نے اس سے اپنا پچھلا بدلا چکانا شروع کردیا تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ بھاگا ہوا ایک دن میرے پاس آیا۔ کلّو جیسا وہ بھی چھریرے بدن کا سانولے رنگ کا ڈاڑھی رکھے ہوئے بہت پھرتیلا جوان ہے۔ پستول اور رائفل کے نشانوں میں دونوں یکتائے زمانہ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا نشانہ کبھی خالی گیا ہی نہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ "جس طرح آپ نے کلّو کو جہنم کے منھ سے نکالا ہے ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کیجئے۔" میں نے کہا "بھئی سنو! کلّو ایک مقامی آدمی تھا اور ہر وقت میری نظر کے سامنے۔ اس کی نگرانی کرنا میرے لیے آسان اور تم ٹھہرے متفنی محلہ شہر کے رہنے والے۔ میں یوں بھی شہر کم ہی جاتا ہوں، اور میرے ہاتھ اتنے بڑے نہیں کہ وہاں تک پہنچ سکیں۔ اس لیے مجھ کو ذرا غور کرنے دو کہ تم کو اس گندگی سے نکالنے کی کیا ترکیب کی جائے۔ تم تو ہر وقت پولیس کی نظر کے سامنے ہو۔ وہ کسی وقت بھی تمہارا encounter کر سکتے ہیں"۔ پائپ کے دو چار کش لینے کے بعد ترکیب میرے ذہن میں آگئی کہ توبہ اور قسمیں کھانے کے بعد تم کو بے دست و پا پاکر کوئی تم پر حملہ تو نہیں کرے گا اور تم شہر میں بے خطرہ کر شرافت کی زندگی بسر کر سکو گے، مگر توبہ اور قسم تم کو ابھی اور یہیں میرے سامنے کھانا پڑیگی۔ ابھی کا مطلب ہے اس جگہ کو چھوڑنے سے پہلے" تو اس نے کہا کہ "بس دو مہینے کی مہلت دیدیجئے۔ دو معاملے ختم کرکے توبہ کے لیے حاضر ہو جاؤں گا"۔ میں نے کہا "نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے تم ابھی دو ایک غیر قانونی کام کرنے کے لیے موقع چاہتے ہو، تو، توبہ اس طرح نہیں ہوتی کہ اس میں مہلت دی جائے۔ سگریٹ

وہی شخص چھوڑ سکتا ہے جو سگریٹ چھوڑنے کے عہد کے وقت بھری سگریٹ کی ڈبیا زمین پر پھینک کر روند ڈالے۔ یہ نہیں کہ یہ ختم ہو جائے تب سگریٹ پینا چھوڑ دوں گا۔ میں خود ایسا ہی اسموکر ہوں جو باقی تمباکو یا سگار کو پھینک نہیں سکتا اسی لیے آج تک اسموکنگ نہیں چھوڑ سکا۔" اب تم کو کیا کہنا ہے جلدی کہو مجھے اور بہت سے کام ہیں اور اگر تم ابھی اور یہیں توبہ نہیں کر سکتے تو پھر میرے پاس کبھی نہ آنا۔" مہدی نے کہا "آپ بہت سخت اور بے رحم آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔ یہ یاد رہے کہ مہدی گریجویٹ ہے اور مفتی محلہ کے بہت اچھے خاندان کا فرد ہے جو خراب صحبت میں پڑ کر خراب ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا یہ بھی تمہارا خیال ہے۔ میں بے رحم نہیں البتہ اصول کے معاملہ میں سخت ضرور ہوں۔ ہاں تو تم نے کیا فیصلہ کیا ہے جلدی بتاؤ۔" اس نے کہا کہ "آپ کے سامنے اور ابھی توبہ کر لوں اور تب آپ سے جان بچانے کی ترکیب پوچھوں۔ یہ کر لینا تو آسان ہے مگر جان بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اگر میں توبہ کر لوں گا تو آپ مجھ کو جان بچانے کی ترکیب بتلا دیں گے؟ ابھی جون پور کے ایک غنڈہ نے توبہ کی تھی۔ پولیس نے اس کے ہاتھ پیر لوہے کی سلاخوں سے اس طرح توڑ ڈالا ہے کہ وہ زندہ تو ہے مگر وہ گھسٹ گھسٹ کر زمین پر چلتا ہے"۔ میں نے کہا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے پائے گا"۔ اس نے کہا تو فرمایئے میں کس طرح قسم کھاؤں اور کیا توبہ کروں"۔ میں نے کہا کہ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر میں جو کہتا ہوں تم اس کو دہراؤ۔ میں مہدی اپنے اللہ سے پرانے گناہوں کی توبہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ اس وقت سے کبھی ڈاکہ نہیں ڈالوں گا اور کوئی کام قانون وقت اور شرع کے خلاف نہ کروں گا اور اور کبھی جھوٹ نہ بولوں گا چاہے اس کے بدلے میں جان چلی جائے"۔ جب وہ اس قسم کو دہرا چکا تو میں نے کہا تم اب بالکل پاک صاف ہو بے گناہ ہو۔ اب یہاں سے اٹھ کر۔ کس سواری سے آئے ہو"۔ موٹر سائیکل سے جو باہر کھڑی ہے"۔ اب تم سیدھے یہاں سے مولوی محمود الحسن صاحب قبلہ پرنسپل ناصریہ اسکول کے پاس جاؤ۔ نہ ہوں تو وہیں اسکول میں ان کا انتظار کرو اور جب ان کا سامنا ہو تو فوراً ان کے قدموں پر گر پڑنا اور سر رکھ دینا اور اُٹھ کر اپنی قسم اور توبہ کا تفصیل سے ذکر کرنا۔ ان سے میرا نام لینا اور کہنا کہ اس وقت سے تم کو وہ اپنی حفاظت میں لے لیں۔ وہ بہت بہادر اور ایماندار آدمی ہیں، وہ تمہارے تحفظ کے لیے لاٹھی بھی چلا سکتے ہیں۔ شہر میں لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پولیس والے اور افسران ضلع بھی ان کا احترام کرتے ہیں 'سچا' سمجھتے ہیں۔ بدمعاش بھی ڈرتے ہیں ان سے۔ وہ دو چار دن اپنے ساتھ تم کو لیکر شہر میں گھمائیں گے۔ پولیس والے سے، اہل شہر سے اور افسران سے کہہ دیں گے کہ تم نے توبہ کر لی ہے۔ باقی باتیں وہ خود دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد تم بھی کوئی ایسا کام کرو جس کو عام لوگ دیکھ کر تمہاری عزت کریں۔ کوئی برنس کرو۔ کوئی سوشل ورک کرو۔ اس کے علاوہ تم کیا کر سکتے ہو"۔ چنانچہ مولانا نے اس بات کی مجھ سے تصدیق کی کہ مہدی انکے

پاس گیا تھا اور اس کی پچھلی زندگی سے واقف ہوتے ہوئے اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اس کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

مہدی سے مجھ کو خود معلوم ہوا کہ اس نے B.Ed میں داخلہ لے لیا ہے اور راج ڈگری کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کا صدر منتخب ہو گیا ہے۔ اور طلبا اور اساتذہ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اب وہ کھلے عام اپنے محلہ میں بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے، پتنگ اڑاتا ہے اور تھوڑا بہت کوئی کاروبار بھی کرنے لگا ہے۔ یعنی مہدی بھی اب کلوپردھان کی طرح (Rehabilitate) سماج کا ایک معزز فرد بن گیا ہے۔

اور ان سب کے قلب ماہیت ہونے سے جونپور ضلع میں نشانہ باز ڈاکوؤں کا جتھا بالکل منتشر ہو گیا ہے۔ کسی نے پان کی دوکان کر لی ہے۔ کسی نے چائے کا ہوٹل کھول رکھا ہے۔ غرض کہ اب جو سماج دشمن رہ گئے تھے ان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ چلئے یہ دوسرا اچھا کام ہوا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۲ء میں علاج کے لیے بیگم کو لیکر باقر کے پاس شہدرا دہلی پہنچا۔ ۲۶ دسمبر کو پرکاش پنڈت کا حلق کے کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا۔ میرا بہت پرانا یار تھا۔ اس کے مرنے کا مجھ کو بیحد صدمہ ہوا۔ باقر نے دل بہلانے کے لیے مجھ کو عظیم مصوّر پیلو پیکاسو پر ایک تازہ اشاعت میں طویل مفصل سوانح عمری لاکر دی۔ پیکاسو ۲۵ اکتوبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوا تھا اور ۹۲ برس کی عمر میں ۸ اپریل ۱۹۷۳ء کو مرا تھا۔ جنرل فرینکو کے مظالم سے بچنے کے لیے اس نے اپنی عمر کے آخری نصف ایام فرانس میں گذارے تھے، اور مرنے پر اس نے ایک ارب پچیس کروڑ چھبیس لاکھ بہتر ہزار دو سو مارکس کی مالیت کی تصویریں چھوڑی تھیں۔ اس کے عظیم کارناموں میں اس کی تصویر "گوئرنکا" کو عظیم ترین مانا جاتا ہے۔ اس میں اس نے اسپین کی سول وار کی تباہ کاریوں کو اور سر پر منڈلاتی ہوئی عالمی جنگ کے نتائج کو بڑے بھیانک اور اپنے خاص غیر معمولی انداز میں پیش کیا تھا۔ اس تصویر کو فرانسیسی حکومت نے خرید لیا۔ مگر مغربی پریس نے "گوئرنکا" کو (Funtastic & Fictitious) ناقابل یقین اور من گھڑت ہونے سے تعبیر کیا تھا جس کا جواب اس نے دیا تھا

"Fiction becomes valuable when its power is sufficient to compel us to see in it a new vision of reality."

"فنکارانہ مفروضات اس وقت اہم ہو جاتے ہیں جب ان میں مضمر تخیل کی بے پناہ قوت کسی نئی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے"۔ جس وقت پیکاسو گوئرنکا بنا رہا تھا اس وقت ارنسٹ ہیمنگوے "For whom the bell

”talls اپنا زندہ جاوید ناول لکھ رہا تھا

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

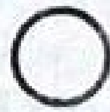
۲۲ مارچ ۱۹۸۲ کو رابندرالے لکھنؤ میں T.V. پر میری صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں میں نے اپنی نظم "سفر ناتمام" سنائی تھی ۔ یہ مشاعرہ دوردرشن لکھنؤ نے دہلی کے نیشنل ہک اپ کے لیے ریکارڈ کیا تھا ۔ مگر علاوہ چند کے شعرا کا انتخاب اچھا نہیں تھا ۔ دوسری بات یہ کھٹکتی تھی کہ نیشنل ہک اپ کا مشاعرہ بجائے دہلی کے لکھنؤ میں کیوں کیا گیا ۔ شاید زیادہ اخراجات سے بچنے کے لیے ۔ اب تو دہلی دوردرشن کے تقریباً سبھی پروگرام (Commercially Spousored) اشتہاری ہوتے ہیں جس سے T.V. کو بجائے خرچ کے لاکھوں روپے روزانہ کا فائدہ ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ دوردرشن کو اپنے پروگراموں کو زیادہ دلچسپ بنانے کی ضرورت ہے ۔ ابھی اس میں زندگی کی لہر کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ مشاعروں میں شاعروں کا انتخاب بھی ایک (Professional art) کاروباری فن ہے ۔ تنقید کی طرح اس میں بھی انتخاب کنندہ کو دوستی تعلقات اور سفارشات سے بالاتر ہو کر شعرا کا انتخاب کرنا چاہیے ۔ شعرا کی ادبی حیثیت کا اسے علم ہونا چاہیے ۔ ہر سن و سال اور مدرسۂ خیال کی نمائندگی ہونی چاہیے ۔ ابھرتے ہوئے نئے (Talents) جوہر کی ہمت افزائی ہونی چاہیے ۔ مقامی اساتذہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے ۔ اسی سال ۳۰ مارچ کو زبیر رضوی نے رامپور ریڈیو پر ایک مشاعرہ کیا تھا اور ان سب امور پر نظر رکھی گئی تھی اور وہ T.V. سے بہت زیادہ کامیاب مشاعرہ ہوا تھا ۔ اس لیے ہر T.V. اور ریڈیو اسٹیشن میں ایک ادبی مبصر کا ہونا ضروری ہے ۔ یہ مشاعرہ اس لیے بھی مجھ کو یاد ہے کہ میں پکاسو کے مندرجہ بالا بیان سے متاثر ہو کر جو غزل کہی تھی، اسی مشاعرہ میں پڑھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ایک خواب ایسا بدن لیٹا ہوا پھولوں میں — بار صد رنگ اٹھائے ہوئے ڈالی کی لچک
ایک خوشبو کہ لغت میں نہیں جس کا کوئی نام — اس کی قربت کا یقیں غیر شعوری سی مہک
ایک تہذیب ہے فنکار کی آشفتہ سری — لے جنوں اور بہک اور بہک اور بہک
ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش — جام لبریز غم زیست چھلک اور چھلک

اعظم گڑھ میں ایک چھوٹی سی بستی گھوسی ہے ۔ وہاں یکم جون ۱۹۸۲ کو ایک بہت اچھا ترقی پسند

اجتماع ہوا جس کی صدارت کیفی اعظمی نے کی تھی اور جس میں شاعر جمالی کے مجموعہ کلام صحیفہ کا اجرا ہوا تھا۔ وہاں کے واپسی کے بعد ابحر کمار، نثار جونپوری اور اصغر مہدی ہوش میرے یہاں آئے اور گفتگو ان الفاظ میں شروع کی کہ "آپ کو جشن کے نام سے الرجی ہے اس لیے یہ طے سمجھیے کہ ہم آپ کا کوئی جشن نہیں منائیں گے۔ آپ کے مجموعہ "شب چراغ" میں آپ کا یوم پیدائش ۲۲ر فروری ۱۹۱۰ء درج ہے تو اگر ہم لوگ ۲۲ر فروری ۱۹۸۴ء کو آپ کی ڈائمنڈ جوبلی منائیں تو اس میں آپ کی کیا رائے ہے"۔ میں نے سوچا کہ اب بُرے پھنسے اور یوں بھی حد سے زیادہ انکار مناسب نہیں اسلیے میں نے ڈائمنڈ جوبلی منانے کی اجازت اس شرط پر دیدی کہ "اس میں کوئی بیجا نمائش نہ ہو۔ پروگرام خالص ادبی اور ثقافتی ہونا چاہیے۔ کسی ڈھول تاشہ، چراغاں اور غیر سنجیدہ دکھاوے کا دخل نہ ہو، تو مجھ کو کوئی عذر نہیں"۔ وہ لوگ بھی اس پر راضی ہوگئے اور خوش خوش واپس چلے گئے اور میرے ۷۵ ویں یوم پیدائش کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔

میری بیگم تو جنم کی بیمار ہیں ہی اور اپنے چھوٹے بیٹے باقر سے بہت مانوس بھی، اس لیے دسمبر ۸۳ء میں انکو لیکر بغرض علاج و تفریح شاہدرہ دہلی پھر گیا۔ اس سال دسمبر ۸۳ء اور جنوری ۸۴ء میں دہلی میں بہت سخت سردی پڑی تھی۔ جنوری ۸۴ء میں تو ایک شب میں درجۂ حرارت $+1°$ تک گر گیا تھا اور کئی موتیں واقع ہوئی تھیں۔ مجھ کو یاد ہے کہ دو مہینہ تک میں اُس مکان کے باہر نہیں نکلا۔ دن میں کُہرے کی وجہ سے ایک دو بجے تک آفتاب نظر نہیں آتا تھا۔ دن بھر کمرہ میں بند لحاف میں پڑا رہتا یا باقر کی لائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔



مجھ کو رات میں نیند قدرے تاخیر سے آتی ہے، مگر جب آتی ہے تو کافی غفلت کی نیند سوتا ہوں۔ اُن سردیوں میں Larpose لارپوز کھا لینے سے اچھی نیند آجاتی تھی۔ میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر ان دنوں ذہن نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ میں خواب دیکھنے لگا تھا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ میں نے ایک طویل خواب چھ قسطوں میں تسلسل کے ساتھ دیکھا، اور روزانہ اس کے تسلسل پر تعجب کرتا تھا۔ خواب دو تین بجے رات کو شروع ہوتا اور کسی وقت بھی فیڈ آؤٹ ہو جاتا تھا اور آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور داستان کا باب ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر دن نکلنے تک سوتا تھا۔ اس کے بعد کئی مہینے تک یہ خواب تفصیل سے یاد رہا۔ کئی جگہ میں نے اس کو گھنٹوں میں احباب کو سنایا بھی مگر کہہ نہیں سکتا کہ اب وہ کتنی تفصیل سے یاد ہے۔ اس خواب کو خود ہی قلمبند کرنے جارہا ہوں۔ شاید واقعات تفصیلات اور مختلف اجنبی کردار مربوط ہو کر قلم سے ترشح ہونے لگیں۔

خواب اس طرح شروع ہوتا ہے کہ میں بیروت (لبنان) میں ہوں۔ اور پیدل ٹہلتا ہوا شہر کے مشرقی کنارے پر ایک صاف ستھرے دو منزلہ مکان کے سامنے اپنے کو پاتا ہوں۔ صبح کا وقت ہے اور حد نظر تک سبزہ زار پر نہایت خوشگوار، سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں زیتون کے باغات بھی ہیں۔ مکان کے دائیں بائیں انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی ہیں اور اُفق پر اونچے اونچے پہاڑ، جنگلوں سے ڈھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ مکان کے اس مشرقی پیش منظر سے جو قدرت کی نعمتوں سے مالامال تھا۔ محو حیرت اور لطف اندوز ہو رہا تھا کہ پشت پر کھلی ہوئی ایک کھڑکی سے آواز آئی "آیئے، اندر تشریف لایئے، باہر کیوں سردی کھا رہے ہیں"۔ گھوم کے دیکھا تو ڈریسنگ گون میں سر پر اونی کنٹوپ اور گلے میں مفلر لپیٹے ہوئے ۴۵۔۵۰ سال عمر کے کچھڑی بال ایک صاحب کھڑکی سے مجھ کو اندر آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ سامنے کے در سے ہوتا ہوا میں بغل کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور ایک گدّے دار کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ سردی کے خیال سے انھوں نے کھڑکی بند کر دی اور خود مقابل میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا "آپ یہاں کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ یقیناً آپ ہندوستانی یا پاکستانی ہیں۔ زبان بھی وہی لہجہ بھی وہی"۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا "بالکل یہی سوال میں آپ سے کرنے والا تھا۔ جی ہاں میں ہندوستانی ہوں۔ مدھیہ پردیش میں ایک چھوٹی سی جگہ بھوپال ہے وہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کا وطن کہاں ہے اور اسم گرامی؟" جواب "جی مجھے واثق جونپوری کہتے ہیں اور اصلی نام احمد مجتبیٰ ہے۔ وطن ایک دیہات لگگاؤں ضلع جونپور اتر پردیش میں ہے۔ اور جناب کا اسم مبارک؟" انھوں نے کوئی خاں نام بتلا دیا جو اسی وقت میں بھول گیا اور ان کو خاں صاحب کہکے خطاب کرنے لگا۔ "مگر آپ کے رہن سہن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مدّت سے قیام پذیر ہیں یا یہیں کے باشندہ ہو گئے ہیں"۔ جواب "جی میں یہاں کا مستقل باشندہ تو نہیں ہو گیا ہوں البتہ تین چار سال سے مقیم ضرور ہوں۔ وطن میں سخت بیمار پڑ گیا تھا۔ پیچش السر، معدہ خراب، جگر خراب۔ تو ڈاکٹروں نے یہ رائے دی کہ میں کسی مغربی ملک چلا جاؤں جہاں کھلی جگہ میں قیام اور وہاں کے مقامی ڈاکٹروں کو رجوع کروں۔ میں نے دنیا کی کافی سیر کی ہے اور چونکہ بیروت مجھ کو سب سے زیادہ پسند تھا، اس لیے آپ مجھ کو یہاں دیکھ رہے ہیں۔ مگر ادھر آپ کا آنا کیسے ہوا"۔ میں نے کہا "شعر کہو تو گردش دوران عشق کرو تو پاؤں میں چکر" یوں بھی مجھ کو سیر و تفریح کا بہت شوق ہے۔ بیروت کی تعریفیں سنی تھیں اس لیے یہاں چلا آیا۔ یہاں کب اور کس سواری سے پہنچا ہوں، یاد نہیں۔ بس آنکھ کھلی تو اپنے کو یہاں پایا اور ٹہلتا ہوا آپ کے مکان کی طرف چلا آیا۔ اور انتہائی خوش قسمتی کہ آپ پہلے ذی روح ہیں جن سے ملاقات ہوئی ہے۔ اور آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی"۔ جواب "بہت خوب بہت خوب۔ مجھ کو بھی آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ تو بتلایئے کیا پیجیے گا۔ یہاں ہر وقت ہر شراب پی جاتی ہے

وہسکی، برانڈی، جن، رم یا کوئی لیکر"۔۔۔ میں نے جواب دیا کوئی خاص تشنگی نہیں ہے اور میں شراب کا عادی بھی نہیں ہوں۔ البتہ موسم کو دیکھتے ہوئے برانڈی میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ خانصاحب نے قریب لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبایا اور نہایت اچھا سوٹ پہنے ہوئے لبنانی عرب ملازم آگیا۔ "برانڈی کا کینٹر اور دو گلاس لاؤ" فیڈ آؤٹ اور میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی تو چار بجے تھے اور میں کروٹ لیکر پھر سوگیا۔ جب سات آٹھ بجے بیدار ہوا تو خواب یاد آیا اور میں دن بھر اس Situa-tion اور اس کی تفصیلات کو ذہن نشین کرتا رہا۔ کئی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ بیروت کس طرح پہنچ گیا۔ پہلی ملاقات ہوئی تو ایک شریف ہندستانی سے ہوئی اور فوراً اس کا نام بھول گیا۔ عرب خادم سے خانصاحب نے اردو میں بات کی اور وہ سمجھ گیا۔ خواب کے ان سب پہلوؤں میں کوئی منطق نہ تھی۔

دوسری شب آئی کھانے کے بعد (Larpose) لارپوز کھایا۔ اور حسب عادت کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے داہنی کروٹ سوگیا۔ جب چت ہوا تو جسم کی حرکت سے نیم خوابی کی سی کیفیت محسوس ہوئی اور چند ثانیے میں پھر غفلت کی نیند سوگیا۔ ذہن کا پردہ اٹھا تو وہ عرب خادم ایک کشتی میں برانڈی اور اس کے ساتھ زیتون کی لوزیں اور caviar (مچھلی کے انڈے) لایا اور بولا کہ ڈاکٹر نے خالی پیٹ پر شراب پینے کو منع کیا ہے" اور قریب ہی ایک چھوٹی میز پر اسکو رکھ کر چلا گیا۔ خانصاحب نے دونوں کٹ گلاسوں کے یک میں برانڈی انڈیلی اور میری طرف پنیر کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا "بسم اللہ نوش فرمائیے" میں نے کہا آپ رہنمائی کریں اور انھوں نے ایک ہی گھونٹ میں اپنا پگ خالی کرکے کہا الحمد للہ اور کیویز سے شوق کرنے لگے۔ میں نے بھی ان کی نقل کی اور زیتون کو گزک بنایا اور باتیں ہونے لگیں۔ "اب آپ کا مزاج کیسا رہتا ہے؟" "پہلے سے تو یقیناً بہتر ہوں مگر زیادہ افاقہ نہیں۔ میں بہت بدپرہیز جو ہوں۔ زندگی میں کیا رکھا ہے۔ یوں بھی میں فطرتاً اپی کیورین ہوں۔ ایٹ۔ ڈرنک اینڈ بی میری"۔ میں نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر آپکے اہل وعیال؟" "اوہ ڈونٹ باور۔ آئی ایم اے کنفرمڈ بیچلر۔ اور آپ کیا ہیں؟" "میں؟ میں ایک کنفرمڈ پیر ڈین ود وَن وائف اینڈ تھری چلڈرن اینڈ چلڈرن آف چلڈرن" جواب "ویری گڈ ویری گڈ۔ یو آر رچ ود ڈے لکی مین۔ لٹ اس گو آؤٹ اینڈ ٹیک اے واک اِن دَا ڈوپن" اور ہم لوگ باہر دور تک ٹہلنے چلے گئے۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ "یہ فلسطینی مجاہدین آزادی اور ازرائیل میں کب تک جنگ ہوتی رہے گی اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا" جواب "ہمارے معالجین نے یہاں کی سیاست پر گفتگو اور غور وفکر کرنے کو منع کیا ہے۔ اسی لیے میں نے شہر کے باہر مکان خرید لیا ہے۔ مجھ کو اخبار پڑھنے سے بھی روکا گیا ہے مگر کبھی کبھی میرا ملازم گردوسری کے ساتھ اخبار خرید لاتا ہے۔ مجھ کو سب خبریں ملتی رہتی ہیں۔ اور آپ سے کیا احتیاط آپ ہمارے ہم وطن ٹھہرے۔ یہ ازرائیل کے مظالم نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی قبر کھود رہا ہے۔

اگر امریکہ کا درمیان نہ ہوتا تو عرب کب کا اس کو جہنم واصل کر چکے ہوتے"۔ اب ہم لوگ واپس آ رہے تھے کہ خانصاحب نے کہا کہ "آپ ٹھہرے کہاں ہیں ؟" میں نے کہا "معلوم نہیں"۔ اس جواب پر وہ بہت محظوظ ہوئے اور سر ہلانے لگے جیسے ان کو تمام راز سمجھ میں آگیا ہو۔ اور بولے کہ "آپ یہیں میرے ساتھ قیام کیوں نہیں کرتے"۔ ان کے اس کہنے پر مجھ کو بھی خیال آیا کہ واقعی میں ٹھہرا کہاں ہوں۔ کہیں نہیں۔ اور ذہن پر وہ جھٹکا لگا کہ آنکھ کھل گئی۔ بڑی دیر تک چت لیٹا خود اپنی لامکانیت پر غور کرتا رہا۔ آخر میں یہ سوچ کر کہ خواب تو خواب ہی ہے، اس کا کوئی سر پیر تو ہوتا نہیں۔ اور یہ کہکر کروٹ لیکر پھر سو گیا۔ اور صبح تک بے خبر سوتا رہا۔

تیسری شب میں خواب اس طرح شروع ہوا کہ جب میں خان صاحب کے مکان کے سامنے پہنچا تو ان کو مکان کے باہر کسی فکر میں ٹہلتا ہوا پایا۔ دور ہی سے صاحب سلامت ہوئی اور جب وہ میرے قریب آئے تو بڑے رازدارانہ انداز میں بولے "کل رات بیروت پولیس کے دو وردی پوش سارجنٹ آئے تھے اور پوچھنے لگے کہ آپ کا پاسپورٹ کہاں ہے دکھایئے۔ میں نے ان کو اپنا پاسپورٹ جس میں میڈیکل گراؤنڈز پر طویل مدت کا ویزا درج تھا، دکھایا۔ اس کے بعد بولے کہ آپ کے یہاں کوئی غیر ملکی آتا ہے ؟ وہ کہاں رہتا ہے ؟ اس نے پولیس کو اپنی آمد کی اطلاع اب تک نہیں دی ہے۔ اور یہ کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے ؟ تو میں نے کہا کہ "اس سے میں نے کئی بار پوچھا کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں تنہا ہوں میرے پاس کیوں نہیں چلا آتا ؟ مگر اس نے ہمیشہ اس بات کو ہنس کے ٹال دیا"۔ "کس وقت آتا ہے ؟" "کچھ ٹھیک نہیں، کبھی صبح، کبھی دوپہر، کبھی شام کو، مگر آتا ضرور ہے"۔ "اب جب آئے تو پولیس کو ٹیلیفون کرنا نہ بھولئے گا"۔ "مگر میرے پاس کوئی ٹیلیفون نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے ٹیلیفون رکھنے سے منع کیا ہے"۔ اور وہ چلے گئے۔ میں نے کہا "آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں ابھی کو دکھائی دے سکتا ہوں جس کو میں چاہوں۔ میں نے آج تک بیروت کا شہر ہی نہیں دیکھا ہے۔ میں تو بس آپ کے پاس آجاتا ہوں کہ آپ میرے ہم وطن ہیں۔ جس وقت کہئے آجاؤں اور جہاں کہئے چلا جاؤں"۔ خاں صاحب متعجب ہو کر بولے Strange indeed (تعجب بالائے تعجب) بہت خوب بہت خوب" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دور سے دو باوردی سپاہی آتے ہوئے دکھائی دیے اور مجھ پر ایک خوف سا طاری ہوا کہ مجھ کو پسینہ آگیا اور جب سردی لگی تو آنکھ کھل گئی۔ اور بڑی دیر تک کروٹیں بدل بدل کر جاگتا رہا۔ گھڑی دیکھی تو ابھی دو بجے تھے اور میں سو گیا۔ نیند آئی تو میں خانصاحب کے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ باہر ترشح ہو رہی تھی "آیئے داموق صاحب، کل تو مزا آگیا۔ آپ سپاہیوں کو دیکھ کر مکان میں چھپ گئے تھے۔ ان لوگوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان ڈالا اور آپ ان کو کہیں نہ ملے اور وہ یہ کہکر چلے گئے کہ "وہ شخص کوئی جن یا جادوگر ہے۔ اب ہم لوگ تو نہ آئیں گے اور آپ بھی اس سے نہ ملا کیجئے۔

آپ کو بھیڑانہ بنا دے" مگر میں جانتا تھا کہ ——— " ان کا جملہ یہیں تک پہنچا تھا کہ میں نے کہا" آپ کیا جانتے تھے۔ آپ نہیں جانتے کہ میں ایک بے چین سیلانی اور آوارہ گرد روح ہوں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ جہاں دل میں آیا پہنچ گیا۔ اسی لیے تو میں بیروت شہر کے اندر نہیں جاتا کہ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ بیروت میں کیا کیا دیکھا تو کیا جواب دونگا" یہ کہکر میں اُن سے رخصت ہو لیا کہ پھر کسی وقت آؤں گا۔ آج شب میں اس خواب نے (Intermitent) وقفہ وقفہ سے دیکھنے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جب میرا کالبد خاکی غفلت کی نیند سو رہا تھا تو میرا شعور خاموشی سے گھر چھوڑ کر پھر بیروت پہنچ گیا اور دیکھا کہ دو اشخاص جو قیافہ سے ڈاکٹر معلوم ہو رہے تھے خاں صاحب کو ڈانٹ پلا رہے تھے کہ آپ بہت بد پرہیز ہیں جس کی وجہ سے ہماری کوئی دوا فائدہ نہیں کر رہی ہے۔ ہم لوگ آپ کی موت کا الزام اپنے سر نہیں لے سکتے۔ کل سے ہمارا استعفیٰ۔ آپ اب کسی دوسرے ڈاکٹر کو رجوع کیجئے۔ آپ شراب پینا چھوڑیں گے نہیں اور بہت جلد مر جائیں گے"۔ میں بھی ایک گوشہ میں بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ جب ڈاکٹر چلے گئے تو میں نے خاں صاحب سے کہا کہ اب آپ یونانی علاج کیجئے تو بیچارے منھ لٹکا کے بولے کہ "یہاں کوئی حکیم وکیم نہیں رہے۔ سب ایلوپیتھ ہیں۔ اگر حکیم ہی کا علاج کروانا ہوتا تو اپنا بھوپال کیا برا تھا اور تب محض پرہیز ہی کیوں نہ کیا جائے، حکیم کی دوائی کی کیا ضرورت ہے۔ مزا تو جب ہے کہ علاج بلا پرہیز ہو۔ خیر دیکھا جائے گا"۔ اس موقع پر مجھ کو میری بد پرہیز بیگم جو بغل کے پلنگ پر سو رہی تھیں یاد آگئیں اور جو اس وقت اپنے بستر سے زور زور سے کہہ رہی تھیں "ہے صاحب ہے صاحب آپ کیا بڑبڑا رہے ہیں۔ میں بڑی دیر سے سُن رہی ہوں۔ ان کی ڈانٹ پر میری آنکھ کھُل گئی اور یہ کہہ کر "کچھ نہیں" پھر سو گیا۔ اس کے بعد اس رات کوئی اور خواب نہیں دیکھا۔

جاگنے کے بعد صبح سوچ رہا تھا کہ اس مسلسل خواب کو اپنے چھوٹے بیٹے باقر سے Discuss کروں گا کہ وہ کلینکل سائیکولوجسٹ ہے دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ مگر وہ ناول Thorn Bird اس قدر دلچسپ تھا کہ میں دن بھر اسی کو پڑھتا رہ گیا اور باقر سے خواب کا کوئی ذکر نہ کیا۔ میں نے کہا خواب کا مزا اسکے دیکھنے میں ہے clinical analysis میں نہیں۔

آج چوتھی شب تھی اور مجھ کو یقین تھا کہ اب یہ قصہ ختم ہوا۔ آج آرام سے غفلت کی نیند سوئیں گے اور بجائے ایک ملی گرام کے دو ملی گرام حُبِّ مسکن کھا کر سو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں خاں صاحب کے مکان میں بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا ہوں کہ مکان کی جانب تین گھوڑے مع سواروں کے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو معلوم ہوا کہ دو سفید گھوڑوں پر دو عورتیں ٹانگیں بائیں طرف لٹکائے ہوئے بیٹھی ہیں اور ایک مرد تیسرے ابلق گھوڑے پر سوار ہے۔ ہم لوگوں کے

باہر نکلنے تک وہ تینوں مکان کے سامنے آگئے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بڑی پھرتی سے گھوڑوں سے اتر گئے۔ دونوں بائیس تیئیس سال کی نہایت حسین عینکیں لگائے ہوئے جوان عورتیں تھیں، بالکل ہم شکل، سر کے بال سفید کنٹوپوں سے ڈھکے ہوئے۔ پاؤں کے گٹّوں تک سفید جامۂ رہبانیت پہنے ہوئے جن کے اوپر کریم رنگ کے سفید سمور کے کوٹ تھے۔ تیسرے ابلق گھوڑے سے اترنے والا گرے فلالین کا سوٹ پہنے ہوئے ایک خوش رو اور تندرست تیس بتیس سال کا سانولا جوان مرد تھا۔ وہ عورتیں خالص یوروپین اور مرد ایشیائی معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں میں سے ایک نے پاؤں جوڑتے ہوئے انگریزی میں دریافت کیا کہ "آپ دونوں میں ہندستان سے آئے ہوئے بیمار مسٹر خان کون ہیں؟" ایک قدم آگے بڑھ کر خاں صاحب نے انتہائی حیرت کے عالم میں انگریزی ہی میں جواب دیا "جی وہ بیمار مسٹر خان میں ہی ہوں۔ کہئے آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں اور مجھ سے ملنے کی تکلیف کیوں گوارہ کی؟" اسی اثنا میں لکڑی اور چمڑے کے بکسوں میں لدے ہوئے سامان کے ساتھ ایک خادم اور ایک میلی کچیلی عبا اور قبا اور چغیا و اُگال میں ادھیڑ عمر کے معیت میں نو دس ٹٹو اور خچر بھی وہیں پہنچ گئے۔ میں بھی کچھ کم محوِ حیرت نہ تھا کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تب دوسری راہبہ نے گلے سے لٹکی ہوئی کانسے کی صلیب کو رکھ کر اور دائیں ہاتھ سے سینے پر چلیپا بناتے ہوئے کہا کہ "کل دن میں ہم کو خداوند پاک و جلیل کے بیٹے جیزز کرائسٹ کی روح القدس کے ذریعہ بشارت ملی کہ ہم لوگ فوراً یہاں آکر نیم مردہ مسٹر خان کا علاج کریں اور ان کو نئی زندگی کے راستہ پر لگائیں۔ کیا آپ کے مکان میں ہم دونوں (Twin Sisters) جڑواں بہنوں، ہمارے (Personal Assistant) نجی معاون مسٹر بھیجے والا اور اسباب کے انچارج خادم کے قیام کرنے کی گنجائش ہے۔ ہم کو تین کمرے چاہئیں۔ ایک ہم دونوں کے لئے، دوسرا P.A. کے لیے اور تیسرا اسباب اور نگران خادم کے لیے" خاں صاحب نے جواب دیا "جی ہاں۔ اوپر کی منزل پر تین ہی کمرہ ہیں جو خالی پڑے ہوئے ہیں اور مسہریاں بھی لگی ہوئی ہیں"۔ یہ سن کر ان دونوں بہنوں کے بے رونق اور ستے ہوئے چہروں پر خوشی کا ایک رنگ آگیا اور اپنے دائیں ہاتھوں سے سفید دستانے اتارتے ہوئے خاں صاحب سے بس انگلیوں کی حد تک مصافحہ کیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ میں خانصاحب کا دوست ہوں تو مجھ سے بھی مصافحہ کیا اور مسٹر بھیجے والا نے بھی اردو میں کہتے ہوئے ہم لوگوں سے مصافحہ کیا کہ "آپ حضرات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔

بھیجے والا صاحب کی نگرانی میں حمالوں نے سب اسباب اٹھا اٹھا کر اوپر کے بڑے کمرہ میں رکھنا شروع کر دیا۔ شام ہو چکی تھی اور ہم چاروں نیچے کے ملاقاتی کمرہ میں جا بیٹھے۔ خانصاحب نے پھر انگریزی میں گفتگو شروع کی۔ "آپ دونوں میرے لیے فرشتۂ رحمت بن کر آئی ہیں۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ کچھ اپنے متعلق مزید تفصیل بیان کیجیے تو تجسس کا غلبہ کم ہو" دونوں ایک دوسرے سے اس حد تک مشابہ تھیں کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون بڑی ہے کون چھوٹی۔ کون سینیر ہے کون جونیر۔ ایک سی صورتیں ایک سا ناک نقشہ ایک سے قد و قامت ایک ہی آواز ایک سا نرم نرم لہجہ ایک سے حرکات و سکنات اور ایک سے لباس۔ بہرحال کسی ایک نے جواب دیا "ہم دونوں ویٹیکن سٹی (روم) کے رہنے والے ہیں۔ ہماری پوری تعلیم لندن (انگلستان) میں ہوئی ہے اور ہم لوگ پوری طرح

کوالیفائڈ اور ٹرینڈ فزیشین ڈاکٹر ہیں۔ ہم دونوں کا مشترک نام کرسٹائن گوڈی سسٹرز ہے۔ پاپائے روم کے حکم سے ہم لوگ لبنان کے شمال مشرق میں اُن پہاڑوں میں رہتے ہیں جہاں ہمارا گرجا گھر خانقاہیں، اسپتال اور بچوں کا اسکول ہے۔ ہمارے اسپتال میں دو معمر ڈاکٹر اور سرجن بھی ہیں، اور سب کے اوپر ایک کارڈنل فادر ہیں جو پورے اسٹیبلشمنٹ کے انچارج ہیں۔ اور بہت سی راہبائیں اور نرسیں ہیں جو دن رات کاموں میں مشغول رہتی ہیں۔ ہم بہنیں ساتھ ساتھ خاص کر ان مریضوں کا علاج کرتے ہیں جن کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہوتی اور جن میں سے ہم سو میں پچاس کو تو بچا ہی لیتے ہیں۔ وہاں سے یہاں تک پورے دو دن دو رات کا سفر ہے اور کوئی سڑک یا راستہ نہیں جس کو ہم لوگوں نے ڈیڑھ دن میں ختم کیا۔ خدا کے بیٹے کا حکم تھا اور جس نے یہاں جلد پہنچنے میں ہماری بہت مدد کی۔ راستہ میں بدو لوگ لوٹ بھی لیتے ہیں۔ جنگلی جانور بھی ملتے ہیں۔ خانصاحب نے کہا "آپ کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھ کو الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ آپ واقعی میرے لیے فرشتہ بن کے آسمان سے اتری ہیں۔ ہم خود بیمار ہیں اور مسافرت میں ہیں، ان حالات میں ہم آپ کی خاطر خواہ خدمت اور تواضع بھی نہیں کر سکتے۔ شرمندگی کا احساس شدید ہے"۔ خان صاحب نے جملے ختم ہی کئے تھے کہ بھیجے والے P.A. کپڑے بدل کر آگئے اور اطلاع دی کہ انھوں نے حاملوں کے ہاتھ ہولی فادر کو خط جس میں یہاں کا پتہ ہے لکھ دیا ہے کہ روزانہ ہماری ڈاک ہرکارے کے ہاتھ تیز رفتار گھوڑے پر آیا کرے۔ ایک سسٹر نے کہا "یہ ہمارے P.A. مہاراشٹر ہندستان کے رہنے والے ہیں۔ بہت پڑھے لکھے اور معزز پورے خاندان کے فرد ہیں۔ جملہ خط و کتابت اور جمع خرچ کا حساب کتاب یہی رکھتے ہیں۔ ان کو اپنے ملک کے ادب سے بڑی دلچسپی ہے۔ ایک لکڑی کے صندوق میں ان کی کتابیں اور جرنلز بھی ان کے ساتھ چلتے ہیں"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کھانے کے کمرہ سے گھنٹی کی آواز آئی اور ہم پانچوں اُٹھ کر کھانے کے کمرہ میں آ گئے۔ آج خانصاحب کا خان ساماں ویٹر اپنے پورے یونیفارم میں تھا۔ بالکل "شپ شیپ"۔ خان صاحب میز کے سرے پر بیٹھے۔ ان کے دائیں بائیں گوڈی بہنیں۔ ایک کے داہنے میں اور دوسری کے بائیں بھیجے والا۔ ایک ڈاکٹر سسٹر نے بھیجے والا سے انگریزی میں کہا کہ وہ ویٹر سے کہیں کہ کھانے کی میز سے سب شرابیں اٹھالے جائے اور کسی الماری میں بند کر کے کنجی آپ کو دیدے۔ یہاں میز پر صرف ریڈ وائن شیری رہا کریگی۔ دوسرے مواقع پر بھی شیری ہی پی جائے گی"۔ اور خان صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ "چونکہ آپ دوا کی مجبوری ہے اور ریڈ وائن متبرک شراب ہے اس لیے آپ کو اس کی اجازت ہے اور ہم لوگ بھی وہی پئیں گے۔ اس کے قدغن میں وہ ہیبناٹک اثر تھا کہ خان صاحب کی زبان سے "جی سسٹر" کے علاوہ کوئی دوسرا فقرہ نہ نکلا۔ میں لحاف میں پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے سو رہا تھا جس کی وجہ سے میرا ایک پاؤں سو گیا تھا اور کچھ ایسا کرب محسوس ہوا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ پیشاب بھی لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بستر سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہا تو سوئے ہوئے پاؤں میں خون کی روانی سے جان آئی اور باتھ روم چلا گیا۔ بالکل صبح ہو چکی تھی اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اور میں دن بھر شراب کے معاملہ میں خان صاحب کی ترم خانی کو

Most obedient

Servant میں تبدیل ہونے پر مصر رہا۔ اُس وقت خاں صاحب کی شکل دیکھنے والی تھی۔ البتہ بمبے والا سے تفصیلی ملاقات نہ کرنے کی تمنا باقی تھی جس کو میں شام تک بھول بھی گیا۔

چوتھا دن ختم ہوا مگر کہرا بدستور معلق رہا۔ پانچویں شب آئی اور ہم لوگ کھانا وانا کھا کر T.V. پر مشہور انگریزی فلم Born Free کا V.D.O. کیسٹ لگا کر بارہ بجے تک دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے بستروں میں لحافوں کو سر سے پاؤں تک تان کر سو گئے۔ معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد میرے خواب کا سیریل شروع ہو گیا۔ اچھا خاصہ دن چڑھے میں خاں صاحب کے بالاخانہ پر بمبے والا کے کمرہ میں داخل ہو رہا تھا۔ "آئیے آئیے وامق صاحب آپ تو کل شب میں کھانے کے فوراً بعد ایسے غائب ہوئے کہ آپ سے کچھ ادبی گفتگو کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" "میں بھی اسی اشتیاق میں خاص طور پر آپ سے ملنے آیا ہوں، مگر پہلے یہ بتلائیے کہ آپ اِن دبے روح اور جذبات سے عاری حسینوں کے پنجۂ غضب میں کس طرح آ گئے، اور آپ ان کے ساتھ کس طرح گذارہ کرتے ہیں۔ آپ بظاہر تو حساس اور جذباتی انسان معلوم ہوتے ہیں اور ادیب بھی ہیں"۔ جواب "واقعہ یہ ہے کہ میں بمبئی کی مصنوعی زندگی اور فلمی ماحول سے تنگ آ گیا تھا کہ دو سال ہوئے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا لبنان کے ایک اسپتال میں P.A. کی آسامی کے لیے ایک ایسے جوان سال تندرست انگریزی کا M.A. کی ضرورت ہے جو Steno typist بھی ہو۔ اور میں اردو اور انگریزی کا فرسٹ کلاس ڈبل ایم۔ اے ہوں اور اردو انگریزی دونوں زبانوں کا Stenotypist بھی۔ معقول تنخواہ۔ آل فاؤنڈ سہولتیں۔ ہر سال پوری تنخواہ اور ہوائی سفر کے ساتھ ایک مہینہ کی رخصت۔ تصویر کے ساتھ درخواست مانگی گئی تھی۔ ان دلکش معاوضوں کو دیکھتے ہوئے میں نے اشتہار میں دیئے ہوئے پتہ پر درخواست مع فوٹو بھیج دی۔ وہاں سے اطلاع آئی کہ میں انٹرویو کے لیے فلاں دن تاریخ اور پتہ پر بیروت پہنچ جاؤں اور ہر حال یعنی کامیابی یا ناکامیابی پر ہوائی سفر اور D.A. ملے گا۔ جب میں بیروت پہنچا تو وہاں میرے علاوہ سفید نسل کے تین اور امیدوار تھے۔ ادارے کے کارڈنل نے چاروں امیدواروں سے گفتگو کے بعد مجھ کو منتخب کر لیا اور کہا کہ دو ہفتے کے اندر اسی جگہ بیروت پہنچ جاؤں جہاں سواری کے لیے گھوڑوں اور محافظ کا انتظام رہے گا۔ یہ سب مجھ کو بڑا رومانٹک اور ایڈونچرس معلوم ہوا اور اس طرح اُس رومن کیتھولک اسپتال پہنچ گیا اور میں Twin Doctors کا P.A. بنا دیا گیا۔ رہا میرا ادیب ہونا تو وہ برائے نام ہے۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق ہے۔ آپ بھی وقت گذاری کے لیے میری کتابیں اور رسالے لے جایا کیجئے مگر شرط یہ ہے کہ واپس ضرور کر دیجیے گا"۔ میں نے کہا "بمبئی کے ادبی سرگرمیوں کا کچھ حال سنائیے"۔ جواب "وہاں کے ادیبوں کا کیا حال پوچھنا ہے۔ بمبئی کے باشعوروں اور ادیبوں نے ایک ماہنامہ نکالا ہے جو میرے پاس پابندی سے آتا ہے۔ اس کے دو چار شمارے میرے ساتھ یہاں بھی آئے ہیں۔ بمبئی کے اُن شاعروں کی لے دے ہو رہی ہے جو فلموں سے مشہور ہو کر بڑے شاعروں میں شمار

ہونے لگے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں آپ کا بھی ذکر خیر کہیں کہیں آجاتا ہے۔" (فیڈ آؤٹ) اسی رات کئی دن تک میری ملاقاتیں بیبے والا سے ہوتی رہیں، ایک دن جیسے ہی اُن کے کمرہ میں گیا کہ ان کا Inter-com بجنے لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ ایک کھڑکی کا پردہ کھینچا تو آج ہلکے کہرے میں سے آفتاب کا زرد چہرہ جھنکتا ہوا نظر آیا۔ جس سے سردی کا احساس کچھ کم ہوا۔

آج چھٹا دن تھا۔ دس بجے دن تک کہرہ بالکل چھٹ گیا اور ہم لوگ ہفتوں سے دھوپ کے ترسے ہوئے تھے۔ گرم جرابیں اور کنٹوپ وغیرہ پہنے باہر لان میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے لگا۔ پرسوں رات سردیوں میں اتنے آدمی مر گئے۔ فلاں گاؤں میں بھالے بندوقوں کے ساتھ ڈاکہ پڑا، ایک عورت ماری گئی اور کئی زخمی اسپتال بھیج دیئے گئے۔ فلاں بینک کا خزانچی راستہ میں لوٹ لیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ پھر تلوار سی کاٹتی ہوئی تیز پچھوا ہوا چلنے لگی اور ہم لوگ پھر مکان میں اپنے کو بند کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ دوپہر میں کھانا کھا کر سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے شام ہو گئی۔ آج T.V. پر کوئی ہندستانی فلم آرہی تھی جس میں ہیروئن (ڈکوکین) کے عرب سوداگروں کے بھی کچھ کردار دکھلائے گئے تھے۔ ٹپیکل عربی لباس میں۔ پکچر چونکہ بہت بورنگ تھی اس لیے ختم ہونے سے کچھ ہی پہلے ہم لوگ کھانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ مگر باقر کے دونوں بچے سیما اور شیلی فلم میں مار دھاڑ سے بہت مخلوظ ہوتے رہے۔ کھانے کے بعد میں گرم پانی کی بوتل سے گرم بستر میں لیٹ کر Thorn Bird پڑھنے لگا اور تقریباً ۱۲ بجے نیند آگئی۔ سونے والے کو یہ اندازہ مشکل ہی سے ہوتا ہے کہ وہ نیند کی کس منزل میں خواب دیکھ رہا ہے۔ صحیح پتہ جاگنے پر چلتا ہے۔ مگر آج کے خواب سے پہلے لاشعور نے بتلایا کہ ابھی میں ایک ہی گھنٹہ سویا ہوں گا کہ کافی دن چڑھے خاں صاحب کے کمرہ میں ہم پانچوں افراد بیٹھے ہوئے ہیں اور اور ان میں کی ایک راہبہ خاں صاحب کا کارڈیوگرام لے رہی ہے۔ کارڈیوگرام پر نظر دوڑانے کے بعد اس نے بیبے والا کو خانصاحب کا نیا مینو اور نئی دوائیں لکھوا دیں۔ جس کو خاں صاحب کا عربی بٹلر لیکر چلا گیا۔ اور وہ خاں صاحب سے مخاطب ہوئی کہ "اگر آپ نے پورے ایک مہینہ اس نئے نسخہ اور مینو پر عمل کیا تو روح القدس کے صدقے میں آپ بالکل اچھے ہو جائیں گے"۔ تو خاں صاحب نے فرط مسرت میں کرسی سے اٹھ کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور وہ تھینک یو کہکر اور زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔ کمرہ میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر متعدد گھوڑوں کی ٹاپوں اور ہنہنانے کی آوازیں کان میں آنے لگیں اور بٹلر نے آکر اور ساؤدھان ہو کر بیبے والا سے کہا کہ "کچھ عرب فوجی افسران دونوں لیڈی ڈاکٹروں سے ملنا چاہتے ہیں"۔ یہ سن کر بیبے والا باہر چلے گئے اور میں ان کے عقب میں ساتھ ہو لیا۔ باہر نکل کر دیکھا تو سات آٹھ دور کابہ عرب گھوڑوں نے ٹاپوں سے مکان کے سامنے کا سبزہ کھود کر رکھ دیا ہے اور ان کے منھ سے کف جاری تھا۔ بیبے والا سے سب سے بڑے عرب فوجی افسر نے کہا کہ "ہم موسل کے شیخ الرئیس کا ڈاکٹر کرسٹائن گوڈلی سسٹرز کے نام ایک خط لائے ہیں جو میں انھیں کے ہاتھوں میں دے سکتا ہوں"۔ جب بیبے والا نے یہ خبر اُن

ان عرب ڈاکٹروں کو دی تو وہ دونوں خود باہر نکل آئیں اور باقی ہم سب لوگ بھی اُن کے ساتھ نکل آئے، کمرہ میں نئے مہمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ دھوپ تھی اور کرسیاں باہر لگادی گئیں۔ ایک بہن نے خط پڑھ کر دوسری بہن کو دیدیا۔ اور کہنے لگی کہ آپ ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔ کل خواب میں روح القدس نے ہم دونوں بہنوں کو بشارت دی تھی کہ شاید یہاں سے ہم لوگوں کو دوسرے دور دراز مقام پر جانا پڑے گا۔ عیسو مسیح کا Standing order ہے کہ ہم کسی مریض کو دیکھنے سے کسی بھی وجہ کی بنیاد پر انکار نہ کریں"

اِدھر خانصاحب نے قہوہ اور بھیے والا سے کنجی مانگ کر بٹلر سے دوسری مشروبات اور گزارے کی ہر چیز لانے کا حکم دیا اور اپنے اور ہولی سسٹرز کے لیے Red wine ۔ چند تانیوں میں دونوں نوکروں نے میزیں لگا کر اُن پر بیروت کا بہترین ناشتہ چن دیا۔ خاں صاحب نے اپنے نئے مہمانوں کو دعوت طعام دی۔ جب ان عربوں کے جسم میں کچھ گرمی پیدا ہوتی تو ان کے چیف نے ہولی سسٹرز سے دریافت کیا کہ "آپ کس وقت تک مراجعت کا ارادہ رکھتی ہیں"؟ جواب "جس وقت آپ تین جیپوں یا پانچ شائستہ گھوڑوں اور دس ٹٹوؤں یا خچروں کا کنوائے مہیا کردیں۔ چیف نے کہا "سڑکیں موٹر یبل نہیں ہیں اس لیے گھوڑوں اور ٹٹوؤں کا انتظام ابھی ایک گھنٹہ میں ہوجائے گا۔ آپ تیاریاں شروع کریں اور ہم سواریاں لیکر آتے ہیں۔ راستہ خطرناک ضرور ہے مگر ہمارے پاس گیارہ رائفلیں اور ایک پستول ہے جو لٹیروں کو دور رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ کوئی فکر نہ کریں"۔ اور وہ سب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر بیروت کی رسدگاہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ اور یہاں سامان بندھنے لگا۔ بھیے والا سے میں نے پوچھا" اور پانچواں گھوڑا کس کے لیے ہے"، تو وہ بولے، "آپ کے لیے۔ آپ کے بلبے بلبے بال اور چہرہ پر تفکر کے نشانات ان کو بہت پسند آئے ہیں۔ اور شاید آپ کو موسل سے چھٹی پانے کے بعد اپنے H.Q. چلنے کی دعوت بھی دیں"۔ میں نے کہا" میں آوارہ روح کی طرح ہوں مجھ کو کوئی پابند نہیں کرسکتا۔ خیر چلئے آگے دیکھا جائیگا"۔ اور یہ کارواں ٹھیک ۱۲ بجے دن کو موسل کی طرف روانہ ہوگیا۔ ان میں سے ایک ہولی سسٹر نے رخصت ہوتے ہوئے خاں صاحب سے پھر کہا کہ اگر آپ بے چون وچراں میرے بتلائے پرہیز اور نسخہ پر عمل کرینگے تو ایک مہینہ میں بالکل تندرست ہوجائیں گے۔ میں نے آپ کے بٹلر کو خاص طور پر اس پر سختی سے عمل کرنے کو بتلادیا ہے"۔ میں نے خاں صاحب کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا" اگر ترنگ آئی تو موسل سے آپ کے پاس پھر آجاؤں گا، ورنہ اُسی طرف سے وطن واپس چلا جاؤں گا"۔

راستہ بہت بیہڑ تھا۔ نالا، ندی، پل، پہاڑ اور جنگل سے گذرتا ہوا جب قافلہ دمشق کی شہر پناہ کے پھاٹک پر تقریباً نصف شب میں پہنچا تو ہولی سسٹرز کے خیر مقدم کے لیے وہاں کے کلیسا کا پادری راہباؤں کو دیکھ کر سینہ پر چلیپا بنانے لگا۔ اس کے ساتھ دو شمع بردار بھی تھے۔ اس نے کہا" آپ سب لوگ ہمارے ساتھ گرجا چلئے وہاں سب زائرین ان دو ہولی سسٹرز کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ سب لوگ ہمارے گرجا کی خانقاہ میں آج رات آرام کریں گے"۔ چنانچہ ہم لوگوں نے

چرچ سروس میں شرکت کی۔ اس کے بعد خانقاہ میں ٹرکی، خرگوش اور ریڈ وائن کی دعوت کھائی اور پہلے سے لگے ہوئے بستروں میں آرام سے سو گئے۔ شہد رہ دہلی کے بستر میں آنکھ کھلی تو رات کے تین بج رہے تھے اور ہم پیشاب کر کے پھر سو رہے۔ قافلہ وہاں سے موسل جانے کے لیے پھر روانہ ہو گیا۔ موسل کا راستہ شمال سے قدرے بہتر تھا۔ راستہ میں لٹیروں کے غول ملے مگر رائفلیں اور بندوقیں دیکھ کر سب درختوں اور چٹانوں کی آڑ میں چھپ جاتے تھے۔ دوپہر کا لنچ ہم لوگوں نے ایک نہایت سایہ دار آب رواں کے نخلستان میں لیا۔ سیاہ رطب بھی توڑ کر کھائے جو شہد سے بھرے ہوئے عنب شاہی علوم ہوتے تھے۔ Stamina بڑھانے کے لیے دو دو تین تین چمچ اونٹ کا دودھ بھی پینا پڑا۔ تھوڑی دیر استراحت کرنے کے بعد قافلہ اپنی منزل کے آخری دور میں داخل ہو گیا اور غروب آفتاب کے قریب ہم لوگ ایک ایسے اونچے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے شیخ الرئیس کا عالیشان فلک بوس محل دکھلائی دے رہا تھا۔ فوجی افسر کی موجودگی میں ہم لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار شاہی محل کے اندر داخل ہو گئے۔ محل کے سناٹے نے بتلایا کہ یا تو شیخ الرئیس بہت زیادہ بیمار ہے یا شاید مر گیا ہے۔ ہم سب لوگ پہلے ایک بہت بڑے ہال میں بٹھائے گئے۔ اور ہم میں ہر ایک کی پشت پر فوجی سپاہی رائفل سمیت پہرہ دے رہے تھے یا یوں سمجھ لیا جائے کہ ہم لوگ ایک طرح کے قیدی تھے کہ کوئی فرار نہ ہو جائے۔ فوجی افسر مع وزیر اعظم کے جوتوں پر کریچ کے پائتابے پہنے ہوئے ہم لوگوں کے پاس آئے جن کا ہم لوگوں سے تعارف کرایا گیا۔ ہولی سسٹرز کو وزیر اعظم نے بتلایا کہ شیخ کی دل بستگی کے لیے ان کے سامنے رقص و سرود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی خاص نور نظر یورپین رقاصہ اس وقت اپنے فن کا کمال دکھلا رہی ہے۔ شیخ اس کا رقص دیکھ کر جوش میں اٹھتے ہیں اور انتہائی کمزوری ان کو پھر لیٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ "اگر آپ اس حالت میں شیخ کو دیکھنا چاہتے ہیں تو چلیئے"۔ ایک ہولی سسٹر نے کہا "ہاں ہم اس کو فوراً دیکھنا چاہیں گے۔ ہم شیخ کو ان کی Natural living condition میں دیکھنا چاہیں گے۔ ابھی ان سے ہمارا تعارف نہ کروائیے گا۔ چنانچہ ہم چار، دو عورتیں اور دو مرد شیخ کے آرام کمرہ میں لیجائے گئے، جس میں عیادت کرنیوالوں کے لیے آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ شیخ اپنی مسہری پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور یورپین رقاصہ اپنے کمالات فن دکھا رہی تھی۔ رقاصہ کو دیکھ کر ایک راہبہ نے وزیر اعظم سے دریافت کیا کہ یہ رقاصہ یہاں کتنی مدت سے شیخ کی خدمت کر رہی ہے اور شیخ کتنی مدت سے بیمار ہیں؟ جواب: "یہ رقاصہ جس کا نام نینسی اور گولڈ بگ ہے یہاں ایک سال سے ہے اور شیخ تقریباً چھ ماہ سے صاحب فراش ہیں"۔ یہ سن کر ایک راہبہ اٹھی اور رقاصہ کے عقب میں جا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا کمر بند مضبوط پکڑ لیا اور بہ آواز بلند بولی "او حرامزادی رنڈی "نینسی گولڈ بگ" (Nany Goldbug) تو ویٹیکن میں ہمارے یہاں سے قیمتی تصویریں اور نوادر چرا کر راتوں رات Tel Aviv (اسرائیل) فلائی کر گئی تھی، اور اب عراق کے تیل پر قبضہ کرنے کے لیے تو یہاں رقاصہ بنا کر شیخ کے حرم میں بھیجی گئی ہے"۔ وزیر اعظم سے "آپ اس کو فوراً حراست میں لے لیجئے، مگر احتیاط سے

اس کے کپڑوں کی تلاشی لیجیے، اس کا ہاتھی دانت کا پستول کہیں ضرور پوشیدہ ہوگا۔ یہ ازرائیل کی جاسوس ہے اور شیخ کو دیر اثر زہر دے رہی ہے۔" یہ سننا تھا کہ رقاصہ ناگن کی طرح پلٹی اور راہبر پر پستول داغ دیا جس کی گولی اس کے بائیں بازو کو چھیلتی ہوئی خالی گئی اور رقاصہ کو پہرہ کے مسلح سپاہیوں نے گرفتار کر کے پستول چھین لیا۔

شور سن کر ایک طرف شیخ جاگ اٹھا اور دوسری طرف اپنے گرم بستر میں میں۔ اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے یہ قسط وار مسلسل خواب بند ہو گیا۔ اور دو سال سے میں نے ابتک کوئی خواب نہیں دیکھا۔

دہلی کے قیام میں باقر سے میں نے اس خواب کا ذکر کیا اور ان کی رائے مانگی تو وہ بولے کہ ابا میں آپ کے بیٹے کی حیثیت سے آپ کے خواب اور اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے معذور ہوں۔ اپنے جونیر تیاگی اور ریتا سے اس کو Discuss کرونگا۔ اور وہ لوگ آپ سے بات کریں گے۔ تیاگی اور ریتا بھی مجھ سے کافی مانوس تھے، اس لیے ان لوگوں نے بھی میرے خواب کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے اس خواب کی لاشعوری نفسیاتی جڑیں دریافت نہ ہو سکیں۔ اور میں کسی پیشہ ور سائکیٹرسٹ سے اس پر تبادلہ خیال کے لیے تیار نہ تھا، اور نہ ہی اس کے لئے فالتو پیسے تھے۔

●●

تیرہواں باب

کجگاؤں ہی میں

جب میں دہلی سے ۲۰؍فروری ۱۹۸۴ء کو دو ماہ کے بعد گھر واپس آیا تو دوسرے ہی دن ابجے کمار، ہوش جونپوری، نثار جونپوری اور شمیم احمد، اس یاددہانی کے لیے لال کوٹھی کے برآمدہ میں موجود تھے کہ ۲۳؍فروری ۱۹۸۴ء بروز جمعرات ہندی بھون جونپور میں ایک بجے دن سے رات گئے تک وامق جونپوری کا ۷۵واں یوم پیدائش منایا جائے گا۔ اس میں فلاں فلاں اردو ہندی کے ادیب، نقاد، شعرا اور صحافی شرکت کر رہے ہیں اور فلاں فلاں جونپور کے ادارے میزبان ادارہ بھارتیہ بھاشا سنستھان جونپور سے پورا پورا تعاون کر رہے ہیں۔ آپ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ آپ بارہ بجے دوپہر تک ہندی بھون ضرور بہ ضرور پہنچ جائیں۔ ۱۱ بجے کار آجائے گی۔ (اس یاددہانی اور دعوت میں نہایت بالتکلف، غیر جذباتی اور پروقار فصل اور بے نیازی کا مظاہرہ شامل تھا۔ یعنی میری گذشتہ بے مروتی اور زیادتیوں کا مجھ سے خلوص آمیز انتقام لیا جارہا تھا اور طرفین ان سب سے لطف اٹھا رہے تھے)۔

چنانچہ میں ۲۳؍فروری کو اپنے Sunday best میں ٹھیک بارہ بجے دن کے وقت ہندی بھون کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ ان دنوں جونپور میں بھی سخت سردی پڑ رہی تھی جس کو ہمارے اطراف میں "بڑھیا کا جاڑا" کہتے ہیں۔ باہر دھوپ میں لان پر کچھ جانی پہچانی اور کچھ نئی صورتیں دکھائی دیں اور بڑھ کے ابجے کمار نے جن کا تعارف مجھ سے کرایا۔ دوسری طرف دیگ ٹھنک رہا تھا۔ اور ہندی بھون کے مہمان خانہ میں مہمانوں کو دوپہر کا کھانا کھلایا جارہا تھا۔ کھانا کھانے والے اور کھلانے والوں دونوں ہندی اردو کے ادیب تھے۔ کوئی نوکر نہ تھا۔ کھانا بھی ابجے کی بیوی آشا اور عشرت صدیقی نے اپنی نگرانی میں پکوایا اور خود پکایا تھا۔ میں نے آشا کی دعوت پر کھانے سے معذرت چاہی کہ میں گھر سے کھا کے چلا تھا۔ مگر چائے اور کافی؟ ان کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے چائے اور کافی کا دور چلا۔ ہندی بھون کے آڈیٹوریم میں مائک پر ہلو ہلو ہونے لگا۔ O.K.۔ اور دو بجے ٹھیک سامعین اور ادیبوں سے بھرے ہوئے ہال میں سیمینار شروع ہوگیا۔ جس کی صدارت کیفی اعظمی نے کی۔ اور نظامت کے فرائض گورکھپور کے مشہور صحافی اور ترقی پسند ادیب ایم کوٹھیا دی راہی نے انجام دئے۔ سیمینار ہال کی دیواریں اور پینلز (Panels) وامق جونپوری کے اشعار پر مبنی تصویروں سے بھرے ہوئے تھے جن میں ابجے کمار اور حفیظ شاعر خطاط کی بنائی ہوئی تصویریں بہت خوبصورت اور تصوراتی تھیں۔ اور شعروں کا انتخاب مجھ کو رسوا کر رہا تھا۔

سیمینار کا موضوع تھا "وامق جونپوری کی شخصیت اور شاعری کے توسط سے اردو ہندی ترقی پسند شاعری پر گفتگو" رائچ نے موضوع کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے باہر سے آئے ہوئے نقادوں میں سب سے پہلے الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر علی احمد فاطمی کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد گورکھپور یونیورسٹی کے ڈاکٹر افغان اللہ نے اپنا مقالہ پڑھا۔ یہ دونوں مقالے بیحد انہماک سے سنے گئے۔ تقریر کرنے والوں کے اور نامہ نگاران اخبارات کے قلم بڑی تیزی سے نوٹ لے رہے تھے۔ بنارس یونیورسٹی کی ڈاکٹر قمر جہاں بیگم نے موجودہ مقالہ تیار نہ کر سکنے کی معذرت کرتے ہوئے موضوع پر بڑی پرمغز تقریر کی۔ اس کے بعد مقالوں پر بحث شروع ہوئی اور تقاریر کے دور کا آغاز ہوا جس میں بنارس یونیورسٹی کے ڈاکٹر اودھیش پردھان ہندی نقاد۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ہندی ادیب رام جی رائے، لکھنؤ کے ہندی نقاد اور صحافی ایچ سنگھ پردیپ سوریہ اور اردو کے ادیب باقر زیدی، کانپور کے ہندی کوی کمل کشور شرمک، اردو شاعر انور جلال پوری اور حیدرآباد کے بزرگ مزاح نگار برق آشیانوی اور مقامی ادیبوں میں مشہور ہندی شاعر چھیم جی، اردو کے شاعر عبدالباری ایڈوکیٹ اور لبھے کمار نے حصہ لیا۔ بحث میں بڑی گرما گرمی رہی اور دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور سب تحریروں اور تقریروں کی تان اس نقطہ پر ٹوٹی تھی کہ وامق جونپوری کے ساتھ نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے دیانت داری سے کام نہیں لیا اور مجرمانہ غیر ذمہ داری اور سطحیت کا ثبوت دیا ہے۔ وامق جونپوری جس ادبی حیثیت اور بلند مقام کے مستحق تھے ان کے اعتراف میں جاہلانہ خست سے کام لیا گیا ہے۔ جبکہ ترقی پسند شاعروں میں ان کی تخلیقات، خدمات اور اضافے (Contribution) اگر سب سے زیادہ نہیں میں تو کسی سے کم بھی نہیں اور ان کی عظیم ادبی حیثیت ان سے بہت پست درجہ کے ادیبوں میں بانٹ دی گئی ہے۔ ان سب باتوں کے اسباب کیا ہیں اور اس المیہ کے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ تاریخ ادب پر نظر ثانی اور غلط بیانیوں کا جائزہ اور ازالہ ادب کے حق میں انتہائی ضروری ہے۔ اس ضمن میں نیاز اکبرآبادی، نزالا اور مکتی بودھ وغیرہ کی مثالیں بھی پیش کی گئیں۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر فاطمی نے بڑے جذباتی انداز میں یہ تک کہہ ڈالا کہ تعجب ہے کہ سردار جعفری نے اپنی کتاب میں ترقی پسند ادیبوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے وامق کا نام ضمناً وغیرہ وغیرہ میں لیا ہے۔ (اس پر سامعین نے شیم شیم بھی کہا)۔

جب میں نے دیکھا کہ بحث کا پارہ بہت اونچا چڑھتا جا رہا ہے اور ادب کے اس المیہ میں ملوث ادیبوں اور نقادوں کے کھلم کھلا نام بھی آنے لگے ہیں تو اس آگ کو فرو کرنے کے لیے میں خود اس آگ میں کود پڑا۔ میری تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ "میرے ساتھ نقادوں اور تاریخ نویسوں کا رویہ کتنا بھی معاندانہ رہا ہو کچھ میں نے بھی اپنی بے نیازی اور انا کا قسم لگا ہوا نہ چھوڑا۔ ادبی دنیا میں مناسب مقام اور جائز شہرت حاصل کرنے کے لیے بھی پروپیگنڈا مشنری کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مشنری کبھی میرے پاس تھی ہی نہیں۔ ادبی مراکز مثلاً دہلی، بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ سے مجھ کو اکثر دور رہنا پڑا۔ دوران قیام علیگڑھ میں وہاں کے ادیبوں سے

انجمن ترقی پسند مصنفین کے مسئلہ پر اور وہاں کے ادبی ٹھیکیداروں کے ذہنی دیوالیہ پن سے اکثر برسرِ پیکار رہنا پڑا۔ نظریاتی اختلافات میں شکست ماننے کے لیے میں تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہاں سے بے لطفی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ان حضرات کی ادبی حیثیت میری نظروں میں کبھی نہ سمائی تھی۔ "ادبِ لطیف" لاہور اور "آبشار" کلکتہ کے اس دور کے شمارے اس جنگ کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں علیگڑھ سے شائع ہونے والی کتابوں اور رسالوں میں ظاہر ہے کہ میرا کوئی ذکرِ خیر نہیں مل سکتا خواہ وہ تاریخ اردو ادب ہو یا وہاں سے نکلنے والے جریدے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی گروہ بندی سمجھوتہ بازی اور "سگِ حضور بہ از برادرِ دور" والی روایت بہت کام کرتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنے نام و نمود کے لیے میں نے کبھی کوئی شارٹ کٹ اختیار نہیں کیا۔ اس میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ مرکز سے قریب رہنے میں اختلاط پیدا ہوتا ہے اور اختلافات اور مسائل کے حل ہو جانے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں اور جب آنکھیں چار ہوتی رہتی ہیں تو بے مروتی اور فرعونیت کے امکانات کم ہو جاتے ہیں میری ادبی حیثیت کی ترسیل میں بھی میں اپنی کوتاہیوں اور ناشروں کی نااہلی کا شکار رہا ہوں۔ میرے تین شعری مجموعے شایع ہوئے اور تینوں میں سے کسی کا Disposal اطمینان بخش نہ ہوا۔ مگر سردار جعفری اور دوسرے ناقدین کو یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ ان کو میری کتابیں نہیں ملیں۔ علاوہ اس کے میری تخلیقات برابر برصغیر کے موقر جریدوں میں شایع ہوتی رہی ہیں اور تب بھی میرا ذکر ضمناً وغیرہ وغیرہ میں آئے تو مورخین اور مبصرین کی بد دیانتی اور معاندت ضرور ثابت ہوتی ہے۔"

سیمینار میں مقررین کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے یہ بھی کہا کہ "فنکار کا اپنی تخلیقات کی طرف سے صد فی صد مطمئن ہو جانا فن کے ناپید اکنار امکانات کو جھٹلاتا ہے۔ تاہم میں بڑی حد تک اپنی تخلیقات کی طرف سے اس لیے مطمئن رہا ہوں اور اس پر بھروسہ کرتا ہوں کہ اس میں میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیا ہے، اور اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا۔ اس کے لیے میں کسی عصری سند کی بھی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ اور اگر اس کو بھی قدرے ضروری مان لیا جائے تو میری مسرت اور میری ادبی حیثیت اور اہمیت کے ثبوت کے لیے یہ کیا کم ہے کہ آج ہندی بھون کا یہ کھچا کھچ سامعین اور ادیبوں سے بھرا ہوا ہال اور باہر لاؤڈ اسپیکروں پر سیکڑوں مزدور اور محنت کش ڈیڑھ دن سے باوجود سخت سردی کے محو سماعت ہیں۔ میری خوشی اور افتخار کی کوئی انتہا نہیں جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے ہم وطن اور دور دراز سے اتنی بڑی تعداد میں آئے ہوئے اردو ہندی کے ادیب مجھ کو اور میری شاعری کو کس قدر عزیز رکھتے ہیں اور قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ آج کے اس جلسے نے تو مہا کوی تلسی داس اور اسی ہی انگریزی کی پرانی کہاوت "پیغمبر کا بھی اس کے وطن والے احترام نہیں کرتے" (A prophet is not honoured in his own land) کو بھی غلط ثابت کر دیا۔ بہر حال آپ حضرات اردو نقادوں اور مورخین سے جو اس قدر بیزار نظر

آئے ہیں تو آپ کو اس حقیقت پر اظہار مسرت بھی کرنا چاہیے کہ بھارتیہ بھاشا سنستھان کے سربراہ ہندی ادیبوں (اجے کمار اور شمیم احمد) نے اپنے مساعی اور تحریروں سے اس کی تکذیب اور ازالہ کر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ اردو کے ہفت روزہ تپھیر جونپور کے مدیر اعلیٰ نثار جونپوری اور مدیر عاقل جونپوری اور ہندی کے ہفت روزہ "سمئے" نے تو جیسے یہ بیڑہ اٹھالیا ہے کہ وہ میرے تاج عظمت کے سارقوں کا پول کھول کر دم لیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اردو کے پیشہ ور نقادوں کی بددیانتی چند دنوں میں خود ان کی رسوائی کا مواد مہیہ کردے گی۔"

مگر میری صفائی کسی نے تسلیم نہ کی۔ ڈاکٹر اودھیش پردھان نے کہا کہ "وامق صاحب! یہ مسئلہ تنہا آپ کا نہیں ہے۔ دل کو چھو لینے والی باتیں کہنے والے جاندار ادیبوں کے خلاف نام نہاد ادب کے ٹھیکیداروں کی یہ خوب سوچی سمجھی سازش اور تخریبی تحریک ہے جس میں بہت گھٹیا قسم کے حربے استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ ہم سب کو اس کا بھانڈا پھوڑنا ہے۔ ہم سب ہندی ادیب وامق کی تخلیقات کو صحت مند قومی شاعری کا ایک سمبل مان کر آگے چل رہے ہیں۔ اُن کی نظم "سفر ناتمام" آج کے ہندی اردو ساہتیہ کا ایک مشترکہ ترکہ ہے، جس پر اردو نقادوں نے کوئی توجہ نہ دی تو ان مسائل کو جو اس میں پیش کئے گئے ہیں، بحث میں لانا پڑے گا۔ اعتراف کریں گے تو اپنی آسودہ زندگی کو خطرہ میں ڈالنا ہوگا۔ انحراف کریں گے تو عوام دامن تھامیں گے، اسی لیے خاموش رہنے میں بڑی عافیت ہے۔ (Silence is the best assylim)"

یہ سیمینار ۲ بجے شروع ہو کر ۶ بجے شام کو ختم ہوا۔ بلا اختلاف رائے یہ سیمینار بہت کامیاب اور چند بہت نتیجہ خیز سیمیناروں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔ کیفی نے اپنی اختتامیہ تقریر میں بڑے پرجوش انداز میں اعتراف کیا تھا کہ "انھوں نے اپنی زندگی میں اردو ہندی کے مخلوط اجتماعات بہت دیکھے ہیں، مگر جس جذباتی ہم آہنگی قربت اور لسانی اخوت کا مظاہرہ آج کے سیمینار میں دیکھنے کو ملا ہے، میری یاد میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ رہا یہ مسئلہ کہ وامق کو ادبی تاریخ میں ان کا جائز مقام ملا یا نہیں تو میں اس ضمن میں صرف دو باتیں کہوں گا۔ وامق کی نظم "بھوکا بنگال" کو ترقی پسند ادب میں جو توقیر ملی وہ کسی دوسری نظم کو نہیں ملی۔ اس کو جوش، سجاد ظہیر، سردار اور میں نے پونا کی سڑکوں پر گایا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ابھی تک ترقی پسند ادب کی کوئی معتبر اور ہمہ گیر تاریخ ہی نہیں لکھی گئی ہے اور جب وہ لکھی جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ وامق کو اس میں وہ بلند مقام نہ ملے جس کے وہ ہر اعتبار سے مستحق ہیں۔"

اس کے بعد سامعین رخصت ہوئے اور مقامی اور غیر مقامی ادیب مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کافی کا دور چلنے لگا اور سیمینار میں ظاہر کیے ہوئے خیالات کا پوسٹ مارٹم ہونے لگا۔ ڈاکٹر اودھیش پردھان، اجے سنگھ (لکھنؤ) اور الہ آباد کے رام جی رائے نے یہ طے کیا کہ ہندی اردو ادب کے ان ٹھیکیداروں کے خلاف ایک زوردار اندولن چلانے کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ ہندی اردو اور انگریزی اخباروں اور رسالوں میں ان ادب دشمنوں کو Expose کیا جانا چاہیے۔ بنارس، الہ آباد، لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں آج کے سیمینار کا سلسلہ قائم رکھنا چاہیے۔ ان ادبی بددیانتیوں کو عوام کے سامنے لانے کے لیے ہمارے پاس مواد (Material)

کی کمی نہیں ہے۔ واثق صاحب نے اپنے کسی مضمون میں ٹھیک ہی لکھا تھا کہ کوئی ادبی بد دیانتی بہت دنوں تک صیغۂ راز میں نہیں رہ سکتی۔ ہم اس کو ثابت کر کے دکھلائیں گے۔"

ایک جواں سال اردو ادیب کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا کہ "ابھی چوٹی کے تمام ادیبوں کی ادبی حیثیت غیر متعین اور غیر معتبر ہے۔ اس وقت تو ہم کو یہ دکھائی دیتا ہے کہ جتنے مشہور شعرا ہیں سب دھوکے کی ٹٹی کی آڑ سے اپنی اپنی کٹھ پتلیاں نچا رہے ہیں اسلیے بھی ہم کو جلد از جلد ان شاعروں کی تخلیقات کا Reassessment کرنا چاہیے۔ بہت ضروری ہے کہ ہندی اردو کے نئے مستند دانشوروں اور نقادوں کا ایک Reassessment Board بنے جس کو یہ تحقیقی کام بڑی دیانتداری اور بے لوث طریقہ سے کرنا ہوگا کہ کسی وقت ان پر بھی وہی الزامات عاید نہ ہوں جو آج کے نقادوں پر کیے جا رہے ہیں۔"

اس طرح شب کے آٹھ بجنے کو آئے اور آشا گھبرائی ہوئی آئی کہ سب لوگ چلیے اور کھانا کھا لیجیے۔ ابھی تو کئی کار کرم باقی ہیں۔ آڈیٹوریم سے بالکل لاحق بھارتیہ بھاشا سنستھان کے دفتر کا بڑا کمرہ کھانے کا فرشی کمرہ بن گیا تھا۔ چنانچہ ہم سب لوگ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا کھایا گیا جو واقعی بہت لذیذ تھا۔ بریانی اور رائتے کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ نوشی اور نثار کا کام ہر بات کی نگرانی تھی اور یہ دونوں شاعر جونپور کے (قاضی شہر) ہونے کی حیثیت سے دبلے ہوئے جا رہے تھے۔

اس کے بعد ۹ بجے کے قریب ہم لوگ پھر ہال میں لائے گئے جس میں ڈائس بھی پہلے سے بہت بڑا ہو گیا تھا اور بجائے کرسیوں کے ہال میں فرش بچھا ہوا تھا جس پر سامعین سخت سردی کی وجہ سے دُلائی، کمبل یا گرم کوٹ پہنے اور پہلو سے پہلو جوڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا اور کنارے کنارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ڈائس پر اردو ہندی کے شعرا اور کوی حضرات اور مہمانان خصوصی بٹھائے گئے۔

اور تھوڑی ہی دیر میں آشا اور اس کی چھوٹی بہن ورشا کی قیادت میں K.G. Class کے ۵۰ بچے اپنی ننھی منی ہتھیلیوں پر ۵۰ جھلملاتے ہوئے دیے سنبھالے ڈائس کے سامنے ہال میں داخل ہوئے۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ آگے رکھی ہوئی ایک میز پر ان بچوں نے چراغوں کو سجا دیا اور Happy birth day to you کا ہندی ورشن تالی بجا بجا کر گایا۔ دیوں کی جھلملاہٹ اور بچوں کی کوئل جیسی کومل آواز میرے دل پر متضاد اثر ڈال رہی تھیں۔ مسرت و غم کے توام آنسو میری آنکھوں میں ڈبڈبا گئے، جن کا چھپانا یا بہانا دونوں مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد شمیم احمد نے ڈائس کا مالک سنبھالا اور اعلان کیا کہ اب واثق صاحب تخت کے کنارے آکر تشریف رکھیں تاکہ گل پوشی کی رسم ادا کی جائے۔ مجھ پر ایسی رسموں کا کوئی خوشگوار اثر نہیں ہوتا مگر ایسے عوامی مظاہروں کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔

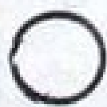
اس رسم میں شہر کے جملہ ادبی، سماجی اور تعلیمی ادارے اور مقامی جریدے شامل تھے اور سب سے آخر میں ابجے کمار نے بھارتیہ بھاشا سنستھان کی جانب سے ایک طلائی تمغہ میری گردن میں ڈال دیا اور اپنی تازہ ترین کویتاؤں کا قلمی انتخاب پیش کیا۔ کتاب تو میں نے اپنی پورٹ فولیو میں رکھ لی اور وہ طلائی تمغہ ان بچوں کو دیدینے کا اعلان کر دیا جنھوں نے میری عمر کے ۵۰ برسوں کو روشن دیوں میں

(چند ہی منٹ کے لیے سہی) تبدیل کردیا تھا۔ (اور وہ طلائی تمغہ بچوں کے اسکول کے ڈرائنگ روم میں شیشہ کے فریم میں آج بھی آویزاں ہے)۔ میں اب اس عمر میں اپنے چھوٹے بھائیوں سے تمغہ لوں؟ ان کا اخلاص اور ادب کے لیے ان کی جد و جہد میرے لیے کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے۔

ان سب رسوم کے بعد کیفی اعظمی کی صدارت اور ثقلین حیدر کی نظامت میں اردو ہندی کے ملے جلے شاعروں اور کویوں کا ایک گنگا جمنی مشاعرہ ہوا۔ افتتاح انور جلال پوری نے اپنی مختصر مگر بہت جامع تقریر سے کیا۔ جس میں انھوں نے اس قسم کے مشترک اجتماعات اور موقع کی اہمیت پر روشنی ڈالی تھی۔ مشاعرہ شروع میں بہت اچھا چلا مگر کچھ دیر بعد چند فرقہ پرست، آسودہ حال گھرانوں کے نوجوانوں نے انتشار پیدا کرنا چاہا جو آجکل کے مشاعروں کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر منتظمین نے ان تخریب کاروں کو نام بنام پکار کر ہال چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد مشاعرہ تین بجے صبح تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ اس موقع پر ہر کوی اور شاعر نے اپنا بہترین کلام سنایا جس کو سامعین نے بہت توجہ سے سنا اور پسند کیا۔

مشاعرہ ختم ہونے پر کیفی نے اپنی اختتامیہ تقریر میں سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا اور اپنی سہ پہر والی بات پھر دہرائی کہ آج کے پورے فنکشن میں اردو ہندی کی اتنی جذباتی قربت قابل رشک اور مثالی ہے اور میں وامق صاحب کو ان کی ۷۵ ویں یوم ولادت کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ان کا کاز (Cause) ہندی اردو ادب کا ایک مشترک کاز بن گیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ اشتراک بڑھتا ہی رہے کم نہ ہو۔ اس کے بعد لیے کمار اور نثار نے کیفی کو کمبل اور لحاف میں لپیٹ سمیٹ کے کار میں بٹھا کر ان کے گاؤں روانہ کیا جو ضلع اعظم گڑھ میں جونپور سے تقریباً چالیس کلومیٹر پر ہے۔ اور میں اپنے گھر کجگاؤں پہنچ کر دن بھر سوتا رہا۔ اور دوسرے دن سے زندگی پھر اپنے پرانے ڈھرے پر آگئی۔ شعر گوئی، باغبانی اور رگس بانی۔

زوار جونپوری کا اس اجتماع کے اخباری فوٹو گرافر تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ زوار نے فوٹو گرافی کو ایک فن بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس دن درجنوں تصویریں لیں اور کمال یہ کہ اس پورے فنکشن میں محض دو مرتبہ دکھائی دئے گئے جب کہ اس فن کے ماہرین پھٹتے رہتے اور تصویریں کھینچتے رہتے ہیں۔



۲۳ فروری ۱۹۸۴ کو میری ۷۵ ویں سالگرہ (Diamond Jubilee) منائی جا چکی ہے اور اسوقت ترقی پسند اردو ادیبوں میں، میں سب سے معمر ادیب ہوں۔ اس موقع پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں مقالہ نگاروں اور دوسرے ہندی اردو کی نئی نسل کے ادیبوں نے اردو کے ان مورخین اور پرانے نقادوں کو بددیانت اور قابل الزام ٹھہرایا جنھوں نے میری ادبی حیثیت

کے ساتھ بددیانتی کی ہے یہ بہت بڑا الزام ہے اور اس کا اتنا ہی بڑا ثبوت ہونا چاہیے اور سیمیناروں میں ادب کے ٹھیکیداروں سے اعلان بیزاری کی وہ گونج ملک کے ہر ادبی حلقہ میں پہنچنا چاہیے۔ الزامات کا ثبوت فی الفور ان نوجوان ادیبوں کے بس کی بات نہیں جب تک ان کو گذشتہ چالیس پینتالیس برسوں کے واقعات، سانحات، ذاتیات، مکروہات اور خرافات کی وہ فہرست نہ دے دی جائے جن سے خود ترقی پسند ادبی انجمن اور افراد انجمن متاثر ہوتے رہے ہیں۔ ان حقائق کا انکشاف اس نہج سے بھی ضروری ہے کہ مرحوم انجمن ترقی پسند مصنفین کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کے بحران کے اسباب و علل سامنے لائے جائیں تاکہ آئندہ پھر کسی کو تکرار جرم کی جرأت نہ ہو۔ ان مواد کی نشاندہی کرنا میرا اور دوسرے دیانتدار ادیبوں کا فرض ہے کہ اپنے دوسرے جنم میں انجمن ترقی پسند مصنفین دوبارہ اسی طرح کے مصنوعی بحران کا شکار نہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر ان افسوسناک واقعات کی ایک طویل فہرست میرے حافظہ میں ابھرنے لگی۔ مجھ پر کوئی ادبی، اخلاقی یا قانونی پابندی بھی نہیں عائد ہوتی جو ان کے اظہار پر کوئی بندش (Taboo) لگا سکے۔

سچی بات کڑوی ہوتی ہے اور ان باتوں کا انکشاف تو بہت زیادہ کڑوا ہوتا ہے جس کے متعلق یہ سوچا جا رہا ہے کہ لوگ اس کو بھول چکے ہوں گے۔ مگر یہ ایسے پتھر کی لکیریں ہیں جو مٹائی نہیں جا سکتیں۔ جستجو طلب نئے اذہان کو بیزاری، الجھن اور جھنجلاہٹ سے نجات ملنی چاہیے۔ یہ اذہان سادہ لوح (Clean Slate) ہیں۔ آج وہ میرے مسئلہ کو لیکر ترقی پسند تحریک اور ادیبوں میں اس کے محرکات اور اسباب ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جن باتوں کا مجھ کو براہ راست علم ہے ان کو بتلا دوں۔

بادشاہوں کے چشم و ابرو کے اشاروں پر، حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے اور جاہ و ثروت کے لیے خود ادیبوں کی آپس کی رسہ کشی اور معاصرانہ چشمک کے سلسلہ میں اس طرح کے جرائم ہر عہد میں سرزد ہوتے رہے ہیں۔ ان کے محرکات استحکام حکومت، حصول مفاد اور رشک و حسد رہے ہیں۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں ادیبوں پر مظالم اور سختیاں ہوتی تھیں اور یہی ان سے توقع بھی تھی۔ "فرزندان ایسٹ انڈیا کمپنی سے خطاب" پر جوش ملیح آبادی کا احتساب ہوا۔ اقبال کو ان کی مغرب دشمنی کی بنا پر نوبل اعزاز سے محروم رکھا گیا۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کتاب "انگارے" ضبط ہوئی، مگر محل استعجاب یہ بات ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد ترقی پسند ادیبوں سے بدسلوکی، بے اعتنائی اور مظالم کی ذمہ داری عہدہ دار ترقی پسند ادیبوں نے خود اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ جن کی چند مثالیں نہایت شرمناک اور ناقابل معافی ہیں۔

پرویز شاہدی صف اوّل کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کو اس کی زندگی میں ان ادبی ٹھگوں نے کسی موقع پر ابھرنے نہیں دیا۔ مگر حق سر پر چڑھ کے بولتا ہے اور عوام جھوٹی تاریخوں کو مسترد کر کے نئی تاریخ لکھتے ہیں۔ آج اسی پرویز شاہدی

کا نام اور اس کی عظمت کا اعتراف بخط جلی ہو رہا ہے اور آج ملک کے بڑے بڑے بزعم خود ادیب پرویز شاہدی اعزاز کے لئے منھ کھولے بیٹھے ہیں۔ بنگال اردو اکاڈمی نے ایک مردہ کو زندہ کر کے بڑا کام کیا۔

تقریباً جاں نثار اختر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مگر مدھیہ پردیش کے عوام اور وہاں کی اردو اکاڈمی نے اس تخریبی دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ مخدوم محی الدین کی ادبی خدمات کا ذکر ضمناً وغیرہ وغیرہ میں ہوتا رہا ہے مگر اس کی ادبی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے آندھرا پردیش اردو اکاڈمی نے مخدوم کے نام کا بھی سکہ چلا دیا۔ نیاز حیدر کو بھی اپنے دوستوں سے زک اُٹھانا پڑی۔ مگر آج ان کے بڑے اور قلم برداشتہ شاعر ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

نیا دور بنگلور کے صمد شاہین اور ممتاز شیریں سے حیدرآباد کانفرنس میں یہ لوگ اس سرد مہری سے پیش آئے کہ ان کو ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ مگر جب تک ہندستان میں رہا نیا دور، ترقی پسند ادب کی برابر خدمت کرتا رہا۔ ڈاکٹر عندلیب الرحمٰن کو بھی شاعری چھوڑ کر ایک مدت تک خاموش رہنا پڑا۔ ظ۔ انصاری کے ساتھ بھی ان لوگوں کا رویہ بڑا معاندانہ رہا ہے۔ ترقی پسندی کی تفصیلات میں ان لوگوں کے آپس کے اختلافات تھے۔ میں بھی ظ۔ انصاری کے خلاف تھا (اگرچہ بحیثیت ادیب ان کو عزیز رکھتا ہوں)، اور یہ لوگ ان کو پیس کر پی جانا چاہتے تھے۔ اس پر بھی ظ۔ انصاری کا کوئی کچھ بگاڑ نہ سکا۔ وہ اصیل منھ زور گھوڑے کی طرح ہیں کہ ماہر فن اور تجربہ کار شہ سوار کے علاوہ اس کی لگام پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ چابک سے کام لیا گیا اور فرس ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے گیا۔

ایک دعوت عام میں مخمور جالندھری اور فکر تونسوی کی توہین کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں ادیب ذاتی طور پر انجمن سے علیحدہ ہو کر ترقی پسند ادب تخلیق کرتے رہے۔

میں ایک واقعہ بالکل بھول چکا تھا مگر ۲۳ فروری ۱۹۸۴ء کی ملاقات میں کیفی اعظمی نے مجھ کو یاد دلایا۔ وہ ایک ادبی بحث تھی جو رسالوں کے ذریعہ میرے اور سردار کے درمیان چلی تھی۔ میرا کہنا تھا کہ ترقی پسند ادیبوں نے زیادہ تر اپنے فرائض کو پورا نہیں کیا۔ ترقی پسند ادب کو ہم ترقی پسند مصنفین عوامی ادب بھی کہتے ہیں، جس کی دو نوعیتیں ہیں، ایک عوام کے متعلق ادب اور دوسرا عوام کے لیے ادب۔ پہلی قسم میں اردو کا معیاری ادب پیش کیا جانا چاہئے اور موخر الذکر میں (جس شاعر سے ممکن ہو) اپنے اپنے منطقے کی بولیوں میں لوک گیت اور ہلکی پھلکی نظمیں لکھے۔ مگر سردار جعفری نے میری اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ دو تین قسطوں کے بعد یہ بحث بغیر کسی فیصلہ کے ختم ہو گئی۔ معلوم نہیں سردار کو اس تجویز میں کیا خطرہ نظر آیا تھا۔ اس کو سردار جعفری اب تک نہیں بھولے ہیں۔ آپس کے جملہ اختلافات کے باوجود بظاہر سردار کے اور میرے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ ہم لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کو پیارے وامق اور پیارے سردار خط و کتابت میں لکھتے رہے۔ مگر چونکہ سردار کو بہت قریب

سے جانتا ہوں، اس لیے ان کی کتاب میں میرے لیے "وغیرہ وغیرہ" پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ سردار سے مجھ کو اس سے زیادہ کی توقع بھی نہ تھی۔ اس تناظر میں ان کی رائے کی کوئی وقعت بھی نہیں۔ ادیب اور بالخصوص مورخ یا نقاد کو ذاتیات سے بالاتر ہو کر قلم اٹھانا چاہیے۔

مزید براں ان واقعات کے اسباب و علل پر روشنی ڈالنے کے لیے اور سردار جعفری کی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے ان کو تین رُخ سے دیکھنا ہوگا۔ جو لوگ سردار کو جانتے پہچانتے ہیں ان کو میری باتیں ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہوگا اور جو سردار کو کم جانتے ہیں، دور سے جانتے ہیں یا بالکل نہیں جانتے وہ بخوبی ذہن نشین کر لیں کہ بحیثیت شاعر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنی شاعری کے متعلق وہ عدم تیقن کے شکار ہیں۔ وہ کسی اچھے شاعر کو ترقی کرتا ہوا اور ادب میں خاص مقام پیدا کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ فیض اور اقبال کو ایک مدت تک بڑا شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے۔ ۴۵ء سے ۴۹ء۔ ۵۰ء تک اقبال کے خلاف ایک طویل مقالہ لیے گھوما کرتے تھے۔ فیض کے متعلق انھوں نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ دوئم درجے کے شاعر ہیں اور چند چلتی ہوئی بحروں میں نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں۔ انھوں نے ان چند کے نام اور تقطیع بھی گنوائی تھی جو مجھ کو اس وقت یاد نہیں۔ بحیثیت اردو کے ایک ادیب کے ان کا مطالعہ کم ہے مگر جو ہے بہت ٹھوس ہے۔ اقتباسات ان کو بہت یاد ہیں۔ عالمی ادب کا مطالعہ بھی اچھا ہے اور اپنے کام کی باتیں اس میں سے مستعار لیتے ہیں۔ وہ اچھے مقرر ان معنوں میں ہیں کہ اپنی بات منوانے پر ان کو بہت ملکہ ہے۔ مغالطوں کے بادشاہ ہیں۔ تیسرے بحیثیت ترقی پسند تحریک کے ایک سربراہ کے شاعروں کے معاملہ میں ان کا رویہ اور برتاؤ معرض بحث میں نہیں آ سکتا۔ جس کی جڑ ان کی پہلی حیثیت سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک (Jealous) رشکی مزاج کے شاعر ہیں اس لیے وہ دوسرے شعرا کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ کیفی اعظمی کو ایک Second fiddle کی حیثیت سے اس لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ کیفی بالطبع ایک صلح پسند انسان ہیں اور سردار کو دوستی یا خوف کی وجہ سے آج کا سب سے بڑا شاعر ماننے کو تیار ہیں۔ سردار انھی کو ادیب گردانتے ہیں جن کو وہ کسی نہ کسی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

مگر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ دوسرے ترقی پسند نقادوں نے میری ادبی حیثیت کو کیوں نظر انداز کیا۔ اس کے جواب میں پہلی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اب پرانے ترقی پسند نقاد ہیں کتنے۔ اور جو ہیں انھوں نے عملی تنقید کے میدان میں کوئی قدم اٹھایا بھی یا نہیں۔ جائزہ لینے سے پتہ چلے گا کہ ابھی وہ صرف تحقیقی کام کر رہے ہیں، کہی ہوئی باتوں کو بار بار نئے عنوانات کے ساتھ پالش کر رہے ہیں۔ گڑے ہوئے مردے اکھاڑ رہے ہیں اور ان کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔ زندہ ادیبوں کے کلام کو کون جمع کرے اور اس کا جائزہ لے۔ یہ بڑا جھنجھٹ اور خطرہ کا کام ہے۔ ایک شاعر کی تعریف کرو تو دوسرے شعرا خفا اور اگر کسی کی شاعری پر حرف لاؤ تو وہ شاعر خفا اور ممکن ہے بحث چھڑ جائے۔ تو اس باب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ یہ لین دین کا معاملہ ہے اس میں آپس کے تعلقات بھی بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ حقیقت بیان کرنے میں خطرہ ہے۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند ادیبوں کے لیے بیحد المناک اور عبرت خیز رہا ہے۔ وہ چوٹی کے ترقی پسند ادیب جنھوں نے اپنے خونِ جگر اور روزگار کی قربانی دیکر ادب کی آبیاری کی تھی، کس طرح ذلیل وخوار ہوتے رہے اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔

علیگڑھ کے چند ادیبوں اور بالخصوص شعبۂ اردو نے میری کوئی پذیرائی نہ کی بلکہ اُلٹے ترقی پسندی کی پاداش میں ایک چیتھڑا گمنام اخبار شایع ہوا جس میں مجھ کو گندی گندی گالیاں دی گئی تھیں۔

۱۹۵۳ء کی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانگریس دہلی کے انتخابات کے بعد انجمن میں جو تعطل زور پکڑ رہا تھا اس کے خلاف میری جدوجہد پر اربابِ ادب علیگڑھ مجھ سے مزید چراغ پا ہوئے۔ میں نے کرشن چندر، بنے بھائی اور سردار جعفری کو اس صورت حال سے آگاہ کیا مگر ان حضرات نے ہماری اور انجمن کی کس مپرسی پر کوئی توجہ نہ دی۔ ترقی پسند ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد اعتکاف میں چلی گئی تھی یا بقول ڈاکٹر اشفاق اللہ کے "گیہوں گلاب" کی کھیتی میں لگ گئی تھی یا کچھ اربابِ تحریک کوئی زیادہ منفعت بخش کام کرنے لگے تھے۔ میری فریاد اور تخلیقات پر توجہ دینے کی کس کو فرصت تھی۔ نتیجہ میں میں اور میرے چند ہمنوا انجمن کی بقا سے بالکل مایوس ہو گئے، البتہ ہمارے ادبی اور تخلیقی کاموں میں کوئی تعطل نہیں آنے پایا۔ اس زمانہ میں لاتعداد ترقی پسند ادیب بالاعلان تحریک کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اپنے حلوے مانڈے میں لگ گئے تھے۔

اگر ادبی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور نظریاتی شعور بالغ ہے تو اس قسم کے بحران کا ذہن پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا البتہ ایک ہلکی سی یاسیت اور جھنجھلاہٹ کی لہر ضرور دوڑ جاتی ہے۔ باوجود اس دھچکے کے میں ادب کی برابر خدمت کرتا رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بحران کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ پہلے میں نے اس بحران کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی مگر جب اس جگ سا (Jig-Saw) معمّہ کے ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کیا تو سب گتھیاں اپنی اپنی جگہ جوڑ سے جوڑ ملا کر بیٹھ گئیں اور ایک ایسی تصویر ابھر کر سامنے آئی کہ اس پر یقین نہ آتا تھا، مگر وہ ایک حقیقت تھی جس سے انکار بھی ممکن نہ ہو سکا۔ یعنی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا بحران بالکل مصنوعی تھا۔ یعنی چند نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کی یہ انجمن دشمن تحریک تھی۔

یہ بحران چند مصلحتوں کی بنا پر داغا (Trigger) گیا تھا۔ یہ مطلب پرستوں کا ایک تیار کردہ منصوبہ تھا جو آزادیٔ ملک کے بعد پہلے آہستہ آہستہ اور پھر یکدم تیز کر دیا گیا تھا۔ قیمتی وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس کے سے لیے کانفرنسیں، جلسے، اجتماعات سب بند کر دیے گئے تھے۔ ادیبوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ کسی کو مطعون کر کے، کسی کے ساتھ بدسلوکی کر کے اور کسی کو نظر انداز کر کے۔ یہ بحران خود چند ترقی پسند ادیبوں کا پیدا کردہ تھا۔ غرض کہ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ادھر چند سال پہلے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میری (Finding) کو تقویت پہنچاتا ہے۔

رسالہ گفتگو میں اشاعت کے لیے میں نے چند غزلیں بھیجیں۔ اس میں ایک مطلع تھا:

فن کار کے کام آئی نہ کچھ دیدہ وری بھی   کرنا پڑی اس عہد میں دریوزہ گری بھی

سردار نے مجھ کو لکھا 'پیارے وامق تم کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو "اس عہد میں" کی جگہ "شہزادوں کو" کر دوں۔ میں نے بھی جواب دیدیا، ہاں پیارے ٹھیک ہے' بدل دو۔ مگر اس ترمیم کی غرض و غایت اب سمجھ میں آئی۔ "اس دور" کو ملامت سے بچاتا تھا کہ ارباب اقتدار بیزار نہ ہو جائیں۔ اب برسر اقتدار جماعتوں سے سمجھوتہ بازی کے نتائج صاف نظر آنے لگے تھے۔

میرے جشن الماسی میں کیفی بھائی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ وامق کا گیت "بھوکا بنگال" اس موضوع پر سب سے اچھا گیت مانا گیا ہے، اور یہ گیت ملک کے کونے کونے میں گا کر بنگال ریلیف فنڈ کے لیے لاکھوں روپیہ جمع کیے گئے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ تاریخ ادب یا تذکروں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" میں ایک مقام پر لکھا ہوا ملتا ہے کہ وامق کی یہ نظم سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ اس کے بعد میں نے اردو زبان و ادب کا پہلا سیٹائر (Satire) "مینا بازار" لکھا، جو گذشتہ ۳۹ سال سے قاریوں اور ادیبوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ علاوہ ڈاکٹر مجاور حسین کے جنھوں نے "مینا بازار" پر ایک مضمون لکھا تھا، کسی نقاد نے اس کو بھی قابل توجہ نہیں سمجھا۔ آزادی کے بعد تقسیم پنجاب اور گاندھی جی کے قتل پر میری نظمیں ابتک رطب اللسان ہیں۔ بمبئی کی ایک ادبی نشست میں کرشن چندر نے تقسیم پنجاب سن کر کہا تھا کہ منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" کا اس سے بہتر رد نہیں ہو سکتا۔ مگر ان نظموں کو بھی نقادوں نے منھ نہیں لگایا۔

۵۱-۵۲ء میں عالمی امن پر میں نے ایک طویل نظم "نیلا پرچم" لکھی جو عوام اور خواص میں بیحد مقبول ہوئی اور جس کو اردو ہندی اخباروں نے ایک دوسرے سے نقل کر کے کافی شہرت دی تھی۔ میں نے اردو میں پہلی اوڈ "زمین" پر لکھی جو اپنے اسلوب ہیئت مواد اور تخلیقی محاسن کے اعتبار سے بھی ادب میں ایک اضافہ تھا اور جسے دانشور طبقے کے دل و دماغ کو اپنی پوری گرفت میں لے لیا تھا۔ انگریزی ادب کے استاد علیگڑھ کے پروفیسر محمود حسین کا کہنا تھا کہ تمہاری "زمین" انگریزی کی تمام اوڈوں سے بہتر ہے۔ محمود صاحب کا یہ قول ایک صاحب نظر کا قول تھا اور میرے لیے باعث افتخار۔ علی عباس حسینی اور ذاکر صاحب کے اقوال تھے کہ وامق کی "زمین" ایک عظیم اور زندۂ جاوید نظم ہے، مگر ہمارے نقادوں میں سے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس کے چند سال بعد میں نے اپنی مشہور نظم "فن" لکھی جس کی موضوعاتی جامعیت اور حسن اسلوب نے بڑے بڑے نقادان فن کو انگشت بدنداں کر دیا تھا مگر اس کا بھی تنقیدی ادب میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اس کے بعد میں ۱۹۶۱ء میں علیگڑھ سے

کشمیر چلا گیا۔ چونکہ علیگڑھ سے بہت بدمزہ ہو کر گیا تھا' اس لیے وہاں نسبتاً خاموش رہا۔ البتہ نریندر نشچل کے اصرار پر ڈماہی محور دہلی کے لیے ایک طنزیہ نظم "ڈھسنوے" لکھی تھی جو بہت دنوں تک دہلی اور لکھنؤ کی ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنی رہی مگر کسی میں اس کا جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی اور نہ نقادوں کے کان پر کوئی جوں رینگی۔

نوکری سے ریٹائر ہو کر نومبر ۱۹۶۹ء میں کشمیر سے اپنے وطن کجگاؤں ضلع جونپور واپس آنے کے بعد بہت سی غزلیں اشعار اور نظمیں کہنے کے بعد میں نے دو بڑی فکر انگیز نظمیں کہیں ایک "وقت" اور دوسری "سفر ناتمام" جنھوں نے اردو ہند کے نئے ادیبوں اور نقادوں کو چونکایا ۔ تب انھوں نے میری پہلے کی تخلیقات میں مجھ کو دریافت کرنا شروع کیا۔ اردو مورخین اور نقادوں کی تحریروں اور کتابوں میں میرے حوالے تلاش کرنا شروع کیے تو ان میں ان کو علاوہ وغیرہ وغیرہ کے کچھ نہ ملا۔ اس پر ان نئے ادیبوں کا ردعمل اور بیزاری حق بجانب ہے۔

میں نے غزلوں کو جو نئے مضامین اور فکری لہجہ دیا ہے ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہے کہ نقادوں کو وہ بھی متوجہ نہ کر سکیں۔ درآنحالیکہ میری ادھر کی غزلوں میں جدید کلاسکیت (Neo - Classiusm) کو داخل کرنے کا پہلا تجربہ ہے۔

تو کیا واقعی میں نے ادب کو کچھ نہیں دیا' یا اس خاموشی کے پس پشت کوئی سازش ہے یا اہل قلم کی نااہلی اور جنگجو میں نے عمل اشعار پر قلم گھستے ہوئے دیکھا ہے۔ جرم یا کسی غلطی کا اعتراف چھوٹے اذہان اور طبائع کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے کھلا ہوا ذہن اور وسیع النظری چاہئے' جن کو سمجھوتے باز اور موقع پرست کھو چکا ہے۔

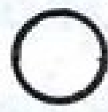
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب　　بڑے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ حضرات میرے مخاطب نہیں ہیں۔ میں نے جو کچھ ان صفحات میں تحریر کیا ہے وہ سچے واقعات ہیں اور جو ہند کی اردو کے ابھرتے ہوئے نئے نقادوں' ادیبوں اور قاریوں کے لیے نشاندہی کے طور پر لکھے گئے ہیں' جن کی آواز اور سیف قلم ادب کی ان بددیانتیوں اور چور بازاریوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔

آجکل عام قاری اور نقاد کی نظر محض ان ادیبوں پر جاتی ہے جن کا نام فلمی پردوں پر لکھا ہوا ملتا ہے' یا جن کی شخصیت میں کسی قسم کا گلیمر ہو' خواہ وہ کوئی عیب یا بیماری ہی کیوں نہ ہو' اور یا جن کو ان کے ہتکنڈوں کی مدد سے عام شہرت مل چکی ہو۔ شہرت کو عظمت کی چھاپ سمجھنا نابختہ ذہن کی دلیل ہے۔ خطاب یافتہ ہونا' انعامات اور اعزازات پانا بھی عظمت کی دلیل نہیں ہے۔ یہ لوگ کس طرح بڑے بڑے نقادوں کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ کس طرح اپنا پروپیگنڈہ کرواتے ہیں۔ کس طرح جیوری کو سفارشات سے متاثر کرواتے ہیں۔ گھر کا یہ سب بھید ہم سے پوچھیے۔ یہ لوگ لالچ کے مارے ہوئے' حکومتوں کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ کوئی شہرت پا کر ان کو خوش رکھتا ہے' کوئی خطاب اور انعامات

حاصل کر کے ان سے سمجھوتا کر لیتا ہے، اور کوئی محض وعدوں اور امیدوں کی گود میں پلتا رہتا ہے۔

میں ان نازک طبع قارئین سے معذرت خواہ ہوں جن کو سطور مندرجہ بالا میں یاسیت اور خودستائی کا شائبہ نظر آیا ہو۔ یہ سب ان کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک زخمی خونخوار شکار کا جوابی حملہ ہے جو وہ شکاری کو شکست دینے کے لیے کرتا ہے۔ اس میں کہیں کہیں تحریر کا اسلوب بھی Sophisticated نہیں ملے گا۔ اس کو خود ترحمی سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں مقصد صرف یہ ہے کہ مندرجہ بالا ادبی المیوں کی ایک سچی تصویر پیش کر دی جائے۔ اگر اپنے ان مساعی میں کامیاب رہا ہوں تو قاری کا کیا ردعمل ہونا چاہیے۔ قاری اس کا اظہار کس طرح کرے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ قاری ادبی مثلث کی ایک ساق ہے۔ فن کار، نقاد اور قاری سے مل کر ایک ادبی مثلث بنتا ہے، ورنہ نقاد میں انانیت آ جائے گی۔



اگر ان موقع پرست ادیبوں کی یہ تمنا تھی کہ میں ان کے گروہ میں شامل ہو کر ان کا ہم خیال اور ہم مشرب بن جاؤں گا اور یا ان کا لوہا مان کر ان کو راضی کر لوں گا تب وہ میرا ذکر کریں گے تو وہ بڑی غلط فہمی کا شکار رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے نظیر اکبر آبادی نے اپنے زمانے کے اُن اداروں کے سامنے گھاس نہیں ڈالی جن کے ہاتھوں میں شاعروں کی قسمت ہوا کرتی تھی، یعنی اس دور کے جو بادشاہ، نوابین اور نوابین کے اسی انداز فکر ورواج سے متاثر مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ان کو سوقیانہ کہکر صفِ شعرا میں جگہ نہ دی، مگر تاریخ کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی اور نہ کسی کی حق تلفی کو گوارہ کرتی ہے۔ غالب نے تو خیر اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے، مگر نظیر اکبر آبادی نے تو ان اداروں کی دعوتوں کو بھی ٹھکرا دیا تھا۔ زندگی کی دوڑ میں کچھ میرا بھی یہی رویہ اور حال رہا ہے۔ میں نے ادب کے معاملہ کے علاوہ تلاش معاش کے معاملہ میں بھی ان ذرائع کو استعمال نہیں کیا جو بہت بلند پایہ قادر اور مؤثر تھے۔

پہلی مثال رفیع احمد قدوائی کی ہے۔ ان کی بھاوج انیس باجی اور ان کے پورے خاندان سے میرے جو عزیزدارانہ اور گھریلو تعلقات تھے۔ اپنی انتہائی اقتصادی پریشانیوں اور بیروزگاری کے زمانہ میں میری انا، خودداری اور بے نیازی نے کبھی گوارہ نہ کیا کہ اُنسے کسی مدد، مراعات یا سفارش کی خواہش کا اظہار کرتا

دوسری مثال لال بہادر شاستری کی ہے۔ جب وہ اتر پردیش حکومت میں فوڈ اینڈ سول سپلائز کے پارلیمانی سکریٹری تھے تو میں بنارس میں .Dy. T.R.O تھا۔ جب وہ محکمہ کا معائنہ کرنے بنارس کا دورہ کرنے آئے تو وہ راشننگ کے کاموں سے بالکل واقف نہ تھے۔ بنارس کے .D.M نے یہ کام میرے سپرد کیا کہ میں موصوف

کو دورہ کرنے میں ان کی رہنمائی کروں۔ پہلے میں ان کو اپنے دفتر لے گیا اور راشننگ اور سپلائی کے ان سب کمزور پہلوؤں سے آگاہ کیا جہاں سے بے ایمانی، چور بازاری اور رشوت ستانی کی راہیں نکلتی تھیں۔ ان کی وسیع القلبی اس امر سے ظاہر تھی کہ انتہائی منکسر مزاجی سے انھوں نے میری شاگردی قبول کی اور اس کے بعد دو کانوں اور دفتروں کا معائنہ کر کے نہایت مکمل رپورٹ اپنے دورے کی گورنمنٹ کو دی اور ہمیشہ مجھ کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا۔ مگر اس محکمہ میں بہت پریشان کیے جانے اور مستعفی ہو جانے کے بعد بھی میں نے اُن سے اپنی خدمات کی کبھی کوئی قیمت طلب نہ کی کہ یہ احسان مجھ کو گوارہ نہ تھا۔

تیسری مثال مسز سروجنی نائیڈو کی تھی۔ یوں تو ۱۹۴۵ء کے حیدرآباد سے ہی میری ان کی ملاقات تھی، مگر گاندھی جی کے قتل پر میری نظم "میر کارواں" سننے کے بعد تو گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کے لیے کھل گئے تھے۔ اور یہ حقیقت کہ میں ایک سرکاری نوکر ہوں ان پر اس وقت واضح ہوئی جب موسم سرما کے دورہ پر وہ الہ آباد آئی تھیں اور وہاں کے کیمپ گورنمنٹ ہاؤس میں شعری نشست کروانا چاہتی تھیں۔ میں ایام بیکاری میں اتفاقاً الہ آباد گیا ہوا تھا اور موصوفہ نے اپنے بھرے دربار میں کہا تھا کہ:

"O, you naughty boy, why ever you did not tell me that you were a government servant. And now tell me what can I do for you. I hear you have resigned". "Yes dear mother. But I dont want you to do anything for me. And if I were again re-instated, you would always miss me. All the same thank you very much". "Forget it mother. Now tell me what do you want me to recite". "Your immortal poem on immortal Bapu".

چوتھی مثال حفاظت حسین صاحب .I.C.S کمشنر بنارس ڈویژن کی ہے جو میں پانچویں باب میں بیان کر چکا ہوں۔

کس کے منھ میں زبان ہے جو میری انا، میری خودداری، خودسری اور بے نیازی سے فائدہ اٹھا کر میری تخلیقات پر حرف زنی کر سکے۔ میری شخصیت، حیثیت اور تخلیقی فنکارانہ صلاحیت کو گمنامی کے پردوں کے پیچھے ڈھکیل کر نہ کوئی اپنا قد اونچا کر سکتا ہے اور نہ میرے قد کو گھٹا سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے سربراہوں نے کبھی کوئی ایسا موقع اور طرز عمل نہیں اپنایا جس میں ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے۔ وقتاً فوقتاً ادبی ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے جہاں شعرا خود اپنا منتخب کلام سنائیں اور کھل کر ان پر تنقید کی جائے اور جواب الجواب سنا جائے۔ ان سب کی روداد شایع ہوتا کہ ادب نواز حلقوں پر واضح ہوتا رہے کہ کون ادیب کیا کر رہا ہے، اور اس شاعر کی کیا حیثیت ہے۔ دنیا بھر میں فن لطیف کی نمائش ہوتی ہے۔ فنکار سامنے آتا ہے اور فن کے مبصرین اس کی تخلیقات پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ مگر شعری ادب کے سلسلہ میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مشاعرے خوب ہوئے اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ نتیجہ میں انتشار بڑھتا رہا اور انتشار میں گروہ بندی

فروغ پاتی ہے، جو ادب کے بارے میں سم قاتل ہے۔ سربراہوں میں کلیدی حیثیت رکھنے والے شعرا میں دو بدو تنقیدی تعین حیثیت اور تقابلی جائزہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔ اس عمل میں ان کے گرد مصنوعی شہرت کے باریک تاروں کے ٹوٹ جانے کے امکانات ہیں۔ اسی لیے ان ممبران تحریک کے سامنے میں یہ تجویز رکھتا ہوں جو عہدوں پر انتخاب کرنے کے لیے مجتمع ہوتے رہتے ہیں کہ شعرا کو کوئی عہدہ نہ دیا جائے کہ وہ تحریک کے ارتقا میں سد راہ نہ بن سکیں۔ ان حضرات کی نازیبا حرکات سے جو وہ اپنے مفاد کے لیے کرتے ہیں تحریک کو اس طرح نقصان پہنچتا ہے کہ اس سے منافرت اور دل سوزی پیدا ہوتی ہے۔

••

چودھواں باب

۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۶ء تک

۱۰ رمارچ ۱۹۸۴ء کا دیوگام اعظم گڑھ میں مشاعرہ اس لیے یاد ہے کہ اس میں اصغر مہدی ہوشؔ جونپوری کے شعری مجموعہ "ناگزیر" کا اجرا ہوا تھا۔ اس جشن کے کنوینر اردو کے شاعر عبدہٗ اعظمی تھے جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اختتام مشاعرہ پر بوقت رخصتی اپنے تالاب سے منگوا کر ہر شاعر کے ساتھ ایک ایک رہو یا جھاشیر کر دیں گے مگر آج تک وہ مچھلی دیکھنے میں نہیں آئی شاید تیار مچھلیوں کو دیکھ کر ممکن ہے ان کا خیال بدل گیا ہو اور وہ مچھلیاں اپنے استاد محترم حضرت جوہر بنارسی کی خاطرداری کے لیے مخصوص کر رکھی ہوں۔ دوسری طرف جونپور پریس نے ناگزیر کو اس لیے ناپسند کیا کہ اس میں ہوشؔ نے اپنے چند اقوال نقل کر دیے تھے۔ کسی کے قول سے اختلاف دوسری بات ہے اور شعر کو فنی حیثیت سے پرکھنا اور بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہوشؔ بہت اہم غزل اور اچھے اشعار کہتے ہیں۔ کسی ادب پارے کو اس بنا پر مسترد نہیں کہا جا سکتا کہ چند قارئین کو شاعر کے خیال سے اختلاف ہے۔ فن پارے کو فن کے معیار پر تول کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ غالبؔ اور یگانہؔ کی شاعرانہ چٹکیوں کا کوئی جواب نہیں۔ اسی طرح ہوشؔ کے خیالات کو بھی برداشت کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہوشؔ سے انصاف نہیں کیا گیا۔

۱۴ر اپریل ۱۹۸۴ء کو فیض آباد میں فاربس کالج کے میدان میں جشن احسن رضوی کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا تھا۔ اس کے کنوینر منیر قریشی تھے۔ صدر مشاعرہ مٹیا برج کے پرنس انجم قدر جانشین واجد علی شاہ تھے اور سارے انتظامات کے نگراں ڈاکٹر اختر اور حکیم ابنؔ تھے۔ ممکن ہے کہ اس مشاعرہ کو بہت کامیاب کہنے میں میرے داخلی جذبات کا فرما ہوں مگر اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیض آباد انیسؔ اور چکبستؔ کی سرزمین ہے اس لیے وہاں کے سامعین میں ثقافت اور سخن فہمی نے ایک روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہاں تقریباً دو بجے شب میں میرے پڑھنے کا نمبر آیا تھا، مگر مجمع اسی طرح جمع ہوا بیٹھا رہا جیسا ۱۰ بجے مشاعرہ کے آغاز میں تھا۔ ایسا آجکل بہت کم ہوتا ہے۔

۲۱-۲۲-۲۳ر اپریل ۱۹۸۴ء میں ایک منقبت کے جلسہ میں حیدرآباد بلایا گیا تھا۔ وہاں میں نے مولائے

کائنات کی طرح محفل میں طرح کے اندر میرا منقبت پڑھی تھی جو وہاں کے سامعین کے لیے ایک نئی چیز تھی اور شاید اپنے نئے پن کی وجہ سے بہت پسند کی گئی۔ اس محفل کا V.D.O. بھی بنا تھا۔ خیر یہاں تک تو کوئی خاص بات دیکھنے میں نہیں آئی۔ خاص بات کا احساس اس وقت ہوا جب محفل کے دوسرے دن صبح کے وقت روزنامہ منصف حیدرآباد کے ڈپٹی ایڈیٹر میرا انٹرویو لینے پہنچ گئے اور اس طرح کے سوالات کرنے لگے جن کا تعلق میرے نظریہ حیات سے تھا۔ سوال: "آپ کیمونسٹ ہیں"۔ جواب: "جی ہاں میں کیمونسٹ ہوں"۔ سوال: "آپ کا نظریہ حیات مارکسزم ہے"۔ جواب "جی ہاں! میرا نظریہ حیات مارکسزم ہے"۔ سوال: "تو آپ مذہبی اجتماعات میں کس حیثیت سے حصہ لیتے ہیں، نظمیں سناتے ہیں اور تقریر بھی کرتے ہیں"۔ جواب: "مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور مارکسزم ایک سائنسی حقیقت ہے۔ اور چونکہ اسلامی نظریہ سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے اس لیے مجھ کو ایک کیمونسٹ یا مارکسسٹ کی حیثیت سے منقبت کہنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اور اس میں شاعری کے نئے نئے گوشے ملتے ہیں، اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو مسلمانوں کے ایک فورم کو مارکسی فلسفہ کے لیے کیوں نہ استعمال کروں۔ ایک کیمونسٹ ایک اچھا مسلمان بھی ہو سکتا ہے، جیسے اسحاق سنبھلی جو بڑے مذہبی آدمی ہیں، پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں اور ہر وقت کیمونسٹ پارٹی کا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر زیڈ احمد C.P.I. کی قومی کونسل کے سرگرم کارکن ہیں اور میرٹھ کی نوچندی میں رات رات بھر قوالی سنتے ہیں۔ میں بھی محفل سماع میں ان کے ساتھ شرکت کر چکا ہوں۔ اور ایسی بہت سی مثالیں ہیں تو آپ کو محفلوں میں میری شرکت پر کیوں تعجب ہوا۔ علاوہ بریں میں مسلمانوں کو کٹھ ملاؤں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں مذہب والوں کے سامنے اشتراکیت، مارکسزم اور اسلام میں تطابق کو اپنی شاعری میں پیش کرتا ہوں۔ مذہبی جلسوں اور ترقی پسند شاعری میں کوئی تضاد یا Disparity نہیں ہے۔ آپ اگر غور سے میری نظم "وقت" پڑھیں گے تو اس میں اسلامی تصور، تخلیق آدم اور ڈارون کے احوال ارتقا میں کوئی فرق نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر آپ وقت کے تصورات کو پوری طرح سمجھ جائیں تو آپ کو یقین کرنا پڑے گا کہ آپ کو خدا کی معرفت حاصل ہو گئی۔ تضادات کے خلیج کو بڑھائے رہنا تو کٹھ ملاؤں کا کام ہے۔ مذہب کی صداقت سائنس سے ثابت ہے۔ اس لیے مذہبی مدارس کے نصاب میں اعلیٰ سائنس کی تعلیم کو لازمی بنانا چاہیے تاکہ ہمارا عالم اور مذہبی رہنما ایک روشن خیال انسان ہو۔

۲۲ مئی ۹۴ء کو فرید احمد نامی لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم خورشید لسوانی کا خط لیکر میرے پاس آئے کہ "یہ میرے سالے ہیں اور آپ کی زندگی، شخصیت اور فن پر Ph.D. کی ڈگری کے لیے ریسرچ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پہلے تو اجازت دیدیں اور اس ضمن میں ان کی رہنمائی کر دیں"۔ میں نے فرید سے دریافت کیا "تم نے اب تک میرے

متعلق کتنا مواد جمع کیا ہے"۔ جواب: "بہت کم، اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ یہ مواد کن کن کتابوں اور جریدوں میں مل سکتا ہے"۔ میں نے کہا: "میرے متعلق تم کو اس لیے کم حوالے ملیں گے کہ ابتک مجھ پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ مگر تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو؟ مجھ سے زیادہ نہ مجھ کو کوئی دوسرا جانتا ہے اور نہ میری تخلیقات کو مجھ سے زیادہ سمجھ سکتا ہے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ جو کچھ معلوم کرنا ہے، چند دن میرے پاس رہکر میرے متعلق ضروری معلومات قلمبند کرو، اور میرے یہ تین مجموعے لے جاؤ، ان کو خوب غور سے پڑھو۔ علاوہ اس کے میں نے ان کو پانچ چھ کتابوں کا نام بھی لکھوا دیا جہاں میرے متعلق ان کو تھوڑا مواد مل بھی سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے متعلق اول درجہ کی Evidence تو میں ہی دے سکتا ہوں۔ کسی دوسرے کا بیان بہرحال Second Hand ہوگا مگر افسوس یہ ہے ڈگریاں Second class evidences پر ہی ملتی ہیں جن کی حیثیت مستعار ہوتی ہے۔ اگر ادیب ایماندار ہے اور اخلاقی جرأت رکھتا ہے تو اس پر اُس سے بہتر Thesis کوئی نہیں لکھ سکتا اور نہ دے سکتا ہے۔ مواد حقائق پر مبنی ہوں تو Finding میں ریسرچ یا تحقیق کرنیوالا بالکل صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہیں۔ اور تخلیقی ادب کا یہی لوچ ہے کہ بالکل ایک ہی موضوع پر دو بالکل متضاد تھیسس لکھی جا سکتی ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

سیّد حامد I.A.S.، سیّد احمد حسن صاحب کلکٹر ضلع I.A.S. کے داماد ہیں اور سیّد احمد حسن صاحب مہدی افادی کے فرزند۔ چونکہ سیّد احمد حسن صاحب سے میرے گہرے تعلقات تھے، اس لیے سیّد حامد کی ذات سے بھی مجھ کو دلچسپی رہی ہے اور وہ بھی مجھ سے ہمیشہ بہت مانوس رہے۔ سرکاری نوکری سے دست بردار ہونیکے بعد سیّد حامد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے V.C. ہوئے۔ ان کے عہد میں اساتذہ و طلبا ر دانشگاہ کے بیشتر افراد ان سے برانگیختہ رہے چونکہ ان سے مجھ کو ایک جذباتی لگاؤ تھا اسلیے میں متفکر ہوا۔ حسن اتفاق کہ اپنا ٹرم ختم کرنے سے چند ماہ قبل اہل جونپور کی دعوت پر جونپور تشریف لائے۔ حضرات کو میرے ان کے تعلقات کا علم تھا۔ اس لیے ان کو ایک ہمدرد اور تسکین بخش ماحول کا احساس دلانے کے لیے مجھ کو بھی ان کے ہر پروگرام میں حصّہ لینے کی دعوت دی گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مدتوں بعد ایک دوسرے سے ملکر بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کے میزبانوں میں سب کے سب ان کے موافق نہ تھے۔ یہاں بھی ان کے خلاف مخالفت اور شکایات کی خاصی لہر ملتی تھی۔ انھوں نے جونپور کے متعدد تعلیم گاہوں میں اساتذہ اور طلبا کو خطاب کیا تھا۔ بحیثیت V.C. علیگڑھ دانشگاہ کے اپنے موقف اور پالیسیوں پر روشنی ڈالی تھی اور بہت سے وضاحت طلب سوالات کے جوابات دیے تھے، جن سب کا لب لباب یہ نکلتا تھا کہ

"ابتک وہاں کے طلبا کو ماں کی سی محبّت ملتی رہی ہے، اور اب انھوں نے ان کو باپ کی محبت دی ہے۔ ماں کی محبت صرف ماتا کے جذباتی لگاؤ کی مظہر ہوا کرتی ہے اور باپ کی جہاں محبّت درکار ہے وہاں محبت اور جہاں تادیب درکار ہے وہاں نظم وضبط قدرے سخت گیر ہوتے ہیں" وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ "علیگڑھ کے طلبا سے میرا برتاؤ وہی رہا ہے جو اپنے بیٹوں سے مگر وہاں کے اساتذہ اور طلبا کا ایک حلقہ جو اقلیت میں تھا کسی بجا سختی کو بھی کبھی گوارہ نہ کرسکا۔ مگر میرا ضمیر اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف سے بالکل مطمئن ہے۔"

سیّد حامد ادیب اور اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کے دورہ جونپور کا آخری آئٹم میری صدارت میں ایک مشاعرہ تھا جو محمد حسن انٹر کالج کے ہال میں ہوا، جس میں وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس کے بعد وہ ایک جذبۂ امتنان کیساتھ ہم اہل جونپور سے رخصت ہوئے۔ سیّد حامد کی جاذب نظر شخصیت اور اخلاقی حیثیت کا یہ اثر تھا کہ انکے مخالفین بھی سر بہ گریباں نظر آتے تھے۔

چند سال پہلے یوم محشر عنایتی رامپوری کے دوران اسلم خاں رامپوری نے میری ملاقات ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے کرائی تھی۔ آدمی ذہین اور صاحب نظر معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد اسلم خاں اپنے بیٹے بیٹی کی دعوت پر پاکستان چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میرا بھی ناتا رامپور سے کم وبیش ٹوٹ گیا۔ اُدھر اختر علی خاں رامپور کے خطوط آنے لگے کہ "اسلم خاں کے جانے کے بعد تو آپ رامپور کو بالکل بھول ہی گئے واقعی رامپور میں آپ کے لیے اسلم خاں کا وجود بڑی اہمیّت کا حامل تھا، مگر ابھی رامپور آپ کو نہیں بھولا ہے۔ یہاں آپ کے عشاق کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس سال نمائش کے مشاعرہ میں ضرور تشریف لائیے گا اور میرے ساتھ قیام کیجئے گا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء کو رامپور ریڈیو کے مشاعرہ میں گیا تھا جب وہاں زبیر رضوی اسٹیشن ڈائرکٹر تھے۔ اور میں نے اختر علی خاں کے یہاں قیام کیا تھا۔ دوست احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ ادبی نشستیں رہیں۔ رئیس اور اظہر عنایتی سے مل کر اسلم خاں کی یادیں تازہ ہوئیں۔

اس کو ڈیڑھ سال گذرے ہوں گے کہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر بیدار کا پٹنہ سے خط آیا کہ "خدابخش لائبریری نے منتخب شعرا کی مختصر خود نوشت اور انتخاب کلام پر مشتمل ایک مجلہ شائع کرنیکا منصوبہ بنایا ہے۔ امید ہے کہ آپ جلد از جلد اپنی مختصر خود نوشت، منتخب نمونہ کلام اور اپنی تصویر سے ہم کو نوازیں گے اور جس کے لیے ہم متشکر ہوں گے۔" ہفتہ عشرہ میں میں نے مختصر خود نوشت ایک نظم اور غزل کے چند اشعار مع تصویر کے ڈاکٹر بیدار کو بھیج دیے۔ خط کی

رسید ملی اور اطمینان ہوگیا۔ مگر ڈاکٹر بیدار نہ اطمینان سے خود بیٹھتے ہیں اور نہ کسی ادیب کو اطمینان سے بیٹھا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ خط آیا کہ کیا آپ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو لائبریری کے "سرسید ڈے" میں شرکت کر سکتے ہیں؟ مگر میں شرکت نہ کر سکا۔ میری بیگم سردیوں کی آمد کی خبر سن چکی تھیں، اس لیے وہ پھر باقاعدہ بیمار پڑنے لگیں اور بڑا لڑکا اکرام کو سنگرولی لے گیا اور میں کان کا علاج اور آنکھیں ٹسٹ کروانے دہلی چلا گیا۔ یہ کام دہلی میں ختم کر کے ۲ئیں جنوری ۱۹۸۵ء میں دہلی سے شمس آباد ہوتا ہوا وطن واپس آگیا۔

اب میں ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو پورے ۷۵ سال کا ہو چکا تھا۔ لمحات حیات اپنی پوری تیز رفتاری سے گذر رہے تھے۔ مشاعرے، سمینار، مقالے، مضامین اور فن تخلیق جیسے اب جوان ہو رہی تھی کہ ۱۹۸۵ء نے اپنی آمد کا ڈنکا بجایا اور اپنے پنجۂ غضب میں مجھ کو دبوچ لیا۔ ڈائمنڈ جوبلی کے بعد ہی سے میں جسمانی طور پر اپنے کو کمزور اور ذہنی طور پر بالکل جوان محسوس کرنے لگا تھا۔ غزل در غزل اور بیشمار غزلیں نظمیں اور مضامین لکھ ڈالے۔ ہر مشاعرہ، ہر مباحثہ اور ٹی۔وی، ریڈیو پروگراموں میں کثرت سے شرکت کرنے لگا تھا۔ ۷ر فروری ۱۹۸۵ء کو الہ آباد ریڈیو نے میری نظم غزل در غزل پر ایک ادبی مباحثہ کا انعقاد کیا۔ جس میں ڈاکٹر حسین، اردو کے ایک اسکالر ایک ہندی کے پروفیسر اور صحافی نے حصہ لیا تھا۔ مختلف سوالات اور جوابات کے بعد یہ فیصلہ قرار پایا کہ غزل کی کھوئی ہوئی عظمت نے بازیافت پائی۔

اس کے بعد مارچ میں معلوم ہوا کہ اسلم خاں رامپور آئے ہوئے ہیں اور ہندستان کی شہریت کے لیے کوشاں ہیں۔ مجھ کو ان کا خط ملا اور میں خط ملتے ہی رامپور پہنچ گیا۔ اب کی وہ اپنی بیگم کے ساتھ اپنے برادر نسبتی ببن خاں صاحب باجوڑی ٹولہ میں قیام پذیر تھے۔ چنانچہ میں بھی وہیں مقیم ہوا۔ ان کے ہمراہ تمام احباب سے ملاقاتیں کیں۔ اختر علی خاں، شبیر علی خاں شکیب، مولانا اسحاق البنی علوی کی معیت میں کافی وقت گذرا۔ پبلک لائبریری میں ایک شام نظمیں سنانا پڑیں۔ دوسرے دن رئیس رامپوری کے لٹریری کلب کے ہوٹل ملن کے مشاعرہ میں شرکت کی۔ یہ سب دن کے پروگرام تھے۔ شب میں اسلم اور میں تخلیہ میں گفتگو کرتے جس میں کسی نامحرم کا گذر نہ تھا۔ مجھ سے اس ملاقات کے بعد اسلم کا جذبۂ ہندستانیت اور تیز ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ ہماری حکومت نے ان کی ہندستانی شہریت کی درخواست ہمیشہ کے لیے مسترد کر دی اور ان کو کراچی واپس جانا پڑا۔ وہ ایام ہوٹل کے تھے اور ہم لوگ کئی ہندو دوستوں کے یہاں بھی ملنے گئے، اور ہر ہندو دوست اسلم سے ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ اس شہریت کے معاملہ میں کوئی خدمت ہم سے لیجئے مگر اسلم خاں نے حکومت کے ایسے ایسے جید کھمبے پکڑ رکھے تھے کہ ان کے آگے کوئی جا نہیں سکتا تھا۔ ہمارے ملک و قوم کی بدبختی کہ وہ ہندستانی کو نہیں پہچانتی یہ سرکاری کاغذ جو لکھا ہے اسی کو حرف آخر سمجھتی ہے۔ اور

دوسری طرف رامپور کے لیے اسلم خاں اس طرح تڑپتے ہیں جیسے ماہی بے آب۔

میں وہاں سے اپنی بٹیا شیریں اور خویش الیاس کے پاس دل بہلانے شمس آباد چلا گیا، وہاں چند دن قیام کر کے اپریل میں وطن واپس آگیا اور یہاں بھی دل نہ لگا تو ۱۵ر اپریل ۸۵ء کو پٹنہ چلا گیا۔ ڈاکٹر بیدار، ان کی بیگم اور بچے میری آمد کے منتظر تھے۔

دوسرے دن قبل دوپہر رضا نقوی واہی سے ملنے چلا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ واہی اس دور کے سب سے اچھے طنز و مزاح کے شاعر ہیں اور اس خلا کو بڑی حد تک پُر کر رہے ہیں۔ عجیب اتفاق کہ ابتک اُن سے میری ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ تقریباً دو گھنٹے ان سے ادب پر نہایت دلچسپ گفتگو رہی۔ آج دن پٹنہ ریڈیو پر ایک ادبی انٹرویو دینا تھا، اس لیے ان سے رخصت ہو کر لائبریری واپس آگیا۔ واپسی میں لائبریری کے پھاٹک پر سیاہ بورڈ پر جلی حرفوں میں اعلان پڑھا کہ —— ۱۷ر اپریل ۸۵ء کو دس بجے دن سے ایک بجے سہ پہر تک پٹنہ کے ادیبوں، صحافیوں اور مقتدر شخصیتوں سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار میرا تعارف کرائیں گے۔ مجھ سے میری زندگی و ادب پر سوالات ہوں گے جن کا مجھ کو جواب دینا ہوگا اور دلیل میں اشعار اور موقف پیش کرنے ہوں گے جس کی V.D.O. ریکارڈنگ ہوگی، اور اسی دن شام کو چھ بجے سے "وامق جونپوری کے ساتھ ایک شام" کے نام سے دوسری ادبی نشست ہوگی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں جب ڈاکٹر بیدار کے آفس کم ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ان کو ٹیلیفون کرتے ہوئے پایا اور بیگم بیدار کو بہت لمبی شیشے کی میز پر کھانا چنتے ہوئے۔ کھانے پر معلوم ہوا کہ تحریری دعوت ناموں کے علاوہ معزز سامعین کو دونوں پروگراموں میں شرکت پر اصرار کے طور پر یہ برقی کارروائی ہو رہی تھی۔

پٹنہ میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔ البتہ پرویز شاہدی کے انتقال کے بیس سال بعد میں وہاں گیا تھا۔ پہلے پٹنہ اتنا بڑا نہ تھا جتنا میں نے اس کو ۱۹۸۵ء میں پایا۔ تناظر بھی بدلا ہوا تھا۔ پرویز شاہدی اور سہیل عظیم آبادی قدیم پٹنہ کے نواح میں رہتے تھے اور خدا بخش لائبریری نئے پٹنہ میں ہے۔ یوں بھی آمد و رفت میں تعطل پیدا ہو جانے سے مقامات، شخصیتیں اور راستے ناآشنا ہو جاتے ہیں۔ حافظے سے نام اور شکلیں محو ہو جاتی ہیں۔ میرے دماغ میں ناموں کی لائبریری بڑی ہوادار ہے۔ ذرا وقفہ کی ہوا تیز چلی اور ناموں کے اوراق اڑ اڑ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ رہیں شکلیں تو وہ بھی بیس سال میں بدل جاتی ہیں۔ اس تغیر میں وہاں کے پرانے شناساؤں کے علاوہ میں خود بھی اپنی شکل بدل کر وہاں پہنچا تھا۔ اس کمزوری میں وہاں مجھ کو سبقت اس لیے بھی حاصل تھی کہ ارباب شہر میری آمد سے واقف تھے مگر مجھ کو بہت سی

شکلیں اور نام یاد رکھنے میں قدرے دقت محسوس ہوئی تھی۔ حسنِ اتفاق کہ وہاں ملاقاتوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا کہ مجھ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اچھے باذوق اور تجربہ کار لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ "آپ نے مجھ کو پہچانا"، بلکہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس موقعہ پر پرانے ملنے والوں نے زیادہ تر یہی کہا کہ "میں فلاں ہوں، آپ تو پہچان ہی گئے ہوں گے، مگر آپ میں بہت تغیر ہوگیا ہے"۔ ڈاکٹر بیدار کے یہاں سب سے پہلے میری ملاقات "نفسیاتی جائزے" کے مصنّف ڈاکٹر محمد محسن ماہر نفسیات سے ہوئی۔ میرے ہم عمر ہیں اور بڑی پُروقار شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے میرے لڑکے باقر کو پڑھایا تھا اور بڑی محبّت سے اس کا ذکر کرتے ہیں، اور جسکی وجہ سے مجھ کو بھی اُن سے ذاتی لگاؤ پیدا ہوگیا۔ ڈاکٹر محسن میں اب مجھ کو ایک اور محافظ مل گیا تھا۔

لنچ کے بعد ریڈیو پٹنہ پر ریکارڈنگ کے لیے گیا وہاں مجھ کو تقریباً ان سب سوالوں کے جوابات دینا پڑے جو دوسرے دن .D.O.V اور شام کی نشست میں دینے تھے۔ وہاں سے واپسی پر شام کو ہم لوگ گاندھی پارک اور گنگا کے کنارے گاندھی گھاٹ کی سیر کرنے چلے گئے۔ یہ دونوں جگہیں میری دیکھی ہوئی تھیں مگر اس بار پارک کے گھیرے میں چہل قدمی کے لیے تین میٹر چوڑی تارکول کی سڑک ملی اور گنگا میں تغیانی کم۔ یہ دونوں جگہیں علی الصباح اور شام کی سیر و تفریح کے لیے بیحد پُرسکون ہیں۔ وہاں جاکر پٹنہ کی بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ چونکہ ان مقامات کا وجود داغ دہلوی کے زمانہ میں نہ رہا ہوگا، اسی لیے ان کو یہ شعر کہنا پڑا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں   عظیم آباد میں وہ منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

دوسرے دن دس بجے ڈاکٹر بیدار ڈاکٹر محسن کی معیت میں لائبریری ہال میں پہنچا جہاں مہمان سامعین میں بیگم اختر اورینوی صاحبہ بھی تشریف فرما تھیں۔ اور میرے پرانے دوست ریٹائرڈ آئی جی عباس صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی پرانے احباب سے ملاقات ہوئی۔ مرکزی میز پر میرے دائیں بائیں ڈاکٹر بیدار اور ڈاکٹر محسن کے بیٹھتے ہی ویڈیو کیمرہ نے ہم کو گھورنا شروع کردیا۔ ڈاکٹر بیدار نے میرا تعارف کرایا۔ اس کے بعد گفتگو اور سوالات کی بوچھار ہونے لگی، جن کے جواب سے میں عہدبرا ہوتا رہا۔ جب تنقید کا ذکر شروع ہوا تو قدیم مشرقی اور جدید مغربی تنقیدوں پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے دونوں کے ٹکراؤ کا ذکر کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹکراؤ ناگزیر تھا جس میں جدید مغربی تنقید کی نمائندگی پروفیسر کلیم الدین احمد کر رہے تھے۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ انگریزی کے استاد تھے اس لیے وہ زندگی بھر انگریزی ادب سے اردو شاعری کو ناپتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریروں میں بڑی جان ہوتی تھی اور ان کی ہر کتاب یا مقالہ پر کوئی نہ کوئی طوفان ضرور برپا ہو جاتا تھا۔ ان کے اکثر خیالات سے میں اتفاق کرتا

تھا۔ البتہ ادھر گذشتہ چند برسوں سے ان کا یہ کہنا کہ "اردو غزل" ایک نیم وحشی صنف شاعری ہے' میرے دل کو نہ لگتا تھا۔ اور اس سے زیادہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ اس مسئلہ پر مدتوں بحثیں ہوئیں مگر کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ غزل نیم وحشی صنف نہیں ہے، اور نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ پروفیسر موصوف اپنی خاندانی روایات سے بے نیاز ہو کر اور انگریزی شاعری کی اصناف کی روشنی میں غزل کو اس حقارت سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ ادھر اُدھر سے فریقین کی تحریریں دیکھتا رہا کہ ایک دن پوری بات سمجھ میں آگئی۔ اس غیر فیصلہ کن تصادم کی تہ میں یہ راز تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے غلط موقف پر قلم گھس رہے تھے۔ دونوں "نیم وحشت" کے لغوی معنی کو تسلیم کر کے بحثیں کر رہے تھے۔ کسی نے بھی نیم وحشی قوموں اور قبائل کی زندگی کا قریب سے مطالعہ یا دوسرے ذرائع معلومات سے ان کی خصوصیات، حرکات، سکنات اور امزجہ کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ دونوں فریق اصلیت سے لاعلم تھے اور یا ان کی زندگیوں کو صحیح زاویہ سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر موصوف کو تو غزل اس نہج سے بھی نیم وحشی معلوم ہوتی رہی ہوگی کہ انگریزی شاعری میں غزل کہیں نہیں تھی۔ صحیح موقف تو یہ ہے کہ غزل کے حسن و جمال اور اس کے کوائف سے بہرہ ور اور لطف اندوز ہونے کے لیے نیم وحشی قبایل کی فطری تہذیب اور متلون مزاجی، عادات و اطوار کی رنگارنگی سے پوری واقفیت ہونی چاہئے۔ ہر قوم کا ایک جمالیاتی حس (Aesthetics) ہوتا ہے' جس کا تعلق قوم کے جغرافیائی حالات، روایات اور ذہنی نشوونما سے ہوتا ہے اور غزل مشرقی جمالیاتی حس کی دین ہے۔ اگر اس کا تقابلی مطالعہ نیم وحشی قبائل کی فطری اور مجرد تہذیب کی رنگارنگی سے کیا جائے تو یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ غزل اور نیم وحشت میں بڑی مماثلت ہے' یعنی پروفیسر موصوف کی نظر میں غزل کی تحقیر توقیر میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مجھ کو پہلے خیال آیا کہ اس پر مقالہ لکھوں مگر ہوش جونپوری کے اصرار پر اسی (Comparative Study) تقابلی مطالعہ کو بجائے نثر کے نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کا عنوان اور ہئیت "غزل در غزل" ہے۔ اس پر کئی جگہ اور بحثیں ہو چکی ہیں اور اب اس کو پروفیسر کلیم الدین احمد کے ہم وطن دانشوروں کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ وہ کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ سب نے بڑی توجہ سے سنا اور چند سوالات اور میرے وضاحتی جوابات کے بعد سب نے اتفاق رائے سے فیصلہ میرے موافق دیا اور غزل در غزل کو میرے بڑے کارناموں میں شمار کیا۔ یہ نشست بڑی حسن و خوبی کے ساتھ مسلسل گفتگو کرنے کے بعد اختتام پذیر ہوئی اور ویڈیو کیمرہ میری صورت دیکھتا اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔

چھ بجے شام والی نشست ان معنوں میں قدرے مختلف تھی کہ زیادہ تر اس میں مجھ سے فرمائشی نظمیں اور غزلیں سنی گئیں۔ اس میں بھی سامعین اور دوسرے دانشور اور صحافی حضرات میری تخلیقات کے تجزیوں سے

شکلیں اور نام یاد رکھنے میں قدرے دقت محسوس ہوئی تھی ۔ حسن اتفاق کہ وہاں ملاقاتوں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا کہ مجھ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہو ۔ اچھے باذوق اور تجربہ کار لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ "آپ نے مجھ کو پہچانا"، بلکہ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس موقع پر پرانے ملنے والوں نے زیادہ تر یہی کہا کہ "میں فلاں ہوں، آپ تو پہچان ہی گئے ہوں گے، مگر آپ میں بہت تغیر ہو گیا ہے" ۔ ڈاکٹر بیدار کے یہاں سب سے پہلے میری ملاقات "نفسیاتی جائزے" کے مصنّف ڈاکٹر محمد محسن ماہر نفسیات سے ہوئی ۔ میرے ہم عمر ہیں اور بڑی پُروقار شخصیت کے مالک ہیں ۔ انھوں نے میرے لڑکے باقر کو پڑھایا تھا اور بڑی محبّت سے اس کا ذکر کرتے ہیں، اور جس کی وجہ سے مجھ کو بھی اُن سے ذاتی لگاؤ پیدا ہو گیا ۔ ڈاکٹر محسن میں اب مجھ کو ایک اور محافظ مل گیا تھا ۔

لنچ کے بعد ریڈیو پٹنہ پر ریکارڈنگ کے لیے گیا وہاں مجھ کو تقریباً ان سب سوالوں کے جوابات دینا پڑے جو دوسرے دن V.D.O. اور شام کی نشست میں دینے تھے ۔ وہاں سے واپسی پر شام کو ہم لوگ گاندھی پارک اور گنگا کے کنارے گاندھی گھاٹ کی سیر کرنے چلے گئے ۔ یہ دونوں جگہیں میری دیکھی ہوئی تھیں مگر اس بار پارک کے گھیرے میں چہل قدمی کے لیے تین میٹر چوڑی تارکول کی سڑک ملی اور گنگا میں تغیانی کم ۔ یہ دونوں جگہیں علی الصباح اور شام کی سیر و تفریح کے لیے بجد پُرسکون ہیں ۔ وہاں جا کر پٹنہ کی بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئی تھیں ۔ چونکہ ان مقامات کا وجود داغ دہلوی کے زمانہ میں نہ رہا ہو گا، اسی لیے ان کو یہ شعر کہنا پڑا ۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں   عظیم آباد میں وہ منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

دوسرے دن دس بجے ڈاکٹر بیدار ڈاکٹر محسن کی معیت میں لائبریری ہال میں پہنچا جہاں مہمان سامعین میں بیگم اختر اور رینوی صاحبہ بھی تشریف فرما تھیں ۔ اور میرے پرانے دوست ریٹائرڈ آئی جی عباس صاحب بھی موجود تھے ۔ ان کے علاوہ اور بھی پرانے احباب سے ملاقات ہوئی ۔ مرکزی میز پر میرے دائیں بائیں ڈاکٹر بیدار اور ڈاکٹر محسن کے بیٹھتے ہی ویڈیو کیمرہ نے ہم کو گھورنا شروع کر دیا ۔ ڈاکٹر بیدار نے میرا تعارف کرایا ۔ اس کے بعد گفتگو اور سوالات کی بوچھار ہونے لگی، جن کے جواب سے میں عہدہ برا ہوتا رہا ۔ جب تنقید کا ذکر شروع ہوا تو قدیم مشرقی اور جدید مغربی تنقیدوں پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے دونوں کے ٹکراؤ کا ذکر کیا ۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹکراؤ ناگزیر تھا جس میں جدید مغربی تنقید کی نمائندگی پروفیسر کلیم الدین احمد کر رہے تھے ۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ انگریزی کے استاد تھے اس لیے وہ زندگی بھر انگریزی ادب سے اردو شاعری کو ناپتے رہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریروں میں بڑی جان ہوتی تھی اور ان کی ہر کتاب یا مقالہ پر کوئی نہ کوئی طوفان ضرور برپا ہو جاتا تھا ۔ ان کے اکثر خیالات سے میں اتفاق کرتا

تھا۔ البتہ ادھر گذشتہ چند برسوں سے ان کا یہ کہنا کہ "اردو غزل" ایک نیم وحشی صنف شاعری ہے، میرے دل کو نہ لگتا تھا۔ اور اس سے زیادہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ اس مسئلہ پر مدتوں بحثیں ہوئیں مگر کوئی یہ ثابت نہ کر سکا کہ غزل نیم وحشی صنف نہیں ہے، اور نہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ پروفیسر موصوف اپنی خاندانی روایات سے بے نیاز ہو کر اور انگریزی شاعری کی اصناف کی روشنی میں غزل کو اس حقارت سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ ادھر اُدھر سے فریقین کی تحریریں دیکھتا رہا کہ ایک دن پوری بات سمجھ میں آگئی۔ اس غیر فیصلہ کن تصادم کی تہ میں یہ راز تھا کہ دونوں فریق اپنے اپنے غلط موقف پر قلم گھس رہے تھے۔ دونوں "نیم وحشت" کے لغوی معنی کو تسلیم کر کے بحثیں کر رہے تھے۔ کسی نے بھی نیم وحشی قوموں اور قبائل کی زندگی کا قریب سے مطالعہ یا دوسرے ذرائع معلومات سے ان کی خصوصیات، حرکات، سکنات اور امزجہ کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ دونوں فریق اصلیت سے لاعلم تھے اور یا ان کی زندگیوں کو صحیح زاویہ سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر موصوف کو تو غزل اس نہج سے بھی نیم وحشی معلوم ہوتی رہی ہوگی کہ انگریزی شاعری میں غزل کہیں نہیں تھی۔ صحیح موقف تو یہ ہے کہ غزل کے حسن و جمال اور اس کے کوائف سے بہرہ ور اور لطف اندوز ہونے کے لیے نیم وحشی قبائل کی فطری تہذیب اور متلون مزاجی، عادات و اطوار کی رنگا رنگی سے پوری واقفیت ہونی چاہئے۔ ہر قوم کا ایک جمالیاتی حس (Aesthetics) ہوتا ہے، جس کا تعلق قوم کے جغرافیائی حالات، روایات اور ذہنی نشو و نما سے ہوتا ہے اور غزل مشرقی جمالیاتی حس کی دین ہے۔ اگر اس کا تقابلی مطالعہ نیم وحشی قبائل کی فطری اور مجرد تہذیب کی رنگا رنگی سے کیا جائے تو یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ غزل اور نیم وحشت میں بڑی مماثلت ہے، یعنی پروفیسر موصوف کی نظر میں غزل کی تحقیر توقیر میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مجھ کو پہلے خیال آیا کہ اس پر مقالہ لکھوں مگر ہوش جونپوری کے اصرار پر اس (Comparative Study) تقابلی مطالعہ کو بجائے نثر کے نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کا عنوان اور ہئیت "غزل در غزل" ہے۔ اس پر کئی جگہ اور بحثیں ہو چکی ہیں اور اب اس کو پروفیسر کلیم الدین احمد کے ہم وطن دانشوروں کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ وہ کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ سب نے بڑی توجہ سے سنا اور چند سوالات اور میرے وضاحتی جوابات کے بعد سب نے اتفاق رائے سے فیصلہ میرے موافق دیا اور غزل در غزل کو میرے بڑے کارناموں میں شمار کیا۔ یہ نشست بڑی حسن و خوبی کے ساتھ مسلسل گفتگو کرنے کے بعد اختتام پذیر ہوئی اور ویڈیو کیمرہ میری صورت دیکھتا اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔

چھ بجے شام والی نشست ان معنوں میں قدرے مختلف تھی کہ زیادہ تر اس میں مجھ سے فرمائشی نظمیں اور غزلیں سنی گئیں۔ اس میں بھی سامعین اور دوسرے دانشور اور صحافی حضرات میری تخلیقات کے تجربوں سے

کافی متاثر اور متعرف رخصت ہوئے اور میں دوسرے دن وطن واپس آگیا اور پھر اپنے کاموں میں مشغول ہوگیا۔

اب ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو کون پاتا ہے۔ دو ہی مہینے بعد ۶ جولائی ۱۹۸۵ء کو ان کا ایک .D.O ملتا ہے کہ خدا بخش لائبریری کا شعبۂ نشر و اشاعت آپ سے ایک خاص پروجکٹ پر کام کروانا چاہتا ہے، اور وہ پروجکٹ ہے آپ کی خود نوشت سوانح عمری۔

مَیں ایک مدت سے خود اس منصوبہ پر کام کرنیکا ارادہ رکھتا تھا۔ خود نوشت کی ڈمی بھی برسوں سے بنی رکھی تھی اور دو ایک باب لکھ بھی چکا تھا، مگر اس خیال سے کہ اس ۷۵۔۸۰ برس کی طویل داستان پارینہ کو کون چھاپے گا؟ اس ارادہ کو تقریباً موقوف ہی کر چکا تھا کہ یہ خط آیا۔ اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں اور میں نے خط کے جواب میں حامی بھرلی۔ اور جم کے لکھنا شروع کر دیا۔ سنجیدگی سے سوچنے پر اوّل اوّل یہ محسوس ہوا کہ اب اس عمر میں یہ مشکل کام مجھ سے تو نہ ہوگا۔ مگر پھر خیال آیا کہ ۷۵۔۸۰ ہی کی عمر خود نوشت لکھنے کی ہوتی ہے، اس عمر سے پہلے یہ کام پوری طرح تشکیل نہیں پا سکتا تھا یا پھر اگر جوانی سے یہ کام شروع کر دیا جاتا تو ہر پانچ دس سال کے بعد اس میں ابواب کے اضافے ہوتے رہتے۔

ابھی خود نوشت کے دو تین ابواب ہی لکھ سکا تھا کہ میں ۵ اگست ۸۵ء کو سخت بیمار پڑا۔ چار دن کے ملیریا بخار نے میری صحت کو بالکل ناقابل علاج کر دیا۔ رخصت ہوتے ہوئے ۱۰۴° کے بخار نے وہ (Parting Kick) دولتی دی کہ معدہ، جگر اور تمام اعضائے رئیسہ جواب دے گئے۔ اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ معمولی نقل و حرکت ناممکن ہوگئی۔ اپنے پرانے فیملی ڈاکٹر رام چندر اوپادھیا کو بلا کر دکھلایا۔ جن کے نسخہ سے بس اتنا ہوگیا کہ کچھ اشتہا لگنے لگی تھی۔ اسی کمزوری کی حالت میں مَیں نے اپنے بڑے لڑکے شموں کو اپنی بیماری کی اطلاع تین جملوں میں پوسٹ کارڈ پر سنگرولی بھیجی۔ میں اپنے بچوں کو انگریزی میں خط نہیں لکھتا۔ ہمیشہ اردو میں۔ مگر بخار اور کمزوری کے غناٹے میں تین جملے انگریزی میں لکھ سکا

Very sick. Very weak. Cant walk any more.

پانچویں دن شموں مجھ کو لے جانے کی غرض سے گاڑی لیکر پہنچ گئے اور مجھ کو لاد پھاند کر سنگرولی پہنچا دیا۔ وہاں میرا علاج تقریباً ایک مہینہ ہوا جس سے کچھ افاقہ بھی ہوا۔ مگر چونکہ وہاں کا پانی پسند نہیں آیا اس لیے میں پھر وطن واپس آگیا۔ اور یہاں سے خود نوشت کا میٹریل اور جملہ کاغذات لیکر باقر کے پاس ۸ اکتوبر ۸۵ء کو شہدرہ پہنچ گیا شہدرہ دہلی میں مینٹل ہوسپیٹل کے قریب ہی سرسوتی دیانند ہوسٹل ہے جو باقر کے گھر سے ایک فرلانگ

کے فاصلہ پر واقع ہے۔ بہت بڑا اسپتال ہے اور اس میں بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر متل وہاں کے اچھے ڈاکٹروں میں ہیں۔ پورے چیک اپ اور خون، یورین اور اسٹول کے ٹسٹ رپورٹ کے بعد انھوں نے میرا علاج شروع کیا۔ نسخہ لے کے باقر نے ڈاکٹروں سے سوال کیا کہ کھانے پینے میں کیا کیا پرہیز ہوگا؟ ڈاکٹر متل نے جواب دیا اگر پرہیز ہی کروانا ہے تو دوا کی کیا ضرورت ہے۔ میرا کام علاج کرنا ہے اور آپ لوگ ان کو خوب کھلائیے کہ میری دوائیاں مرض دور کرنے کے علاوہ بھوک بھی لگائیں گی۔ کوئی پرہیز وہیز نہیں ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں مجھ کو بہترین دوائیاں اور بہترین کھانا ملنے لگا۔ چھوٹی دلہن کو معلوم تھا کہ کھانے کے معاملہ میں بیحد ندیدہ ہوں۔ اس لیے اس نے میری ہر پسندیدہ ڈش پکوانا اور کھلانا شروع کر دیا۔ دو ہفتہ میں میں باقاعدہ چلنے پھرنے بھی لگا تھا۔

دوران قیام وطن میں بیماری نے مجھ کو ایسا بنا دیا تھا کہ میرے تیماردار اور عیادت کرنیوالے میری زندگی کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور سب کو یہ گمان غالب تھا کہ میں اب بچونگا نہیں اور مجھ کو بھی ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ "این قدر ہست بانگ جرسے می آید"۔ دود کشی جس کا میں عادی تھا اور بیماری سے پہلے ۱۵ گرام تمباکو روزانہ پی جایا کرتا تھا، اس سے یک لخت نفرت ہو گئی تھی۔

اس بیماری کے درمیان وطن میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ ہمارے ایک بہت قریبی عزیز گاؤں میں مستقل رہتے ہیں۔ وہ روزانہ میری عیادت کو آتے تھے۔ ایک دن جب طبیعت بہت خراب تھی تو انھوں نے کہا کہ "آپ جلد از جلد کوئی اچھا بڑا ڈاکٹر بلوایے اور ہو سکے تو جلد اپنے بیٹوں کو بلا یے کہ وہ آکر آپ کو لیجائیں اور معقول علاج کروائیں ورنہ بات کہنے کو رہ جائیگی"۔ اچھے ہونے کے بعد میں نے یہ گفتگو اپنے ماموں زاد بھائی علی حسین جعفری کو سنائی تو وہ بہت ہنسے اور کہا کہ انھوں نے ٹھیک ہی رائے تو دی تھی۔ آپ کے بچنے کی کوئی امید تو تھی نہیں اور آپ کی اولادوں میں سے کوئی آپ کے پاس نہ تھا۔ ایسی صورت میں خدانخواستہ اگر آپ انتقال کر جاتے تو علاوہ اس غریب کے آپ کی تجہیز و تکفین کون کرتا اور اس کا اینشیل اکسپنڈیچر تو وقتی طور پر انھی کو اٹھانا پڑتا۔ چنانچہ وہ آپ کو یہ صحیح رائے دے رہے تھے۔ سارے اخراجات تو بعد میں ان کو ملتے ہی مگر عین وقت پر اخراجات کا تمام بوجھ انھی پر آتا۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے آپ صرف ان کی موجودگی میں مریں" ہم لوگ اس پر خوب ہنسے۔

ہاں تو میں ڈاکٹر متل کے علاج کا پندرہواں دن بیان کر رہا تھا۔ جب میں چلنے پھرنے لگا تو ایک دن ٹہلتا ہوا ڈاکٹر متل سے خود ملنے چلا گیا تھا۔ قدرے تھکن کا احساس ہوا تھا مگر چند دنوں میں وہ بھی دور ہو گیا۔ ڈاکٹر متل نے میری دود کشی ترک کرنے کا حال سنا تو انھوں نے فوراً اس کو پھر شروع کر دینے کا حکم دیا اور کہا کہ "دیکھئے گذشتہ ۶۰ برس میں تمباکو کو جس قدر نقصان کرنا تھا کر چکا اور اب یہ آپ کی زندگی کا اہم جزو بن گیا ہے۔ آپ اسموک کرنا شروع

کر دیجیئے ورنہ امکانات اس کے بھی ہیں کہ اسموک نہ کرنے سے کوئی Mental یا Physical (Ritardation) تعویق پیدا ہو جائے چنانچہ اسی دن سے میں نے پائپ پینا اور خود نوشت لکھنا شروع کر دیا۔

دوران علاج قیام دہلی میں میں نے تین چار ابواب لکھ ڈالے۔ اس دوران ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے میری خط و کتابت ہوتی رہی اور وہ میری ہمت بڑھاتے رہے۔ اب میں بالکل صحتیاب ہو چکا تھا اور ڈاکٹر متل کی اجازت سے ۲۰ر نومبر ۸۵ء کو شہدرا سے شمس آباد اپنی بٹیا شیریں کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں بھی خود نوشت کے ایک آدھ باب لکھے۔ اور یکم دسمبر کو شمس آباد سے روانہ ہو کر ۲ر دسمبر کو اپنے وطن جگناؤں پہنچ گیا۔ وطن میں سب نے میری صحت کی تعریف کی جس پر میں بہت خوش ہوتا تھا۔ میں دبلا پتلا ہوں یا موٹا، جب مجھ سے کوئی کہتا ہے کہ آپ بہت دبلے ہو گئے تو میرے منھ کا مزہ خراب ہو جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ وہ شخص جلد از جلد میرے سامنے سے ہٹ جائے۔ یوں بھی بیوقوف لوگ بیمار کو دیکھ کر کہتے ہیں "ہائے ہائے آپ کتنے نحیف و زار ہو گئے ہیں، پہلے کتنے تندرست تھے"۔ تو ان بیوقوفوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طریقۂ عیادت بہت نامناسب ہے۔ کوئی کتنا ہی بیمار ہو ہمیشہ اس سے کہنا چاہیے کہ تم اب بہتر معلوم ہو رہے ہو اور جلد ہی چلنے پھرنے لگو گے"۔ یا بیماری کے بعد کسی سے ملو تو ہمیشہ اس کی صحت کی تعریف کرنے سے اچھا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ نہ کہ بیمار سے ہمدردی اور اظہار رحم و کرم۔ جس کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

میں اب تک تیرہ ۱۳ ابواب قلمبند کر چکا ہوں، مگر صاحبو! خود نوشت کی اس منزل پر پہنچ کر میرا وہم یقین کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ یہ بہت ہی جان لیوا کام ہے اور شاید اسی لیے زیادہ تر اہل قلم حضرات عام طور پر اس صنف ادب پر قلم اٹھانے سے کتراتے رہے ہیں۔ سوانح حیات لکھنے والا اپنے ہیرو کو بہ مشکل آدھا دیکھ سکتا ہے جبکہ خود نوشت کو اپنی شخصیت اور کردار کا سو فیصد سچائی اور سوانح حیات کا مرقع ہونا چاہیے۔ خود نوشت کے ان عناصر کو نظر میں رکھتے ہوئے بڑے نازک مراحل سے گذرا ہوں اور جن کے اعتراف میں بڑی جرأت سے کام لینا پڑا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ میں ان منزلوں سے بغیر کاندھا ڈالے ہوئے کس طرح گذر گیا۔ اس زندگی کے بحر ناپید کنار میں میری حیثیت ایک قطرہ کی بھی تو نہیں ہے۔ مگر کس کو خبر کہ اس ایک قطرہ میں ایک عالم اور خود ایک بھری پری دنیا ملتی ہے جس میں دوبارہ از سر نو سفر کرنا پڑا ہے۔ کس دھن میں وہ سب راز ہائے سربستہ افشا کر دیے سمجھ میں نہیں آتا۔ دروغ گوئی بڑا جرم ہے مگر صادق الہجہ ہونا اس کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کلّو ڈاکو سے جھوٹ نہ بولنے کی قسم لی تھی۔ اس کے نتیجہ میں اس کی زندگی کتنی تلخ ہو گئی تھی کہ بیان سے باہر اسی طرح خود نوشت کے سفینہ کا سلامتی سے پار لگانا انتہائی مشکل اور جرأت طلب ثابت ہوا ؎

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ مذہب عشق اختیار کیا

(آپ میری داستانِ زندگی سے بور تو نہیں ہوئے ؟ اگر ہوئے تو کوئی محلِ تعجب نہیں کہ پانی یا شیشہ کا ایک بلبلہ اتنا سخت ہو گیا کہ آہنی ہتھوڑوں سے بھی نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ بہرکیف اب آپ کے صبر کا زیادہ امتحان نہ لوں گا۔ آج ۲۵ر فروری ۱۹۸۶ء ہے۔ آج تک کی چند باتیں اور، جس کے بعد کون جانے کہ آپ کہاں ہوں گے اور میں کہاں ہوں گا۔ نیوکلائی جنگ کے بادل سر پر منڈلاتے چلے آ رہے ہیں)

جب صحت یاب ہو کر گھر واپس آیا تو ڈاک میں دو اہم خطوط ملے۔ ایک کامریڈ مقیم الدین فاروقی چیف ایڈیٹر ہفت روزہ "حیات" کا خط تھا کہ "۲۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو دہلی کی شاخ C.P.I. کے جشن طلائی کا مشاعرہ ہے اور آپ کی شرکت اس میں یقینی اور ضروری ہے۔" دوسرا خط تھا الہ آباد سے میرے بھانجے اعجاز اور افتخار کا کہ ان کے مرحوم بھائی ابوالحسن کا ۲۹ر فروری کو فاتحہ اربعین ہے۔ ابوالحسن مرحوم میری اہلیہ کے سگے بھانجے تھے مگر چونکہ وہ خود بیمار ہو کر دلی میں زیر علاج ہیں اس لیے میری شرکت اس میں بھی لازمی ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۲۷ر دسمبر کی شام کو میں جامع مسجد دہلی کے سامنے اردو بازار میں فاروقی صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ کوئی مزدور نہ ملا تو اسباب خود اٹھا کر دوسری منزل پر لے گیا۔ ابھی تک بیماری کے بعد پرانی سکت چونکہ واپس نہیں آئی تھی، اس لیے سانس پھولنے لگا۔ ہولڈال پر بیٹھ کے پہلے سانس درست کیا اور پانچ منٹ بعد تیسری منزل کو آواز دی کہ کوئی ہے تو اوپر سے ایک بڑی گوری چٹی ڈبل روٹی جیسی پلپلی سیدھی سادی لڑکی دوڑتی ہوئی نیچے آئی "ارے وامق چچا۔ یہ سامان آپ خود اٹھا کر اوپر لائے ہیں۔ غضب کر لیا"۔ میں نے کہا، "بیٹی! پہلے یہ بتلاؤ کہ تم کون ہو؟" "میں تاباں صاحب کی لڑکی صہبا اور فاروقی صاحب کی بہو ہوں"۔ میں نے کہا "لعنت ہو مجھ پر کہ تم کو نہ پہچان سکا۔ مگر میں نے تم کو بہت چھوٹا سا کبھی دیکھا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں ہم تم ہلکے سامان اوپر لے چلیں گے"۔ اوپر پہنچے تو بیگم فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ ان کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ان ہی سے معلوم ہوا کہ ایک گھنٹہ بعد بہادر شاہ ظفر مارگ پر پیارے لعل بھون آڈیٹوریم میں مشاعرہ شروع ہو جائے گا۔ اور فاروقی صاحب وہیں گئے ہوئے ہیں۔ چائے پینے کے بعد ایک ٹیکسی سے پہلے اجے بھون C.P.I. H.Q. پہنچے۔ وہاں اپنے نامزد کمرہ میں سامان رکھ کے ہم دونوں پیارے لال بھون پہنچ گئے۔ مشاعرہ ہال، سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ ڈائس خالی تھا۔ اس لیے میں سامعین کی پہلی صف میں جا بیٹھا۔ اب جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک طرف دہلی یونیورسٹی کے V.C. مونس رضا اور ان کے بغل میں ان کی بیگم تہلا بیٹھی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف پروفیسر ممتاز حسین ہیں۔ لیجیے ڈاکٹر قمر رئیس تاباں اور کیفی اعظمی بھی آ گئے۔ "حیات" کے ایڈیٹر شمیم فیضی اور ان کے ساتھ ان کی نہایت حسین اور شرمیلی دلہن، رفعت سروش، ڈاکٹر اجمل اجملی، اسد رضا، اقبال عمر، اور اظہار اثر، ہندی کے کوی رام کمار کرشک، دنے وشواس اور

دیپک رمش ۔ پنجابی کے شعرا جوگما سنگھ، اقبال دیپ اور موہن جیت اور کشمیری شاعر عبدالستار رنجور بیٹھے ہوئے ملے۔

یہ مشاعرہ کئی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ اس کی صدارت پروفیسر مونس رضا کر رہے تھے، اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر قمر رئیس انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر ممتاز حسین مہمان خصوصی کی حیثیت سے پہلی صف میں موجود تھے۔ اور چار زبانوں کے چوٹی کے ترقی پسند شعرا ڈائس پر تھے۔ سامعین میں کہیں دور بھی ہوئی خاموش فیض احمد فیض کی صاحبزادی منیزہ ہاشمی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صدر مشاعرہ نے ان سے ڈائس پر آکر بیٹھنے کی درخواست کی اور وہ صدر کے داہنی جانب آکر بیٹھ گئیں۔ مشاعرہ ہال دہلی کے منتخب دانشوروں اور صحافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کیا مرد کیا خواتین اور کیا نوجوان سب ادب شناس تھے اور شعر سننے آئے تھے۔ مشاعرہ کا آغاز خود اپنی نظم سے قمر رئیس نے کیا۔ وہ سنا ہی رہے تھے کہ قدرے تاخیر سے سردار جعفری بھی آ گئے۔ اب ڈائس کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا اور نہ ہال کا۔

سامعین میں دوسرے موقر لوگوں کے علاوہ مقیم الدین فاروقی کمیونسٹ پارٹی کی کاؤنسل کے سکریٹری، پروفیسر سیف الدین سوز ایم۔ پی، کل ہند قومی یکجہتی کاؤنسل کی صدر سبدرا جوشی اور بہت سے پاکستانی حضرات بھی ہال میں تشریف فرما تھے۔ اس موقع پر پروفیسر ممتاز حسین نے مجاز پر ایک پاکستانی ادیبہ کی کتاب کی رونمائی بھی کی تھی۔ (اس ضمن میں ہفت روزہ جریدہ "حیات" ۵ر جنوری ۱۹۸۶ء میں مشاعرہ کی روداد تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہے)۔

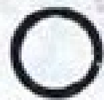
تمام شعرا نے اپنا بہترین کلام سنایا، جن پر ان کو خوب خوب داد ملی۔ تاباں نے دو غزلیں سنائیں اسکے بعد کیفی اعظمی نے فرمائش پر "ابن مریم" اور ایک دوسری نظم سنائی۔ کیفی نے پہلے ہندی چھندوں میں ایک مختصر نظم سنائی۔ میں نے پہلے اپنی تازہ ترین غزل بردیف "سب" سنائی اور متعدد فرمائشوں میں سے ایک نظم "ہم بزدل ہیں" سنائی۔ سردار جعفری نے اپنی ایک تازہ نظم اور پرانی غزل "کبھو کبھو" سنائی۔

فراق گورکھپوری اب ہم میں نہیں رہے اور اگر زندہ ہوتے تو اس مشاعرہ میں ضرور شرکت کرتے۔ وہ اردو کے ایک نامور شاعر تھے مگر ان میں ایک بہت بڑا عیب یہ تھا کہ جب کوئی شاعر مشاعرہ میں ناپسندیدہ کلام سناتا تھا تو وہ عقب میں بیٹھے بیٹھے سامعین کے روبرو نہایت مضحکہ خیز شکلیں بناتے رہتے تھے جس سے سامعین کی توجہ کلام سنانے والے شاعر کی طرف سے ہٹ جایا کرتی تھی۔ اب سردار جعفری نے کم و بیش یہی وتیرہ اختیار کیا ہے۔ میں جتنی دیر غزل اور نظم سناتا رہا وہ کھسیائے ہوئے انداز میں اپنے دانتوں کی نمائش کرتے رہے۔ مگر سامعین اشعار سننے آئے تھے کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی اور پوری توجہ سے میرے اشعار سنتے رہے۔ سردار کی اس خفیف الحرکاتی پر مجھ کو بیحد افسوس ہوا۔ خود ان کا ضمیر بھی ملامت کر رہا ہوگا۔ مشاعرہ کے اختتام پر ہال کے باہر چند نوجوان ادیبوں کی تصویریں لے رہے تھے۔ جب ایک

نوجوان نے سردار کی تصویر لینا چاہی تو انھوں نے خاص طور پر مجھ کو اپنے ساتھ لیکر تصویر کھنچوائی۔ اور میں ایسا بیوقوف کہ پرانے تعلقات اور مروّت کا مارا ہوا ان کے ہر فعل کو برداشت کرتا رہا اور ان کے حال پر افسوس کہ اتنا اچھا دانشور مجھ سے عمر میں کم ہوتے ہوئے اس قدر جلد حذف ہو گیا۔

دوسرے دن صبح سات بجے پوری اکسپریس سے روانہ ہو کر ساڑھے چار بجے سہ پہر کو میں الٰہ آباد پہنچ گیا اور ۲۹ر دسمبر کو ابوالحسن مرحوم کے فاتحہ میں شرکت کرنے کے بعد شب میں ۹ بجے بھگاگاؤں واپس آگیا۔

تین دن کے اس طوفانی سفر نے میرے اعصاب ہلا کر رکھ دیے تھے۔ اس لیے تقریباً ایک ہفتہ تک میں بستر میں آرام کرتا رہا۔ اس کے بعد قوا میں کچھ دم آیا تو میں نے خود نوشت کی باگ ڈور پھر اٹھائی۔



۱۲ر جنوری ۱۹۸۶ر کو ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا خط ملا کہ ۱۵-۱۶-۱۷ فروری ۸۶ر کو خدا بخش لائبریری میں ایک ادبی سیمینار ہو رہا ہے، اس میں ضرور شرکت کیجیے۔ اس سیمینار میں دو مسائل زیر بحث تھے۔ ایک مخطوطات پر اور دوسرا "برصغیر میں آزادی کے بعد اردو دانشوری کا جائزہ"۔ دوسرا موضوع مجھ کو پسند آیا تھا، مگر چونکہ خود نوشت میں منہمک تھا، اس لیے سیمینار میں شرکت سے معذرت چاہی۔ مگر ڈاکٹر بیدار کا اصرار بڑھتا گیا اور مزید یہ کہ مقالہ بھی ساتھ ہو، تا آنکہ ۳ر فروری کو پیشگی سفر خرچ اور ۴ر فروری کو تار کہ بذریعہ تار آنے کے وقت سے مطلع کیجیے۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے بذریعہ تار جواب دیدیا کہ ۱۵ر فروری کی صبح کو پٹنہ پہنچ جاؤں گا، اور میں وقت موعودہ پر خدا بخش لائبریری پٹنہ پہنچ گیا۔ مہمان خانہ میں نمبر ۵ کمرہ میں ڈاکٹر وسیم استاد انگریزی جامعہ دہلی کے ساتھ میرا قیام ہوا۔ وسیم سے اس لیے بھی میں جلد بے تکلف ہو گیا کہ ان کو ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کی چھوٹی ہمشیرہ منسوب ہیں۔

پورا مہمان خانہ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور ہندستان کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مندوبین سے بھرا ہوا تھا اور جب مہمان خانہ میں جگہ باقی نہ رہی تو بہت سے مندوبین اوّل درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے تھے۔

صبح کی چائے ناشتہ، لنچ اور ڈنر کا بہترین انتظام دیکھ کر بیگم بیدار کے حسن انتظام کی تعریف کرنا پڑتی تھی۔

سیمینار کی افتتاحیہ نشست ۱۵ر فروری ۸۶ر کو ٹھیک ۱۱ بجے دوپہر کو خدا بخش لائبریری کے آڈیٹوریم میں شروع ہوئی۔ ڈاکٹر بیدار نے گورنر بہار مسٹر پی۔ وینکٹا سوبیا کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے دم کو اردو کی بقا اور ترقی کا ضامن بتلایا۔ انگریزی میں اس مختصر تقریر کے بعد گورنر موصوف نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، جس میں انھوں نے اردو کو ہندستان کی مخلوط ثقافت کا ایک ستون قرار دیا اور اس کی بقا اور ترقی کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دینے کا وعدہ کیا اور بیرون ملک سے آئے ہوئے مندوبین کو برصغیر میں اردو کی قدر مشترک کی علامت بتلایا تھا۔ خطبہ انگریزی میں طویل اور پر مغز تھا۔ اس کے اختتام پر انھوں نے

سمینار کا افتتاح کیا اور اس کی کامیابی کی نیک خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے مندوبین نے مختصر تقریریں کیں اور دعوت شرکت کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بیدار نے اردو میں تقریر کی اور سمینار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مندوبین کی سمینار سے والہانہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے یقین ہوتا ہے کہ پڑھے جانے والے مقالوں اور اُن پر بحثوں سے ہم استفادہ کریں گے۔ اس کے بعد سلیم الدین احمد صاحب ڈائرکٹر سمینار نے گورنر صدر افتتاحیہ اور تمام مندوبین سمینار کی دعوت پر لبیک کہنے کا شکریہ ادا کیا اور D.O. ۷ جو جلسے کے آغاز سے اختتام تک مستقل اپنی تابش نظر سوز سے پریشان کرتا رہا تھا، آنکھیں بند کر بیٹھا۔

لنچ کے بعد مندوبین نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ میں چونکہ سفر کی تکان سے بہت خستہ ہو رہا تھا، اس لیے دوسرے اجلاس میں جان بچا کر دو بجے سے شام تک اپنے بستر میں سوتا رہا۔

۱۶ فروری سے باقاعدہ مقالہ خوانی کا اجلاس شروع ہوا جس میں پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، جوگندر پال، ساتی رنجن بھٹاچاریہ، جیلانی بانو، انور معظم اور میں نے بھی عملی حصہ لیا۔ ڈاکٹر بیدار نے اس کے کوارڈینیٹر کے فرائض انجام دیئے۔

مقالوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ (۱۶-۱۷) دو دن میں نہ تو سب پورے پورے مقالے پڑھے جا سکتے تھے اور نہ ہی ان پر پوری طرح بحثیں ہو سکتی تھیں، اس لیے ڈاکٹر بیدار نے ہر مقالے کے لیے پندرہ منٹ کا وقفہ مقرر کر دیا تھا اور جس کو گھٹا کر، ا مقالہ کا وقفہ ۱۲ منٹ کرنا ناگزیر ہو گیا۔ ہر مقالہ کی تفصیل تو ان اوراق میں پیش نہیں کی جا سکتی مگر ان کا ایک تاثراتی سرسری جائزہ لینا ممکن ہے۔ ہر مقالہ آزاد حیثیت سے پرمغز اور معلوماتی تھا۔ مگر پاکستان سے آئے ہوئے سب ہی مقالے کم و بیش علامہ اقبال پر تھے اور حوالے ان کتابوں کے تھے جو تقسیم برصغیر کے بعد علامہ اقبال پر لکھی گئی تھیں۔ جن میں دانشوری کا شائبہ تو کہیں کہیں مل جاتا تھا البتہ Intellectual Thinking کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا تھا اس لیے زیادہ تر پاکستانی مقالے اپنی Anachronism سہو زمانی کی بنا پر Out of focus خارج از موضوع معلوم ہوئے۔ اور محل تعجب یہ امر بھی ہے کہ کسی مقالہ نگار نے فیض، جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، فارغ بخاری، حمایت علی شاعر، سید سبط حسن، جون ایلیا، حبیب جالب اور دوسرے بیشمار ابھرتے ہوئے دانشوروں کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کے یا اقبال کے بعد علاوہ ان پر کتابیں لکھنے والوں کے پاکستان میں گذشتہ چالیس برس کے اندر کوئی دانشور پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان مندوبین پاکستان کا یہ رویہ اردو کے حق میں بڑا مایوس کن تھا۔ جب کہ ڈاکٹر محمد حسن اور دوسرے ہندوستانی محققین نے بہت اچھے اچھے مقالے پڑھے جن کو Learned paper کہا جانا چاہیے۔ میرا بھی آٹھ دس صفحات پر مشتمل پندرہ منٹ کا مقالہ تھا، جس میں تقسیم برصغیر کے بعد ادیبوں اور اردو والوں کی کارکردگی کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا تھا اور یہ کہ

یہاں Intellectual Thinkers نے کس طرح عام طور پر بے توجہی برتی یا اردو والوں نے بعض Scientific I.T. کو بجائے اس کا خیر مقدم کرنے کے رد کر دیا۔ اور اس طرح برصغیر میں Intellectual thinkers نے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ اس پر کافی شور و غل ہوا۔ مقالہ کے بعد میرے مقالہ پر بیس پچیس اعتراضات کیے گئے اور کچھ وضاحتیں طلب کی گئی تھیں۔ مجھ کو جواب دینے میں آسانی اس لیے ہوئی کہ جملہ اعتراضات اور سوالات کا مزاج ایک سا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ سب کا نظریہ اور موقف میرے زاویہ نظر سے ٹکرا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے چند جملوں میں سب کو ایک جواب دیدیا۔ میں نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ محض سرمایہ دار طبقہ تنہا اپنے Vestedinterest کا تحفظ نہیں کرتا۔ دانشوروں کے بھی vested interest ہوتے ہیں۔ مذہبوں کے بھی Vested interest ہوتے ہیں اور جو لوگ کچھ نہیں کرتے ان کے بھی ہوتے ہیں اور میرے خیالات سے ان کا ٹکراؤ ہو تو وہ بھی بجائے سر بگریباں ہونے کے خم ٹھونک کر میدان جہاد میں اُتر آئے۔ ظاہر ہے کہ کسی نوع کے Vested interest کو میری طرف سے کوئی ہمدردی یا مفاہمت کا سہارا نہیں مل سکتا۔ چونکہ میرا مقالہ ان تلخ حقائق کو اُجاگر کرتا ہے جو Intellectual Thinking کے خلاف پائے جاتے ہیں تو مخالفین اس کو چکنا چور کر دینے کی سعی کرتے ہیں۔ اصولی معاملات میں جذبات سے برانگیختہ ہو کر تبادلہ خیال ممکن نہیں۔ میرے مقالے کو ٹھنڈے دل سے پڑھا جائے تو ممکن ہے کہ یہ کہکر بات ختم کر دی جاتی کہ ان کو مجھ سے اتفاق نہیں۔ اس کے علاوہ مزید گفتگو کی آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

چند مندوبین نے یہ بھی اعتراض کیا کہ یہ مقالہ ایک خاص نظریہ کی تحت لکھا گیا ہے۔ اس کا صاف جواب یہ تھا کہ کوئی بڑا ادب ایسا نہیں ہوتا جو کسی نہ کسی نظریۂ حیات کے اثرات سے مبریٰ ہو۔ مثنوی مولانا رومؔ کے عظیم ہونے پر کسی کو شک نہیں مگر اس میں شروع سے آخر تک تصوف کا پروپیگنڈا ہے۔ اقبالؔ کی تمام تخلیقات انسان دوستی کے نظریہ سے مزین ہے تو اگر میرا مقالہ مارکسی نظریہ کی عکاسی کرتا ہے تو اس میں کون سی فرد جرم لگائی جا سکتی ہے کسی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

بحث ختم ہونے کے بعد متعدد صحافیوں نے اشاعت کے لیے میرا مقالہ لینا چاہا مگر ڈاکٹر بیدار نے اس کو اپنے قبضہ میں لیتے ہوئے کہا کہ اب یہ ملکیت لائبریری کی ہے، جب وہ اس کو اپنی رپورٹ میں شامل کر کے شائع کر لیں گے تب ہر شخص اس کو شائع کرنے کے لیے آزاد ہوگا۔

دوسرے دن ۱۱ر فروری کو بہت سے مقالے تھے اور وقت ۱۵ منٹ سے گھٹا کر ۱۲ منٹ کر دیا گیا تھا۔ طویل مقالہ نگاروں نے تلخیص پیش کی تھیں مگر جب ڈاکٹر عنوان چشتی کا نمبر آیا تو انھوں نے اپنے طویل مقالہ کو تیز پڑھنے یا

تلخیص پیش کرنے سے انکار کر دیا' جس کو ڈاکٹر بیدار نے بحیثیت کوارڈینیٹر کے مسترد کر دیا تو عنوان چشتی واک آؤٹ کر گئے۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر ممتاز حسین نے کی تھی۔ سیمنار کے اختتام پر ان کی صدارتی تقریر بہت متوازن پر مغز اور خوبصورت تھی' اور میرا خیال ہے کہ ان تین دنوں کی تقریروں میں سب سے اچھی تقریر ممتاز کی تھی۔

اس سہ روزہ سیمنار میں مقالہ نگاروں اور بحث میں حصّہ لینے والوں کے اسمار گرامی یہ ہیں:۔

پاکستان: ممتاز حسین، مسعود احمد برکاتی، محسن احسان مع بیگم، ڈاکٹر ابوالخیر مع بیگم، جمیل اختر خاں، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر یعقوب مغل، سراج منیر، ڈاکٹر معز الدین احمد، غلام مصطفےٰ قاسمی۔ نظیر صدیقی۔ صدیق شبلی، قدرت اللہ فاطمی، نیاز ہمایونی، بیگم بلقیس شاہین۔

بنگلہ دیش: بیگم کلثوم ابوالبشر، حسن رضا دائروی۔

نیپال: موہن راج شرما۔

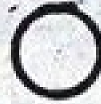
هندستان: عبدالرزاق فاروقی، عبدالصمد، ڈاکٹر عبدالسبحان، ڈاکٹر اقبال الدین اقبال، احمد بدر، احمد جمال پاشا مع بیگم، ڈاکٹر انور معظم، عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، محمد عظیم، حبیب خاں، ڈاکٹر سید حسین احمد، ڈاکٹر سیّد محمد حسن، س۔ س۔ اسمٰعیل، بیگم جیلانی بانو، جوگندر پال، ڈاکٹر کلیم عاجز، محمود حسن قیصر، مسعود انور علوی، متین احمد۔ ڈاکٹر محمد حسن، محمد محسن مع بیگم، ڈاکٹر ممتاز اظہر رضوی، رفیع الدین، رحمت علی خاں، ریحان غنی، ڈاکٹر رضی الدین احمد، ڈاکٹر شکیب ایاز، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، سلیمان اختر جاوید، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، عنوان چشتی، ڈاکٹر محمد وسیم، ڈاکٹر ذکیہ جیلانی، ڈاکٹر ضیاء الدین اصلاحی، اختر شیرازی، ڈاکٹر احمر لاری، انیس صدری، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، حکیم سیّد یوسف پھلواروی، نور عظیم ندوی، محمود الاظہر ندوی، میر مجید الدین علی خاں، منظر حسین شاہ، ڈاکٹر پروین رخسانہ، شاہ علی ابدالی، حفیظ بنارسی، ڈاکٹر نصیر احمد، ڈاکٹر محمد عبدالاحد، نواب رحمت اللہ شیروانی، حکیم خالد جاوید شمسی، حسین الحق، مسعود عالم، موہن بھاٹیہ، عبدالمبین، عطا خورشید، قاضی عبدالستار، ڈاکٹر اخلاق اثر اور راقم الحروف۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ باوجود اپنی چند خامیوں کے یہ سیمنار کس قدر اہم اور کتنا متنوع تھا۔

البتہ ایک بات شروع سے آخر تک کھٹکتی رہی کہ "دانشوری" کی اصطلاح Intellectual thinking کی پہنائی اور اس کے وسیع کینوس کے ساتھ انصاف نہ کر سکی۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ I.T. کا اردو ترجمہ دانشوری سے بہتر نظر بھی نہیں آتا تو معذرت کے ساتھ "انٹلکچول تھنکنگ" کی اصطلاح براہ راست اردو میں کیوں نہ شامل کر لی جائے جس سے اردو قلم کو جولانی کے لیے وسیع تر میدان ملے۔

جو فرق وجدان اور عرفان میں ہے وہی .T.I اور دانشوری میں ہے جو فرق (Creative Arts) تخلیقی فن اور روایتی انداز فکر میں ہے وہی .T.I اور دانشوری میں ہے۔ .T.I میں جب تخلیقی انداز فکر شامل ہو جاتا ہے تو اس کو وجدان کہا جائے گا۔ عرفان کتابوں اور دوسرے ذرائع معلومات سے حاصل کیا جا سکتا ہے، جبکہ وجدان اور اس کی مقدار کی صلاحیت انسانوں میں پیدائشی اور متعین ہوتی ہے اور اسی کے تعین سے تخلیقی فن کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بلند پایہ .T.I کے لیے وجدان ضروری ہے جبکہ دانشوری عرفان تک محدود رہتی ہے، یعنی دانشور کا .T.I یا تخلیقی فنکار ہونا بغیر وجدان کے ثابت نہیں ہوتا۔ میرے یہ چند معروضات ہیں جو کسی سیمینار کے اچھے موضوع بحث بن سکتے ہیں۔ ایسا بھی اس مسئلہ پر فیصلہ کن بحث اس لیے ضروری ہے کہ ہر مصنف، مؤلف، محقق یا نقاد اپنے کو .T.I سمجھتا ہے یا سمجھا جاتا ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی



۹-۱۰-۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی تھی۔ ۹-۱۰-۱۱ اپریل ۱۹۸۶ء کو عالمی سطح پر لکھنؤ میں اس کا جشن طلائی منانے کا بہت بڑے پیمانہ پر انتظام ہو رہا ہے۔ صوبہ بھر میں جگہ جگہ پر فنڈ جمع کرنے کے لیے مشاعرے اور جلسے ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ انتظامیہ کے پریسیڈیم کے صدر کیفی اعظمی ہیں اور میں بھی اس کا ایک ممبر ہوں۔

دوسری طرف کراچی میں ۶-۷ اور ۸ مارچ ۱۹۸۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین (پاکستان) کا جشن طلائی بہت بڑے پیمانہ پر منایا جائے گا۔ اس جشن میں شرکت کے اصرار نامے موصول ہوئے ہیں۔ شوکت صدیقی صدر تنظیمی کمیٹی اور بھائی سیّد سبط حسن کے خطوط ملے کہ جشن میں ضرور شرکت کروں۔ ویزا کے لیے دہلی جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ یہاں کے چند مخلصین کے خطوط ملے کہ ویزا کی درخواست میں انجمن کے جشن میں شرکت کا ذکر نہ کروں ورنہ ویزا نہ ملے گا۔ بلکہ کسی عزیز سے ملنے اور اس کی بیماری کو ویزا کا سبب بناؤں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی میرے تمام ولولوں پر اوس پڑ گئی۔ میں طبعاً غلط بیانی سے معذور ہوں۔ چنانچہ میں نے سیّد سبط حسن اور شوکت صدیقی کو لکھ دیا کہ چند وجوہ کی بنا پر میں باوجود انتہائی للک کے ان تاریخوں میں کراچی نہ آ سکنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ البتہ جشن کی کامیابی کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا ایک پیغام منسلک کر دیا۔ اس مبارک موقع پر کراچی نہ جا سکنے پر میں حقیقتاً بہت مغموم ہوں۔ اپنی گرتی ہوئی صحت کی طرف سے بھی میں مجبور ہوتا جا رہا ہوں۔ طویل سفر سے طبیعت گریز کرتی ہے۔ کراچی میں میرے لاتعداد احباب اور اعزہ ہیں، اس لیے بھی اتنی قلیل مدت کے لیے وہاں جانا مجھ کو گوارہ نہ تھا۔ یہاں خود بھی بہت سے کام ادھورے پڑے ہوئے ہیں، جن کو ایک خاص مدت میں پورا کرنا ہے۔ جبکہ

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد　　　ہر چہ گیرید مختصر گیرید

••

اختتامیہ

آج دنیا، تاریخ کے سب سے خطرناک دور سے گذر رہی ہے۔ آج دنیا، نیوکلیائی جنگ کے خطرات سے دوچار ہے۔ آج دنیا، کو دوامی امن عالم اور عدم جنگ کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، جبکہ ہر قوم، ہر فرد، انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے اور ترقی کے راستہ پر گامزن رہ کر بیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاری میں مشغول ہے۔

ان مساعی میں ہمارا وطن کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہمارا وطن آج ہر اس قوم و ملک کا دوست ہے جو اس تباہ کن جنگ کے خطروں کو ختم کرنے اور پرامن زندگی بسر کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اس کوشش میں ہم سب باشعور ادیب اپنے قلم و قرطاس سے وہی زندگی بخش اور شاندار کردار پیش کر سکتے ہیں جو ہم نے اپنے وطن کی جنگ آزادی میں ادا کیا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ ہمارا وطن اندرونی طور پر اس بحرانی دور سے گذر رہا ہے جس میں گرانی، بیکاری، غریبی اور لاقانونیت اپنے پورے شباب پر ہے جس کے نتیجہ میں عوام کا ذہن اپنی پوری توجہ سے ان بین الاقوامی مسائل کا یہ چیلنج قبول کرنے پر تیار نظر نہیں آتا جن سے پوری دنیا دوچار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ نیوکلیائی جنگ کے خطرات سے بے خبر ہیں یا سوچتے ہیں کہ جنگ ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔ ہم مر ہی رہے ہیں تو فرق کیا پڑے گا کہ ایٹم بم سے مرے یا گرانی، غریبی، بے روزگاری یا لاقانونیت سے مرے۔ ابھی تو ہم ہی اپنی زندگی سے بیزار ہیں اور جنگ میں تو وہ عناصر بھی ختم ہوں گے جو ہماری پریشانیوں سے بھری ہوئی زندگی کا سبب ہیں۔ اور اس (Morbid thinking) مریضانہ اندازِ فکر سے ان کو قدرے تسکین ملتی ہے۔

اس لیے ہم آج اپنے تمام ہموطنوں اور بالخصوص برسر اقتدار قوتوں کو توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ وہ ملک کے مفاد میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لائیں جن سے عوام کو ذہنی سکون ملے اور مستقبل کے خوف سے نجات۔ ملک کی دو تہائی سے زیادہ دولت چند مٹھیوں میں بند ہے، ان کو بغیر کسی تاخیر کے ختم ہونا چاہیے اور وہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ملک کے سرمایہ دارانہ نظام کو یک لخت ختم نہ کر دیا جائے اور ملک کی ساری دولت عوامی حکومت کے ہاتھوں میں نہ آ جائے۔

ملک میں سب سے زیادہ غریب اور بیروزگار طبقہ ادیبوں کا ہے جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں (علاوہ ان کے جو دانش گاہوں اور تعلیمی اداروں میں لگے ہوئے ہیں)، ان میں اچھی خاصی تعداد میں وہ ادیب ہیں جنھوں نے ملک کی جنگ آزادی میں اپنی تخلیقات کے ہتھیاروں سے کام لیا۔ جنگ آزادی کے سلسلہ میں جیل جانا آزادی کے سپاہی بننے کی کوئی بہت بڑی سند نہیں ہے۔ آج زندگی کی پہنائی ان پر سب سے زیادہ تنگ ہے۔ ان کی اقتصادی پریشانیوں کی طرف ابھی

تک قوم نے کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ جہاں ہم سوویت دیس سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں، وہیں سے ہم کو یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ زندہ قومیں اپنے دانشوروں کی اقتصادی بہبودی کا کس قدر خیال رکھتی ہیں۔ مگر اس بخشش سے دانشوروں کو خریدا نہیں جاسکتا۔ ہم دانشور ملک کی برسراقتدار پارٹی کے دُم چھلّا نہیں بن سکتے۔ ہم قوم کے خادم ہیں کسی سیاسی جماعت کے نہیں۔ ہم ہراُس پارٹی کے ساتھ ہیں جو ملک میں جلد از جلد اقتصادی انقلاب لائے۔ اصلی اقتصادی اور ذہنی انقلاب وہ ہے جس کو ملک گیر پیمانہ پر مزدور، کسان، محنت کش اور کم آمدنی والے غریب طبقے مل کر لائیں اور اپنی حکومت بنائیں اور جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو کسی بھی شکل میں باقی نہ رہنے دیں۔ یہ انقلاب کل بھی آسکتا ہے اور مدتوں انتظار بھی کروا سکتا ہے اس لیے انقلابی جدوجہد جاری رکھنا ہر باشعور ہندستانی کا فرض ہے۔ ؎

تمام رات کے جاگے ہوئے نہ سوئیں ابھی — کہ ہل گئی کوئی زنجیر در تو کیا ہوگا

اور دانشوروں کو یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ ؎

یہ تو معلوم ہے مرنے پہ ملے گی اُجرت — کارفنکار ہے تصویر بناتے رہنا

اور مزید یہ کہ ؎

روزنِ انتظار وا رکھیے — شمعِ امید کو جلا رکھیے

اس کا کیا ٹھیک کب وہ آجائے — اپنے غم خانوں کو سجا رکھیے

مگر انجمن ترقی پسند مصنفین (P.W.A.) کو کیا ہوگیا ہے۔ کم از کم ترقی پسند ادبی تحریک میں حصّہ لینے والے دانشوروں اور ان کے سچّے ہمدردوں کے لیے ۹-۱۰-۱۱ اپریل ۱۹۸۶ء کا جشن طلائی لکھنؤ بہت مایوس کن ثابت ہوا۔ ہم کو بار بار یہ کہتے ہوئے اب شرم آنے لگی ہے کہ آخر ہم کب تک سمجھوتے کرتے رہیں گے۔

۱۹۵۲ء سے اب تک انجمن کے چند سربرآوردہ ادیبوں نے برسراقتدار سیاسی جماعتوں کو خوش کرنے کے لیے انجمن کو مصنوعی بحران کا شکار بنایا اور اس صورت حال سے استفادہ کیا۔ اس کے بیسؔ سال بعد انجمن کا پھر احیاء ہوا مگر مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین کا نام بدل کر اس کا اینگلو انڈین نام ترقی پسند ادیبوں کی نیشنل فیڈریشن سے بپتسما کیا گیا۔ یہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری شکست، اس کے دشمنوں کی دوسری فتح اور انجمن کے مفاد پرست ممبروں کا دوسرا شرمناک اقدام تھا۔ نتیجہ میں انجمن کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی اور لکھنؤ کے اس جشن طلائی میں انجمن کے کرتا دھرتاؤں کی حیثیت صفر ہوکر رہ گئی۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ جب مرکزی انجمن ترقی پسند مصنفین باقی نہیں تو اس کا جشن طلائی کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا

اس کی پچاسویں برسی منائی گئی ہے، اس جشن میں چند حضرات کٹھ پتلی معلوم ہو رہے تھے۔ نہ ان کی کوئی آواز تھی اور نہ ہی ان کا کوئی اثر ——— ہندستان کے تقریباً ہر زبان کی P.W.A. کی رپورٹیں سامنے آئیں مگر نہ سننے میں آئی تو وہ اردو P.W.A. کی کی کوئی رپورٹ، جبکہ سوویت دیس، انگلستان، کینیڈا اور پاکستان سے تحریری یا تقریری شکل میں ان ممالک کے اردو دانشوروں کے اعمال کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ڈائس کی زینت کے لیے زیادہ تر اردو ادیبوں کو مُکھ پات کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

جشن طلائی کا بجٹ بہت بڑا تھا۔ اس کے سامنے اخراجات کا تخمینہ بھی بیشک بہت وسیع تھا۔ یہ کانفرنس غیر ممالک سے آئے ہوئے مندوبین اور وفدوں کی شرکت کی بنا پر ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جشن ترقی پسند تحریک کا ایک بہت بڑا اور شاندار مظاہرہ تھا، جس میں اخراجات کے لیے کم از پانچ لاکھ روپیوں کی ضرورت تھی۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ اس طرح پوری ہوئی کہ دو لاکھ روپیے اتر پردیش ریاستی حکومت نے دیے۔ تقریباً پچھتر ہزار ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں کی انجمنوں نے جمع کر کے دیے اور رکم و بیش سوا دو لاکھ مشاعروں اور سیمیناروں اور تحریک کے ہمدردوں سے جمع کر کے کیفی اعظمی اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ نے پول کیے۔ اور تب یہ سفینہ پار لگا۔

آخر یہ بات ہماری سمجھ میں کب آئے گی کہ حکومت جب کسی تحریک یا ادارہ کی مالی امداد کرے گی تو تحریک یا ادارہ کو اس کی چشم و ابرو پر نظر رکھنا پڑے گی۔ ترقی پسند دانشوروں کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ وہ اس احسان سے کس طرح عہدہ برا ہو سکیں گے۔ اور کیا اس ادائیگی میں تحریک کا نسب العین مجروح ہو گا یا نہیں۔ بڑا نازک اور اہم مسئلہ ہے جو ہم سب کو دعوت فکر دیتا ہے اور ملک کے عوامی انقلابی اذہان پر اس کا کیا ردعمل ہو گا۔ مزید یہ کہ اگر اس کے دوررس اثرات عوام کے مفاد یا ترقی پسند تحریک کے موقف کے خلاف جائیں گے تو اس خطائے اجتہادی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ کیا وہی لوگ تو نہیں ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کی چھٹی ساتویں دہائیوں میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے انجمن کو زندہ درگور کیا تھا۔ اس وقت تو محض انجمن کی زندگی و موت کا مسئلہ تھا، مگر اب تو لگتا ہے جیسے اس جشن میں نخل آرزو کی جڑ ہی کٹ گئی۔ اور یہ سب حضرات اپنے کو ترقی پسند عوامی ادیب کہتے ہیں ——— مجھ کو تو بس لکھنؤ کی پچاس سالہ کانفرنس میں ایک بات بہت پسند آئی کہ اپنے وطن کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مختلف زبانوں کے ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملا اور جن ادیبوں کو سالہا سال سے نہیں دیکھا تھا وہ انگلستان، کینیڈا اور پاکستان سے اس کانفرنس کو رونق بخشنے، طویل سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے آئے۔ سب کے چہروں پر گرد سفر کا غازہ تھا جو ان کے قلبی اخلاص کی عکاسی کر رہا تھا۔ رابندر رالیے کا آڈیٹوریم ایک انسانیت کے افراد خاندان سے چھلک رہا تھا۔ ان مہمانوں میں سید سبط حسن

کا نام سرفہرست آتا ہے۔ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں تقریباً تیس سیکنڈ تک بغیر کچھ کہے سنے ایک دوسرے سے پلٹے رہے۔ دل چاہتا تھا کہ ہم ان میں تحلیل ہو جائیں، یا وہ ہم میں!

رہا لکھنؤ کانفرنس کی کمزوریوں کا ذکر کرنا تو اس کا اس وقت دہلی میں ڈاکٹر ملک راج آنند کے بعد مجھ کو سب سے زیادہ حق پہنچتا ہے۔ اپریل ۱۹۳۶ء کی بنیادی لکھنؤ کانفرنس میں ایک طالب علم کی حیثیت سے شریک تھا اور آج میں سب سے معمر ترقی پسند اردو ادیب ہوں۔ میرے بزرگ اور ہم عمر ادیب سب کے سب شہر خموشاں بسا چکے جو اکثر بہت یاد آتے ہیں۔ اگر وہ حیات ہوتے تو شاید P.W.A. جس ذلت اور انحطاط سے آج دوچار ہے، اس کو بیتیں نہ آتیں۔ ہم کو اردو والوں سے اتنی شکایت نہیں جتنی ہندی پرگتی شیل لیکھکوں سے ہے کہ انھوں نے ساہتک سیکولرزم کے بنیادی سبق کو اس قدر جلد بھلا دیا۔ ابھی کل تک ہم دونوں ایک ہی منچ پر بیٹھ کر پرگتی شیل ساہت کے کارواں کو کاندھے سے کاندھا جوڑے کس شان سے منزل مقصود کی جانب لے جا رہے تھے ———— اس جشن کا آخری اجلاس مشاعرہ تھا، جس میں مَیں نے اس لیے شرکت نہیں کی تھی کہ اس میں صرف اردو کے شعرا کو دعوت سخن دی گئی تھی۔ ملحوظ رہے کہ یہ P.W.A. کا مشاعرہ تھا، اس میں اگر سب ہندستانی زبانوں کی نہیں تو چند ایسی زبانوں کی نمائندگی ہونا چاہئے تھی جن کے سمجھنے اور جن سے لطف اندوز ہونے والوں کی لکھنؤ میں کمی نہ تھی، مثلاً ہندی، پنجابی، اودھی، بھوجپوریا اور پوربی وغیرہ۔ اس سے بدرجہا بہتر گنگا جمنی مشاعرہ اور کوی سمیلن چند ماہ قبل دہلی میں Delhi C.P.I. Unit نے کیا تھا۔ جس میں ہندی، اردو، پنجابی اور کشمیری زبانوں کے چوٹی کے ترقی پسند کویوں اور شعرا نے حصّہ لیا تھا۔ سننے اور سنانے والوں کا انتخاب بھی بے مثل تھا۔ پورا ہال ایک ادبی گلدستہ معلوم ہوتا تھا۔

P.W.A. کی مرکزی کمیٹی کو اپنی کارکردگی کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے اس پچاس سالہ اجلاس میں کیا کیا غلطیاں کیں اور جو غلطیاں ہوئیں اعتراف کرتے ہوئے ان کے ازالہ کی سعی کرنی چاہیے۔ ہم سب ساہتکار اور فنکار ہیں۔ ہم سب حق و باطل کے فرق کو دوسروں سے بہت زیادہ جانتے ہیں۔ ہم سب عوام اور قوم کے خادم ہیں اور رہنما بھی۔ ہم سب کو سیاسی کمزوریوں سے بالاتر اور جراُتمند ہونا چاہیے اور ہمیشہ (Under hand) تیشہ در آستین پالیسیوں سے گریز کرنا چاہیے۔

••

چند تصویریں مِری...

- ۱۹۲۷ء
- ۱۹۳۲ء
- ۱۹۴۰ء
- ۱۹۴۴-۴۵ء
- ۱۹۴۵ء
- ۱۹۴۶ء
- ۱۹۴۹-۵۰ء
- ۱۹۵۰ء
- ۱۹۵۱ء
- ۱۹۵۴ء
- ۱۹۵۴-۵۵ء
- ۱۹۶۳ء
- ۱۹۶۳ء
- ۱۹۶۸ء
- ۱۹۶۸ء
- ۱۹۷۹ء
- ۱۹۸۰ء
- ۱۹۸۰ء
- ۱۹۸۱ء
- ۱۹۸۱ء
- ۱۹۸۱ء
- ۱۹۸۱ء
- ۱۹۸۲ء
- ۱۹۸۳ء
- ۱۹۸۴ء
- ۱۹۸۴ء
- ۱۹۸۵ء
- ۱۹۸۵ء
- ۱۹۸۵ء
- ۱۹۹۲ء



انٹر کالج فیض آباد۔ ۱۹۲۷ء



لکھنؤ یونیورسٹی ۔ ۱۹۳۲ء



وکالت (فیض آباد) ۱۹۴۰ء



مشاعرہ کوئین کالج بنارس ۴۵-۱۹۴۴ء



بنارس ۔ ۱۹۴۵ء



بنارس ۔ ۱۹۴۶ء



احمد مجتبیٰ/ وامق جونپوری (بارہ بنکی) ۵۰-۱۹۴۹ء



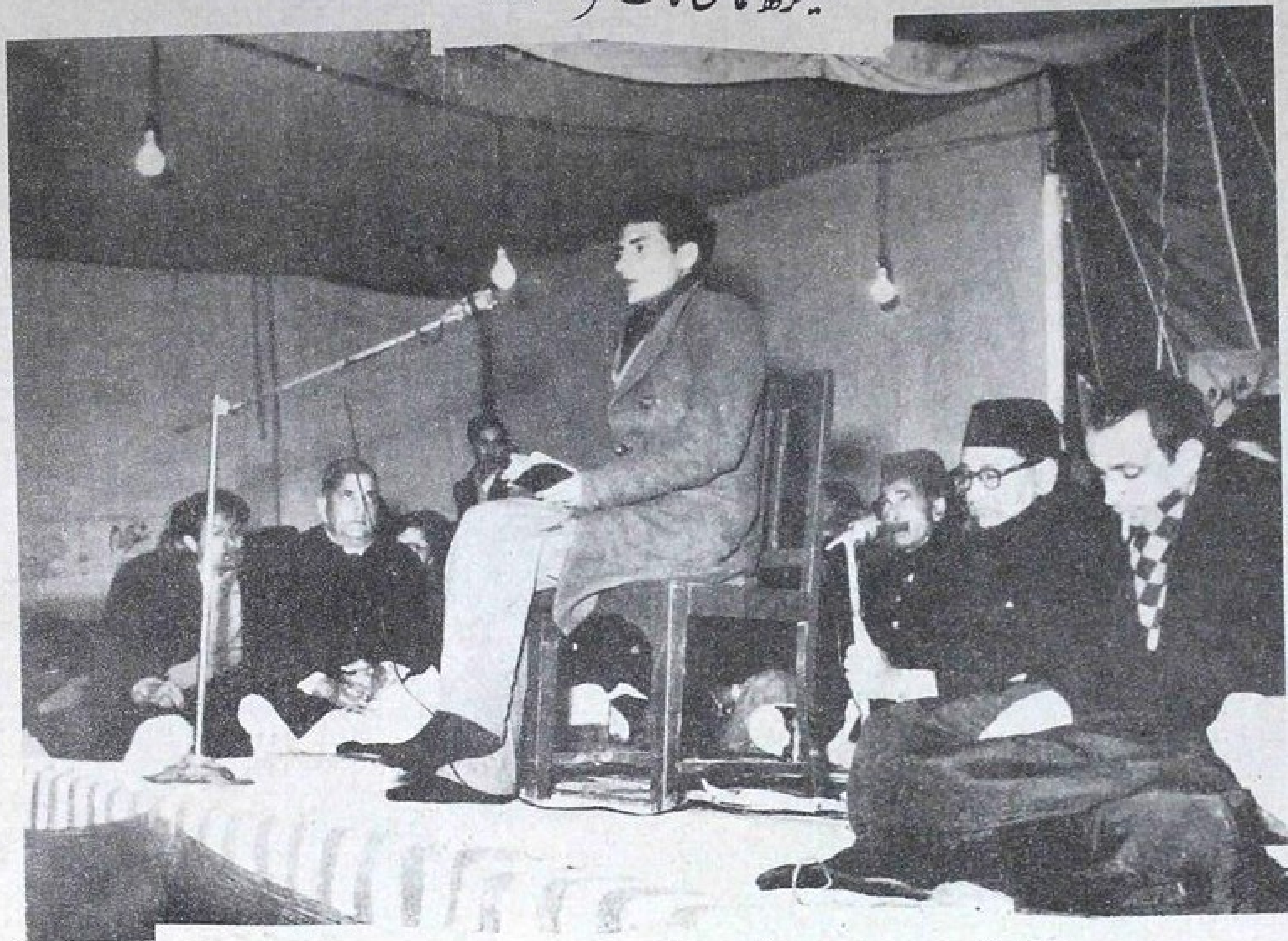
رام پور۔ ۱۹۵۰ء

پٹنہ۔ ۱۹۵۱ء



سہیل عظیم آبادی۔ وامق جونپوری۔ پرویز شاہدی

علیگڑھ نمائش کا مشاعرہ ۱۹۵۴ء



وامق جونپوری۔ نیاز بیری۔ نواب چھتاری۔ بہار برنی۔ جوہر بدایونی۔ راہی معصوم رضا



وامق، تاباں، چین کا نمائندہ شاعر، سردار ۵۵-۳-۱۹۵۴ء



دھنباد ۱۹۶۳ء

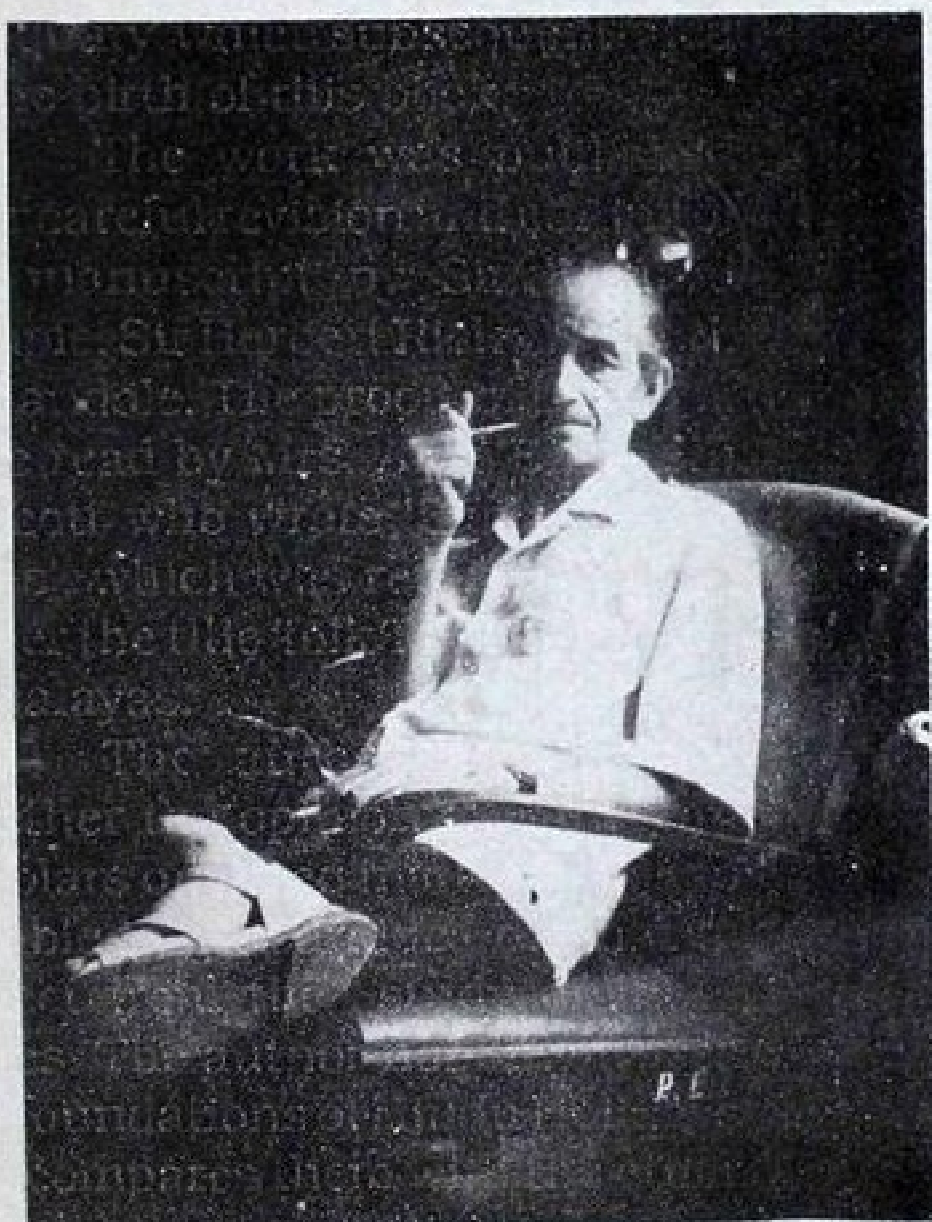
وامق جونپوری اپنے اہل و عیال کے ساتھ (شیریں کی شادی کے بعد):

خویش محمد الیاس صفوی، دونوں بیٹے حشمت مجتبیٰ اور باقر مجتبیٰ۔ بیٹی شیریں، بڑی بہو زہرہ ضیاء، وامق اور انکی اہلیہ کے درمیان پوتی عندلیب۔

سیتاپور ۔ ۱۹۶۳ء



شیریں کی شادی کے بعد

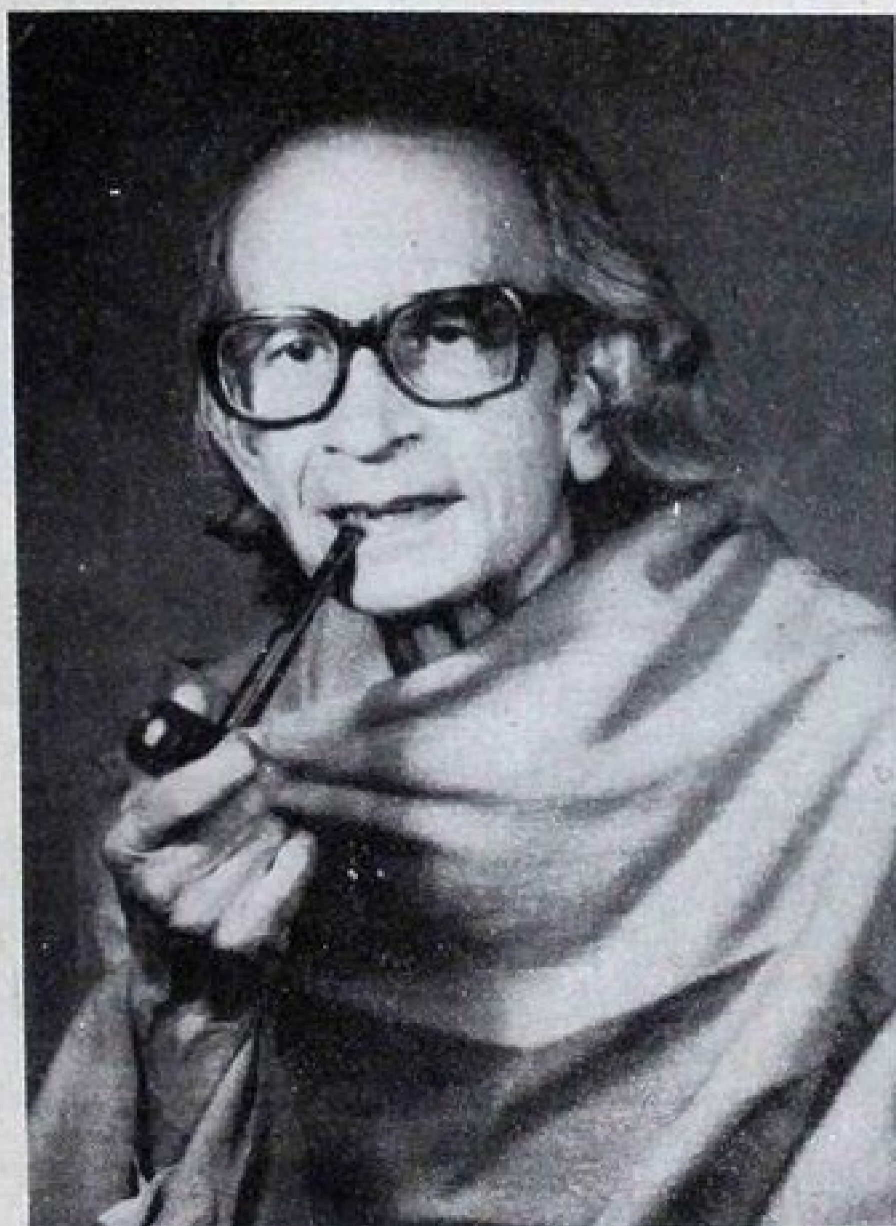


سری نگر۔ ۲۰؍۸؍۱۹۶۸ء

کشمیر میں رزنو صاحب کے یہاں



ڈی، پی، دھر۔ وامق۔ جذبی۔ تاباں۔ سہیل عظیم آبادی۔ رزنو۔ کمال احمد صدیقی



جونپور ۱۹۷۹ء

لال کوٹھی ۔ ۱۹۸۰ء



اظہر عنایتی رامپوری ۔ ہوش جونپوری ۔ نثار جونپوری ۔ وامق جونپوری ۔ شاہزادہ گلریز ۔ شاعؔ جمالی ۔ عالم غازیپوری



سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۸۰ء

تاشقند - جولائی ۱۹۸۱ء



جولائی ۱۹۸۱ء

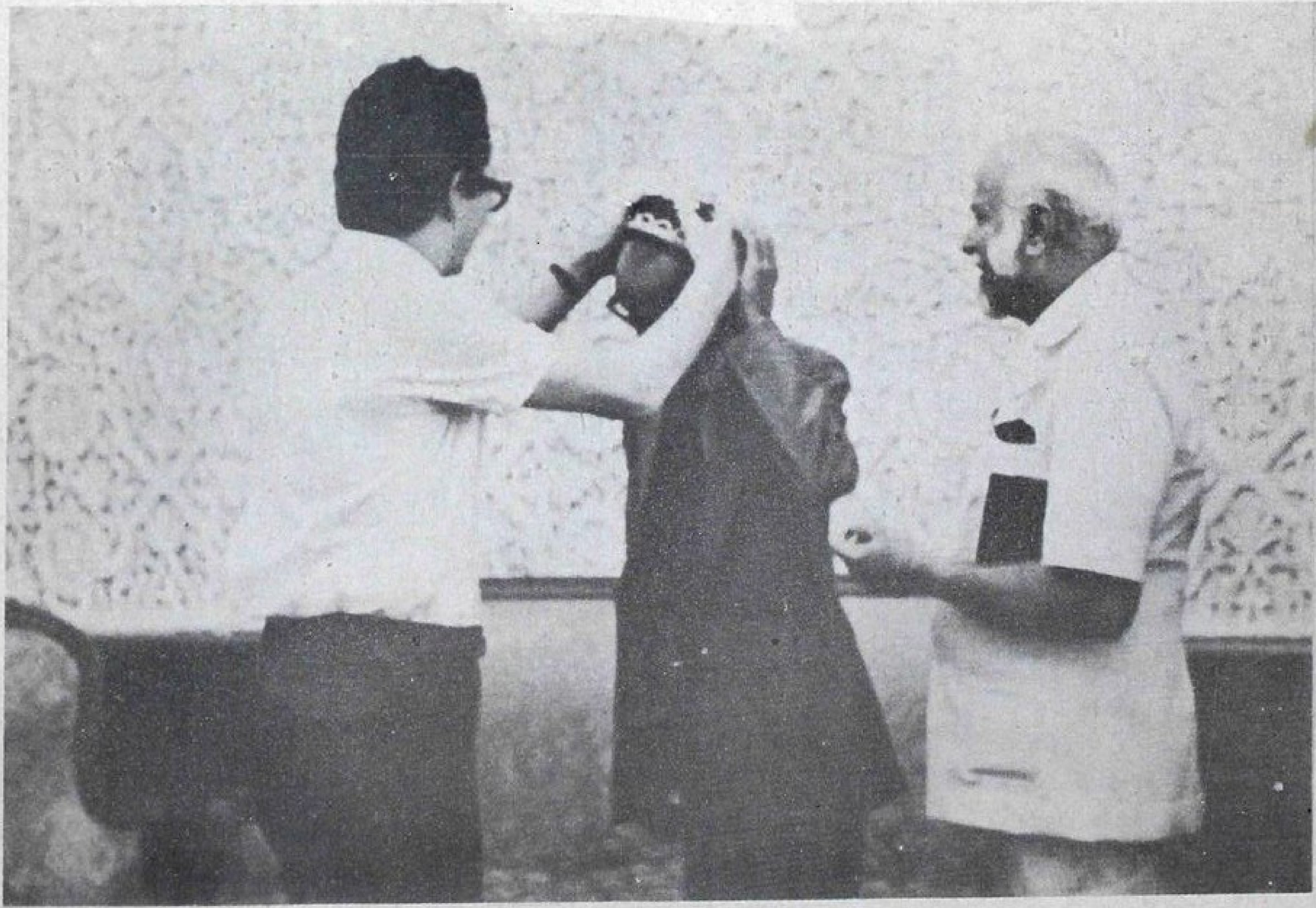


سفر روس کے لیے جونپور میں وداعیہ۔ جولائی ۱۹۸۱ء

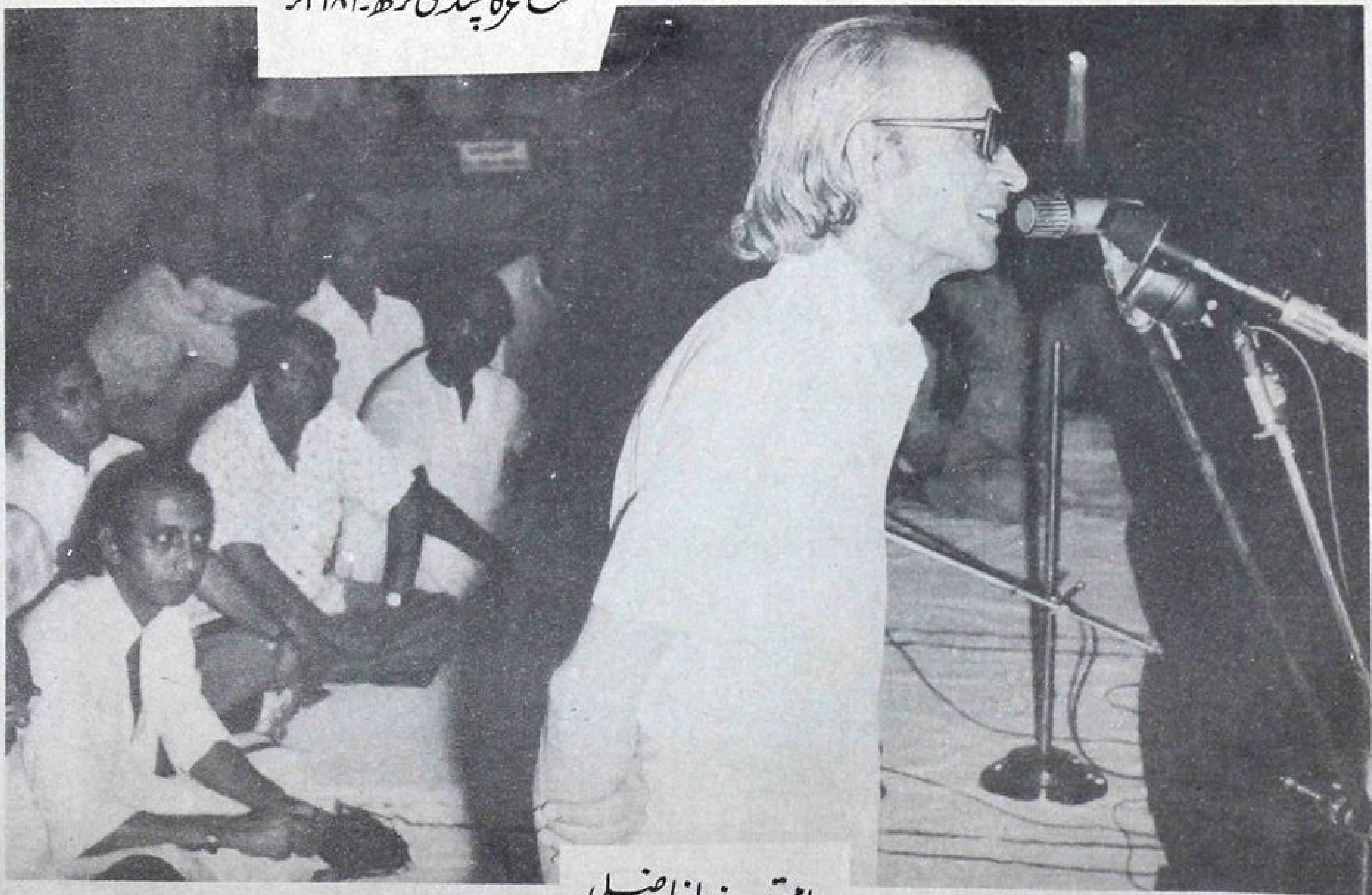


وامق۔ کامریڈ رمیش چندر۔ کامریڈ مفتی انوار چندر

تاشقند جولائی ۱۹۸۱ء



مشاعرہ چنڈی گڑھ ۔ ۱۹۸۲ء



وامق ۔ ندا فاضلی

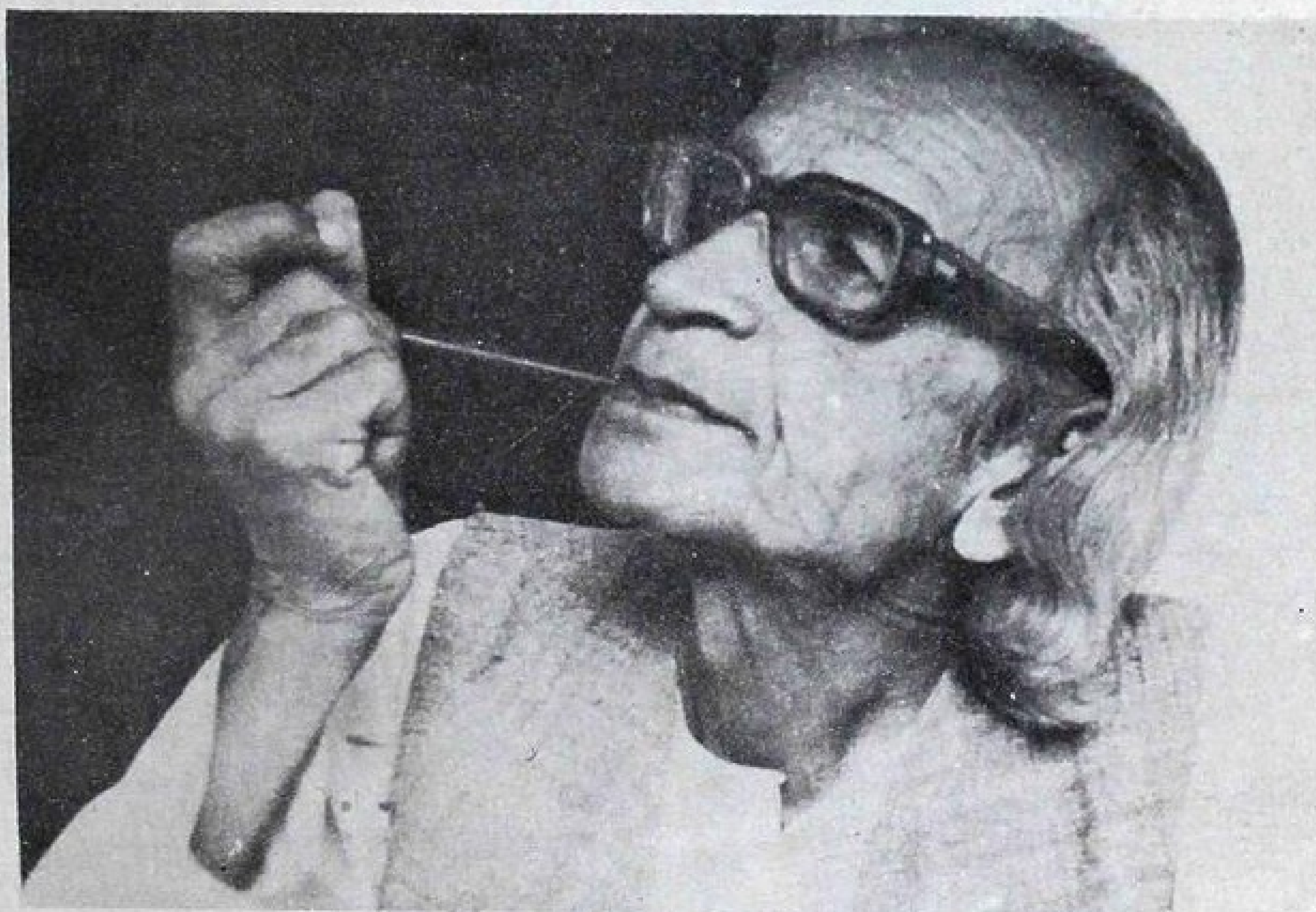
لال کوٹھی کجگاؤں۔ ۱۹۸۳ء



اجے کمار ـــــ وامق



لال کوٹھی ۔ ۱۹۸۴ء

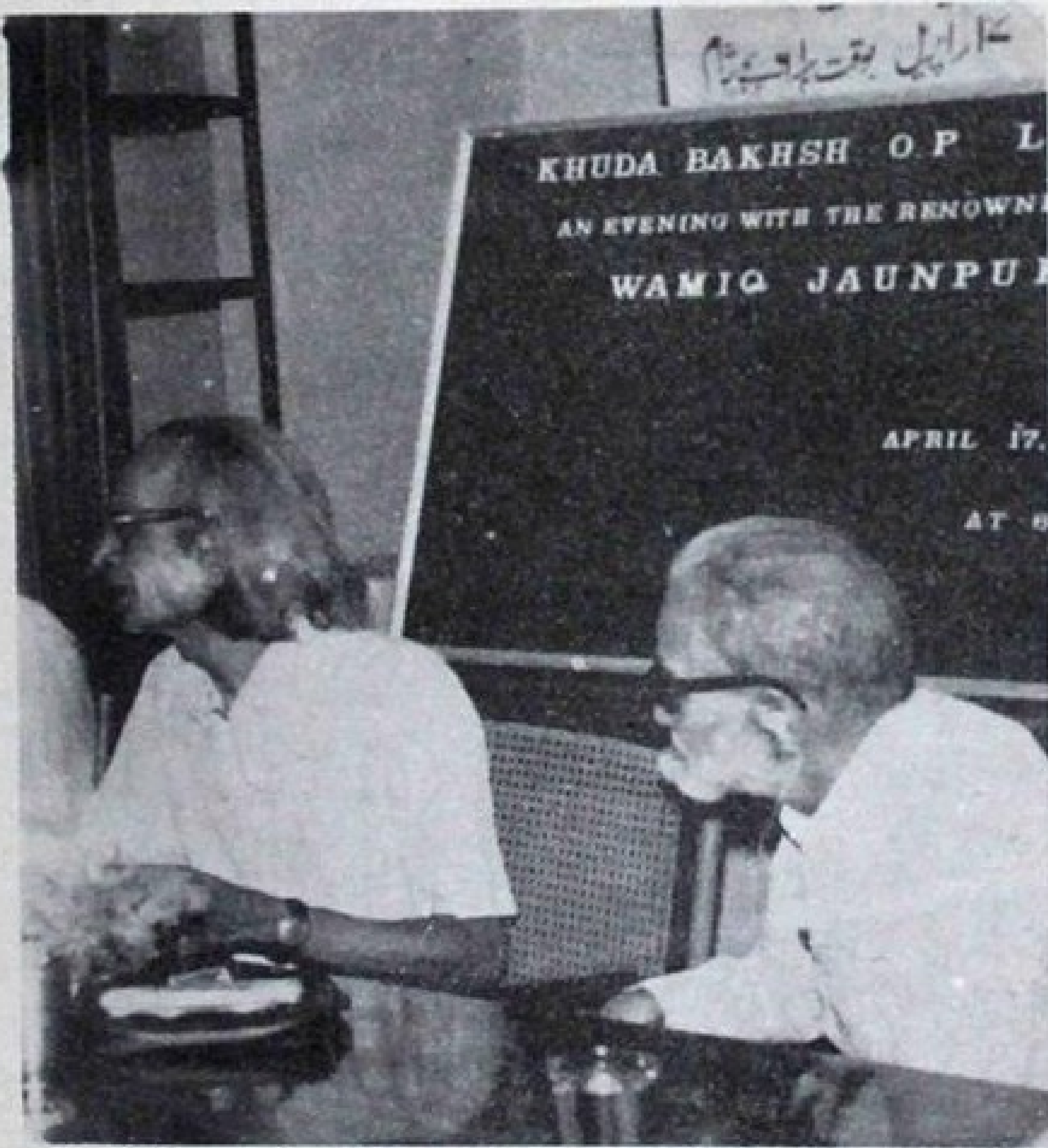


لال کوٹھی (کجگاؤں) ۱۹۸۴ء

لال کوٹھی ۔ ۱۹۸۵ء



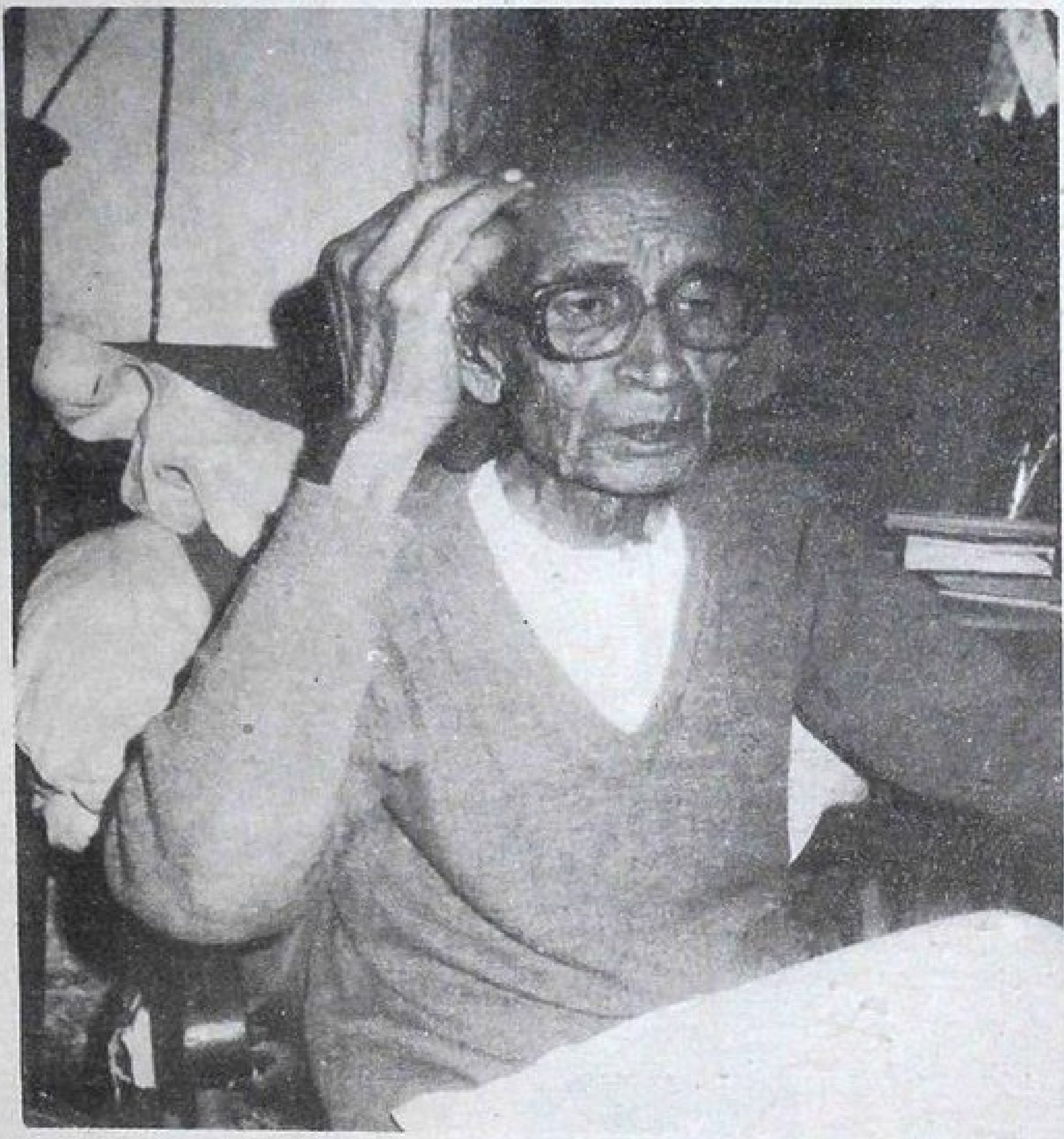
اجے کمار کے ساتھ



خدا بخش لائبریری پٹنہ۔ اپریل ۱۹۸۵ء



خدابخش لائبریری پٹنہ - اپریل ۱۹۸۵ء

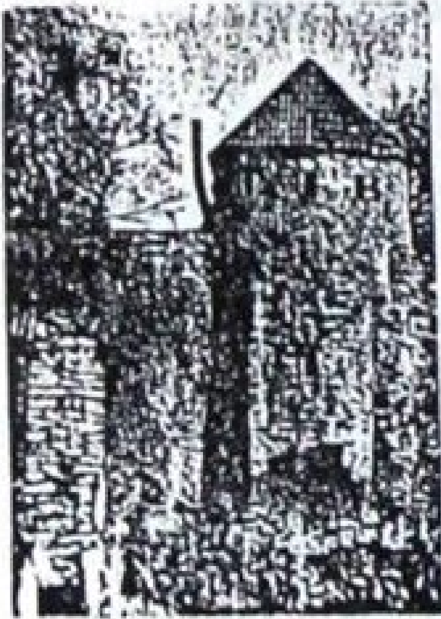


وامق جونپوری

(حالت علالت ۱۹۹۲ء میں)

...چند حسینوں کے خطوط

○ سیّد حبیب	۹ر دسمبر ۱۹۵۷ء
○ سردار جعفری	۲۰ر جولائی ۱۹۶۴ء
○ " "	۱۴ر جولائی ۱۹۸۰ء
○ ساغر نظامی	۲۰ر جون ۱۹۶۶ء
○ سجّاد ظہیر (بنّے)	یکم مئی ۱۹۷۰ء
○ مجروح	۷ر اکتوبر ۱۹۷۳ء
○ پرکاش پنڈت	۱۴ر جولائی ۱۹۷۵ء
○ راج بہادر گوڑ	۶ر اگست ۱۹۸۰ء
○ جنید احمد	۸ر اگست ۱۹۸۴ء
○ " "	۲۵ر جون ۱۹۸۵ء
○ سبط حسن	۷ر جنوری ۱۹۸۶ء
○ " "	۲۸ر مارچ ۱۹۸۶ء
○ شوکت صدیقی	۸ر جنوری ۱۹۸۶ء
○ کیفی اعظمی	۲۷ر جنوری ۱۹۸۶ء
○ " "	۱۳ر فروری ۱۹۸۶ء
○ " "	۱۴ر مارچ ۱۹۸۶ء
○ صالحہ عابد حسین	.... ۱۹۷۱ء
○ وامق جونپوری	۱۰ر دسمبر ۱۹۹۲ء


ENSV Tallinn. Linnamüüri torniga
ЭССР Таллин. Крепостная башня

USSR-Moscow.
Foreign Languages Publishing House,
21, Zubovsky Blvd.
Habib-ur-Rahman
(Urdu Section)

Dec. 9, 1957.

ڈیر ... صاحب ۔ آداب عرض ۔ مزاج شریف

آج شاہدہ صاحبہ وطن جا رہی ہیں ۔ انور عظیم صاحب کی بیگم صاحبہ سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کو ہم اب بھی یاد ہیں ۔ اس لیے سوچا کہ اس کے شکریہ کے سلسلے میں آپ کو کم از کم خط ہی پڑھنے کی زحمت دے دوں ۔ یعنی چھ مہینے یہاں آئے ہو گئے ۔ ویسے تو یہاں کی ہر بات ٹھیک ہے ۔ لیکن ایک جلا وطنی سی ہے ۔ اوّل تو یہاں آ کر یہ جلد پتہ چل جاتا تھا سب ہی میں لگتا ہے ۔ نہ تو اخبار ہی پڑھ سکتے ہیں اور نہ کتاب ۔ ایک ماسکو نیوز ہفتہ میں دو مرتبہ نکلتا ہے ۔ اگرچہ اس میں بھی خبریں نہیں ہوتیں صرف مضامین ہوتے ہیں ۔ پھر بھی اس کا انتظار رہتا ہے اور وجہ یہ کہ یہاں تو بات چیت کی زبان ہی میں اپنے پیچھے نہیں پڑتی ۔ انگلستان کا ایک اخبار "ڈیلی ورکر" یہاں ملتا ہے ۔ وہ بھی دور دراز ہو کر میں ۔ اپنی ادبی ادارت کی وجہ سے ابھی تک روسی کو بھی دلچسپی ہے ۔

ادبی زندگی کا یہ حال ہے کہ شاید وہاں سے کوئی اردو کا رسالہ کسی مسافر کے ساتھ چلا آئے تو خیر ۔ ورنہ ابھی تک وہی جا رہے یہاں سے پہلے ہم ہندوستان میں گزارے کر چکے تھے ۔ جب کہ اب تک بس صاحب کا گزر یہاں رہا ۔ جب تو یہ بہر حال دھوپ یا کوئی فلمی موسیقی کا کچھ تو منہ کا مزا بدل دیتا تھا ۔ لیکن اب تو یہاں برف ہی برف ہے ۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر آپ یہاں آ جاتے تو کیسا اچھا رہتا ۔ سجاد ظہیر صاحب یہاں ہو کر گئے ہیں کہہ رہے تھے کہ اگلے سال میں یہاں آئیں گے ۔ کیا اچھا ہو کہ آپ بھی آ جائیں ۔ بس آپ آ جائیے اور پھر کسی بات کی فکر کی ضرورت نہیں ہے ۔ بڑا اچھا موسم ہوتا ہے ۔ مئی سے ستمبر جولائی تک اور پھر گرمی چھٹی کا زمانہ بھی ہوتا ہے ۔ یہیں واقعی بکھر رہا ہو کوئی تکلف نہیں ہے ۔

اچھا بھائی ۔ کچھ اپنے یہاں کا حال لکھئے ۔ اور یہ کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں گے وہ یہاں سب کے لیے دلچسپ ہو گا ۔ حسنا صاحب کہاں ہیں اور جناب مولانا ... ۔ انور صاحب کو میرا سلام ۔ باقر صاحب ... اور ... کو سلام ۔ یہ جانتے ہوں گے کہ آپ بہت معروف آدمی ہیں جواب کی امید ہے اور ... ۔ دیکھئے شہر اور ملنا ہے ... ۔ اچھا ۔ خدا حافظ ۔ فقط

آپ کا

Rafi

O.K.

5/1/58

10, Seela Mahal,
Bomanji Petit Road,
Bombay, 26.

۲۰ جون ۷۲ء [illegible]

پیارے واثق ۔ تمہارا خط ابھی ابھی ملا۔

اتنے عرصے کے بعد تمہاری تحریر دیکھ کر بہت خوشی
ہوئی ۔ کشمیر کی جو کیفیت تم نے ذکر کی ہے وہ سن
کر ابتدا ایک محدود کشمیر میں اور [illegible]
اور [illegible] یونین میں دیکھا ہے اور [illegible]
ہم خیال ہیں ۔ لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible] ۔ غالباً [illegible]
[illegible]
[illegible] ۔ میں کشمیر
[illegible]
[illegible] ۔ اس سال گذشتہ
[illegible] ۔ تم سے [illegible]
[illegible]

مسز [illegible] سلسلے میں [illegible]

[illegible]

ہیں۔ تم کو خط لکھنے لگا تھا جب پتہ چلا کہ [illegible] اس طرف ملنے [illegible]

پیر دافع درد تو ہیں ہی ۔ خارش اب صاف ہو گئی [illegible]

تم گھر پر پڑی رہنا۔ آرام کرنا ۔ مشکل طالب علم

[illegible] مشکل تم کو دل لگانا ۔ مستحسن فعل

نہیں ہے۔ اس سے پہلے [illegible] اپنی پڑھائی کرو ۔

اگر [illegible] مشکل ہے تو [illegible] دل لگا دینا

[illegible] تو پھر [illegible] اللہ [illegible] کوشش

کرتی رہو۔

تمہارا [illegible] زمانہ [illegible]

خاص طور سے [illegible] گیا ہے۔ اللہ تمہارا

[illegible] محفوظ رہے اور [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] عالم [illegible] اور [illegible]

[illegible] تمہارا [illegible]

[illegible] کر دیا گیا ہے۔ [illegible]

[illegible] تمہارا [illegible] ۔

[illegible] اور [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] تمہارا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۱۰ جنوری ۱۹۸۰ء

پیارے داؤد — خوش رہو

تمہارا خط مجھے [illegible] ملا [illegible] شبیر الحسن [illegible]

دیر سے ہوا اور [illegible] ۔ بہت مصروف تھا [illegible]

[illegible] کو [illegible] ۔ آخر مجلہ کا [illegible] پہلا [illegible] ـ

۱۹۷۷ء میں بین الاقوامی اقبال سیمینار ہوا تھا اس کے مقالات کی کتاب

انگریزی میں شائع ہوتا ہے ـ وزیر اعظم ۲۴ مجلدات

تحریر مقالات [illegible] اور [illegible] ہے ۔ انتخاب کا [illegible]

تعداد [illegible] ہے کہ میں اقبال [illegible]

خیال [illegible] [illegible] احمد [illegible]

[illegible] اس جلسے میں شریک ہوتا ہوں

[illegible] گفتگو [illegible]

[illegible] سال [illegible] خدا [illegible]

اس ماہ میں شائع ہو گا [illegible] پہلی جلد [illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible]

پہلی جلد [illegible] میں [illegible] کا ذکر تک ـ

[illegible] میں [illegible] کہا ہے [illegible]

میں [illegible] اور [illegible]

[illegible] میں [illegible] ایک نظم کربلا

یہ مجموعہ بھیج رہا ہوں ۔ اگر چھپ جائے [illegible]
[illegible]
امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے ۔

تمہارا
سردار جعفری



अन्तर्देशीय पत्र कार्ड
INLAND LETTER CARD

यहाँ काट कर खोलिए TO OPEN CUT HERE

105 — 52
21
28
28
2.8
53 8

Mr. Waamiq Jaunpuri,
Lal Kothi,
P.O. Kajgaon,
Distt. Jaunpur
पिन PIN (U.P.)

पहला मोड़ FIRST FOLD

तीसरा मोड़ THIRD FOLD

इस पत्र के भीतर कुछ न रखिए NO ENCLOSURES ALLOWED

प्रेषक का नाम और पता :— SENDER'S NAME AND ADDRESS :—

Sardar Jafri,
10, Geeta Mahal,
Bomanji Petit Road,
Bombay.
पिन PIN 40003



۳۵۹ - سندر لال روڈ نئی دہلی

۲۰ - جون سنہ ۱۹۶۶ء



پیارے اشفاق!

جتنے دن تمہارے ساتھ گزارے ابھی تک میری زندگی میں بہترین تھے
خدا کرے تم جُگ جُگ جیو اور ہم اسی طرح مل کر جب تک زندگی کے اندھیرے سامنے ہیں
—— اس مسلسل اندھیرے میں شمع جلاتے رہیں —
آگرہ چھوڑنے کے بعد دو مہینے کی (Champagne) پی کر زندگی کی بلندیوں سے یکایک گوشت کی پلپلی پستیوں کی طرف دھکیل دیا —
یہاں آ کر یہاں شہر کی تکلیف کی معلومات ضرور ہیں وہ کچھ دوسری ہیں
[illegible] خدا بہتر کرے کہ ہم کو ناگہانی [illegible]
مل گئی ہیں — میں اور بات کرنے میں جھگڑے کی نسبت دماغ [illegible]
رہ گئے اور میری تو ساری رات شب بیداری میں گزری

بہر حال کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچ گئے تھے۔ میلوں تک دن بھر اخطمی بھی آ ملے
تھے۔ مگر ان کو اور شباب کو نہ اپنے بچے والی گاڑی میں زرد روشنیں
ملتا۔ مگر یقین ہے بعض کرائی لیا رقعہ بھی اپنی گردن تک پہنچے
نا ملے۔

یہاں نشست کرنے خیر مقدم کرتے گھر تک آ جاتے قدرت کیوں جلدی
معدوم کر دی گئی تھی۔ بہر حال بات کی بہروں اپنی اور شدت کی
دلعوبہ ابر ہوا۔ یادوں میں تبدیل ہو گئی۔ آج تک جب
بارش ہوتی ہے۔ اس وقت فاطمی خفگی کی۔ آئی خفگی
اور فاطمی کی ہنسی بنتی ہے یوں کہ تم بابا نے پایا نا
خود وہ ہے گئے وقت میں کھا گئی تھی۔ تم جب مزید سب اُن لوگوں
نے میں نے تو عورتوں کی کمینہ سوچا بھی نہیں اکیلے بیٹھ دیکھو

میری دلی دعا ہے کہ تم خوش و خرم رہو اور زندگی کے آخری دن
آرام و راحت سے بسر کرو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم میں
جو بصیرت پیدا ہوئی ہے زندگی بنا ہے تم اب خوش سے
خوش رہا کرو گے۔

کیا اُس محبت اور خلوص کا شکریہ ممکن ہے اور اس فرض جو تم نے اس
سفر میں ادا کیا ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ ممکن نہیں ہے
صرف اتنا کہوں گی کہ تمہاری ان کاوشوں کے بغیر شاید میں ان وسائل
میں بہتر ہی نہیں رہ سکتی۔ اور امید ہے کہ جو کچھ کیا ہے
ہے۔ اس کے آگے دیکھو گے میں اور وہ کچھ بھی ہوا دوستی
بھی رہی ہے۔

سلام
دنیا بہ سلم کے میرا آداب جب تم جا دو تو میرے

पहला मोड़ First fold

S. Sajjad Zaheer

Y-24, HAUZ KHAS.
NEW DELHI-16.
Tele.: 77245

[illegible] ۱۹۷۱ء

عزیزی [illegible] - تمہارا ۲۸ اپریل کا خط ابھی ملا - اس کا جواب [illegible]

تم کو اتنی دیر سے ملا - [illegible] پتہ ہی نہیں معلوم تھا - [illegible] بھجوایا -

کیا اچھا رہتا اگر تم [illegible] میں شریک ہوتے - بیس برسوں کے بعد ہم لوگ ایک [illegible]

[illegible] - مجھے [illegible] اچھا تھا [illegible]

لوگ [illegible] - کوئی دس ہزار کا مجمع رہا ہوگا - سب سے زیادہ قابلِ اطمینان بات

یہ تھی کہ متعدد پرانے، "نیم پرانے" اور نئے نوجوان [illegible]

[illegible] - اب [illegible] قابلِ ذکر [illegible]

[illegible] - [illegible] ایک نظم [illegible]

[illegible] سردار جعفری اور [illegible] - [illegible] ایک اچھی نظم [illegible]

[illegible] - [illegible] کی کتاب [illegible]

[illegible] تنظیم کی صدارت [illegible]

[illegible] - [illegible]

[illegible] کہ تم [illegible]

مبارک ہو - [illegible] حالات میں [illegible]

اگر [illegible]

میں [illegible] مصروف رہا - تم کو [illegible] حیدرآباد، بمبئی،

آسام، [illegible] - [illegible] کا دورہ بھی [illegible] - دوسری

[illegible] تنظیم [illegible]

[illegible] ایشیائی، افریقی ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس [illegible]

[illegible] - [illegible]

[illegible] یاد کرتی ہیں - [illegible]

[illegible] اچھی ہیں - [illegible]

[illegible] - تم اپنے بچوں کا حال لکھو - کیسے ہیں اور کیا

[illegible] -

سب کو پیار

[illegible]

[illegible]

میری رائے یہ ہے کہ اگر تم اب بارکوں میں یہاں آ جاؤ [illegible]

ہے۔ رضیہ اور نقی سے پلاننگ (ادبی کام کا) میں تم کو شامل کرنے کی بات کی۔ رضیہ تو فوراً راضی ہو گئیں۔ البتہ نقی کہتے ہیں کہ ممکن ہے شاید وہ کام شروع کرنا ممکن نہ ہو۔ ویسے وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ تم اس (کام) کو سنبھالو۔ اب فرصت کی بات ہے کہ ہم، رضیہ، نقی اور میں ایک ساتھ بیٹھیں اور اس کام کا جائزہ لیں۔ میری رائے ہے کہ تم نقی کو لکھو کہ تم چند دنوں کے لئے دہلی آنا چاہتے ہو، اس کام ساتھ ہی فیاض کو بھی (جو ہمارا گھر سے متصل ہے) اور پھر ہم سب ایک ساتھ مل کر مشورہ کر لیں کہ اس کام کو کیسے شروع کیا جائے۔ نقی تمہارا بہت لحاظ کرتے ہیں اور محبت بھی۔ تم یہاں ہوگے تو کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکلے گی۔ اگر مشاعرے میں شریک ہو گئے (جس کا اب بھی کسی قدر امکان ہے) تو اور بھی اچھا رہے گا۔

تم اگر دہلی رہ گئے تو پھر PWA کی تنظیم میں بھی ہمارے شریک بن سکتے ہو۔ اس وقت اس کام کی حالت بہت خراب ہے۔ یہاں آ کر تم موجودہ صورت حال (یعنی مختلف رجحانوں اور تنظیم کی نوعیت) کا بھی تم کو صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

امید کہ ہماری دوستی میں تمہارا ساتھ رہنے سے بڑی تقویت ہوگی۔ اور بڑی روحانی تقویت ہوئی۔ دوست کی دوستی اور رفیق کی رفاقت اور عزیز کی محبت سے بڑھ کر زیادہ قیمتی اور دل نوازی کی دنیا میں اور کوئی دوسری چیز نہیں!

پیار

تمہارا بھائی

بنے

Majrooh
Sultanpuri

PHONE: 533918
6, CHINOY COLONY · JUHU · BOMBAY-54 ·

پیارے دانش۔ یہ خنجر صاحب ہیں، ایک بے حد نیوریشٹ عوامی شاعر (سیاسی مضمون نہیں) نہ ناسک کے ہوں سناتے ہیں۔ یہ پریس تک نہیں ہوتے مگر وہ درد کا رشتہ تو ہے جو ہماری طرح ہر ہو۔ ان کا ایک کام ہے جسے لے کے آپ کو یہ لکھنؤ کا سفر بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ خط آپ کی دردمندی سے واقفیت کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ بقول نظیری

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

[illegible] چلے گئے۔ مجروح سلطانپوری نے انکا ایک نوحہ لکھ دیا، چلیے فرض ادا ہو گیا۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے ۔ صفی

بقول احمد سعید خاں بھوپالی، ہمارا قطب مینار ہے جھک گیا اب ہم ان کی سمت لیے [illegible] تیار رہیے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

یہ خط زیادہ بیکار نہ ہو تو خود ہی سمجھ لیجیے یا پھر ان کو [illegible] ۔ ابھی سے خوبیوں کا سفر روزانہ جاری ہے [illegible] اگر یہ خواہ [illegible] تو محسوس نہ کیجیے گا۔ آپ کا ۔ تمہارا

مجروح سلطانپوری
[illegible]



Hind Pocket Books Private Ltd
G. T. ROAD, SHAHDARA, DELHI-110032

Grams : POCKETBOOK DELHI
Phone : 21 20 46, 21 23 32

12.5.82

۱۲ / ۵ / ۸۲

پیارے فائق،

تمہارا خط ملا گویا ملاقات ہو گئی — تم تو
دہلی میں بیٹھے ہوئے بھی کمال کر رہے ہو — ہم اب تک
صحت مند رہنے کی کوشش کر رہے ہیں — تم فرشتہ صفت ہو
اور صحت مند بھی — ہم فرشتہ صفت ہیں مگر صحت
سے تہی — تمہیں ملنے کا شوق ہے یہ کم نہیں — مگر
بہت سی باتیں دوسروں نے بھی کہی ہیں جب مل کر
بیٹھیں گے تو بہت سی باتیں ہوں گی انشاء اللہ جلد ہی روانہ
ہونے والا ہوں گا —

تمہارا

اب جب ملاقات ہو تو ہم سب کو ملانا نہ بھولنا۔ بچوں کو پیار
بہت بہت

Ajay Bhavan
Kotla Marg
New Delhi - 110002
Dt 6.8.1980

پیارے وامق!

کتنی "صدیوں" کے بعد "شب چراغ" کے واسطے سے تم سے "ملاقات" ہوئی۔ فاروقی نے کہا تھا ــــ دس کہ تبصرہ کر دوں۔ جی تو کہتا تھا کتاب "مار دوں" (حیدرآباد کی زبان میں) ویسے کتاب "مارنا" ایک بہت مقدس قسم کی چوری ہے۔ میں نے تبصرہ کر دیا ہے اور ۱۰/ اگست کے "حیات" میں شائع ہو رہا ہے۔ کمال یہ تھا کہ میں نے تقسیم بھی کی ہے۔ [illegible] ایک لطیفہ سناؤں کاتب نے "انسانوں" کو "افسانوں" لکھ دیا۔ میں نے کہا ــــ

عہد کی خوشیوں نے دیوانہ بنا ڈالا
انسان کو کاتب نے افسانہ بنا ڈالا

لوگوں نے بہت enjoy کیا۔ ویسے میں نے یہ اپنے کسی مضمون میں کاتب کو "اردو کا دوسرا مزاح نگار" کہا ہے۔

ارے تمھاری کتاب ــــ تمھاری تصویر سے مل گئی۔ بے انتہا مسرت ہوئی مگر کتاب ــــ کے دوسرے صفحے پر "تعارف" دیکھا تو تشنگی اور بڑھ گئی۔ بہر حال ہم تمھارے گیتوں کے مجموعے کا شدت سے انتظار رہے گا۔
یار! میرا ماں باپ تو بنارس ضلع (اب ضلع بھدوہی) کی تھی۔ آخر کچھ تو گاؤں ہوگا نا۔ برسوں پہلے کہیں گیا تھا تو گاؤں کی عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا! "ارے دولہا کا لڑکوا آوا ہے" (میری ماں کا نام [illegible] تھا) تو سینے میں دل دھڑکنے لگا تھا۔ راجستھان یونیورسٹی کے ایک صاحب نے مجھ پر ادب پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ مگر کتنی نہیں ہوتی۔

کتاب پر "تعارف" کے عنوان سے جو تمھارا نثر لکھا ہے اس پر

INLAND LETTER CARD

NO ENCLOSURES ALLOWED

Sri Wamiq Jaunpuri
Lal Kothi
P.O. ... Manza Kajgaon
Distt. Jaunpur (U.P.)

SENDER'S NAME AND ADDRESS:
Raj Bahadur Gaur
Ajoy Bhavan, Kotla M...
New Delhi 110002

THIRD FOLD

FIRST FOLD

۲۰

خدا کرے اچھے ہو۔ امید ہے مل جاؤ گے

۸ر اگست کو کلکتہ جا رہا ہوں اور وہاں سے ۱۳ر اگست کو ... جا رہا ہوں
ٹریڈ یونین کانفرنس کا جلسہ ہے۔ ۱۶ر اگست کو دہلی آ جاؤں گا اور پھر
جے پور جاؤں گا۔ ٹریڈ یونین کی وہاں بھی کانفرنس ہے۔ پھر ۲۲ر اگست
کو دہلی آ جاؤں گا۔ امید ہے اس وقت تک تمہارا جواب آ جائے گا۔

آج کل یہاں ... دہلی میں ... ہمارا ہے۔ یہ کسی نے ...
سجاد ظہیر اور ممتاز حسین دونوں ہی آ رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کیا ...
ہوتا ہے یا ... ہوگا۔

آج کل ... ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہے۔
آپ بھی ...؟ یا گوشہ نشینی ... "خود ساختہ ..." اختیار کر رکھی ہے۔

بہت پیار
تمہارا راج بہادر گوڑ

۸ر اگست ۸۴ء

محترم وامق صاحب

آداب۔ فطرت کی سب سے بڑی ستم ظریفی ضعیف العمری ہے۔ افسوس کہ الیکٹرانک عہد تک بڑھاپے کی زحمتوں سے بچنے کا کوئی راستہ تلاش نہیں کیا جاسکا۔ بہر طور یہ بڑی خوش توفیقی ہے کہ بیگم وامق کو آپ علاج کے لیے دہلی لے جارہے ہیں جہاں ہر قسم کے علاج کی بہترین سہولیتں ہیں۔ خدا انھیں جلد صحت بخشے۔ رفیق حیات کی سب سے زیادہ اہمیت عمر کے آخری حصے ہی میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ آپ کا انٹرویو اخبار عالم یا بلٹز میں نظر سے گذرا تھا اور پرانے اخبارات تو ردی میں جا چکے ہیں۔ میں بمبئی ٹی وی کے اردو سیکشن سے ربط قائم کررہا ہوں کہ وہ آپ کو مدعو کریں "وامق جونپوری کے ساتھ ایک شام" کا پروگرام کچھ محنتانہ بھی نذر کیا جاسکے گا اور میں چند روز آپ کو حاصل کرسکوں گا۔ میں بفضلہ دست نگر تو نہیں لیکن کچھ ایسا خوشحال بھی نہیں کہ ممتاز دانشوروں کو مدعو کروں تو فرسٹ کلاس کی سہولیتیں پیش کرسکوں۔ صحیح اندازہ میرے حالات کا آپ دیکھ کر ہی کرسکیں گے۔

وہ سوشلزم کی تحریک ہو یا ترقی پسندی کی یا تحریک خلافت، تحریک میں کشش تیس پینتیس سال ہی رہتی ہے اس کے بعد اس کی حیثیت روایتی مذاہب کی ہوجاتی ہے۔ بصیرت حاصل کرنا، اصول پرستی پر جمنا، گروپ بندی سے احتراز کرنا ان سب کے لیے ایک ہی نام ہے "پل صراط" اگر ہم آہنگی اور مفاہمت پر اصول پرستی کو ترجیح دی گئی تو ڈاکٹر محمد اشرف اور کرشنا مینن سے مختلف حشر نہیں ہوتا۔

سردار نثر میں کوئی اسلوب نہیں رکھتے، شاعر اچھے ہیں، مقرر بہت اچھے ہیں لیکن ان کے ہاں شاہکار نہیں ہیں اور فنون لطیفہ میں اہمیت صرف شاہکار کی ہوتی ہے۔ سردار کی بڑائی یہ ہے کہ وہ خود کو بھی بڑا شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ تنقید نگاروں میں مجنوں، کلیم الدین، آل احمد سرور، احتشام حسین، ممتاز حسین سرفہرست نام ہیں، تنقید نگاری میں سردار کی اہمیت کبھی تسلیم نہیں کی گئی۔

انھوں نے ترقی پسند ادب میں عادل رشید کو بھی ادیب کی حیثیت سے شمار کرایا ہے، جب ان کا معیار یہ ٹھہرا تو شکر ہے کہ انھوں نے آپ پر قلم نہیں اٹھایا۔ سردار کا مطالعہ وسیع ہے، ان میں بڑا شاعر بننے کی صلاحیتیں نہیں لیکن برسوں پارٹی لائن پر نظمیں لکھتے رہنے سے ان کی صلاحیتیں سلب ہوگئیں یہ ان کا ایثار بھی ہے اور بدبختی بھی۔ شروع کے آٹھ دس سال رہ کر کمیونسٹ اور ترقی پسند رہے یودھ راج اور مدھوسدن جیسے کروڑ پتی سرمایہ داروں کے ذریعے کمند ڈالی گئی اور ووٹر لسٹ قائم ہوا اور سردار کمیونزم اور تصوف میں مفاہمت پیدا کرنے لگے۔ آج ان سے زیادہ آداب مجلس برتنے والا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ سردار کو سب سے بڑی نعمت سلطانہ کی شکل میں ودیعت کی گئی۔ سردار کی کامیابی میں سلطانہ کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ سلطانہ غیر معمولی شخصیت کی حامل نہیں، ان میں کوئی کمی رہی تو یہ کہ جنسی کشش ان میں شباب کے ایام میں بھی نہ تھی زندگی کے حالات، ادبی اور علمی موضوعات پر کیسٹ سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن "جن سے متاثر ہوا" اس عنوان کا تقاضا ہے کہ جب بھی آپ موڈ میں ہوں، جو بھی اہم، دل چسپ، شیریں اور تلخ تجربات مشاہدات یاد آجائیں انھیں لکھ لیا جائے۔ اس مضمون میں بظاہر بے ربطی کا احساس ہو تو وہ بھی حسن بن جائے گا۔

ویسے آپ تشریف لائیں گے تو لڑکے آپ کا کلام تو ٹیپ کریں گے ہی۔

خدانخواستہ ٹی وی والوں نے دعوت نہ دی یا جلد پروگرام نہ بنا سکے اور آپ آنے کے لیے آمادہ ہوسکیں تو براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ زادِ راہ کے لیے کتنے روپے بھیجے جائیں۔ آپ کے جو مسودات شایع نہیں ہوسکے یا نظرِ ثانی کی طوالت کے باعث یہ اندیشہ ہو کہ بس رکھے ہی رہ جائیں گے ان کے متعلق میں استدعا کروں گا کہ آپ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو خدا بخش لائبریری پٹنہ مطلع فرمائیں وہ نہایت محتاط مزاج رکھتے ہیں مسودات کو حفاظت سے رکھیں گے اور موقع بہ موقع شایع کریں گے۔ ویسے آپ کی یوپی اردو اکادمی بھی تو اپنے خراج سے مستند دانشوروں کی تحریریں صحیفۂ آسمانی سے کم درجہ نہیں رکھتیں آپ کے خطوط جتنے طویل ہوں گے اتنے ہی ذہنی غذا فراہم کریں گے اور کیا عجب کبھی میں انھیں بھی ترتیب دے سکوں۔ یوں سیکڑوں اصحابِ ذوق لطف اٹھا سکیں گے۔

خادم

جنید

Gulistan. Pathanwadi. Malad ملاڈ Bombay. 97

Telephone: 683026

۲۵ جون ۸۵ء

محترم وارث صاحب

آداب۔ بیگم وارث کی صحتیابی مبارک ہو۔ آپکا خط ۲۸-۸-۲۸-۳۰ سے ۱۳ جون ۸۵ء تک
مشتمل موصول ہوا۔ جس واقعہ کو آپنے تفصیل سے بیان کیا ہے وہ آپکے مذہبی اور تہذیبی
ہزار سالہ روایات کی آپ پر گہری چھاپ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ خاندانی ورثہ جو
آپکے پاس ہے تیسرے دار کے پاس ہے اور میں اور سجاد ظہیر کے حصے میں آیا تھا دوسرے دانشوروں
کے پاس کم ہیں جو اس دولت سے عاری ہیں۔ آپ نے ظ۔ انصاری صاحب کا ذکر کیا ہے ظ نے
غیر معمولی محنت سے علم حاصل کیا ہے۔ انکے پاس خوبصورت اسلوب ہے لیکن خاندانی روایات
کی مجبوری نے ان میں مستقل احساس کمتری کو جگہ دے رکھی ہے تیسرے دار کی ہر محفل میں چھا جانے کی
بات کا سراغ یہاں ملتا ہے۔ ویسے بھی ظ کا موضوع تنقید ہے جسمیں بین السطور
تلخی اور طنز بھی ہے۔ ظ کا اپنا تخلیقی سرمایہ کیا ہے؟ ترجمے بے شک انہوں نے بہت سے
کئے ہیں۔ مجروح یقیناً غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں لیکن جگر کی طرح انکے ترنم سے پڑھنے کو
علیحدہ کر دیجئے تو شاہکار؟ فنون لطیفہ میں شاہکار سے کم کا کوئی درجہ ذرا کم ہے۔ مجھے
ذوق کی تسکین کے لئے مجروح کا مجموعہ اچھی چیز ہے اور فلمی گیتوں کے ذریعے اردو زبان کی
خدمت ہوا ہے۔ آپ جہاں جس شے بدمزہ ہو تو وہیں وہ رچی ہوئی اودھ کی تہذیب ہے
آپکے ہمعصر بھی کم اس سے فیضیاب ہوپائے ہیں۔
سیف الدین کچلو، پنڈت سندرلال اور مولانا حسرت موہانی ایک کاروان ہیں۔ میں نے
مشتاق آرزو داغ اشرف کا مکمل پڑھوں لیا کہ یہ دونوں میرے اعصاب پر چھائے ہوئے ہیں۔
وقت کی تعریف جب کبھی موڈ ہو۔ آپ مجھے اپنے بچپن کے ماحول سے متعلق بتلا دیں گے
کالج کی زندگی تک کن شخصیتوں نے متاثر کیا؟ کن مصنفین نے آپ پر نقوش چھوڑے؟
انگریزی فارسی اردو کی وہ کون کتابیں ہیں اور انکے وہ خاص حصے جنہوں نے آپکے ذہن اور
ذوق کی تربیت میں حصہ لیا؟ شعر و ادب کے کچھ ٹکڑے جو دوران مطالعہ آپنے نشان لگائے
ہوں گے کاش انہیں بھی نقل کر سکیں۔
اسرائیل نے قلب عرب میں جو جنت ارضی بنائی ہے اب عرب اس سے جینے کا سلیقہ
سیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان بھی رو رہے ہیں کمانے عرب جا رہے ہیں لیکن اب
یہ سوچیں کہ تشبیہ کشتی نشانہ جو لکھنؤ سے فلسطین تک۔ مسلمانوں کی فوج اور ان کی
ہولی کھلوا رہا ہے اسکے سدباب کا بھی کوئی راستہ بنا ہے؟
مفادات سے قطع نظر قبضۂ زمین اور سرزمین کے تحت جیسے دور خلافت پر الزامات ہیں

اس میں آپ کو دلچسپی ہوگی کہ اُنکے اندر جو آزادی کا عالم ہوتا تھا اُسکی تشکیل میں جہاں تک تاریخی
شعور اور تہذیب کا [illegible] دخل ہے۔ علاوہ [illegible] اُنکے منشور سے اُنکے اجداد ایران سے
سبب سے جس ایران کا یہ [illegible] ایک مسجد ایک امام اور [illegible] تقیے سے ادا
کرتے تھے [illegible] اُنکے ورثے سے [illegible] آتی نفرت [illegible] اور زمانے میں ہو گیا ہے۔
یہ مجموعے کیونکر ختم کئے جا سکتے ہیں؟ [illegible] کمیونزم کے درمیان
کم فرق محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اب [illegible] تجزیہ فرمائیں گے کہ وہ شیعہ تھے یا سنی جن زمانوں میں
وہ [illegible] اسکی [illegible] اثر [illegible] ہیں [illegible] ہو کہ [illegible] پچھلے ہزار برس میں کہیں کہیں
امام [illegible] [illegible] اُنکی [illegible] الاظلام جو سب کو [illegible] اور
مطمئن زندگی دے سکیں تو قائم نہیں کیا جا سکتا؟
زندگی کے تجربے اور [illegible] ان بڑی اور [illegible] شخصیتوں کی خصوصیات [illegible]
جن سے آپ [illegible] وقت [illegible] ہیں [illegible] اُنکے تاثرات آپکے ذہن میں
اجاگر ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں بعض بہت اچھے مواقع ہر شخص کو ملتے ہیں جن سے
بہت کم مستفید ہوتا ہے [illegible] اور زندگی [illegible] افسوس ہوتا ہے؟ آپ کے [illegible] کیا ہوا؟
خدا بخش لائبریری [illegible] اپنے کو [illegible] [illegible] [illegible]
ذاکر [illegible] خدا بخش [illegible] اخلاق و [illegible] اور [illegible]
اور [illegible] کام کر رہے ہیں۔
واقعی صاحب! صاحب ذوق عالم اور شاعر کو کون اور کیا معاوضہ
دے سکتا ہے؟ آپ سب لوگ ہمارے لئے عطیۂ فطرت ہیں۔

خادم

جنید

S. Sibte Hasan

46-E, BLOCK 4, GULSHAN-E-IQBAL
KARACHI-47
RES : 466481
OFF: 200336

7.1.86

برادرم وامق صاحب ـ سلام شوق

یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ سے ملے ہوئے اتنے دن ہو گئے کہ اب یہ بھی یاد نہیں کہ آپ سے آخری بار کب ملاقات ہوئی تھی البتہ ہندستان سے آنے والے مشترکہ دوستوں سے آپ کی خیریت ضرور دریافت کر لیتا تھا۔ بھلا "بھوکا ہے بنگال" کے مصنف کو بھی بھلایا جا سکتا ہے۔ وہ تو ہماری انقلابی تاریخ کا نہایت اہم حصہ بن چکا ہے۔ کبھی معلوم ہوا کہ آپ کشمیر میں ہیں، کبھی پتہ چلا کہ علی گڑھ میں ہیں۔ پھر سنا کہ آپ مستقلاً وطن چلے گئے۔ یہاں کے رسالوں میں آپ کا کلام بھی نظر سے نہیں گذرا اور ہندستان کے رسالے دیکھنے کو نہیں ملتے مگر مجھ کو یقین ہے کہ مشق سخن بدستور جاری ہوگی۔ آپ آئیں گے تو ہم بھی پھر سے سنیں گے۔ البتہ ویزا کے لئے ابھی سے کوشش کریں۔ مگر کانفرنس میں شرکت کا ذکر نہ ہو بلکہ رشتہ داروں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جائے۔ وہ بھی کراچی میں مقیم رشتہ داروں کی ورنہ ویزا ہرگز نہیں ملے گا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس سے رابطہ مناسب رہے گا۔ اپنی آمد کی تاریخ سے ہمیں پہلے مطلع کر دیجئے گا کیونکہ خطوں کو یہاں آنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ کانفرنس ۶/۷/۸ مارچ کو ہوگی ـ

نیازمند
سبط حسن

S. Sibte Hasan

46-E, BLOCK 4, GULSHAN-E-IQBAL
KARACHI-47
RES : 466481
OFF: 200336

28.3.86

برادر عزیز وامق صاحب ۔ خوش رہیے ۔

آپ کا خط مورخہ ۲ فروری ملا ۔ مدت دراز کے بعد آپ کی تحریر نظر سے گذری اور جی بہت خوش ہوا ۔ آپ کا محبت سے لبریز پیغام کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنا دیا گیا تھا مگر آپ کے کانفرنس میں شریک نہ ہونے کا بہت افسوس رہا ۔ میں تو آخر دن تک راہ دیکھتا رہا لیکن قمر رئیس نے آن کر بتایا کہ آپ اور آپ کی اہلیہ دونوں علیل ہیں ۔ امید ہے اب آپ شفایاب ہو چکے ہوں گے ۔ میرا حتمی ارادہ لکھنؤ کانفرنس میں شریک ہونے کا تھا ۔ پاسپورٹ پر ہندوستان کا اندراج بھی ہو گیا تھا مگر آخر وقت پر صحت نے جواب دے دیا ۔ خیال تھا کہ سب دوستوں سے ملاقات ہو جائے گی مگر یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی ۔ یہاں کانفرنس بہت کامیاب رہی ۔ بالخصوص نئی نسل کے ادیبوں کا جوش خلوص اور ولولے نے ہم بوڑھوں میں بھی نیا خون دوڑا دیا ۔ یہاں تحریک میں وہ گروہ بندیاں تو نہیں ہیں اور نہ سرکار دربار کی دہلیز پر سر رگڑنے کی کسی کو آرزو ہے لیکن یہاں کے لسانی مسائل بہت پیچیدہ ہیں ۔ پنجابی اور سرائیکی (ملتان) کے ادیبوں حتیٰ کہ ترقی پسند ادیبوں کے مابین غلط فہمیاں، سندھی اور اردو کے ادیبوں میں بدگمانیاں ۔ یہ مسائل کانفرنس کے دوران بھی اٹھے لیکن خوش اسلوبی سے طے پا گئے ۔ ہندوستان سے قمر رئیس، تاباں، اقبال مجید عشرت، ردولوی اور ان کی بیوی، جوگندر پال اور ان کی بیوی، اور اصغر علی انجینئر تشریف لائے تھے ۔ ملک راج آنند اور کیفی کو ہمارے سفارت خانے نے ویزا دینے سے انکار کر دیا اور سردار جعفری علالت کی وجہ سے نہ آ سکے ۔ ریاض حیدر کو ہم نے مدعو کیا تھا ۔ قمر رئیس سے تاکید کی تھی لیکن انھوں نے آ کر کہا کہ وہ حضرت سرے سے لاپتہ ہیں اس لیے ان سے رابطہ ہی نہ ہو سکا ۔

ہندستان میں ترقی پسندوں کے درمیان حکومت کے بارے میں جو نظریاتی اختلافات ہیں اُن کا مجھ کو تھوڑا بہت علم ہے ۔ لیکن لندن کانفرنس کی تعزیتی قرار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ تھوڑی بہت بدنظمی ہر کانفرنس میں ہوتی ہے سو لندن میں بھی ہوئی ۔ یہ دیکھیے ابھی سیکرٹریٹ کمیٹی کا جلسہ ہی تھا لیکن اعلان نامہ آخر وقت تک تیار نہ ہو سکا تھا بلکہ ہال میں کانفرنس ہو رہی تھی اور ہم لوگ اعلان نامہ کا آخری مسودہ دوسرے کمرے میں فائنل کر رہے تھے ۔ تعزیتی قرار داد پہلے سے نہیں لکھی گئی تھی بلکہ جس وقت آخری اجلاس ہو رہا تھا تو میں نے عاشور کاظمی کو اسٹیج پر رقعہ بھیجا کہ ایک تعزیتی قرارداد فوراً پیش کر دو ۔ چنانچہ اس وقت جس کو جو نام یاد آیا اس نے ہال میں سے پکار کر آواز دے دی ۔ کسی سوچی سمجھی سازش کی وجہ سے کسی کا نام نہ شامل ہوا نہ حذف کیا گیا ۔

آپ میرے اس بیان کی تصدیق قمر رئیس اور [illegible] اختر سے کر سکتے ہیں ۔

(۲) سردار جعفری کا معاملہ سو اُن کو دشمن بنانے کا ہنر خوب آتا ہے مگر میرے بھائی آپ خود سوچیں اُن کے یا کسی دوسرے نقاد کے ماننے نہ ماننے سے آپ کے شاعرانہ مقام میں کیا فرق آئے گا ۔ اصل چیز تو آپ کا فن ہے ۔ قبول عام اور بقائے دوام کی سند تو وہ آپ کو دلوائے گا نہ کہ نقاد حضرات ۔ آپ تو ادب کی تاریخ سے مجھ سے کہیں زیادہ واقف ہیں ۔ بتائیے کیا کسی ادیب کسی شاعر کو سازش یا سفارش سے کوئی فائدہ یا نقصان پہونچا ہے ۔ چند دنوں کی واہ واہ سے کیا فرق ہوتا ہے ۔ بس آپ اپنا دل میلا نہ کیجیے ۔ سردار جعفری جیسے سو اور مجھ سے ہزار بھی آپ کی شاعری کو کوئی ضرر نہیں پہونچا سکیں گے ۔

کبھی کبھار خیریت کی دو چار سطریں لکھ دیا کریں ۔ [illegible] کیسے گذرتے ہیں ۔ میری زندگی کے حالات پاکستانی ادیبوں سے معلوم ہوں گے جو لکھنؤ جا رہے ہیں ۔

خیر طلب
سبط حسن

(جنہوں نے ۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو دہلی میں انتقال کیا ۔ واثق)

فون: ۲۱ ۷۶ ۹۲

ترقی پسند ادبی (گولڈن جوبلی) کانفرنس

۱۰۔ نورانی بلڈنگ کیمبل اسٹریٹ کراچی

تاریخ ۸ر فروری ۸۶ء

مکرمی راہی صاحب، آداب!

کرم نامہ پہنچا۔ یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ کانفرنس کی تاریخ ۶، ۷ اور ۸ مارچ مقرر کی گئی ہے۔ تفصیلی پروگرام جلد ہی مطلع کر دیا جائے گا۔ احباب آپ کے منتظر ہیں۔ اہل ذوق مشتاق دید ہیں۔

سبط حسن صاحب سلام کہتے ہیں، مزاج اچھے ہیں۔

خدا کرے آپ بالکل خیریت سے ہوں!

خیر اندیش

بہش صدیقی

بخدمت

احمد مجتبیٰ راہی صاحب

جونپور

PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION

GOLDEN JUBILEE CELEBERATIONS

Lucknow - 9, 10 & 11 APRIL 1986

۲۷ دسمبر ۸۵ء

لکھنؤ

رفیق محترم و مشفق حبیب، ترقی پسند مصنفین کی

گولڈن جوبلی ۹، ۱۰ اور ۱۱ اپریل کو لکھنؤ میں منائی جانے والی ہے۔ بیرونی ملکوں کے

ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ ہندوستان کی سبھی زبانوں کے نمائندے شریک

ہوں گے۔ خرچ کا آپ کو اندازہ ہے۔ [illegible] کم کا نہیں ہے [illegible] فنڈ اکٹھا کرنے کے

اس سلسلے میں یہ طریقہ سوچا ہے کہ ایک [illegible] جلسہ [illegible]

شہروں میں مشاعرے منعقد کیے جائیں [illegible] کریں۔ ان مشاعروں میں

[illegible] صرف [illegible] کا [illegible] اور [illegible]

[illegible] روپے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کہ آپ [illegible] مشاعروں میں شریک ہو [illegible]

شریک [illegible] کہ آپ [illegible]

[illegible] آپ کی [illegible] اور [illegible]

[illegible] ۱۱/۱

شریک

will participate

۱۵ فروری	[illegible]	۲ مارچ [illegible]
۱۹ فروری	[illegible]	۳ مارچ [illegible]
۲۲ فروری	[illegible]	۱۹ مارچ [illegible]
۲۳ فروری	[illegible]	۲۹ مارچ [illegible]
۲۰ فروری	[illegible]	

افسوس [illegible] خالی نہیں ہوں گا

جواب [illegible] لکھ دوں

[illegible]



PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION

GOLDEN JUBILEE CELEBRATIONS

Lucknow - 9, 10 & 11 APRIL 1986

13.2.86
لکھنؤ

بھائی وارثی صاحب

آپ کا ۱۱ جنوری کا خط مجھے دیر سے ملا اس لئے کہ میں انجمن
کے بعض الجھے ہوئے معاملوں کو سلجھانے کے لئے دہلی چلا
گیا تھا۔ آج ہی واپس ہوا ہوں لہٰذا آپ کا دعوت کا
معاملہ آپکو اندازہ ہوگا کہ اس سے مجھے کتنی
خوشی ہوئی اور خوشی ہے نہیں لیکن شمولیت ملی
بہت بہت شکریہ۔

مشاعروں کے سلسلے میں یہ عرض ہے ۲۰ اور
۲۱ مارچ کے مشاعرے نہیں ہیں۔ باقی مارچ میں
جتنے مشاعرے ہیں انکی تاریخیں اور مقام لکھ رہا ہوں
انہیں سے کچھ مشاعرے بہت اہم ہیں جنمیں اگر
آپ شریک ہو سکیں تو مجھے بہت مدد ملے گی

27-2-86

۱۶، ۱۹ مارچ ۱۹۸۶ء — نہٹور
۲۲، ۲۳ مارچ — مگلک ...
۱۶، ۱۷ مارچ — اعظم گڑھ شبلی کالج
اسمیں شرکت بہت ضروری ہے —
...کی تاریخ بھی ... لوٹ

...[illegible]...

~~44 USMAN ENCLAVE, ALIGANJ, LUCKNOW-226020~~
12 - Field Hostle . Cannal Colony
Cantt Road Lucknow.

۱۲/۳/۸۷

وارث بھائی! آداب۔ مدت سے آپ کا ۲۶ فروری کا لکھا ہوا خط ملا۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ غالباً نئی دہلی سے پٹنہ کلکتے ۲۲-۲۴ کو تشریف لے جائیں گے۔ بھائی کلکتے کا مشاعرہ کینسل ہو گیا جو آگے مشاعرہ کرے گا ان کی تاریخیں ابھی طے نہیں ہوئی ہیں۔ اب تو کانفرنس سر پر آ گئی ہے۔ میں نے گھر والوں سے بھی عرض کیا ہے ۳۱ کو آپ اعظم گڑھ پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ۲۴ اپریل کو گورکھپور میں ۲۸، ۲۹ مارچ کو بستی میں مشاعرہ ہے اگر صحت اجازت دے تو ان مشاعروں میں شرکت کر لیجیے۔ کانفرنس میں تو آپ کو ضرور آنا ہے صحت اجازت دے یا نہ دے۔

مخلص
کیفی

میرا نیا پتہ یہ ہے
سی۔ پی۔ آئی آفس
۲۲، قیصر باغ لکھنؤ

R 14/3/86

Saliha Abid Husain
Jamia Nagar, New Delhi - 25

صالحہ عابد حسین
جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

برادرم تسلیم

اس حادثہ عظیم میں آپ کا ہمدردی و دلسوزی سے بھرپور خط ملا جس کے لئے شکرگزار ہوں۔ ایسے جانکاہ صدموں میں صرف دوستوں اور عزیزوں کی غم خواری ہی زندہ رہنے کا سہارا ہوتی ہے۔ لیکن یہاں کا غم کسی بہن کے لئے جان لیوا ہے نہ کہ میرا بھائی جو نہ صرف خاندان کا بلکہ ملک و قوم کا فخر، ان سب کا چشم و چراغ تھا۔ جو بہن کی جان تھا۔ دوست، گویا استاد، رہنما، سب کچھ! جس کی صحبت میں زندگی کے بہترین سال جنت میں گزرے۔ اب ایسا حسین بہشت سے بچھڑ جائے تو کیسے زندہ رہیے اور کیوں رہے؟ لیکن یہ بارِ زندگی جب تک دینے والا واپس نہ لے اٹھانا ہے ہر مجبور رہنا!

آپ سے انہیں بڑی محبت تھی اور آپ کا کلام پسند کرتے تھے۔ ~~[illegible]~~ در اصل سیدین صاحب کی جدائی صرف میرے یا ان کی بیٹیوں یا سب قریبی دوستوں اور عزیزوں ہی کا نقصانِ عظیم نہیں بلکہ

ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہے جو ان کی انسانیت، شرافت، ان کی اعلیٰ قدروں، ان کی انسان دوستی اور مذہب و اخلاق پر ان کے اٹل عقیدے سے روشنی حاصل کرتے تھے۔ جن کو ان کی دوستی کی بیش بہا نعمت ـــ بلکہ ان کی محبت کی نرمی اور گرمی کی دولت حاصل تھی!

ہائے واحق صاحب! وہ شخص کتنا بڑا تھا یہ تو سبھی جانتے ہیں مگر وہ اصل میں کیا تھا، اس کا دل کتنا وسیع، کتنا درد مند، سوز و گداز سے کتنا بھرپور، کتنا صابر، کتنا راضی برضا رہنے والا تھا یہ بس میں جانتی ہوں! ایک بار تو خالقِ کائنات بھی جھوم اٹھا ہوگا اپنی اس حسین تخلیق پر!

اور اب؟

زندگی میں سوا اداسی اور محرومی کے کچھ نہیں رہا۔

آپ کی سوگوار بہن

صالحہ

ایک تازہ مکتوب

وامق کی اپنی تحریر

Wamiq Jaunpuri

Lal Kothi,
P. O. Kajgaon,
Dist. Jaunpur (U. P.)
Pin - 222138

Date 10-12-92

برادر مکرم ڈاکٹر بیدار   آداب

نوازش نامہ نمبر 3795 مورخہ 6-12-92 موصول ہوکر باعث
مسرت ہوا۔ علالت طول کھینچتی اور صحت بد سے بدتر ہوتی
جارہی ہے جو آپکی مطلوبہ منسلک تصویر سے ظاہر ہے۔

یہ چند حسینوں کے خطوط آپکو کہاں سے مل گئے۔ یاد نہیں
آپکو کب بھیجے تھے۔ ذاکر صاحب۔ محمود صاحب۔ سرور صاحب
ظ۔ انصاری۔ مخدوم۔ سہیل عظیم آبادی۔ پرویز شاہدی۔
ڈاکٹر اعجاز۔ احتشام صاحب۔ راہی معصوم رضا۔ شکیل احمد
صدیقی اور دوسرے ادیبوں کے خطوط بھی میرے پاس
محفوظ ہیں۔ کس بنڈل میں ہیں کس الماری میں ہیں
یاد نہیں اور میں انکو تلاش کرکے نکالنے سے رہا۔
البتہ شعرگوئی کا جنون اپنے شباب پر ہے جس میں اعضا
کی کمزوری نے حد سے زیادہ تلخی پیدا کردی ہے۔ نمونے کے
طور پر ایک تازہ ترین غزل کے چند اشعار ارسال
کررہا ہوں:۔

زباں نہ کھلواؤ میری باتوں میں لطف بھی ہے عتاب بھی ہے
زباں میں نوکِ تیغ بھی ہے زبانِ چنگ و رباب بھی ہے

نہ مجھکو اقرار میں تکلف نہ تجھکو انصاف سے تعلق
زباں مری بے لگام اگر ہے ستم ترا بے حساب بھی ہے

غزل میں جو سرگرانیاں ہیں وہ سب ہماری کہانیاں ہیں
زباں کی سحر البیانیاں ہیں بیاں میں پیچ و تاب بھی ہے
غزل کی صورت ہے رنگ و رامش غزل کی سیرت ہے غمزہ و تابش
غزل کی تخلیق کارِ دانش غزل جنوں کی کتاب بھی ہے

ہماری آہٹ پہ چلتے رہنا رکاوٹیں لاکھ ہوں نہ رکنا
یہیں کہیں ہم بھٹک رہے ہیں یہیں کہیں انقلاب بھی ہے

جو اپنی منزل سے ہٹ گیا ہے جو اپنی دنیا سے کٹ گیا ہے
مکان بھی جس کا لٹ گیا ہے یہیں وہ خانہ خراب بھی ہے

"سوزِ ناتمام" جو مجھے شعری مجموعہ کا ایک نسخہ بھی ارسال کر رہا ہوں

بچوں کے لیے نظمیں - پوربی بولی کے گیت - تقریباً ایک درجن طویل
اور نیم طویل تمثیلیات اور ہجویات ملیح کے مجموعے ترتیب
دے چکا ہوں مگر ناشر حضرات سے کوئی رابطہ کبھی رہا تھا اور
نہ اب ہے - متفرق مضامین اور انشائیوں اور تراجم - منظوم
ڈراموں اور علمی مباحث کے مسودات کی فائلیں نظرِ ثانی کی
منتظر الماریوں میں ڈھیر ہیں مگر اب کس کمبخت میں اتنی سکت
ہے کہ انکی گرہیں کھولے اور دیکھے - شاید میرے بعد کوئی
سرپھرا ان اوراقِ پارینہ کو ترتیب دے سکے -

ایک تکلیف اور دینا چاہتا ہوں - تصویروں میں دھنباد گروپ
1963 کے پیچھے یا بغل میں اتنا اور لکھوا دیجئے - "وامق جونپوری
اپنے اہل و عیال کے ساتھ - خواتین محمد الیاس صفوی - دونوں بیٹے قسمت
مجتبیٰ اور باقر مجتبیٰ - بیٹی شیریں - بڑی بہو زہرہ نیاز - وامق اور
انکی اہلیہ کے درمیان پوتی عندلیب"
آپکے سارے منسلکات میں نے بستر علالت کے تکیوں تلے دبا لئے
ہیں (بالخصوص غالب اور ٹیگور کے مرقعے اور وصلیوں کی تصویریں
جو اصل سے زیادہ دیدہ زیب ہیں - والدعا

آپکا مخلص

وامق جونپوری

منسلک - تصویر
- سوزِ ناتمام

خط و تصویر گری

گریزد از صف ما هر که مرد غوغا نیست
کسی که کشته نشد از قبیله ما نیست

مغان بہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

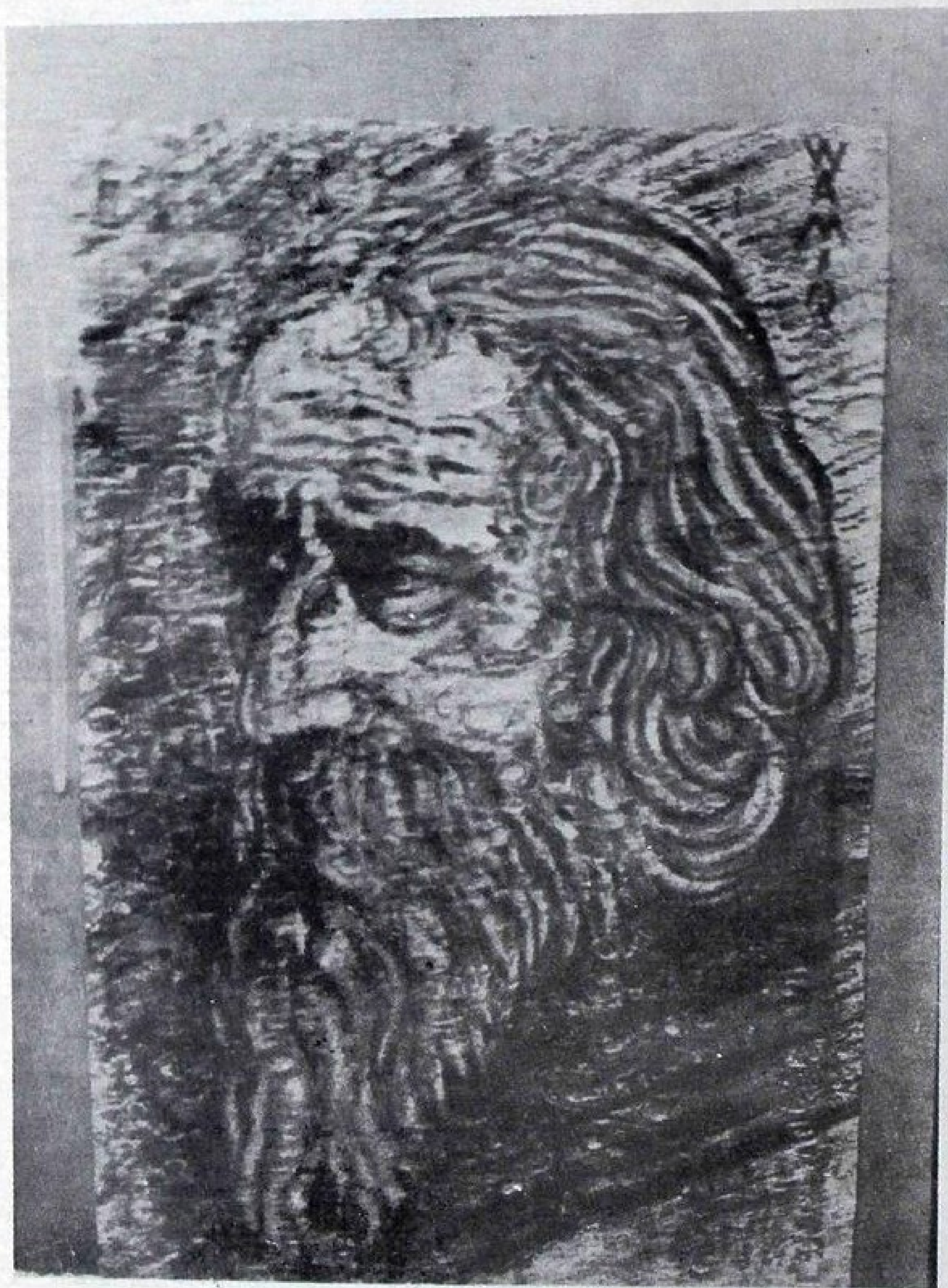
ابن سید

احمد سبط

محمد تقی

واثق

شاعری جزویست از پیغمبری





حرفہائے دو چند

بھائی عابد رضا بیدار صاحب   بہت بہت دعائیں

آج سے چار دن پہلے آپ کے خط 5479 مورخہ 93-2-25 کے ساتھ میری خود نوشت کا ببلا نسخہ جس کے پہلے ہی صفحہ پر آپ کا جان لیوا نوٹ "حرفے چند" تھا ملا' جس کا نام "گفتنی ناگفتنی" تو باقی رہا مگر بقول آپ کے "گفتنی" کی اشاعت فوراً ہو گئی اور "ناگفتنی" مولانا آزاد روایت کے مطابق تیس سال بعد ہوگی۔

آپ کو مجھ سے جو تعلق خاطر ہے اس کا کوئی جواب نہیں البتہ آپ نے اس کتاب کی اشاعت میں میرے بچوں کے انتباہ پر میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے' اس کا بھی کوئی جواب نہیں یعنی میری خود نوشت کا گلا گھونٹ کر اس کی بے روح لاش میرے سامنے ڈال دی۔

اس کی کیا ضمانت ہے کہ 21 ویں صدی کے 23 ویں سال تک میں تو خیر کیا' میرے بچے' خدا نہ کردہ زندہ نہ رہیں گے اور مارچ 2023ء میں انشاء اللہ آپ بھی ہوں گے اور وہ بھی اور جب آپ کے ادارہ نشر و اشاعت پر اُس دَور کے روشن خیال ناقدین اور قارئین کے نشتر قلم جو لعنتیں برسائیں گے اور ضرب لگائیں گے تو آپ ان کو کیا جواب دیں گے ؟ یقیناً اُس وقت تالی بجانے کے لیے افسوس میں نہ ہوں گا اور میرے بچے بھی جو اکیسویں صدی کے روشن خیال شہری بن چکے ہوں گے' آپ کی کوئی معاونت نہ کریں گے اور آپ کو فرار کا راستہ نہ ملے گا۔ اِس وقت آپ برسرِ اقتدار اور بااختیار ہیں جو چاہیں کر لیں ؛ اُس وقت آپ کو اپنے اختیار خصوصی (Prerogative) پر سب سے زیادہ تاسف ہوگا۔ آج کی مسترد "ناگفتنی" سونے کے حروف میں شایع ہوگی اور آپ اس کی تائید کریں گے۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر   یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

زیر نظر خط کو کہیں جلد از جلد شائع کرا دیجیے' یا زیر تدوین خود نوشت ہی میں اگر ممکن ہو تو اس کی کاپیاں چسپاں کروا دیجیے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج کے قاری اور نقاد پر آپ کے "حرفے چند" پڑھنے کے بعد میرے "حرفہائے دو چند" کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ والدعا۔

پ۔ن: اس خط کے شامل کتاب ہو جانے سے میرا دل کچھ ہلکا ہو جائے گا۔

خیر اندیش

وامق جونپوری

لال کوٹھی، کجگاؤں

جونپور

8 3 93

نول کوٹھی - گجاؤں -
جونپور 8-3-93

"حرفہائے دو چند"

بھائی عابد رضا بیدار صاحب   بعد بہت بہت دعائیں

آج سے چار دن پہلے آپکے خط 5474 مورخہ 25-2-93 کیساتھ میری خودنوشت کا پہلا نسخہ جسکے پہلے ہی صفحہ پر آپکا جان لیوا نوٹ "حرفے چند" تھا ملا جسکا نام "گفتنی ناگفتنی" تو باقی رہا مگر بقول آپکے "گفتنی" کی اشاعت فوراً ہو گئی اور "ناگفتنی" مولانا آزاد روایت کے مطابق تیس 30 سال بعد ہو گی۔

آپکو مجھ سے جو تعلق خاطر ہے اسکا کوئی جواب نہیں البتہ آپنے اس کتاب کی اشاعت میں میرے بچوں کے انتباہ پر [illegible] میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُسکا بھی کوئی جواب نہیں یعنی میری خودنوشت کا گلا گھونٹ کر اسکی بے روح لاش میرے سامنے ڈالدی۔

اسکی کیا ضمانت ہے کہ 21ویں صدی کے 23ویں سال تک میں تو خیر کیا میرے بچے خدانکردہ زندہ نہ رہینگے اور مارچ 2023ء میں انشاءاللہ آپ بھی ہونگے اور وہ بھی اور جب آپکے ادارۂ نشر و اشاعت پر اس دور کے روشن خیال ناقدین اور قارئین کے نشتر قلم جو لعنتیں برسائینگے اور ضرب لگائینگے تو آپ انکو کیا جواب دینگے۔ یقیناً اُس وقت تالی بجانے کے لئے [illegible] افسوس میں نہ ہونگا اور میرے بچے بھی جو اکیسویں صدی کے روشن خیال شہری بن چکے ہونگے آپکی کوئی معاونت نہ کرینگے اور آپکو فرار کا راستہ نہ ملیگا۔ اس وقت آپ برسر اقتدار اور با اختیار ہیں، جو چاہیں کریں اُس وقت آپکو اپنے اختیار خصوصی (Prerogative) پر سب سے زیادہ تاسف ہوگا۔ آپکی مسترد "ناگفتنی" سونے کے حروف میں شائع ہو گی اور آپ اسکی تائید کرینگے۔۔۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

زیر نظر خط کو کہیں جلد از جلد شائع کروا دیجئے یا زیر تعدیں خودنوشت ہی میں اگر ممکن ہو تو اسکی کاپیاں چھپاں کروا دیجئے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپکے قاری اور نقاد [illegible] آپکے "حرفے چند" پڑھنے کے بعد میرے "حرفہائے دو چند" کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ والدعا۔

انیس
[illegible] جعفری

اُس خط کے شامل کتاب ہو جانے سے میرا دل کچھ ہلکا ہو جائیگا۔